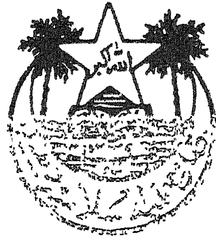
نمبر ۱۸۹۲

رجسٹرڈ





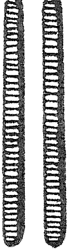
جلد ۱۰

بابت ماہ فروری ۱۹۲۸ء









مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱ | بابتہ ماہ رمضان سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق فروری ۱۹۲۸ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

اجمل خاں

اُس عظیم الشان انسان کی زندگی، جس کو قضائے الٰہی نے دنیائے بے ثبات کی کشمکش اور زندگی کی تمام کاوشوں سے آزاد کر کے آغوشِ رحمت کی سپرد کر دیا، صرف تین لفظوں میں بیان ہو سکتی ہے:-

محبت، خدمت، استقامت

جس روح نے اس کالبدِ خاکی میں ۶۲ برس اپنے وجودِ اعلیٰ کو دنیا کی گندگی سے پاک رکھا اور کبھی اُن ادنیٰ محسوسات سے آلودہ نہ ہونے دیا جو ایک معمولی انسان کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، اُس روح کی ساری روندادِ زندگی ان تین لفظوں میں محفوظ ہے۔

میں اجمل خاں کا عقیدتمند، نیازکیش تھا، میں اُنکی پاکیزہ صحبتوں کا ایک خوشہ چیں تھا، میں اجمل خاں کے اُس لازوال تبسم کا ایک درمِ ناخریدہ تھا جس تبسم کے اندر میں نے بارہا اُن کی روحانیت کو جھلکتے دیکھا ہے، ۱۶ برس تک اُس اعلیٰ اور ارفع انسانیت کی ہر ادا میری ادنیٰ اور معمولی انسانیت کو حیاتِ حقیقی کے سبق پڑھاتی رہی۔ ۱۶ برس تک بعض اوقات شب و روز، دنوں اور ہفتوں مسلسل، اُس صحبت کے مزے لوٹے، سفر میں اور حضر میں، خلوت میں اور جلوت میں، شریف منزل کی اُن صحبتوں میں جہاں کبھی کبھی اُنکے خاص احباب جمع ہو جایا کرتے تھے، اور اُن محفلوں میں جہاں سیاسی اور قومی مسائل کے ہنگامے برپا ہوتے تھے، والیانِ ریاست کے درباروں میں، ہندوستان کے دور دراز مقامات پر، اور یورپ اور ممالکِ غیر کی اجنبی فضا میں، اجمل خاں بجائے خود ایک شمعِ محفل ہوتے تھے، اُن کی شخصیت، اپنی تمام تر جاذبیت اور سنجیدگی کے ساتھ، ہر محفل میں، مرکز

نظر اور مرکز خیال ہوا کرتی تھی۔ آہ اُس مٹھی بھر خاک میں کیا تھا جواب نہیں ہے! اور جو کچھ تھا وہ کہاں گم ہو گیا!

وہ ذرا سا دل، ناتواں اور داغدار، جس کی حرکت ۲۰ اور ۲۹ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب میں بند ہو گئی محبت و اخلاص کا ایک موجزن سمندر تھا، جو کوئی اس کے ساحل تک پہنچا کبھی ناکام نہ آیا، اجمل خاں کے دل کی وسعت وہی جان سکتا ہے جس نے اُنکی دلفریب صحبتوں میں اس دلنواز شخصیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا ہو۔ ۱۶ برس کے عہد نیازمندی میں کبھی ایک دفعہ بھی میں نے اُنکو اپنے کسی مخالف یا دشمن کے لئے کڑی بات کہتے نہ سنا، ہزار بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے اور میری طرح دوسرے احباب نے بعض اشخاص کا تذکرہ کیا جن کی بد زبانی سر بازار اُنکو ہدف بناتی تھی، لیکن اجمل خاں کے پاس دشمنوں کی دشمنی کا صرف ایک ہی جواب تھا یعنی مسکرا کر خاموش ہو جانا۔ زیادہ سے زیادہ سخت بات جو میں نے کسی شخص کے متعلق کبھی اُنکی زبانی سنی وہ صرف یہ ہوا کرتی تھی کہ قاضی صاحب! زید کچھ اچھا آدمی نہیں ہے"! کتنے انسان ہیں جو اس اولوالعزمی کے ساتھ دوسروں کی کمزوریوں کو نظر انداز کر سکتے ہوں۔ اُس دل میں محبت کے سوا کچھ نہ تھا، خاص احباب کا تو ذکر ہی کیا ہے غیر بھی اُنکے دل کے کسی نہ کسی گوشہ میں جگہ پا لیتے تھے، اور پھر وہ جگہ انکے لئے ہمیشہ محفوظ رہتی تھی، غریب اور امیر بڑے اور چھوٹے، برے اور اچھے سب اُس گھر میں محبت کا سایہ پاتے تھے اور وہ ایک فیض عام تھا کہ جاری تھا۔

خدمت۔ اجمل خاں کی ساری زندگی کا کارکن جذبہ تھا، وہ اتنا اعلیٰ تھا، اتنا استوار تھا، اتنا عام تھا، کہ اُنکا آخری سانس بھی خدمت خلق میں گزر گیا شخصی زندگی میں، خاندانی زندگی میں، مطب میں سیاسیات میں، معاشرت میں وہی ایک جذبۂ خدمت ہمہ وقت کارفرما تھا، ساری کاروبار زندگی کا سربراہ کار وہی ایک جذبۂ اعلیٰ تھا جس نے اجمل خاں کو لاکھوں دلوں کا حاکم اور لاکھوں گھروں کا چراغ بنا دیا تھا۔ تین سو برس تک جس خاندان نے طب کے ذریعہ سے ہندوستان

اجمل خاں مطب میں اور ماوراے ہندوستان مخلوق خدا کی خدمت کی تھی اُس خاندان کے نام نیک کو وسعت سے بہت آگے اور اس فن شریف کی بلندیوں سے بلند تر لے گئے۔ اُنکا جذبہ خدمت وسیع ترمیدان مانگتا تھا، بلند تر فضا ڈھونڈتا تھا، بہت کم باقبال ایسے ہیں جو اپنی پبلک زندگی کے شباب میں، انحطاط کا وقت آنے سے پہلے عین معرکہ کارزار میں کمر باندھے ہوئے گزر جائیں اور زندگی کی پستی کا ایک قدم بھی انکو اٹھانا نہ پڑے، کارساز حقیقی اُنکا ایسا کارساز تھا جس نے اُنکے نفس آخر تک وہی ایک کام اُن سے لیا جو دنیا کے بڑے سے بڑے اشخاص کا تمغہ امتیاز اور مایہ افتخار ہوتا ہے۔ وہ ایک غلام، مجبور، اور پست قوم کی تباہیوں میں پیدا ہوئے، ہاں، قدرت کا یہ ایک غیر معمولی کرشمہ تھا کہ اس عام پستی کی حالت میں بھی آنکی فطرت اس قدر بلند اور اس قدر آزاد رہی۔ کاروبار قدرت میں کوئی انسان دم نہیں مار سکتا، لیکن اجمل خاں کو تو کسی زندہ قوم میں پیدا ہونا چاہیے تھا! گذشتہ دسمبر میں جب امیر افغانستان کی تشریف آوری کے سلسلہ میں وہ بمبئی تشریف لے گئے تھے تو بستر علالت سے اٹھ کر ایسی حالت میں روانہ ہوئے تھے، کہ اُنکے لئے معمولی نقل و حرکت بھی تکلیف دہ تھی۔ میں نے کتنی دفعہ عرض کیا کہ اس حالت میں بمبئی کا طویل سفر کسی طرح مناسب نہیں، پہلے تو خاموش رہے پھر فرمایا کہ "مجھے جامعہ کے لئے روپے کی فکر ہے، بغیر بمبئی گئے انتظام ہونا ممکن نہیں" وہاں سے واپس ہو کر جب رامپور تشریف لائے تو پانچ روز سے غذا برائے نام رہ گئی تھی، میں نے عرض کیا کہ کچھ روز رامپور میں قیام کیجیے، دلی کی مصروفیت ایسی حالت میں ناقابل برداشت ہوگی، لیکن اُنکی حالت تو یہ تھی کہ ایک لمحہ بیکار نہیں گزار سکتے تھے، کام اُنکے لئے نفس حیات تھا۔ رامپور میں کبھی ہز ہائنس سے اپنی علالت کا ذکر نہ فرماتے تھے اور تمام احباب کو ہدایت ہوتی تھی کہ ہز ہائنس تک اُنکی سوء مزاجی کی خبر نہ جانے پائے، وہ خوب جانتے تھے کہ ایسی حالت میں ہز ہائنس کی محبت کا لازمی تقاضہ یہ ہوگا کہ وہ رامپور میں روکے جائیں اور یہ انکو گوارا نہ تھا، اُنکو گوارا نہ تھا کہ وہ اپنے مرکز عمل سے دُور رہیں۔

یوں تو کبھی پیشانی پر شکن نمودار نہ ہوتی تھی لیکن اہل غرض کے لئے تو ہمہ وقت اُنکے گھر

کا اور ول کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ بارہا میں نے عرض کیا کہ اپنے مشاغل میں فرصت اور آسایش کا بھی کوئی وقت نکالئے، جب فرمایا تو یہی فرمایا کہ "قاضی صاحب! میں کیسے کسی کو منع کر دوں"! خدمت خلق کے اس ذوق دوام کے ساتھ شان استغنا یہ تھی کہ کبھی اپنے کسی عزیز دوست کو تکلیف نہ دے سکتے تھے۔ کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ انکا کوئی عقیدتمند چند ساعت انکی کوئی خدمت کر سکے۔ وہ دوسروں کی خدمت کر کے مسرور اور انکی وجہ سے کوئی دوسرا تکلیف اٹھائے تو آزردہ ہوتے تھے! انکا وجود دنیا میں محض خدمت کے لئے تھا، بستر مرگ پر بھی انہوں نے اپنے کسی خادم یا دوست کو اس کا موقع نہیں دیا کہ کوئی چند منٹ انکی خدمت کر لیتا جس شان سے دنیا میں زندہ رہے اسی شان سے سدھار گئے۔ انکی زندگی کا سارا سفر جس طرح باعزم و وقار گزرا اسی طرح اس دنیا سے! یا یوں کہ میں انکے آخری لمحے بھی انتہائی خودداری کے ساتھ (جو ہمیشہ نخوت سے پاک رہی) گزرے۔ انہوں نے احسان کئے، احسان لئے نہیں۔ اس خراب آباد عالم سے وہ ہنستے بولتے گزر گئے اور لاکھوں کو روتا چھوڑ گئے۔

آں طبیبے کہ شفا یافت جہاں از نفسش
حال درد شب ہجراں کہ رساند زنفش (شیدا)

استقامت۔ اجمل خاں کی تصویر حیات کا ایک فولادی فریم تھا۔ انکی فطرت کے لاکھوں لطیف و نازک خط و خال اس فریم میں اہل بصیرت کے لئے زیب نظر تھے۔ وہ کوہ وقار انسان جس کا نام اجمل خاں تھا اپنی زندگی کے اصولوں کا ایک سورما تھا۔ اجمل خاں کے اصولوں کی چٹان پر ہزارہا خودغرض اشخاص کی کشتیاں ٹکرا ٹکرا کر غرق ہو جایا کرتی تھیں۔ عمر کا ایک بڑا حصہ انہوں نے اپنے فن کی خدمت میں صرف کیا، آج طبیہ کالج اور دواخانہ یونانی اس عالی حوصلہ انسان کے عزم و استقامت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہیں۔ جو طب صدیوں سے حالت انحطاط میں تھی، جو طب دنیا کے ترقی یافتہ علوم سے محروم اور اجنبی تھی، اُس کو ایک بلند تر سطح پر لانے اور اس کام میں قدامت پسندوں

کی قدامت پسندی کا مقابلہ کرنے میں مسیح الملک کو کتنی قربانیاں کرنی پڑی ہوں گی کتنے مخالفوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا! یہی نہیں بلکہ جب انہوں نے اپنے خاندان کے تمام علم سینہ کو عامۃ الناس کی ملکیت بنا دیا اور خاندانی نسخوں کو راز میں رکھنا اپنے لئے حرام کرلیا تو بلا شبہ انہوں نے ایک ایسی قربانی کی جس کی ہمت بڑے بڑوں کو کبھی نہ ہو سکی۔ اُنکی اس قربانی کا مظہر دواخانہ یونانی ہے جو آج خاندان شریفی کی تمام علمی جواہر کا مالک ہے۔ پھر جب اُنکی فطرت عالی نے اپنے لئے ایک وسیع تر میدان عمل مانگا تو وہ سیاسیات کی طرف متوجہ ہوئے اور اس عزم و قوت کیساتھ متوجہ ہوئے کہ اپنی بقیہ زندگی معہ اُن تمام آسائشوں اور راحتوں کے جو انکو میسر تھیں یک قلم قربان کردی۔ وہ امراء اور رؤسا کی محفل سے اٹھکر، فرش خاک پر آ بیٹھے۔ میں نے اُن اجمل خاں کو بھی دیکھا تھا جو سیاسیات کے گزشتہ ہنگامہ عظیم سے پہلے، ایک عالی شان طبیب ایک اولوالعزم رئیس، اور ایک بلند مقام شخص تھے، اور پھر میں نے اُن کھدر پوش اجمل خاں کو دیکھا جن کی صبح اور شام کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ اُنکی زندگی کی صبح مسند پر ہوئی اور اس کی شام فقیر کے بوریے پر! یہ انقلاب عظیم محض سیاست و معاشرت کا انقلاب تھا۔ انسانیت کا جوہر تو وہی تھا جو خدا کا دیا لیکر وہ دنیا میں آئے تھے اور اپنے ساتھ قبر کے کونے میں لے گئے۔ اُنکی فطرت عالی کبھی زربفت اور کھدر کے اختلاف سے متاثر نہ ہو سکتی تھی۔ خدا نے جو کچھ انکو عطا کیا تھا وہ بہت عطا کیا تھا۔ اُن کے لئے عطائے الٰہی مقدار میں محدود نہ تھی۔ دولت بہت کمائی اور بہت صرف کی، عزت بہت حاصل کی اور آخر وقت تک اس کو محفوظ رکھا، محبت دوسروں سے اپنے لئے حاصل کی اور بے اندازہ حاصل کی، اسی طرح اپنے دل کی محبت دوسروں کو بخشی اور بے اندازہ بخشی! جذبۂ قومی انکو سیاسیات کی قربانگاہ پر لایا تو کچھ نہ تھا جو انہوں نے قربان نہ کر ڈالا ہو۔ یہ فقیر منش انسان اپنے دل کی سلطنت میں کتنا بڑا شہنشاہ تھا! اللہ! اللہ!!

اجمل خاں کی سیاست فی نفسہ بالکل تعمیری تھی، تخریبی نہ تھی، اُنکی فطرت اُن کو ہر چیز کے

تعمیری پہلو کی طرف لیجاتی تھی، خواہ تخریب کا پہلو کتنا ہی اہم اور ناگزیر کیوں نہ ہو۔ اسی تعمیری جذبہ کا آخری اور محبوب ترین ثمر جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس کے لئے انہوں نے اپنے آخری زمانہ میں بہت سی کٹھن منزلیں طے کیں۔ جامعہ درحقیقت اجمل خاں کی ان فطری خصوصیات کا ایک عجیب و غریب مرکب ہے یعنی محبت، خدمت اور استقامت۔ جب علیگڑھ میں دن اور رات پرانے کالج اور نوخیز جامعہ کی کشمکش ہو رہی تھی، اس وقت بھی میرے ذاتی علم و یقین میں، اجمل خاں ایک ہی اصول پر جمے ہوئے تھے اور وہ صرف یہ تھا کہ قومی تعلیم کا ایک نیا اور کامیاب مطمح نظر، جامعہ کے قالب میں دنیا کے سامنے رکھا جائے۔ انکے خیال میں جامعہ کو سیاسی کشمکش میں ڈالدینا ایک سخت غلطی تھی، وہ جامعہ کے بنیادی اصول کو ہمہ وقت پیش نظر رکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ خالص قومی تعلیم کا مرکز بنا کر جامعہ کو سیاسی حوادث سے محفوظ کر دیا جائے۔ وہ صحبتیں مجھے یاد ہیں جب عبدالمجید خواجہ صاحب کے مکان پر اس مسئلہ کے متعلق ان سے اور دوسرے اکابرین قوم سے اختلاف رائے ہوتا تھا اور سیاسی فضا کی اس گرمی میں انکو اپنے ہم خیال دو تین آدمی بھی نہ ملتے تھے، پھر وہ وقت آیا کہ علیگڑھ میں جامعہ ایک مریض جاں بہ لب تھا اور اسکا یہ مسیح نفس تیمار دار اس مایوسی کی حالت میں بیمار کو اپنے گھر لے آیا۔ وہ ایک خالص قومی محبت تھی، وہ ایک جذبۂ بے اختیار تھا جس نے اجمل خاں کو مجبور کیا کہ تمام سیاسی مصلحتوں، اس کام کی تمام ذمہ داریوں اور دشواریوں، اور اپنی خرابیٔ صحت سے قطع نظر کر کے وہ گرتی ہوئی دیوار کی اینٹوں کو چن کر علیگڑھ سے دہلی لائیں، یہ انکا عظیم الشان جذبۂ قومی تھا کہ انہوں نے جامعہ کو جس کا سہارا وہ تھے، خود اپنی زندگی کا سہارا بنا لیا، دنیا بھر کے تردد ات، سارے جہان کی فکریں، لاکھوں مشاغل، یہ سب ایک طرف رہے اور جامعہ کا تخیل دوسری طرف! ترازو کا یہی پلہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا! مجھ سے کئی دفعہ فرمایا کہ "کاش! میں دو برس اور زندہ رہ سکوں، جامعہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے، پھر مجھے کوئی فکر نہ ہوگی!" لیکن چراغ میں تیل ختم ہو چکا تھا اس کو تو گل ہونا ہی تھا، جامعہ کو اب صرف خدا کے سہارے پر زندہ رہنا ہے، وہ سدھار گئے

اور اپنی محبت، خدمت، استقامت کے لازوال نقوش جامعہ کے در و دیوار پر چھوڑ گئے جس کو جامعہ کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت ہونا چاہئے۔

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود ۔ سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

اجمل خاں کے استقامت اور عزم کی اعلےٰ ترین تصویر جامعہ ملیہ ہے۔ اس باب میں انکے مخصوص احباب تک ان کی اس ہمت پر حیران تھے۔ میں تو کبھی کبھی تنگ آکر عرض کرتا تھا کہ "حکیم صاحب! اب خاک ڈالئے، کچھ نہ ہوگا، کہاں تک بھیک مانگئے گا"۔ یہ سنکر مسکرا دیا کرتے تھے، اور شاید دل میں میری کم ہمتی پر ہنسا کرتے ہونگے، انکا عزم راسخ ہم جیسے کتنوں کو شرما دیا کرتا تھا، شاید ہم ہی جیسوں کے لئے انہوں نے فرمایا تھا کہ:

توشیریں کار باش و باز بنگر سرفروشے را
کہ من در زیر دلق خود قبائے کوہکن دارم (شیدا)

میں تو کچھ ایسا مایوس اور افسردہ ہوں کہ حرف تمنا کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک نفس سرد بھی نہیں نکلتا۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جامعہ کا حشر کیا ہوگا، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جامعہ کے متعلق اجمل خاں کے شیدائیوں کا فرض جو کچھ ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ساری عمر اجمل خاں نے کسی سے اپنی خدمتوں کی قیمت اور داد نہیں چاہی، اپنی قربانیوں کا معاوضہ نہیں مانگا، آج اُن کی رحلت کے بعد کم از کم اُنکے مخصوص نیازمندوں کو اُس شہید کے خون میں اپنا خون ملا دینا ہے یوں تو اہل بصیرت کے لئے ہر قدم پر اجمل خاں کا نشان موجود ہے، لاکھوں داستانیں ہیں جو لکھی جائیں گی، پڑھی جائیں گی اور سنی جائیں گی، لاکھوں قصے ہیں جو بیان ہوں گے، مگر اُن کی زندگی کی آخری داستان جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ اب اجمل خاں کی یادگار قائم کرنے کا سوال کیسا؟ یہ بحث کیسی کہ یادگار قائم ہو، کہاں قائم ہو، اور کیا قائم ہو۔ اجمل خاں کے چاہنے والوں کے لئے ان کی یہ یادگاریں کیا کم ہیں۔ ایک جامعہ جو اُن کی محبت کا

آخری مرکز و مظہر تھا اور دوسرا وہ کبھی نہ مندمل ہونے والا زخم جو مرتے دم تک دل میں رہے گا۔ ہائے اجمل خاں!

کلام راسخ

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے
گو زمانے کو انقلاب رہا

تم ہو پردوں میں بوئے گل کی طرح
ہم ہیں یاں در بدر صبا کی طرح

آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے
جن سے تم آشنا ہوئے ہو تم

کدھر کعبہ، کہاں کا عرش اعظم
دل شکستہ ہے کاشانہ تیرا

ایک تیری نگاہ آشنا نے
سب سے بیگانہ کر دیا ہے

بڑھی ٹوٹنے سے مرے دل کی قیمت
یہ شیشہ وگرنہ بہت کم بہا تھا

دانیالی بشارتیں

سنین محمدؐ

(۲)

حضرت دانیال ع نے آنحضرت صلعم کے ظہور کا سن اور سال تک بتا دیا ہے لیکن آیتوں کو سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ ہم بخت نصر کی حکومت کا پہلا سال متعین کرلیں کہ وہ سن مسیحی اور سن ہجری سے کس قدر قبل تھا۔ ہمارے مسیحی احباب سنہ ۶۰۶ یا سنہ ۶۰۴ ق م بتاتے ہیں۔

زمانہ مابین بخت نصر و خسرو بہمن

بخت نصر کے پہلے سال اور خورس کے پہلے سال کے درمیان مسیحی علمائے دین اور مورخین صرف ۷۰ برس کا زمانہ فرض کرتے ہیں، حالانکہ خورس کے پہلے سال سے ۲۰۸ یا ۲۱۰ برس پہلے سنہ جلوس بخت نصر تھا۔

مسیحی غلطی کے اسباب مسیحی علما اور مورخین کو دھوکا ہوا، وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ تواریخ کے آخر میں اور عزرا کے شروع میں مذکور ہے کہ یہودی قوم بابل میں اس وقت تک غلام رہی جب تک یرمیاہ کی پیش گوئی کے ۷۰ برس گزر نہ گئے لیکن اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ ۷۰ برس جب پورے ہولئے تو اسکے بعد واپسی کی اجازت ملی۔

ایک فرشتہ نے سنہ ۲ جلوس دارا میں فرمایا کہ "اے رب الافواج تو کب تک یروشلم اور یہوداہ کے شہروں پر رحم نہ کھائے گا جن پر تو ۷۰ برس سے غضب نازل کرتا ہے" (زکریا ۱: ۱۲)
اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ بابل میں یرمیاہ کے موعودہ ۷۰ برس گزر جانے کے بعد بھی مصیبت کے برسوں کو انہیں ۷۰ برسوں میں شمار کر دیا گیا ہے۔

یرمیاہ نے جن ۷۰ برسوں کی پیش گوئی کی تھی وہ یرمیاہ باب ۲۵ میں مذکور ہیں۔ ۷۰ برس بابل میں غلام رہنے کی میعاد انہوں نے مقرر کی تھی اس کے بعد بابل کی تباہی کا وعدہ تھا۔ حزقی ایل کے بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے قہر الٰہی کی مدت خدا نے ۴۰ سال اور ۳۹۰ سال کل ۴۳۰ برس مقرر کی تھی (حزقی ایل باب ۴)

مسیحی غلطی کے دلائل

عزرا کا بیان ہے کہ "جب خورس کے پہلے سال میں بنی اسرائیل کے قبائل واپس آئے تو بنی حبایاہ، بنی قوس اور بنی برزلی وغیرہ قبائل اپنا نسب نامہ پیش نہ کر سکے اس لئے وہ ناپاکوں کی طرح کہانت سے خارج کیے گئے، (عزرا ۲: ۶۱) کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نہیں متعدد قبیلے صرف ۷۰ برس کے اندر اپنا پورا نسب نامہ بھول جائیں؟ خصوصاً ایسی قوم جس کے بزرگوں کو سو سو، دو دو سو برس کی عمر کا بتایا جاتا ہے۔

یوروپین مفروضہ کے خلاف ایک بات یہ بھی ہے کہ سنہ جلوس خورس میں زروبابل بن شیالتی ایل ایک شخص نظر آتا ہے، جو ہزاروں کی گنتی میں بنی اسرائیل کو اپنی قیادت میں لیکر یروشلم میں آیا اور تعمیر ہیکل کا کام شروع کیا (عزرا باب دوم) یہ شخص بنی اسرائیل کا ناظم تھا (حجی) اس لئے اس کی عمر سنہ خورس میں کم از کم ۳۰ - ۳۲ برس کی ہوگی، اس نے تعمیر کے لئے جن نوجوانوں کو مقرر کیا انمیں سے کسی کی عمر ۲۰ برس سے کم نہ تھی (عزرا ۳: ۸) اسی سے اندازہ کر سکتے ہو کہ اس وقت اس کی عمر کیا ہوگی۔

یہ شخص یکونیاہ سے گرفتاری کے ایام میں پیدا ہوا (متی ۱: ۱۱) اور سنہ یا سنہ میں گرفتار ہوا، جسے ہم یروشلم پر بخت نصر کے قبضہ کا آٹھواں یا نواں سال کہہ سکتے ہیں اسکے بعد پورے ۳۷ برس جیل میں رہا، ۳۷ دیں برس کے ختم ہونے کو ۵ دن باقی تھے جب یہ جیل سے نکلا (یرمیاہ ۵۲: ۳۱) اس بنا پر یہ قطعی ہے کہ سنہ یا سنہ قبضہ بخت نصر اس کے جیل سے نکلنے کا سال ہے۔ اپنی گرفتاری کے وقت وہ آٹھ برس کا تھا (تواریخ)

فرض کرو جس سال وہ قید سے چھوٹا اسی سال اس نے شادی بھی کر لی پھر بھی ماننا پڑیگا کہ ۸۶ قبضہ بخت نصر سے پہلے اس کی کوئی اولاد پیدا نہوئی۔

اگر ۱ خورس ۵۳۶ بختنصری تھا تو اس سال یکونیاہ کی عمر کسی طرح ۷۱ برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ۲ تواریخ کے مصنف اور متی کے متفقہ بیان سے ظاہر ہے کہ یکونیاہ کی پیدائش کا عین وہی سال تھا جب یروشلم بخت نصر کی حکومت قائم ہوئی۔

۵۹۵ قبضہ بخت نصر میں اس کے بڑے سے بڑے فرزند کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۳ برس کی ہوگی کیونکہ یہ قطعی ہے کہ ۵۷۷ سے پہلے اس کی کوئی اولاد پیدا نہوسکی۔

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اگر بخت نصر اور خورس کے سنین جلوس کے درمیان صرف ۷۰ برس کا فرق تھا تو آیا یہ ممکن بھی ہے زروبابل بن شیالتی ایل جو یکونیا کا پوتا یا پروتا تھا ۵۹۵ قبضہ بخت نصر میں منصہ وجود پر آچکا ہو۔

بخت نصر کے پہلے سال خورس تک کا تخمینی زمانہ

زروبابل کو متی، عزرا، زکریا، حجی، اور لوقا متفقہ طور پر زروبابل بن شیالتی ایل کہتے ہیں، اس سے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ شیالتی ایل زروبابل کے آباء میں تھا، مگر ابھی یہ طے کرنا باقی ہے کہ شیالتی ایل اسکا حقیقی باپ تھا، یا جس طرح متی نے یکونیا کے دادا یوشیاہ کو اسکا باپ لکھدیا ہے (متی ۱: ۱۰) اسی طرح شیالتی ایل بھی زروبابل کا دادا تھا، عرب اور یہود دونوں کا طریقہ ہے کہ اکثر ابن کا لفظ دادا کی طرف بھی مضاف کر دیتے ہیں۔

(۱ تواریخ ۳: ۱۹) زروبابل کو فدایاہ میں شمار کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شیالتی ایل اور فدایاہ دونوں زروبابل کے آبا میں داخل تھے۔

(۱ تواریخ ۳: ۱۷) کی عبارت یوں ہے "اور بنی یکونیاہ، اسیر اسکا بیٹا شیالتی ایل اور ملکرام اور فدایاہ" اس آیت سے صاف واضح ہے کہ شیالتی ایل براہ راست یکونیاہ کا بیٹا نہیں بلکہ اسیر کا بیٹا ہے۔

اس موقع پر فدایاہ بظاہر شیالتی ایل کا بھائی معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس جگہ قبائل کا تذکرہ ہو رہا ہے، خود فدایاہ تو شیالتی ایل کا فرزند تھا، لیکن اس کی نسل سے جو قبیلہ پیدا ہوا وہ اتنا بڑا ہوا کہ ایک الگ قبیلہ قرار دیا گیا۔

اسیر بھی براہ راست یکونیاہ کا فرزند نہ تھا کیونکہ یکونیاہ کا بیٹا تو صدقیاہ تھا چنانچہ ۱ تواریخ ۳: ۱۶ میں صاف لکھا ہے۔

"اور بنی یہویقیم اسکا بیٹا یکونیاہ اسکا بیٹا صدقیاہ"

اس موقع پر ۱۹۰۶ء کی چھپی بائبل میں صدقیاہ پر حاشیہ دیکر یہ لکھا ہے کہ یہ اس کا چچا تھا، لیکن چونکہ اسکا قائم مقام ہوا اس لئے اسکا بیٹا ٹھہرا"، یہ حاشیہ پادری صاحبان کی جدت ہے کیونکہ یکونیاہ کے چچا صدقیاہ کا ذکر تو (۳: ۱۵) میں خود ہی آچکا ہے اس لئے یہ صدقیاہ یقیناً بادشاہ صدقیاہ کے بھتیجے کا لڑکا ہے، پادری صاحبان غالباً یہ خیال کرنا مناسب نہ سمجھے کہ سامی قوموں میں دادا اور پوتے اکثر ہم نام ہوا کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ زربابل کا پورا نسب نامہ یوں ہے

"زربابل بن فدایاہ، بن شیالتی ایل بن اسیر، بن صدقیاہ، بن یکونیاہ۔

یکونیاہ کا سال پیدائش (متی ۱: ۱۱) کی رو سے گرفتاری کے ایام میں داخل ہے یکونیاہ جب تخت پر بیٹھا تو وہ صرف ۸ برس کا تھا (۲ تواریخ ۳۶: ۹) لیکن (۲ سلاطین ۲۴: ۸) میں اس وقت اسکی عمر اٹھارہ برس بتائی گئی ہے، متی اور ۲ تواریخ کے متفقہ بیان کے مقابلہ میں اس بیان کی وقعت نہیں نسخوں کی غلطی نے ۸ کو ۱۸ کر دیا۔

یکونیاہ سے نیچے کی پانچ پشتوں کی پیدائش کے لئے کسی طرح صرف ۲۵ برس کافی نہیں ہو پشتوں کی پیدائش کے لئے کم و بیش ۲۰۰ برس کا زمانہ درکار ہوتا ہے۔

صحیح زمانہ

حضرت دانیال کی کتاب میں دو خورس کا تذکرہ ہے، ایک خورس تو وہ ہے جس کا

صرف پہلا سال انہوں نے پایا (دان ۱۱: ۲۰) دوسرا خورس وہ ہے جس کے تیسرے برس انہوں نے یونانی حکومت کے قیام کی خبر دی (دان ۱۰: ۱)

عزرا کے زمانہ میں جو خورس تھا اسکا زمانہ اگر دانیال نے پایا ہوتا تو وہ انکا تذکرہ بھی ضرور کرتے۔

خورس جس کے تیسرے جلوس میں حضرت دانیال زندہ تھے وہ خورس نہیں ہے جو حضرت عزیز کا معاصر تھا، حضرت عزیز والے خورس یا خسرو کو حضرت یشعیاہ خدا کا مسیح (۴۵: ۱) خدا کا چرواہا اور خدا کی مرضی پوری کرنے والا (۴۴: ۲۸) قرار دیتے ہیں اور حضرت عزیز کے بیان سے وہ مامور من اللہ ثابت ہوتا ہے (۱: ۲) لیکن دانیال کا خورس اتنا بڑا تھا کہ وہ ۲۱ دن تک خدا کے فرشتہ کا مقابلہ کرتا رہا (دانیال ۱۰: ۱۳) اور جس سے جنگ کرنے کے لئے خدا کا فرشتہ مستعد تھا (دان ۱۰: ۲۰)

اسی خورس کے عہد میں حضرت دانی ایل کے فرشتہ نے خبر دی کہ ایران میں چار بادشاہ اور ہونگے اس کے بعد یونانی سردار آئے گا (دان ۱۱: ۲)

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ خورس خسرو گشتاسپ تھا جس کے بعد بہمن، ہمائے چہرزاد دارا ابن اور دارا ابن دارا چار بادشاہ اور ہوئے۔

مسیحی مورخ ابن العبری نے مختصر الدول میں لکھا ہے کہ تمام یہود، نصاری، مجوس اور مورخین کے نزدیک عزرا کا معاصر یہی بہمن بن اسفندیار تھا۔

بہمن کا پہلا سال حکومت ۵۳۵ھ یا ۵۳۶ھ ق م بتایا جاتا ہے بہمن کا پیشرو خورس یا خسرو گشتاسپ تھا، خدا نامہ ایران کی قدیم ترین تاریخ کے حوالہ سے مشرق کے تمام مورخین گشتاسپ کے ایام حکومت ۱۲۰ برس بتاتے ہیں اسلئے دانیال کے معاصر خورس کا پہلا سنہ جلوس یقیناً ۶۵۵ھ یا ۶۵۶ھ ق م تھا۔

سنہ بخت نصری| خود حضرت دانیال کے بیان سے واضح ہے کہ یہ خورس دارا ابن خشو یرس مادی کے

بعد ہوا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اسکے ایام حکومت معلوم نہیں لیکن پھر بھی ہم کو یہ غور کرنا ضرور ہے کہ اس سال سے کتنے دنوں پہلے بخت نصر کا پہلا سال حکومت تھا۔

بخت نصر کے ایام حکومت عیسائی مورخین صرف ۴۳ یا ۴۴ برس فرض کرتے ہیں تاکہ وہ سنہ بختنصری سے سنہ جلوس بہمن تک صرف ۷۰ برس کے زمانہ کا حساب درست رکھیں۔

حالانکہ (یرمیاہ ۵۲ : ۳۰) اور (۲ سلاطین ۲۵ : ۲۷) کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ادیل مرودک نے اپنے پہلے ہی سنہ جلوس میں یکونیاہ کی گرفتاری کے ۳۷ ویں برس کے ۱۲ ویں مہینہ کی ۲۵ ویں (یا ۲۷ ویں) تاریخ کو یکونیاہ کو قید خانہ سے نکالا۔

ظاہر ہے کہ یہ اس نے عین تاریخ جلوس کے روز کیا ہوگا، جیساکہ بادشاہوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ بخت نصر جناب یکونیاہ کی اسیری کے بعد ۳۷ برس تک حکومت کرتا رہا۔

بخت نصر کی سیادت یروشلم پر سنہ یہویقیم سے شروع ہوتی ہے، وہ یروشلم پر آٹھ برس بذریعہ یہویاقیم حکومت کر چکا تھا پھر یکونیاہ تخت پر بیٹھا۔ یکونیاہ ۳ ماہ حکومت کرتا رہا چوتھے ماہ بخت نصر نے اسے تخت سے اتار کر قید کر لیا اور صدقیاہ کو تخت نشین کیا۔

صدقیاہ کے سنہ جلوس کو دانی ایل اور یرمیاہ بخت نصر کی حکومت کا ۱۹ واں سال بتاتے ہیں اس لئے سنہ جلوس صدقیاہ سنہ ۹ قبضہ بخت نصر کے برابر تھا، اور یہی یکونیاہ کی گرفتاری کا سال ہے۔

اب صاف ہو گیا کہ یروشلم پر استیلا کے بعد سے سنہ گرفتاری یکونیاہ تک ۴۵ برس بخت نصر نے یروشلم پر حکومت کی تھی۔

بائبل میں عموماً سنہ یہویقیم بخت نصر کی حکومت کا پہلا سال کہا گیا ہے، اس سے پادریوں نے اسی کو سنہ جلوس بخت نصر سمجھ لیا ہے، حالانکہ بائبل کے مصنفین بخت نصر کے سن

جلوس سے بحث نہیں کرتے وہ صرف یروشلم پر اس کے قبضہ کا سال بتاتے ہیں اور یہ خیال کہ یہی سن اسکی حکومت کی ابتدا کا سال بھی ہے غلط نہیں تو بالکل واجب التسلیم بھی نہیں۔

جناب حزقی ایل نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں سنہ گرفتاری یکونیاہ کو سنہ بھی کہا ہے ظاہر ہے کہ سنہ بخت نصر کے علاوہ اور کسی دوسرے بادشاہ کا سنہ جلوس نہیں ہو سکتا، اس لئے ثابت ہوا کہ بخت نصر یکونیاہ کی گرفتاری سے ۲۵ برس پہلے اور یروشلم پر استیلا، سے ۱۷ برس پہلے سے بابل کا حکمراں تھا، اور اس کی حکومت کا زمانہ کم از کم ۶۲ برس ہے۔

(۱) یروشلم پر استیلا سے پہلے	۱۷ برس
(۲) یکونیاہ کی گرفتاری تک	۹ برس
(۳) گرفتاری کے بعد	۳۶ برس
جملہ	۶۲ برس

بخت نصر کے بعد اویل مردک تخت پر بیٹھا اس کے ایام حکومت بائبل میں مذکور نہیں اسلئے مسیحیوں نے صرف ایک برس فرض کیا ہے تاکہ دانیال کی زمانہ طویل نہ ہو۔ دانیال کی کتاب میں دارا مادی اور بیشفر دو بادشاہوں کا اور ذکر ہے دارا مادی کے ایام حکومت مذکور نہیں، اس کو بھی مسیحیوں نے صرف ایک سال فرض کیا ہے، بیشفر کے ایام حکومت ۳ سال مذکور ہیں (دانیال)

مجبوراً ہم بھی بخت نصر کے وارثوں کے ایام حکومت کو وہی سال فرض کر لیتے ہیں، حالانکہ اس کے جانشین دو ایک اور بھی گزرے ہیں اور انکی حکومت بھی مسیحیوں کی غالباً دانستہ غلطی سے بہت گھٹ گئی ہے۔

بہر حال ۶۵۸ میں ۶۷ اور جوڑ دیں تو بخت نصر کا سال حکومت سنہ ۷۲۵ ق م ہو جائے گا یہ کم سے کم مدت ہے ورنہ بخت نصر کا سنہ جلوس کسی طرح سنہ ۷۲۶ ق م یا سنہ ۷۲۷ ق م سے ادھر نہیں ہو سکتا۔

بطلیموس نے مجسطی میں سنہ بختنصری کا حساب درج کیا ہے، اس لئے ابو الفدا کا بیان ہے

کہ اسمیں مورخین اور نجومیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ابتدائے ملک بخت نصر سے ہجرت نبوی تک ۱۳۶۹ سال گزرے، ابو الفدا نے ان ۱۳۶۹ سالوں کی تشریح حسب ذیل طریقہ سے کی ہے۔

(۱) ابتدائے ملک بخت نصر سے ابتدائے سن سکندری ۴۳۵ سال
(۲) ابتدائے سن سکندری سے پیدائش مسیح تک ۳۰۲ "
(۳) پیدائش مسیح سے ہجرت تک ۶۳۱ "
جملہ ۱۳۶۹ "

اس تفصیل میں ابو الفدا سے ایک سہو یہ ہوا ہے کہ پیدائش مسیح کا سال ۳۰۲ میں تو شامل ہی تھا ۶۳۱ میں بھی مکرر ہو گیا ورنہ جملہ صرف ۱۳۶۸ سال ہونگے۔

ابو الفدا نے ہجرت سے پہلے کے سال کا نام ۶۳۱ئہ رکھا ہے، حالانکہ آج کل جو حساب رائج ہے اسکی روسے یہ سال ۶۲۱ء تھا، لیکن یہ کوئی اہم فرق نہیں ہے جو لوگ حضرت مسیح کی پیدائش ۳۱۲ئہ سکندری بتاتے ہیں انکے نزدیک حضرت مسیح ابتدائے سنہ مسیحی سے ۱۰ برس پہلے پیدا ہوئے، موجودہ سنہ مسیحی کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ حضرت مسیح واقعہ صلیب سے ۳۴ برس پہلے پیدا ہوئے۔

ابو الفدا کے اس بیان کی بنیاد بطلیموس کے بیان پر ہے، اس نے مجسطی میں سنہ بخت نصری کا حساب درج کیا ہے اور اس کو استعمال کیا ہے۔

افسوس یہ کہ ہمارے پاس مجسطی کا کوئی نسخہ نہیں، یہ کتاب ابتک غالباً چھپی نہیں اسکا ایک قلمی نسخہ گورکھپور کے ایک رئیس مولوی سبحان اللہ کے پاس تھا، انہوں نے اتنا سارا کتب خانہ علیگڑھ یونیورسٹی کو دیدیا ہے۔ غالباً یہ کتاب اب وہیں ہوگی۔

اگرچہ مجسطی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا، لیکن اتنا تو اریخ کی ہر کتاب میں مذکور ہے کہ سن سکندری کی ابتدا ۴۳۵ئہ بخت نصری میں ہوئی اور یہی سال سنہ سکندرانی ہے۔

مجسطی کے حوالہ سے جامع بہادر خانی میں مذکور ہے کہ سکندرانی سن کی ابتدا سن بختنصری کی ابتدا سے (۱۵۹۱۰۱) دن کے بعد ہوئی۔ بختنصری سال صرف ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا۔ سنہ ۲۰۲ بختنصری میں معلوم ہوا کہ اصل مقدار سال کی ¼ ۳۶۵ دن ہے۔ سنہ ۴۳۷ میں جب سنہ سکندری شروع ہوا تو جس دن بختنصری سنہ کا ۴۳۶ واں سال ختم ہوتا تھا اس سے ۳۹ دن پہلے یونانی سال شروع ہوتا تھا اس لئے سنہ سکندرانی سے پہلے کے ۴۳۶ سال بخت نصری صرف (۴۳۶×۳۶۵-۳۹) یعنی ۱۵۹۱۰ دن یعنی ۴۳۵ سال ۲۱۷ دن کے رہ گئے۔

سنہ مسیحی کی ابتدا سن سکندرانی کی ابتدا سے ۱۱۳۶۸۸ دن بعد ہوئی، اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ سن مسیحی کی ابتدا سن سکندرانی سے ۳۱۱ سال ۹۵ دن بعد اور سن بختنصری سے ۷۴۷ سال ۳۱۲ دن بعد ہوئی اور سنہ ہجری کی ابتدا سنہ سکندرانی سے ۹۳۲ سال ۲۸۷ دن بعد اور سن بخت نصری سے ۱۳۶۸ سال ۱۳۹ دن بعد ہوئی۔

یعنی یہ کہ سنہ بخت نصری ۷۴۷ئہ ق م یا ۱۳۶۸ ق ھ کے مطابق تھا۔ (باقی آئندہ)

تاریخ عالم کی تعبیر

اوسوالڈ اشپنگلر نے یورپ کی علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے اُن کی کتاب "زوالِ مغرب" موجودہ صدی کی سب سے اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ موصوف نے ہمیں اجازت دی ہے کہ اس کتاب کا جو حصہ عرب تمدن کے متعلق ہے اُسکا ترجمہ جامعہ میں شائع کریں مگر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سے قبل اُس حصے کا اقتباس قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں جس میں انہوں نے تاریخ عالم کی تعبیر کے متعلق اپنا نظریہ بیان کیا ہے۔ آئندہ نمبروں میں انشاء اللہ انکے خیالات عرب تمدن کے متعلق اور اُن کی پیشین گوئی زوالِ مغرب کے بابتہ بھی شائع کیجائے گی۔

عابد

بادی النظر میں تاریخ عالم کا جو نقشہ ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے۔ بیشمار تصویروں کا لا متناہی سلسلہ جو کبھی دکھائی دیتا ہے کبھی چھپ جاتا ہے کبھی ابھر آتا ہے اور کبھی دب جاتا ہے۔ بے تعداد رنگوں اور روشنیوں کا طلسم جو بظاہر ہمیں محض بے ربط، بے ترتیب اور اتفاقی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو آنکھ حقیقت کی گہرائی تک پہونچتی ہے وہ اس بظاہر بے معنی دفتر سے ان اصولوں کو ڈھونڈھ نکالتی ہے جن پر نسل انسانی کی نشو و نما مبنی ہے۔ شاہد معنی لاکھ نقابوں میں چھپے سعی و تلاش کا دست شوق ان حجابوں کو اٹھا ہی کر مانتا ہے۔

کائنات کی مجموعی ارتقا ایک فلک رفیع ہے جس کے آفاق بے تعداد ہیں — تاروں بھرے آسمان کی نشو و نما، سطح زمین کا قائم ہونا۔ جاندار مخلوق کا پیدا ہونا، انسان کا ظہور۔ فاوسٹ(۱) کی

---

(۱) فاوسٹ گوئٹے کے مشہور ڈراما کا ہیرو ہے جو تمام کائنات کا علم حاصل کرنیکا شوق رکھتا ہے۔

آنکھ اس سب کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پیش نظر محض اسکا ایک عشر عشیر یعنی آباد کرہ ارضی کی داستان ہے۔ اس میں سے بھی ہم صرف ترقی یافتہ انسانوں کی ۶ ہزار سال کی تاریخ کو لیتے ہیں جس کی طرف بوڑھے گوئٹے کو ذرا بھی توجہ نہ تھی یہ اہم مسئلہ کہ ارتقائے عالم کے مختلف آفاق میں کس حد تک یکسانی ہے ہم چھیڑنا نہیں چاہتے۔

جس چیز سے تاریخ عالم کے خواب پریشان کی تعبیر ہوسکتی تھی اور جواب تک "واقعات" اور "سنہ و سال" کے بے ترتیب انبار میں چھپی ہوئی تھی وہ بڑے تمدن کا ظہور ہے۔ جب تک ہم انسانی نشو و نما کی ان اصل صورتوں کے خط و خال کا مشاہدہ، احساس اور احصار نہ کرلیں اسوقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے نسل انسانی کی تاریخ کی حقیقت اور اندرونی ماہیت اور اسکے اور تاریخ فطرت کے فرق کو سمجھ لیا ہے۔ ان تمدنوں پر گہری اور وسیع نظر ڈالنے کے بعد ہم فلسفۂ تاریخ کا نام لے سکتے ہیں۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہم ہر تاریخی واقعہ کو، ہر خیال کو، ہر آرٹ کو، ہر تاریخ کو، ہر جنگ کو ایک "علامت" کے طور پر سمجھ سکیں اور تاریخ پر محض اس حیثیت پر نظر نہ ڈالیں کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کا ایک مجموعہ ہے جس میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ اصول بلکہ اُسے ایک نامی جسم کی حیثیت سے دیکھیں جس کی ساخت مستحکم ہے جس کے اعضاء کی تقسیم معنی اور منشار رکھتی ہے، جس کی نشو و نما کے مشاہدے میں ہم اپنے زمانے کے "حال" کو ماضی سے جدا نہیں کر سکتے اور مستقبل کو لامعلوم اور غیر متعین نہیں کہہ سکتے۔

دنیا کے مختلف تمدن اجسام نامیہ ہیں۔ تاریخ عالم ان کی مجموعی سوانحعمری کا نام ہے چین یا یونان و روما کا قدیم تمدن صورت کے لحاظ سے ایک مثنیٰ ہے ایک انسان کی ایک جانور کی، ایک درخت کی یا ایک پھول کی زندگی کا۔ یہ بات فاؤسٹ کی سی ہمہ گیر نظر رکھنے والے کیلئے کوئی تحقیق طلب مسئلہ نہیں بلکہ ایک تجربہ ہے اگر انسان اس اندرونی "صورت" کو پہچاننا چاہتا ہے جو طرح طرح کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو اس کیلئے حیوانات اور نباتات کی ساخت کے تقابل نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ پوری تاریخ انسانی متفرق تمدنوں کی رام کہانی کا نام ہے۔

جو ایک دوسرے کے بعد اٹھتے ہیں، پہلو بہ پہلو نشوونما پاتے ہیں کبھی آپس میں مل جاتی ہیں کبھی ان میں کا ایک دوسرے پر چھا جاتا ہے یا اُسے برباد کر دیتا ہے۔ اور اگر انسان اُن کی تصویروں کو جنہیں اب تک سطحی اور بے مغز "تاریخ عالم" نے چھپا رکھا تھا چشم بصیرت سے دیکھے تو یقیناً اس میں کامیابی ہوگی کہ وہ ساری فضولیات سے قطع نظر کر کے تمام ظلمات کو ہٹا کر تمدن کی اصلی صورت دیکھے جو تمام متفرق تمدنوں کا نصب العین ہے۔

میرے نزدیک کسی تمدن کا یعنی اُس کے اندرونی امکانات کا تصور دوسری چیز ہے اور اُسکا محسوس مظہر جو تاریخ میں واقعی حیثیت سے نظر آتا ہے دوسری چیز ہے ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو روح کو عالم مرئی میں اپنے مظہر یعنی جسم سے ہے کسی تمدن کی تاریخ اس کے امکانات کے بتدریج قوت سے فعل میں آنے کا نام ہے تکمیل کے معنی ہیں موت۔ یہ نقشہ ہم کو یونان کے قدیم تمدن میں نظر آتا ہے جو اپالو سے مشابہ روح کا مظہر تھا اور جس کے وہ آثار جو آنکھ کو اور ذہن کو میسر آتے ہیں اب تک آثار قدیمہ، علم اللسان اور جمالیات کے ماہرین کا موضوع تحقیق ہیں۔

تمدن ساری گزشتہ اور آئندہ تاریخ عالم کا موضوع اصلی ہے۔ ہم گوئٹے کے گہرے "زندہ فطرت" کے خیال کو جسکی کسی نے اب تک قدر نہیں کی اُس کے صحیح معنی میں ان تمام تاریخی تمدنوں کے مشاہدہ میں استعمال کریں گے جو پختہ ہو کر فنا ہو گئے یا عین پختگی کی حالت میں برباد ہو گئے یا نیم پختہ ہو کر مٹ گئے یا بن کھلے مرجھا گئے۔ یہ طریقہ تحلیل اور تجزیہ کا نہیں بلکہ احساس اور مشاہدہ کا ہے "عقل انسانی کی بلند ترین منزل حیرت ہے۔ اس لئے اگر انسان کو اشیاء کی "صورت اصلی" حیرت میں ڈال دے تو اُسے اسی پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ بلندی اُسے میسر نہیں آسکتی اور اس پردے کے پیچھے نظر ڈالنا اُس کے لئے بیکار ہے۔ یہی اُس کی حد پرواز ہے" "صورت اصلی" وہ ہے جس میں انسان کو عین ارتقا صاف اور خالص دکھائی دے۔ گوئٹے کی چشم بصیرت کو ہر ایک پودے میں خواہ وہ موجود ہو یا ممکن "اصلی پودے" کا عین صاف نظر آتا تھا۔

. . . . اُس نے ٹنیلز سے جو خط ہرڈر کو لکھا تھا اُس میں اپنے دریافت کردہ اصول کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "اسی قانون کا اطلاق اور سب زندہ چیزوں پر ہوتا ہے" وہ اشیا کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس کی قدر لائبنتز کر سکتا تھا۔ ڈارون کی صدی میں ہونے کے باوجود اُسے اس عہد کے خیالات سے انتہائی بعد تھا۔

لیکن تاریخ کی ایسی تعبیر جس میں ڈارون کا رنگ یعنی با نظام اور علت و معلول پر مبنی سائنس کا دخل نہ ہو ابھی تک نہیں کی گئی۔ کسی کو بالارادہ یہ خیال تک نہیں آیا کہ نئے طریقہ سے تاریخ کی ایک صحیح اور واضح علم حیات پر مبنی تفسیر کیجائے جس کے ذرائع معلوم اور جس کی حد معین ہو۔ یہی بیسویں صدی کا سب سے بڑا کام ہے کہ اُن مظاہر نامیہ (یعنی انسانی تمدنوں کی اندرونی ساخت) پر غور کرے جو تاریخ عالم کا موضوع ہیں اُنکے اہم اور ضروری عناصر کو غیر ضروری عناصر سے الگ کرے واقعات کے اصل معنی معلوم کرے اور کائنات کی لسان مرموز کی کنجی تلاش کرے۔

(باقی آئندہ)

ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک

(۳)

دنیا کی طرف سے جو رویہ ترک قوم رکھتی تھی اور اُس کی جو تفسیر کرتی تھی اس کے بدلنے کیساتھ فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات اور جماعت کے نئے تخیل میں تبدیلی ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دوسرے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جماعت کی تاریخی شکل کو مسترد کر دیا جائے کہ اس میں فرد جذب ہی نہیں فنا ہو جاتا تھا لیکن یہ مخالفت اسلام کے تصور جماعت یا خود ملت اسلامی کے خلاف نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نئی تمدنی تحریک نے نشو و نما پائی تو ایسے حالات موجود تھے جو حکومت کے لئے ہر طرح نامساعد تھے اور یہ تمدنی تحریک خود جماعتی اعتبار سے بھی اسلامی تصور کائنات کے زیر اثر تھی۔

لیکن آخر اسلام کا یہ جماعتی تصور ہے کیا؟ اگر اسکا جواب ہماری تمدنی تحریک کے بہت سے مظاہر کے سمجھنے کے لئے ازبس ضروری نہ ہوتا تو میں اس سوال پر اس جگہ نظر نہ ڈالتا۔

اسلام کے تصور جماعت میں روح اور جسم کی طرح فرد اور جماعت ایک ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک ہی کل کے جزو ہیں۔ عقیدہ مذہبی میں توحید کے ساتھ ساتھ اسلام میں ایک دنیاوی تحریک ایک جماعتی توحید بھی موجود ہے۔ اسلامی خیال سے جماعت اہل ایمان کی جماعت کا نام ہے۔ اسلامی دنیا صحیح معنوں میں "مدینۃ اللہ" ہے جسکا حقیقی حکمران اور شریعت ساز خدا ہے۔ فرد کے حقوق و فرائض بھی خدا ہی کے یہاں سے متعین ہیں۔ دنیاوی حکمران اس عالم میں خدا کے نائب ہیں اور فرد کے ان حقوق و فرائض میں نہ کمی کر سکتے ہیں نہ بیشی خود حکمراں کی دسترس کی حدود شریعت میں متعین ہیں لیکن یہی حدود ہر فرد واحد کے لئے بھی ہیں۔ اس جماعت میں دراصل نہ کوئی

حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔

یہ وہ تصورات ہیں جن سے پیروان اسلام کے ذہن میں جماعتی تاثرات و خیالات کے خاکے تیار ہوئے ہیں۔ اسکے نتائج سب کو معلوم ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں حریت اور مساوات کے تصورات موجود نہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ انکے یہاں موجود ہونیکی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ اسلام پر ایمان لانے سے حریت بھی حاصل تھی، مساوات بھی۔ اور یہ ایک بدیہی بات تھی۔ حریت و مساوات مسائل کی صورت وہاں اختیار کرتے ہیں جہاں انسان انسان پر حکمراں ہو یعنی حکومت خالص دنیاوی حیثیت رکھتی ہو۔ مگر جہاں آئین جماعت و حکومت الٰہی ہو جہاں حکمراں خدا کے سامنے معمولی انسان کے برابر ہو وہاں حریت اور مساوات کا "مسئلہ" پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ پیروان اسلام میں قوم اور وطن کا تصور یکسر مفقود ہے "مذہب اور قوم ایک ہیں" یہ وہ تعلیم ہے جو مذہبی سوال و جواب کی کتاب میں ملتی ہیں۔ مسلمان اپنے کو مملکت اسلامی کا شہری جانتا ہے۔ اسکا وطن ساری اسلامی دنیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں حکومتیں، مملکتیں سب بڑی جمعیۃ اسلامی اور عام شریعت اسلامی کے زیر نگیں سمجھی جاتی ہیں جبتک کہ اسلامی قومیں، خلافت کی مذہبی جمہوریت کے ماتحت رہیں اور عالم اسلامی عظیم الشان حکومتوں سے عبارت رہا اس وقت تک یہ تصورات و خیالات زندہ رہے۔ لیکن اسلامی تاریخ کی پہلی صدی ہی میں اس صورت حال میں تغیر رونما ہونے لگا اور تاریخ نے انسانی و دنیاوی شکل اختیار کی۔ مگر ایک چیز ضرور باقی رہی یعنی فرد اور جماعت کی یگانگت و ہمنوائی اور توحید جمعیۃ پر ایمان۔

ملل اسلامی میں فرد کی جماعتی حیثیت اور اس کے تاریخی ارتقا کے جو نتائج ہوئے وہ سب پر ظاہر ہیں ہم یہاں اس ردعمل کا ذکر کریں گے جو ان نتائج کے خلاف رونما ہوا اور اسپر مندرجہ ذیل چار پہلوؤں سے نظر ڈالیں گے: (۱) تصور حریت (۲) تصور وطن (۳) تصور قومیت

(۴) تصور مذہب اور خصوصًا اسلام کا تصور۔

تصور حریت کی بنیاد موجودہ نسل کے ان جذبات حیات میں ہے جنہیں اس نئی تمدنی تحریک نے اور خصوصًا قدیم نظام جماعت کے درہم و برہم ہونے نے پیش پیش کر دیا ہے۔ اس وجود انسانی کی تکمیل جو اپنے اثبات حیات اور ذوق عمل کے ساتھ اس نئے تصور زندگی میں ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے صرف حریت ہی کی فضا میں ممکن ہے طبیعتیں یونہی تیار تھیں کہ مغربی تمدن سے واقفیت اور انقلاب فرانس کے خیالات سے آگاہی نے ان میں اور بھی آگ لگا دی۔ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنی نظموں میں اس آزادی کے گیت گائے اور اپنے مضامین میں اس کی تلقین کی۔ یہاں صرف اسکے "وطن شاقی" اس کے مشہور قصیدہ، اور اس کے مضمون "حریت افکار" کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ اس کے نقش قدم پر حامد چلا ہے۔ جس نے اپنی نظم "کلبۂ اشتیاق" میں حریت کو "نور انسانیت" سے تعبیر کیا ہے اور جس نے اپنے متفرق ڈراموں میں تصور حریت کا شاعرانہ اظہار کیا ہے اور اپنی متعدد نظموں میں اس کے راگ گائے ہیں۔ فکرت آئین اور عاکف سب کے کلام میں اس جذبۂ حریت کی صدا سنائی دیتی ہے۔

جدید حکومت نے اپنے اعلانات و دستور اساسی میں حریت کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دیدیا ہے۔ سعید حلیم پاشا نے جو نئی مذہبی تحریک کے قاید ہیں اپنی تصنیف "اسلام لشماق" میں حریت کو فرض مذہبی ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "آزاد ہونا ہر مسلم کا فرض ہے"۔

اگرچہ یہ سب لوگ جنکا ذکر ہوا نہایت غیر معمولی شخصیتوں کے لوگ تھے لیکن پھر بھی حریت کا تصور انکے یہاں انفرادیت سے کسی طرح نہ ملتا تھا حتیٰ کہ خود مغرب پسند فکرت کے یہاں بھی نہیں۔ ان سب میں نہایت قوی احساس جماعت اور جدید جذبہ حب وطن موجود تھا۔ اور یہ بات زیادہ تر اس توحید جماعتی کے عقیدہ کا نتیجہ تھی جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اور جو ظاہر ہے کہ مغرب پسندوں میں اب نہیں پایا جاتا۔

تصور وطن جو حریت کے پہلو بہ پہلو آج ذہنوں پر سب سے گہرا اثر رکھتا ہے۔ اس کا بھی

سب سے پہلا اور نام آور سپاہی کمال تھا۔ تصانیف حامد کا ایک ناشر سلیمان نظیف نے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، اس کی مختصر سی کتاب "الہام وطن" پر جس میں حامد کی وطنی نظمیں ہیں ایک مقدمہ لکھا ہے جس کا موضوع یہی ترکوں میں تصور وطن کی نشو و نما ہے۔ میں ذیل میں اسکے ایک جزو کا لفظی ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

"ہمارے ملک کی موجودہ تباہی میں سب سے بڑا عنصر یہ ہے کہ ہمارے وطن میں تصور وطنیت بہت دیر میں اور بہت نامکمل طور پر باہر سے آیا ہے۔ باہر سے، میں ارادۃً کہتا ہوں چاہے ہماری قومی خودداری پر یہ بات کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے لیکن ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تصور خود ہماری قوم کی روح، اس کے وجدان اور ارادہ سے پیدا نہیں ہوا۔"

مغرب کی ذہنی تخلیقات نے ہمارے ملک میں اور خصوصاً ہماری شاعری میں اس تصور کو داخل کیا اور ہمارے ذہنوں پر اسکا اثر ڈالا۔ جذبہ وطنیت کے وجود اور اس کی ضرورت کو ہم نے اسی وقت تسلیم کیا جب ہم مغرب کی تخلیقات ذہنی سے آشنا ہوئے۔ ہم اپنے ان مشاہیر کی یقیناً عظمت کرتے ہیں جنہوں نے بے حد و نہایت جذبہ ایثار کے اثر سے اپنے جسموں کو قربان کردیا اور آج ہماری حدود سے دور سپرد خاک ہیں یقیناً جب ہم کبھی انکا خیال کرتے ہیں نہایت گہری عقیدت اور شکر گزاری کے ساتھ لیکن ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ انہوں نے جو اپنی جان قربان کی تو جذبہ شجاعت کے اثر سے یا دوسری دنیا میں آسایش دامن کی خاطر جبتک اصلی بہشت کی طرف سے نظریں پھری رہیں اور ایک آنے والی موعودہ بہشت کا طلسم اس پر غالب ہو تو ظاہر ہے کہ قربانی کا خون اسی مقام رجعت کی خاطر بہایا جائے گا نہ کہ دنیاوی وطن کے لئے لیکن وطن کا مقصد آخرت نہیں یہی دنیا ہے۔ وہ تمدن کو برباد نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسکی تعمیر کا طالب ہے۔ ہمارا عقیدہ ہونا چاہیئے کہ زندہ رہنا فرض ہے اس لئے کہ وطن کی حیات برقرار رہے کہ یہ اس سے زیادہ عظیم الشان اور زیادہ ضروری فرض ہے۔"

ترکی کی موجودہ حالت زار کو جب وطن کے فقدان سے اس طرح منسوب کرنے کے بعد

نطیف کہتا ہے :۔

" وہ جوامت کے رہنما اور معلم بننا چاہتے تھے انہوں نے قوم کے جذبات اور اعمال کے لئے صدیوں تک ایک ایسا دور افتادہ مقصد مقرر کیا اور اس طرح کیا کہ اس پیغمبر اعظم کی روح جس کا مقدس نام لیکر یہ گفتگو کرتے تھے یقیناً اس پر ناراض اور بیزار ہوتی ہوگی۔ اس پیغمبر نے تو بار بار اور نہایت زور سے یہ کہا ہے کہ اس دنیا کا تمدن اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس دنیا کے لئے عبادت۔ لیکن یہ لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے قول وفعل سے امت محمدی کو دنیا سے بیزار کردیا"

" وطن کو پس پشت ڈالنے اور اسکی محبت کی تعلیم سے گریز کرنے کے گناہ میں ہمارے شعرا بھی اسی قدر آلودہ ہیں جس قدر کہ صاحبان جبہ و دستار"

" نامق کمال نے اپنی قوم کی شاعری کو اسی پراگندگی کے حال میں پایا۔ نامق کمال ہی پہلا شخص ہے جس نے وطن کے حسن اور وطن کے مصائب کا گیت اپنے شاندار اور پراثر انداز میں گایا"

" ہمارے سیاسی اقتدار کا سنگ بنیاد سلطان عثمان نے رکھا تھا لیکن اقتدار ادبی کا نامق کمال نے رکھا ہے۔ وہ وطن کا بانی تھا یہ حب وطن کا"

مجھے سلیمان نطیف کے ان الفاظ سے بڑی حد تک اتفاق ہے اور اس موقع پر میں ان میں کچھ اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ کمال کے بعد تو ہمارے تمام کے تمام شعرا نے وطنیت کے گیت گائے ہیں۔ ان سب کا سردار حامد ہے جس نے اپنے کلام میں ہر جگہ وطن کے لئے اظہار محبت کے تمام دلفریب انداز وقف کر دئے ہیں۔

غرض اس طرح وطن کا تصور ترکیہ جدید کی نئی ذہنیت کے لئے ایک بڑی طاقت بن گیا اور اس نے ایک ایسی قومی قدر مقدس کی حیثیت اختیار کر لی کہ آج ہمارے بہترین دل و دماغ اسکے لئے جیتے اور اس کے لئے مرتے ہیں۔

وطن کے ساتھ ساتھ قوم کا تصور بھی پیدا ہوا۔ لیکن قوم پرستی کے آخری مراحل تک یہ تصور کچھ دھندلا اور غیر متعین سا رہا اور اسمیں کوئی خاص معنی پیدا نہیں ہوئے مثلاً کمال کے کلام

میں خلق، ملت، اور امت، کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اور کمال کے زمانہ میں ترکی قوم کے جو اجزائے ترکیبی تھے ان سے اس بات کی تشریح بھی ہو جاتی ہے لیکن تاہم جب کمال یہ الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کے پیش نظر عثمانی قومیت ہی کا تصور ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے یہاں تو شدید احساس نسل تک کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے اس قصیدہ میں جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں وہ "اس معزز عثمانی نسل" کا ذکر کرتا ہے "جس نے ایک قبیلہ سے ایک سلطنت بنالی"

حامد کے کلام میں 'وطن' کے ساتھ ساتھ 'ملت' کا لفظ بھی آتا ہے کہیں کہیں اس سے مطلب عثمانیوں یا ترکوں سے ہے لیکن عموماً ملت اسلامی مراد ہوتی ہے۔ ۱۹۱۳ء کی لکھی ہوئی ایک نظم میں وہ کہتا ہے کہ "مذہب ہی سچی قومیت ہے" (الہام وطن ص ۹۷) اپنے ڈراما طارق میں اس نے پہلی مرتبہ جب قوم (ملت سیوداسی) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک عرصہ تک خصوصاً تنظیمات کے زمانہ میں ملت سے مراد حکومت عثمانی کی تمام رعایا سے تھی اور اسمیں مختلف حصوں کی تفریق کے لئے لفظ قوم استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی یہ ایک سیاسی تصور تھا۔ ترکی قوم پرستی کی تحریک نے اس میں تغیر پیدا کیا اور لفظ 'ملت' کو ایک خاص معنی دے یعنی اسے ترکی قوم کا مرادف بنایا (ضیا، کوک الپ 'ملت و وطن')

چونکہ عہدنامہ سیورے کے بعد سے ترکی ایک قومی حکومت ہوگئی ہے اس لئے ملت کا یہ تصور بھی مستقل معلوم ہوتا ہے۔ جمعیتہ اسلامی کے لئے ملت سے مفہوم تمام اسلامی برادری ہے ("اسلام بین الملی") اور اگرچہ مذہبی حلقوں نے بھی نئے تصور کو تسلیم کرلیا ہے تاہم وہ لفظ 'ملت' کو کل جماعت اسلامی کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں قوم اور قومیت کے الفاظ رکھتے ہیں۔ لیکن 'قوم' کے بہ حیثیت ایک حیات باقی اور جماعتی ہستی کے یہ بھی قائل ہیں اور اسکے علیحدہ وجود اور مخصوص حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس طرح 'وطن' اور 'قوم' کے تصور سے نیا تصور جماعت پیدا ہوا ہے۔

اب کچھ نئے تصور مذہب کے متعلق تفصیلات بالا سے یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ ہماری

ہدی تحریک ترکوں کے مذہب کے ساتھ ساتھ چلی ہے اور اسلام کی گود میں پیدا ہوئی ہے۔ لیکن یہ
گمان بس ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ اور وہ یوں کہ ہر جگہ جہاں ہمیں اسلام سے سروکار ہوا ہے
وہ موجودہ اسلام نہیں جس کی آج فرمانروائی ہے بلکہ ایک خیالی تصوری اسلام ہے۔ کمال جب
اپنے تمام تصورات اور مطالبات کی بنیاد اسلام کو بتاتا ہے، جب حامد اسلام کا ذکر کرتا ہے،
تو ان دونوں کا مطلب اس اسلام سے نہیں ہوتا جو انکے سامنے موجود تھا یعنی انکی مراد تاریخی اسلام
سے نہیں ہوتی۔ ہمارے انقلاب کی ذہنیت اس "تاریخی اسلام" کے بالکل خلاف ہے جس پر جمود
طاری ہے جو توہمات سے پرانے اور رایسے خیالات سے لبریز ہے۔ جو زندگی اور دنیا سے بیر رکھتے
ہیں۔ جماعت کا نیا تصور تعلیمات اسلامی کے مطابق مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے اگرچہ خود کمال اور
حامد کو اسکا احساس نہ تھا۔ اقوام اسلامی کی زندگی میں مذہب کی جو حیثیت ہے وہ معلوم ہے۔
اسلام تو کل انسانی زندگی کا شخصی ہو کہ جماعتی ایک مکمل نظام بننا چاہتا ہے اور آج تک کم و بیش
اس حیثیت سے رہا ہے اور ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں محدود معنوں میں 'مذہب' بھی ہے اور
نظام قانون و اخلاق بھی۔ چنانچہ آج جو مذہبی اصلاح ہو رہی ہے اس میں وہ ایسی نظری تجدید
کا مخالف ہے جیسے مذہب و اخلاق کی علیحدگی، مذہب و سیاست کی جدائی، مذہب و حکومت کی علیحدگی،
چونکہ اسکے نزدیک حقیقی زندگی میں ان چیزوں کا نہ کوئی مستقل وجود ہے نہ جداگانہ اقتدار۔ تمام
تمدنی زندگی ایک کل ہے اور اسلام اسکا واحد نظام۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اسلام ہر چند اسلام کی دراصل یہ حالت نہ تھی تاہم
تاریخی ارتقا نے اسے محض عبادات کا مذہب بنا دیا تھا اور اس کے پیرووں کی زندگی زیادہ
انہیں عبادات ظاہری کے لئے وقف تھی۔ نیا انسان جس کا ذوق عمل اپنے لئے میدان مانگتا تھا
اور جس کی نظر اس دنیا کی طرف لگی ہوئی تھی اس صورت حال کو کیسے مان سکتا تھا چنانچہ خود حامد
کے کلام میں ہمیں ایک خالص عقیدہ کے مذہب کی ابتدا دکھائی دیتی ہے مثلاً اس کی نظم "تہلیل"
میں اور اس کی دوسری نظم "بر واعظ بر موعظہ" میں۔

مزید براں یہ کہ نئی حکومت کو نئے حالات کے لحاظ سے نئے قانون کی ضرورت ہوئی جو کچھ تو اسلامی شریعت پر مبنی تھا اور کچھ اس سے جدا تھا۔ اُدھر شریعت اسلامی میں اضافہ واجتہاد کا دروازہ کوئی ستتہ ھ سے بند تھا۔ چنانچہ طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں کہ مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ترک مذہب کے مغربی تصور سے بھی آشنا ہوئے۔ خصوصًا دو مثالوں نے برا اثر ڈالا۔ ایک تو لوتھر کے کام نے دوسرے انقلاب فرانس کی سیاست مذہبی نے۔ مغرب میں حکومت اور کلیسا کی علیحدگی سے انہیں مذہب و سیاست کو جدا کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن مغربی خیالات کے اثر نے یہیں بس نہیں کیا۔ فرانس کی نئی روشنی، حکمت طبیعی کی مادہ پرستی، اور انیسویں صدی کی مذہب دشمن فلسفہ ان سب کا عمل دخل ترکوں کے دماغوں میں شروع ہوا۔ اسلام پر اہل مغرب نے جو نکتہ چینی کی ہے وہ بھی بے اثر نہ رہی۔ بہتوں نے تو اس نکتہ چینی کو اپنا لیا، اور بہتوں نے اس کی وجہ سے خود غور و فکر شروع کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب انفرادی عقیدہ کی بات ہے اور اسے سیاست و اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یہ خیال جس کی تلقین مغرب پرستوں نے کی اور جسے بعد میں قوم پرستوں نے اختیار کیا اس قدر انتہائی تھا کہ بہت جلد اس کی مخالفت و تردید شروع ہوگئی۔ مذہبی حلقے جو شریعت اسلامی کے حامی تھے اس ترقی کے ساتھ ساتھ آگے نہ بڑھے تھے اس لئے پہلے پہل تو وہ اس نئی صورت حال کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن جب سر پر مقابلہ آن ہی پڑا تو وہ بھی تیار ہو گئے اور انہوں نے اصلاح مذہب کی طرح ڈالی۔ اس طرح مذہب کے عام تصور نے بدلکر اسلام کے تصور کی شکل اختیار کی جس کی رو سے اسلام اس دنیا کا مذہب ہے، عقیدہ کا مذہب ہے، اور اخلاق حسنہ کا مذہب ہے جس میں عبادات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری کتاب میں بحث کیجائے گی۔



امریکہ انگریز مصنفین کے زاویۂ نگاہ سے(1)

"میرا خیال ہے کہ میں اپنے دماغ میں ایک شریف اور طاقتور قوم کو دیکھتا ہوں جو خواب راحت کے بعد ایک قوی آدمی کی طرح کھڑی ہو رہی ہے اور اپنی ناقابل تسخیر قیود پر غالب آرہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے ایک شہباز کی طرح اپنی شہزور جوانی کا رنگ لختیا کرتے ہوئے اور اپنی چکاچوند ہونے والی آنکھوں کو شعاع نیمروز سے روشن کرتے ہوئے دیکھتا ہوں"

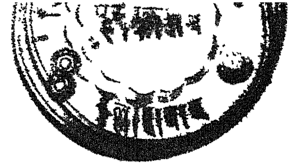
ملٹن

یہ نہایت افسوسناک بات ہے کہ مابین انگلستان و امریکہ ادبی مخالفت روز بروز ترقی پذیر ہے ممالک متحدہ امریکہ کی نسبت حال میں بہت دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور لندن کے مطابع جمہوری سلطنت کے سفرناموں سے پر ہیں لیکن انکا منشاء واقفیت کی بجائے غلط فہمی پھیلانا معلوم ہوتا ہے اور وہ اس بارے میں اسقدر کامیاب ہوگئے ہیں کہ دونوں قوموں کے متواتر ربط ضبط کے باوجود دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جس کے بارہ میں برطانیہ کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اس قدر

---

(1) یہ مضمون واشنگٹن ارونگ کی کتاب اسکیچ بک سے ترجمہ کیا گیا ہے جو ۱۸۱۹ء میں شائع کی گئی تھی۔ ممالک متحدہ امریکہ ۱۷۷۶ء میں انگلستان کے پنجہ سے آزاد ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے دونوں ممالک میں حسد و رقابت کا بازار گرم تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس مضمون کا دونوں ممالک پر کیا اثر ہوا لیکن اس کے بعد حسد و رقابت کی آگ ضرور سرد ہوگئی اور ارونگ نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ امریکہ انگلستان کی مصیبت میں اسکا ہمدرد رفیق ثابت ہوسکتا ہے وہ جنگ عظیم میں ایک صدی بعد پوری ہوئی اور انگلستان کو امریکہ کی بدولت جرمنی سے (دیکھو صفحہ ۳۲)

مزید براں یہ کہ نئی حکومت کو نئے حالات کے لحاظ سے نئے قانون کی ضرورت ہوئی جو کچھ تو اسلامی شریعت پر مبنی تھا اور کچھ اس سے جدا تھا۔ اُدھر شریعت اسلامی میں اضافہ واجتہاد کا دروازہ کوئی صدیوں سے بند تھا۔ چنانچہ طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں کہ مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ترک مذہب کے مغربی تصور سے بھی آشنا ہوئے۔ خصوصًا دو مثالوں نے برا اثر ڈالا۔ ایک تو لوتھر کے کام نے دوسرے انقلاب فرانس کی سیاست مذہبی نے۔ مغرب میں حکومت اور کلیسا کی علیحدگی سے انہیں مذہب وسیاست کو جدا کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن مغربی خیالات کے اثر نے یہیں بس نہیں کیا۔ فرانس کی نئی روشنی، حکمت طبیعی کی مادہ پرستی، اور انیسویں صدی کی مذہب دشمن فلسفہ ان سب کا عمل دخل ترکوں کے دماغوں میں شروع ہوا۔ اسلام پر اہل مغرب نے جو نکتہ چینی کی ہے وہ بھی بے اثر نہ رہی۔ بہتوں نے تو اس نکتہ چینی کو اپنا لیا، اور بہتوں نے اس کی وجہ سے خود غور و فکر شروع کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب انفرادی عقیدہ کی بات ہے اور اسے سیاست واخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یہ خیال جس کی تلقین مغرب پرستوں نے کی اور جسے بعد میں قوم پرستوں نے اختیار کیا اس قدر انتہائی تھا کہ بہت جلد اس کی مخالفت و تردید شروع ہوگئی۔ مذہبی حلقے جو شریعت اسلامی کے حامی تھے اس ترقی کے ساتھ ساتھ آگے نہ بڑھے تھے اس لئے پہلے پہل تو وہ اس نئی صورت حال کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن جب سر پر یہ مقابلہ آن ہی پڑا تو وہ بھی تیار ہو گئے اور انہوں نے اصلاح مذہب کی طرح ڈالی۔ اس طرح مذہب کے عام تصور نے بدلکر اسلام کے تصور کی شکل اختیار کی جس کی رو سے اسلام اس دنیا کا مذہب ہے، عقیدہ کا مذہب ہے، اور اخلاق حسنہ کا مذہب ہے جس میں عبادات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری کتاب میں بحث کیجائے گی۔



امریکہ انگریز مصنفین کے زاویۂ نگاہ سے[1]

"میرا خیال ہے کہ میں اپنے دماغ میں ایک شریف اور طاقتور قوم کو دیکھتا ہوں جو خواب راحت کے بعد ایک قوی آدمی کی طرح کھڑی ہو رہی ہے اور اپنی ناقابل تسخیر قیود پر غالب آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے ایک شہباز کی طرح اپنی شہزور جوانی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے اور اپنی چکاچوند ہونے والی آنکھوں کو شعاع نیمروز سے روشن کرتے ہوئے دیکھتا ہوں"

ملٹن

یہ نہایت افسوسناک بات ہے کہ مابین انگلستان و امریکہ ادبی مخالفت روز بروز ترقی پذیر ہے ممالک متحدہ امریکہ کی نسبت حال میں بہت دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور لندن کے مطابع جمہوری سلطنت کے سفرناموں سے پر ہیں لیکن انکا منشاء واقفیت کی بجائے غلط فہمی پھیلانا معلوم ہوتا ہے اور وہ اس بارے میں اسقدر کامیاب ہو گئے ہیں کہ دونوں قوموں کے متواتر ربط ضبط کے باوجود دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جس کے بارہ میں برطانیہ کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اس قدر

---

(۱) یہ مضمون واشنگٹن ارونگ کی کتاب اسکیچ بک سے ترجمہ کیا گیا ہے جو سنہ ۱۸۱۹ء میں شائع کی گئی تھی۔ ممالک متحدہ امریکہ سنہ ۱۸۰۰ء میں انگلستان کے پنجہ سے آزاد ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے دونوں ممالک میں حسد و رقابت کا بازار گرم تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس مضمون کا دونوں ممالک پر کیا اثر ہوا لیکن اس کے بعد حسد و رقابت کی آگ ضرور سرد ہو گئی اور ارونگ نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ امریکہ انگلستان کی مصیبت میں اسکا ہمدرد رفیق ثابت ہو سکتا ہے وہ جنگ عظیم میں ایک صدی بعد پوری ہوئی اور انگلستان کو امریکہ کی بدولت جرمنی سے (دیکھو صفحہ ۳۲)

کم صحیح اطلاعات ہوں یا اس قدر کثیر التعداد تعصبات اُس کے دل میں جاگزیں ہوں۔
دنیا میں انگریز سیاح بہترین بھی ہیں اور بدترین بھی۔ جب غرور یا نفع کا خیال دل میں موجزن نہ ہو تو عمیق اور فلسفیانہ سماجی خیالات میں یا بیرونی اشیاء کی واقعی اور ہو بہو تصویر کھینچنے میں کوئی اُنکی برابری نہیں کرسکتا۔ لیکن جب اپنے ملک کی شہرت یا بہبودی کسی دوسرے ملک سے تصادم کرتی ہے تو وہ مخالفت کی انتہائی سرحد پر جا پہنچتے ہیں اور اپنی صداقت اور دیانت کو جو اُنکا معمول ہے نا ملائم طعن تشنیع اور بدمذاق تمسخر سے لطف اندوز ہونے میں فراموش کر جاتے ہیں پس اُن کی سیاحت اسی قدر صحیح اور درست ہوگی جس قدر کہ وہ ملک جس کا وہ حال بیان کریں اُن سے دور ہوگا، میں ان ممالک کے حالات کی نسبت جو دریائے نیل کے آبشاروں سے اُدھر واقع ہیں یا غیر دریافت شدہ جزائر کے بارہ میں جو بحیرۂ زرد میں ہیں، یا ہندوستان کے اندرونی حصص یا کسی دوسرے قطعہ زمین کی بابت جس کو دوسرے سیاح اپنے تخیل کی بلند پروازی سے دکھلانے کیلئے تیار ہوں ایک انگریز کے بیان پر فوراً اعتماد کرلوں گا لیکن میں اُس کے قریبی ہمسایوں یا ان قوموں کے بیان کردہ حالات کو جن سے وہ بہ بعید ملتا جلتا رہتا ہے احتیاط کی نظر سے دیکھونگا۔ بالفاظ دیگر میں اس کی دیانت پر اعتماد کرنے کے لئے کیسا ہی آمادہ کیوں نہ ہو جاؤں لیکن میں اسکے تعصبات پر بھروسہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔
ہمارے ملک کی یہ عجیب قسمت ہے کہ اس کو بدترین انگریز سیاحوں سے واسطہ پڑا ہے جبکہ فلسفی اور روشن خیال لوگوں کو انگلستان سے قطبین کا حال معلوم کرنے صحراؤں کو عبور کرنے اور وحشی قوموں کے عادات و اطوار مطالعہ کرنیکے لئے بھیجا جاتا ہے جن کے ساتھ اُنکے ملک کو کوئی مستقل نفع یا خوشی کا رابطہ نہیں ہے تو یہ کام ٹوٹے پھوٹے تاجر، خیالی پلاؤ پکانے والے شخص، آوارہ گرد مزدور یا نچسٹر اور برمنگھم کے گماشتے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ امریکہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱) مقابلہ میں نسخ حاصل ہوئی۔ تنہا

کے بارہ میں انگلستان کو واقفیت بہم پہنچائے ۔ ان ذریعوں سے انگلستان ایسے ملک کے بارہ میں واقفیت حاصل کرنے پر قانع ہے جو اخلاقی اور جسمانی ترقی کی عجیب شاہراہ پر گامزن ہے ۔ ایسا ملک جس میں دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے سیاسی تجربوں میں سے ایک پر اس وقت عمل کیا جا رہا ہے اور جو فلسفی اور مدبر کے لئے نہایت عمیق اور اہم مطالعہ کا سامان پیش کرتا ہے ۔

یہ بات کہ ایسے اشخاص امریکہ کے حالات تعصب کیساتھ بیان کریں تعجب خیز نہیں ہے ۔ وہ غور طلب مضامین جو یہ پیش کرتا ہے اس قدر وسیع اور بلند ہیں کہ وہاں تک اُنکی رسائی نہیں ہو سکتی ۔ قومی مسلک ابھی خام ہے اور حالت پختگی میں ہے ۔ ممکن ہے اس میں جھاگ اور تلچھٹ ہو لیکن اسکے اجزا صحیح اور مفید ہیں ۔ اس نے شجاعت اور فیاضی کے ثبوت پہلے ہی سے فراہم کر دئے ہیں اور مجموعی حیثیت سے کسی نہ کسی نفیس شے میں اس کے تبدیل ہونیکی امید ہے ۔ لیکن وہ اسباب جو اُس کو مضبوط اور شریف بنانے میں مصروف ہیں اور اسکی قابل تعریف صفات کا روزانہ اظہار یہ تمام باتیں ان تنگ نظر لوگوں پر کچھ اثر نہیں ڈالتیں اور نہ ان چھوٹی چھوٹی سختیوں سے جو اُس کی موجودہ حالت کا اقتضا ہیں متاثر ہوتے ہیں ۔ وہ صرف سطحی معاملات کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں ، اُن معاملات کو جو اُنکے نجی مفاد اور ذاتی منافع سے متعلق ہیں ۔ وہ اُن چھوٹے چھوٹے آرام و راحت کے سامانوں سے محروم رہتے ہیں جو ایک قدیم ، خوب آراستہ اور ضرورت سے زائد آباد قوم کی حالت کا حصہ ہوتے ہیں جہاں مفید محنت کے تمام درجے پُر ہو جاتے ہیں اور اکثروں کو خواہش اور تعیش کے توہمات کا مطالعہ کر کے تکلیف دہ اور ذلیل معاش پیدا کرنی پڑتی ہے ۔ لیکن تنگ نظر لوگوں کی نگاہ میں یہ چھوٹے چھوٹے آرام ہی سب کچھ ہیں یا ان کو نظر نہیں آتا یا وہ اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ جن عظیم برکات کا حصہ ہم کو عام طور پر ملا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ بہتر ہیں ۔

غالباً وہ کسی فوری نفع کی بیجا توقعات میں ناکام رہے ہیں ۔ غالباً انہوں نے امریکہ کو ایک سونے کی کان سمجھا تھا جہاں سونا اور چاندی بافراط تھا اور دیسی لوگ فہم و فراست کے حصہ دار

نہ تھے اور جہاں وہ یکایک تعجب خیز طریقہ پر کسی غیر متوقع لیکن آسان طریقہ سے مالدار ہو جاتے۔ وہی دماغی کمزوری جو فضول توقعات سے پُر ہے مایوسی میں چڑچڑاپن پیدا کر دیتی ہے ایسے اشخاص اُس ملک کے جانی دشمن بن جاتے ہیں جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جیسا کہ ہر جگہ کوئی شخص بھی اُس وقت تک فصل درو نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس نے بیج نہ بویا ہو ظاہر ہے کہ ہر شخص محنت اور دماغ سے دولت حاصل کر سکتا ہے اور قدرت کی عام مشکلات اور ایک ذہین اور حوصلہ مند قوم کی ہوشیاری کا مقابلہ کر کے کچھ کما سکتا ہے۔

شاید غلط فہمی یا ہر قسم کی مہمان نوازی کی وجہ سے یا اجنبی کو ہر وقت خوش اور بشاش رکھنے کے خیال سے جو میرے ہم وطنوں میں پایا جاتا ہے امریکہ میں اُن کو غیر معمولی عزت کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور چونکہ وہ تمام عمر اپنے آپ کو عمدہ سوسائٹی سے فروتر سمجھتے رہے ہیں اور انہوں نے فروتنی کے غلامانہ احساس میں نشوونما پائی ہے لہذا وہ تہذیب کے معمولی استعمال پر مغرور بن جاتے ہیں اور اپنی برتری کو دوسروں کی حقارت میں صرف کرتے ہیں، اور اُس سوسائٹی کی تحقیر کرتے ہیں جہاں کوئی مصنوعی امتیاز نہیں ہے اور جہاں ایسے افراد جیسے کہ وہ خود ہیں کسی اتفاق سے بڑے آدمی ہو سکتے ہیں۔

لیکن ہر شخص یہ خیال کریگا کہ اطلاعات ایسے ذرائع سے ایسے مضمون پر جہاں حقیقت و واقعیت نہایت ضروری ہیں مہتممان اخبارات کو وصول ہوتی ہونگی وہ ان کو باحتیاط کام میں لاتے ہونگے اور یہ کہ ان اشخاص کے مقاصد، انکی دیانتداری، ان کی تحقیق و تدقیق کے مواقع اور صحیح رائے قائم کرنے کی استعداد کو سختی کے ساتھ جانچ لیا جاتا ہوگا قبل اس کے کہ انکی شہادت کو اپنی ہی جیسی قوم کے خلاف اس کثرت کے ساتھ تسلیم کرتے ہونگے۔ مگر معاملہ اسکے بالکل برعکس ہے اور اس سے انسانی اختلاف رائے کی ایک عجیب و غریب مثال مہیا ہوتی ہے۔ اُس احتیاط سے جس سے انگریز نقاد ایک سیاح کی صداقت کو جو کسی دور دراز اور نسبتہً غیر اہم ملک کے حالات بیان کرتا ہے، جانچتے ہیں کوئی شے سبقت نہیں لیجا سکتی کیسی ہوشیاری

کے ساتھ وہ اہرامِ مصری کی پیمائش یا کسی کھنڈر کے حالات کا مقابلہ کرینگے اور کیسی سختی کے ساتھ وہ کسی غلطی پر جو محض عجیب و غریب باتوں کی واقفیت کے متعلق ہو ملامت کریں گے حالانکہ وہ کیسے شوق اور بلا تامل یقین کے ساتھ بھدّے اور گمنام مصنفین کی محض خیالی باتوں کو اُس ملک کی نسبت پڑھتے ہیں جس سے کہ خود اُنکا ملک نہایت اہم اور نازک تعلقات سے وابستہ ہے نہیں وہ ان غیر یقینی جلدوں کو مستند کتابیں بنا دینگے اور جن پر وہ اُس جوش اور قابلیت کے ساتھ اضافہ کریں گے جن کا اس سے زیادہ فیاضی کے کام میں صرف کرنا بہتر ہوتا۔

لیکن میں اس دل اکتانے والے اور بیش یا افتادہ مضمون پر زیادہ بحث نہیں کرونگا اور میں اس مضمون کیطرف قطعی توجہ نہ کرتا اگر میرے ہموطن بیجا دلچسپی کا اظہار نہ کرتے یا یقینی مضر نتائج جن کے پیدا ہونے کا مجھکو خوف ہے قومی احساسات پر اپنا اثر نہ چھوڑ جاتے۔ ہم ان حملوں کو ضرورت سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہم کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غلط فہمیوں کا جال جو ہمارے گرد بنا جاتا ہے اُس مکڑی کے جالے کی مانند ہے جو ایک دیوزاد کے اعضا کے گرد تانا جائے ہمارا ملک اس سے برابر باہر نکلتا جا رہا ہے۔ ایک غلط بیانی دوسری دروغ بیانی کے بعد خود بخود زائل ہوتی جا رہی ہے۔ ہم کو صرف زندہ رہنا چاہئے اور ہر روز ہم تردید کی ایک مجلد کتاب پیش کر رہے ہیں۔

انگلستان کے تمام مصنفین یک زبان ہو کر، اگر ہم ایک لحظہ کے لئے یہ فرض بھی کرلیں کہ انکے عالی دماغ اپنے درجہ سے گر کر ایسے ایک فضول کام کے لئے متفق ہو جائیں گے، ہماری روزافزوں اہمیت اور بے نظیر مرفہ الحالی کو چھپا نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتے کہ یہ دونوں باتیں نہ صرف جسمانی اور مقامی بلکہ اخلاقی اسباب کے تابع ہیں۔ یعنی سیاسی آزادی علم کی عام اشاعت، عمدہ اخلاقی اور مذہبی اصول کی پیروی جو ایک قوم کے مسلک کو طاقت اور استقلال بخشتی ہیں اور جو فی الواقع خود اُنکی قومی طاقت و عظمت کی مسلمہ اور عجیب و غریب مؤید رہی ہیں۔

لیکن ہم انگلستان کی لعنت و ملامت کا کیوں اسقدر خیال کرتے ہیں ؟ ہم کیوں اس توہین اور گستاخی سے متاثر ہوتے ہیں جن سے وہ ہمارے ساتھ پیش آنے کی کوشش کرتا ہے ۔ صرف انگلستان ہی کی رائے پر یہ بات منحصر نہیں ہے کہ عزت و آبرو قائم رہے اور شہرت حاصل ہو ۔ ایک قوم کی شہرت کا فیصلہ تمام دنیا کے ہاتھوں میں ہے ۔ اپنی ہزاروں آنکھوں سے وہ ایک قوم کے افعال و اعمال پر نظر ڈالتی ہے اور اُن سب کو مجموعی شہادت سے قومی عظمت یا قومی بے آبروئی قائم کیجاتی ہے ۔

لہذا جہانتک ہم لوگوں کا تعلق ہے یہ امر نسبتاً بہت کم اہمیت رکھتا ہے کہ انگلستان ہمارے ساتھ انصاف کرتا ہے یا نہیں ۔ غالباً یہ امر خود اُس کے لئے زیادہ اہم ہے ۔ وہ ایک نوجوان قوم کے سینہ میں غیظ و غضب کی آگ مشتعل کر رہا ہے جو اُس کی نشو و نما کے ساتھ بڑھتی جائے گی ، اور اُس کی طاقت کے ساتھ طاقتور ہوتی جائے گی ۔ اگر امریکہ کو جیسا کہ انگلستان کے بعض لکھنے والے اس کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں ، وہ اس کے بعد ایک قابل رشک رقیب اور ایک مہلک دشمن پائے تو اُس کو اپنے ان مصنفین کا شکر گزار ہونا چاہئے جنہوں نے رقابت اور غضبناک دشمنی کا بیج بویا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل علم ادب کا کس قدر اثر پڑتا ہے اور بنی نوع انسان کے جذبات اور آراء اُس کے کسقدر ماتحت ہیں ۔ تلوار کی لڑائیاں عارضی ہوتی ہیں ۔ اُنکے زخم صرف گوشت پر لگتے ہیں اور فیاض طبع لوگ اس کو فخر سمجھتے ہیں کہ وہ اُن کو بھول جائیں اور معاف کر دیں لیکن قلم کی طعن و تشنیع دل و جگر کو چیر ڈالتی ہیں ۔ اچھے سے اچھے آدمیوں کے اندر بھی اُنکا وجود عرصہ تک قائم رہتا ہے وہ دماغ میں ہمیشہ تر و تازہ رہتی ہیں اور مریض کی طرح نہایت حقیر تصادم پر اُنکا احساس ہوتا رہتا ہے ۔ یہ صرف شاذ و نادر ہوتا ہے کہ کسی ظاہری فعل کی بنا پر دو قوموں کے درمیان مخاصمت قائم ہو ، زیادہ تر دیرینہ گزشتہ حسد اور بغض و عناد ہوتا ہے اور وہ رجحان طبیعت جو ناخوشگواری پیدا کرتا ہے ۔ ان باتوں کے اسباب دریافت کرو اور یہ بکثرت کرایہ پر لکھنے والوں کے مضر خیالات کا نتیجہ پائے جائینگے جو اپنے کمروں میں محفوظ ذلیل طور پر روٹی کمانے کے لئے اُس زہر کو پیدا کرتے اور پھیلاتے ہیں جو فیاض اور بہادر اشخاص کو بھی مشتعل کر دیتا ہے ۔ میں اس امر پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دے

رہا ہوں کیونکہ یہ بات نہایت تاسناک طریقہ سے ہماری خاص حالت پر صادق آتی ہے۔ اخبارات کسی قوم پر امریکہ کے لوگوں کی نسبت زیادہ قابو نہیں رکھتے کیونکہ غریب سے غریب طبقہ کی عام تعلیم نے ہر شخص کو پڑھنے والا بنا دیا ہے۔ انگلستان میں ہمارے ملک کے متعلق کوئی تحریر ایسی شائع نہیں ہوتی جو ہمارے ملک کے ہر حصہ میں نہ پہنچ جاتی ہو۔ انگریزی قلم سے نہ کوئی ایسی ملامت ٹپکتی ہے اور نہ کوئی ایسا بیجا طنز کسی انگریز مدبر کی زبان سے نکلتا ہے جو خوشگواری کے حس کو ٹھنڈا نہیں کرتا اور چھپے ہوئے غضب کے ڈھیر میں آگ نہیں لگاتا۔ پس انگلستان اس سرچشمہ کا مالک ہوتے ہوئے جس سے کہ اس زبان کا علم ادب جاری و ساری ہے کسقدر کامل طور پر اس پر قابض ہے اور کس قدر صحیح طور پر اسکا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو خوشگوار اور شاندار احساس کا ذریعہ قرار دے۔ ایک دریا جہاں دونوں قومیں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ لیکن اگر وہ اس کو تلخی کے سمندر میں بدلنے پر مصر ہے تو ایک زمانہ آئے گا جب وہ اپنی اس حماقت پر افسوس کریگا، امریکہ کی موجودہ دوستی ممکن ہے اس کے لئے آج کل کچھ اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن اس ملک کی آئندہ ترقی میں کوئی شک نہیں۔ اور انگلستان کی آئندہ قسمت پر کچھ شک و شبہات کے بادل نظر آتے ہیں۔ پس اگر تاریکی کا دن آجائے۔ اگر وہ بدنصیبی پیش آجائے جس سے مغرور مغرور سلطنتیں مستثنٰی نہیں رہیں۔ تو وہ افسوس کے ساتھ اپنی حماقت کو یاد کریگا اور اس قوم کو اپنی بغل سے نکالنے پر جو اس کے سینے سے چمٹ جاتی اور اس طرح اپنے ممالک کی حدود سے باہر کی حقیقی دوستی کے موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھنے پر کف افسوس ملیگا۔

انگلستان میں یہ عام خیال ہے کہ ممالک متحدہ کے باشندے اس ملک کے دشمن ہیں جہاں سے انکا نکاس ہے۔ یہ ان غلطیوں میں سے ایک ہے جن کو سرگرمی کے ساتھ غرض مند مصنفین نے پھیلایا ہے۔ بلاشبہ بیحد سیاسی رقابت موجود ہے اور انگریزی اخبارات کی تنگ خیالی عام تلخی کا باعث ہی لیکن عام طور پر لوگوں کے خیالات انگلستان کے بیحد موافق ہیں، فی الواقع ایک زمانہ میں اتحاد امریکہ کے اکثر حصوں میں وہ تعصب کے لغو درجہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ صرف انگریز کا نام ہر

خاندان کے اعتماد اور مہمان نوازی کے لئے ایک پروانۂ راہ داری تھا اور ناشکر گزار اور بیکار لوگوں نے بھی عارضی رواج سے فائدہ اٹھایا۔ تمام ملک میں انگلستان کے خیال کے ساتھ ایک جوش بھرا ہوا تھا۔ ہم اُس کو محبت اور احترام کے خون احساس کی نظر سے اپنے بزرگوں کا وطن سمجھتے تھے۔ اپنی نسل کے مقبروں اور قدیم یادگاروں کا مخزن۔ ہماری آبائی تاریخ کے سورماؤں اور دانشمندوں کا مقبرہ اور جائے پیدائش۔ ہمارے اپنے ملک کے بعد کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی شان و عظمت سے ہم زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی عمدہ رائے حاصل کرنے کا ہم کو بجد خیال ہو۔ کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی طرف ہمارے دل قرابت اور خون کے جوش سے ایسے مائل ہوں۔ گزشتہ لڑائی کے زمانہ میں بھی جہاں کہیں نرم احساسات کو پیدا ہونے کا کم سے کم موقع ملا۔ ہمارے ملک کے فیاض دلوں کو اس میں مسرت ہوئی کہ دشمنی کے زمانہ میں بھی وہ ظاہر کریں کہ اُن میں اتحاد و یگانگت کی چنگاریاں موجود ہیں۔

کیا ان تمام باتوں کا خاتمہ ہونے کو ہے؟ کیا یہ سنہری قرابتی ہمدردیوں کا رشتہ جو قوموں میں اس قدر شاذ ہے ہمیشہ کے لئے ٹوٹنے والا ہے؟ غالباً یہ سب سے بہتر تھا۔ اس سے اُس فریب کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہم کو دماغی غلامی میں رکھتا، جو اکثر ہمارے اصلی مفاد میں مخل ہوتا اور صحیح قومی فخر و مباہات کے نشو و نما میں حائل ہوتا۔ لیکن نسلی رشتہ کو ترک کرنا مشکل ہے اور فائدہ سے زیادہ عزیز وہ احساسات ہیں۔ جو فخر و مباہات کی نسبت سے زیادہ قریب ہیں اور جو ہم کو ایک نظرِ حسرت سے دیکھنے کے لئے مجبور کریں گے جبکہ ہم آبائی سقف کے نیچے سے زیادہ بعید ہوتے جائیں گے اور اُس باپ کی ضد پر رنج و الم کریں گے جو اپنے بچے کی محبتوں کو دور دور کرتا ہے۔

لیکن انگلستان کا طرز اس شیوۂ دشنام دہی میں تنگ نظر اور ابلہانہ ہو، ہماری طرف سے بھی اُس کا بدلہ لینا مساوی طور پر احمقانہ ہوگا۔ میں اپنے ملک کے کسی فوری اور پر جوش بدلہ کا ذکر نہیں کرتا اور نہ مجھے اُس کے دشنام دہندوں کی تیز سے تیز دل آزاری کا خیال ہے۔ لیکن میں اُس دماغی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو اُسی طرح بدلہ لینے کو تیار ہو اور جو طعن کا بدلہ طعن سے

دے اور تعصب پیدا کرے اور یہ ہمارے لکھنے والوں میں وسعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ ہم کو ایسے مزاج کی خاص طور پر نگہداشت کرنی چاہئے کیونکہ اس سے دگنی خرابی ہو جائے گی بجائے اس کے کہ غلطی کا ازالہ ہو۔ کوئی شئے اسقدر آسان اور ترغیب دہ نہیں ہے جس قدر دشنام اور طنز کا جواب لیکن یہ بیکار اور فضول جھگڑا ہے۔ یہ دماغی خرابی کا دوسرا نام ہے جو غیظ و غضب کی بجائے چڑ چڑا پن پیدا کرتی ہے۔ اگر انگلستان تجارت کی کینہ رقابتوں یا سیاسی نفرت انگیز دشمنی سے اپنے اخبارات کو دیانت و صداقت سے محروم ہونیکی اجازت دیتا ہے اور رائے عامہ کے سرچشمہ کو زہر آلودہ بناتا ہے تو ہم کو اس کی مثال سے احتراز کرنا چاہئے، وہ اپنا فائدہ غلطی کی اشاعت اور خصومت پیدا کرنے میں سمجھا کرے تاکہ ترک وطن پر لوگ آمادہ نہ ہوں لیکن ہمارا تو کوئی ایسا مقصد نہیں ہے۔ نہ ہم میں قومی حسد کی آگ بھڑک رہی ہے کیونکہ ابتک انگلستان کے خلاف تمام رقابتوں میں ہم ہی کامیاب اور فائدہ مند فریق رہے ہیں۔ لہذا دل کا بخار نکالنے کے سوا جو بدلہ لینے کی محض ایک خواہش ہے جواب کا کبھی خاتمہ نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارے جوابات انگلستان میں کبھی شائع نہیں ہوتے۔ پس وہ اپنے مقصد کی ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں لیکن وہ ہمارے مصنفین میں جھگڑالو طبیعت اور چڑچڑا پن پیدا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے ابتدائی علم ادب کی شیریں رفتاری کو تلخ بناتے ہیں اور اس کی کلیوں میں جھاڑیاں اور کانٹے بوتے ہیں۔ اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ وہ صرف ہمارے ہی ملک میں اشاعت پذیر ہیں اور جہاں تک انکا دائرہ اثر ہے وہ زہریلے قومی تعصبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ یہ آخری خرابی ایسی ہے جس کا فوراً انسداد ہونا چاہئے چونکہ ہم رائے عامہ کے زیر فرمان ہیں، پس نہایت احتیاط برتنی چاہئے کہ پبلک کا دماغ صاف و شفاف رہے۔ علم طاقت ہے اور صداقت علم ہے لہذا جو شخص عمداً تعصب پھیلاتا ہے وہ جان بوجھ کر اپنے ملک کی طاقت کی بنیاد کا خون چوستا ہے۔

سب آدمیوں سے بڑھ کر ایک جمہوری سلطنت کے افراد کو متدین اور ہر جوش سے خالی ہونا چاہئے۔ وہ انفرادی حیثیت سے شاہی دماغ اور شاہی مرضی کے اجزا ہیں اور انکو قومی تعلقات

کے جملہ مسائل کو خاموشی اور غیر متعصبانہ فیصلوں سے طے کرنا چاہیئے۔ انگلستان سے ہمارے تعلقات ایک خاص قسم کے ہیں پس ایک مشکل اور نازک قسم کے سوالات بار بار پیش آتے ہیں جو کسی اور قوم کے ساتھ ہم کو پیش نہیں آتے۔ وہ مسائل جو نہایت سخت اور مشتعل کرنے والے احساسات پر اثر ڈالتے ہیں اور چونکہ انکے درست کرنے میں ہمارے قومی پیمانے عام احساس کے لحاظ سے کلی طور پر طے ہو جانے چاہئیں اور ہم کو تمام پوشیدہ جوش یا تعصب سے پاک و صاف ہو جانا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم زمین کے ہر حصہ کے اجنبیوں کے واسطے محتاج خانے بناتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ ہم سب کو کسی تعصب کے بغیر خوش آمدید کہیں۔ کم از کم ہم کو ایسی ایک قوم کی مثال پیش کرنے پر فخر کرنا چاہیئے جو قومی مخاصمتوں سے پاک ہو اور جہاں نوازی کے ظاہری افعال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ شاذ و نادر شریفانہ اخلاق کو کام میں لانا چاہیئے جو آزادی رائے سے پیدا ہوتا ہے۔

قومی تعصبات سے ہم کو کیا مطلب ہے؟ یہ قدیم ممالک کے امراض مزمنہ میں سے ہیں جو جہالت اور وحشت کے زمانہ میں وجود میں آئے تھے جب قومیں ایک دوسرے کا حال کچھ نہ جانتی تھیں اور اپنی حدود کے باہر دوسروں پر بے اعتباری اور خصومت سے نظر ڈالتی تھیں، برخلاف اسکے ہماری قومی زندگی ایک تابناک اور فلسفیانہ عہد میں وجود میں آئی ہے جبکہ آباد دنیا کے مختلف حصص اور انسانی خاندان کی مختلف شاخیں ان تھک کوشش کے ساتھ مطالعہ کی گئی ہیں اور ایک دوسرے کو بتائی گئی ہیں اور ہم اپنے پیدائشی حقوق سے بھی محروم ہو جائیں گے اگر ہم قدیم دنیا کے قومی تعصبات کو دور نہ کریں جیسا کہ ہم مقامی اوہام کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں۔

لیکن سب سے ضروری یہ امر ہے کہ ہم پر غیظ و غضب کے خیالات کا اثر نہ ہونا چاہیئے اور ہم کو انگریزی شعار میں جو بہترین اور قابل تعریف امور ہیں اُن سے اپنی آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں۔ ہم ایک نوجوان قوم ہیں۔ لازماً ہم دوسروں کی نقل کرتے ہیں اور بڑی حد تک ہم اپنے نمونے اور مثالیں یورپ کی موجودہ قوموں سے لیتے ہیں۔ ہمارے مطالعہ کے لئے کوئی ملک انگلستان سے زیادہ موزوں نہیں ہے اس کی مشروطہ کی روح ہمارے آئین حکومت سے نہایت مشابہ ہے۔

وہاں کے لوگوں کے طریقے۔ ان کی دائمی جدوجہد، اُن کی آزاد خیالی، اُن کی عادات ان مضامین پر غور کرنے کی، جو نہایت عزیز فوائد اور نجی زندگی کی نہایت متبرک سخاوتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام امریکی شعار سے ملتے جلتے ہیں اور فی الواقع یہ تمام حقیقی عمدہ صفات ہیں کیونکہ برطانیہ کی مرفہ الحالی کی گہری بنیادیں وہاں کے لوگوں کے اخلاق پر رکھی گئی ہیں۔ اور اوپر کی عمارت کیسی ہی پرانی یا برائیوں سے لبریز ہو لیکن کچھ نہ کچھ مضبوطی بنیادوں میں ہے اور سامان بھی قابل تعریف ہے اور عمارت کی ساخت استوار ہے جو اس قدر عرصہ تک دنیا کے طوفان میں بغیر جنبش قائم رہی ہے۔

لہٰذا غصہ کے خیالات کو دور کر کے اور برطانوی مصنفین کی تنگ خیالی کا بدلہ لینے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ہمارے مصنفین کا یہ فخر ہونا چاہئے کہ انگریزی قوم کا ذکر تعصب کے بغیر اور رٹے شدہ دیانت کے ساتھ کریں۔ جبکہ وہ اُس بلا امتیاز تقلید کو ملامت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس سے ہمارے بعض ہموطن ہر اُس چیز کی جو انگریزی ہے محض اس خیال سے کہ یہ انگریزی ہے تعریف کرتے اور نقل کرتے ہیں ان کو آزادی کے ساتھ ظاہر کرنا چاہئے کہ کیا چیز واقعی پسندیدگی کے قابل ہے۔ اس طرح ہم کو انگلستان کو اپنے سامنے حوالہ کی ایک مستقل کتاب کی طرح رکھ کر استعمال کرنا چاہئے جس میں سالہا سال کے تجربوں کے عمدہ نتائج درج ہیں اور جبکہ ہم ان غلطیوں اور فضولیات سے اجتناب کریں جو کتاب کے صفحہ میں تحریر ہو گئی ہوں ہم کو اس سے عملی دانشمندی کے سنہری اصول اختیار کر لینے چاہئیں تاکہ ان سے ہم اپنے قومی شعار کو مستحکم اور خوبصورت بنا سکیں۔

رائے

۱۹۲۷ء کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب غفران مکاں کے ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم بھی حکیم صاحب علیہ الرحمۃ ڈاکٹر انصاری صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ یکایک موصوف کی نظر ہمارے اوپر آ پڑی (یہ دور بیٹھنے والے پر نظر جا پڑی کی ضد ہے آ پڑی) ہم نے فوراً ادب سے سلام عرض کیا تو اخا فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے فرمایا

"اجی یہ ہیں مُلا رموزی"

تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اٹھے اور ہم سے مصافحہ فرمایا (حالانکہ موقع معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ

"ہم تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ آج آپ کی صورت بھی دیکھلی"

ہم یہ سمجھے کہ اوہو اب تو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے پیام مشرق اور مثنوی وغیرہ سے بھی بڑھ گئے اور انکی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے کہ وہ جرمنی زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے ؟ مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز تردید بھی ہوگئی کہ۔ جرمنی میں مضامین پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ کہ زبان جرمنی۔ ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید توپڑی مگر ہم نے خود کو سنبھال کر فوراً رسالہ "جامعہ" کا تذکرہ شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان جتایا کہ

"ہم نے جامعہ کے علیگڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں جو اصطلاح میں" "معرکۃ الآرا کہلاتے ہیں"

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "مگر اب تو آپ نے جامعہ کو بھلا ہی دیا"

تو ہم نے بھی فی البدیہہ یہ عرض کیا "جامعہ تو اب بالکل ہی متین اور علمی رسالہ ہو گیا ہے، اور ہمیں متانت سے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے جتنی ہندوستانی پولیس والوں کو ہڑتالیوں سے"

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا! "آپ اپنے ہی رنگ میں لکھئے"

اس لئے بہ الفاظ اخبار "ریاست دہلی" ان اوپر کے حالات کی وجہ سے۔ جامعہ میں یہ عجیب مضمون پیش کرتے ہیں۔ خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر سے بچائے۔ کہ کہا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اس مضمون کا عنوان ہے "رائے"، اس سے مراد کوئی رائے بہادر یا رائے سینا دہلی نہیں جہاں سرجان سائمن ڈیڑھ ہے جاتے پڑے ہیں۔ بلکہ رائے سے مقصود قدرت کا وہ گراں منزلت انعام و عطیہ ہے جس پر انسانی عروج و ترقی۔ اصلاح و رہنمائی، امن و سلامتی کا بدارو انحصار ہے، اور اگر یہی چیز برطانوی پارلیمنٹ کو بھی روزی ہوتی تو وہ قیامت تک کمیشن کو ہندوستان نہ بھیجتی جس کی وجہ سے دن بھر اپنے شہروں کی دکانیں بند رکھی گئیں۔ ہمیں جہاں تک یاد ہے "رائے" اس فکری قوت کا نام ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نہایت درجہ صحیح اور مفید مشورہ دیتی ہے، اور جہاں تک علم ہے یہی وہ قوت ہے جس کے فقدان، کمی، یا۔ غلط روی۔ سے انسان پھر۔ دواخانہ یونانی دہلی ہی کا محتاج ہو جاتا ہے یا پھر اسے کچھ دن۔ کسولی۔ میں رہنا پڑتا ہے، انفرادی حیثیت سے رائے کی قوت انسان کے مزاجی اعتدال یا عمدہ تندرستی سے طاقتور ہوتی ہے اور اجتماعی حیثیت سے افراد ملک کی رائے اسی حالت میں صحیح رہ سکتی ہے جب وہ کسی جامعہ قومی کے تابع ہوں یا ان پر کسی منتظم حکومت کا احتساب ہو، بخلاف اس کے جن لوگوں کی صحت میں اعتدال نہیں ان سے یہ قوت سلب ہو جاتی ہے، اور اسی سے جنون پیدا ہوتا ہے اور وہ چند دن بھی کسی ایک رائے پر قابو نہیں پا سکتے یہی حال ان عام افراد کی رائے کا ہوتا ہے جن پر انکی قومی حکومت کا احتساب نہیں ہوتا۔

رائے کی اصابت اور پختگی کا ایک ذریعہ اعلیٰ تعلیم و تربیت بھی ہے مگر یہ اپنے ہندوستان کا بی۔اے یا ایم۔اے پن نہیں کیونکہ اس سے تو صرف انگریزی زبان بولنا اور لکھنا آجاتا ہے (یہ ایم۔اے پن جلا ہا پن کے وزن پر ہے) بخلاف اس کے جن لوگوں کو اپنی قومی حکومت حاصل نہیں اُن کی رائے میں اصابت اور پختگی نہیں ہوتی، ہر شخص اپنی اینٹوں والی مسجدوں میں نمازیں پڑھنے کا طالب نظر آتا ہے اور ایسی ہی قومیں ہوتی ہیں جو عروج و ارتقا اور وحدت و جامعیت کا کبھی منہ نہیں دیکھ پاتیں۔ اور اُن میں ہمیشہ افتراق و برہمی موجود رہتی ہے۔ لیکن تم ترکی جامعہ قومی یا جامعہ ایران پر ایک نظر ڈالو جہاں مصطفےٰ کمال پاشا اور شاہ رضا خاں کی ایک آواز پر وہاں کے بڑے بڑے ارباب رائے بغیر کسی اختلاف و تردید کے آمادہ عمل ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے رہنمائے اعظم کے خلاف اپنی کوئی علیحدہ رائے ہی نہیں رکھتے، لیکن ایک اپنا ہندوستان بھی ہے جس کے اندر آج ۳۳ کروڑ افراد کی ۳۳ کروڑ قسم کی رائے بھی ہیں، جہاں ہر شخص مختار ہے کہ جب چاہے کانگریس۔ مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء۔ ہندو مہاسبھا۔ وغیرہ سے کنارہ کشی کرلے یا لیڈروں میں سے کسی کا مخالف ہو جائے۔ پس اس اختلاف رائے کے اسباب یہ ہیں:-

(۱) کوئی قومی احتساب و سزا نہیں جس کے خوف سے افراد کی رائے ایک متحدہ مرکز عمل کی تابع رہ سکے۔

(۲) صحیح تعلیم و تربیت نہیں جو اُن کو ایک متحدہ مرکز کے تابع بنائے رہے۔

(۳) قوم کے سامنے خود لیڈروں کا کوئی متفقہ مقصد نہیں۔ گویا خود لیڈروں کی بھی کوئی رائے نہیں۔

(۴) قوم کی صحت یقیناً معتدل نہیں، اور اُس میں امراض یا آلام کو کثرت سے دخل ہے جس کے اثر سے اُنکے دماغ معطل نہیں تو متاثر ضرور ہیں۔

(۵) جن لوگوں کی صحت اچھی ہے جو تعلیم یافتہ بھی ہیں اور جو صحیح رائے قائم کرنے کے اہل بھی ہیں اُن پر بھی کوئی سزا یا احتساب عائد نہیں۔ لہٰذا اُنکی رائے بھی صحت کے اعتبار سے ناقص اور

بعض مواقع پر غلط ہوسکتی ہے، جیسے ہندوستانی لیڈر جن کے اعمال پر کوئی گرفت دپرسش نہ
بخلاف اس کے مغربی ممالک میں ایسے آزاد رائے رکھنے والے لیڈر ہلاک کردئے گئے ہیں
نے اظہار رائے میں غلطی کی لیکن ہندوستان میں مذکورہ غلطیاں یا کمزوریاں موجود ہیں

نپولین بوناپارٹ کے متعلق ایک نہایت پرانے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ جب وہ کسی ا
کو ظاہر کرنا چاہتا تھا تو ایک کھلے میدان میں اکڑ کر کھڑا ہوجاتا تھا، پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر گر
کو سینہ کی طرف جھکاتا تھا اور کئی گھنٹہ سوچا کرتا تھا، پھر جو رائے وہ اس غور کے بعد قائم
تھا اُس پر شدت سے عمل کرتا تھا۔ لیکن دنیائے انسانیت کے مصلح اعظم حضور اقدس داعی
محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم نے بتلایا تھا کہ تم اپنی قائم کی ہوئی رائے پر دوسرے
ذی شعور لوگوں سے رائے لیلو تاکہ اُس کی پختگی پر تمہیں کامل اعتماد ہوجائے اور اسی کو اصطلا
میں مشورہ، کہا گیا تھا، اور حضور اقدس علیہ السلام کے اس حکمت فروز کلمہ ہی سے اس امر کا
اندازہ ہوسکتا ہے کہ "رائے" کس درجہ ذمہ دارانہ یا اہم قوت کا نام ہے جس کے لئے اس قدر
اہتمام کی ضرورت ہے لیکن ہندوستان میں یہ کچھ بھی نہیں بلکہ یہاں کا کم سن، کم علم اور ناوا
طالب علم بھی کانگریس اور جمعیتہ علمار کے اعمال واحکام پر رائے دے سکتا ہے اور اس وہ ا
ساتھیوں کو بھی متاثر کرتا ہے، بس اخبار کا پڑھ لینا آگیا کہ رائے کی تمام ذمہ داریاں گویا آئینہ
ہوگئیں اور حق یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے بھی فکری آزادی یا آزادئ رائے ہی جو ہندوستا
کی ہر اجتماعی تحریک کی بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے اب ذیل میں ایسے آزاد راسے طبقا
کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

علمائے کرام۔ مسلمانوں کے اعتقادی نقطہ نظر سے بھی وہ مقدس و محترم طائفہ ہے جس کی
رائے پر مسلمانوں کی جملہ تحریکات کا مدار رہتا ہے اور اسی طرح از روے ضوابط اسلامی بھی وہ طبقہ
ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہے لیکن مجھے جرأت سے کہنے دیجئے کہ اس محترم طبقہ

میں رائے کی ذمہ داری کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ گو ایسے بھی قابل احترام علماء موجود ہیں جو رائے کی ذمہ داری کو بطریق احسن محسوس فرماتے ہیں لیکن ایسے بیدار مغز علماء کی تعداد کم ہے، اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی متعدد جماعتیں ہیں جو ایسے علماء کرام کے تابع غیر اصول بلکہ تباہ کن زندگی میں مبتلا ہیں جو اپنی رائے کی ذمہ داری کو محسوس نہیں فرماتے، اور جو اجتماعی اور انفرادی رائے کے فرق اور اثر سے بے خبر تو کیا بے پرواہ ہیں، جہاں کوئی اجتماعی تحریک رونما ہوئی اور علمائے کرام میں اظہار رائے کا مجادلہ شروع ہو گیا جس نے جو چاہا کہہ دیا۔ ہاں علیگڑھ، اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ کالج لاہور کے مسلمان طلبہ کے لئے انکے انگریزی لباس کے لئے انکی مذہبی ناواقفیت کے لئے انکے انگریزی اخلاق و آداب کے لئے جس قسم کی رائے چاہے دیدیجائے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ علمائے کرام اپنی رائے اُن مسائل کے خلاف بھی ظاہر فرماتے ہیں جو مجلس مرکزی یعنی جمعیۃ عالیہ علماء ہند کی متفقہ رائے ہوتی ہے اور علماء محترم کا ایسا آزادانہ اختلاف بھی حقیقت میں کسی قومی یا ریاستی احتساب کے فقدان کا نتیجہ ہے، اور ہندوستان میں تو اختلاف رائے نے عقائد تک متاثر کر کر جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اکثر انہی لیڈروں کے جلسوں میں لٹھ لیکر گھس جاتی ہیں جن کے مظاہرے سلطان ابن سعود کی مخالفت میں کثرت سے دیکھے گئے۔

لیڈروں کی رائے۔ جب سے مسلمانوں نے علوم دین کی تحصیل و تعلیم بغیر انگریزی تعلیم پر اکتفا کر لیا اسوقت سے یہ قابل نفرت اور نقصان رساں خیال مسلمانوں میں جڑ پکڑ گیا کہ۔ دین اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں اور یہ سمجھ لینے کا سبب بھی اسلامی حکومت کا فقدان تھا۔ گو یہ خیال ابھی ہندوستان میں جرأت سے ظاہر نہیں کیا جاتا لیکن غیر دینی تعلیم نے اس خیال کو راسخ ضرور کر دیا ہے اور یہ غیر محسوس رفتار سے پوری سرعت سے ترقی کر رہا ہے، اور بعض معاملات میں عملی صورت بھی اختیار کر چکا ہے، ورنہ علماء کرام کے بعد لیڈر کوئی دوسری چیز نہیں تھے، لیکن بے دینی کا اثر ہے کہ آج علماء مکرم اور لیڈر دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ شرعی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کی ذمہ داری ایک ہی ہے۔ بہر حال لیڈر کی رائے بھی بڑی قیمتی شے ہے اور رائے جس قدر بہ مضبوط

اور صائب ہونا چاہئے وہ ظاہر ہے اور یہ صرف اجتماعی حیثیت سے ورنہ انفرادی حیثیت سے تو آج تمام ہندوستانیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کہدیں کہ صبح سویرے بغیر انگریزی چائے کے ڈکار لینا بھی حرام ہے۔ یا ہم کہدیں کہ ہندوستانیوں کا موجودہ کثرت کے ساتھ چائے پینا بھی مغربی لوگوں کی تمدنی یا معاشرتی غلامی ہے۔ پس اجتماعی حیثیت سے ملک کے موجودہ لیڈروں کی رائے آج جس درجہ ارزاں اور اختلاف افزا ہوا کرتی ہے ظاہر ہے ان حضرات میں اختلاف رائے کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مقابل کی اتباع کو برداشت نہیں کرسکتے اور اس سے اُن کے مزاج یا صحت کے غیر معتدل ہونیکا علم ہوسکتا ہے، یقین نہ ہو تو قبلہ کرم حکیم محمد احمد صاحب کو نبض دکھاکر معلوم کرلیجئے، اسی طرح اظہار رائے میں جو عجلت اس طبقہ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے وہ بھی لیڈری کی ذمہ داری کے منافی ہے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام میں ذہنی استعداد نہونے کے باعث اس اختلاف رائے کو بھی اُسی طرح قبول و اختیار کیا جاتا ہے جس طرح علماء کرام کی جماعتوں میں دکھایا گیا ہے، اور یہ لیڈروں کے اختلاف رائے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں بے شمار انجمنیں اور کانفرنسیں نظر آتی ہیں جو کسی صحیح مرکز سے وابستہ نہیں، ورنہ اصولاً ہونا یوں چاہئے تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں جمعیۃ علماء سے وابستہ ہوتیں کہ ہر اعتبار سے یہی مجلس مسلمانوں کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہوسکتی ہے، اور مجلس خلافت مجلس تبلیغ، اور مسلم لیگ اس کی شاخیں سمجھی جاتیں، اسی طرح ہندو بھائیوں کے ہاں، ہندو مہا سبھا کو مجلس اعلیٰ بنایا جاتا اور اسکا اقتدار، شدھی سبھا، آریہ سبھا، ہندو آدی سبھا، اور گؤ رکھشا وغیرہ پر ہوتا، لیکن ایسا جو نہیں ہورہا وہ اسی لئے کہ لیڈروں کی رائے پر بھی کوئی احتساب و سزا نہیں یہ ہر جگہ لفظ سزا کے معنی آپ بعبور دریائے شور والی سزا نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس سے مقصد اعمال کی پرسش یا گرفت ہے، یا خوف پرسش، مثلاً یہ جو انگریزوں کے خلاف باغیانہ مضامین لکھنے میں ہم انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں سو اسی لئے کہ کہیں ذرا سی غلطی پر کوتوال صاحب ہم سے ملاقات کو نہ آجائیں یا لالہ لاجپت رائے کوئی باغیانہ کتاب لکھنے میں جو تامل کرتے ہیں سو اسی لئے

کہیں جلاوطنی کا معاملہ پھر شروع ہو جائے۔ لیکن انگریزوں سے بے خوفی اور عدم پرسش کی آزادی دیکھنا ہو تو اپنے مولانا محمد علی و شوکت علی مد فیوضہم کو دیکھ لیجئے کہ جو انگریزوں کے خلاف یہی لکھتے رہتے ہیں کہ۔

"ڈرنا بر حق نہیں مرنا بر حق ہے"

غرض لیڈروں کی رائے کی ذمہ داری خود لیڈروں کے ذہن میں نہیں اور اسی لئے ملک بے شمار جماعتوں پر تقسیم ہو چکا ہے۔

ایڈیٹروں کی رائے ۔ علماء کرام اور لیڈروں کے بعد ایڈیٹروں کی جماعت ہے جس کی رائے اجتماعی حیثیت سے بے حد عظمت و اثر کی مالک ہے ورنہ انفرادی حیثیت سے تو اپنے پیشہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی زندہ ہیں، پس اس جماعت کی رائے میں بھی بے حد اصابت، وحدت، اتباع اور سنجیدگی کی ضرورت تھی لیکن اس جماعت میں تعلیم و تربیت کے نقائص زیادہ کار فرما ہیں اور کوئی ایڈیٹر نہیں جو کسی دوسرے اخبار کی پختہ اور صحیح رائے کی اتباع کو پسند کرتا ہو اور اسی لئے اسلامی جرائد کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں، بلکہ الٹی ترکیب یہ اختیار کر لی ہے کہ بجائے رہنمائی کے عوام کے ذوق کی پیروی کرتے ہیں اور جو کبھی اظہار رائے کا موقع آجائے تو پھر اس کثرت سے رائیں شائع ہوتی ہیں کہ اُن سے " باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شروانی" ہزاروں کتابیں شائع کر سکتے ہیں، اسی طرح اظہار رائے میں انتہائی عجلت سے کام لیا جاتا ہے گویا اخبار کا مقصد ہی یہ ہوا کہ اگر وہ روزانہ ہے تو روزانہ ایک نئی رائے کے اشاعت بھی اخباری فرض ہے اور یہ اسی بے اصول رائے زنی کا اثر ہے کہ ناظرین اخبارات میں بھی کسی اجتماعی رائے کی اتباع کی صلاحیت نہیں بلکہ خود ناظرین اخبارات میں بھی اہل الرائے ہونا ہر خریدار کے لئے ضروری چیز ہو گیا ہے اور یہ طے شدہ معاملہ ہے کہ اخبار کا ہر مضمون پڑھ کر اس پر اظہار رائے بھی کیا جائے جیسا کہ جنگ یورپ میں جرمنی فتوحات پر ناظرین اخبارات میں اظہار رائے ہوا کرتا تھا اور یہ اخبار بیں طبقہ ہی کی رائے تھی کہ جرمنی مصر کو فتح کر چکا اور قیصر جرمنی جمعۃ الوداع کی نماز جامع مسجد

کامل

دہلی میں پڑھے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہوچکا ہے، اس وقت ہم نے بھی رائے دی تھی کہ دیکھا قیصر جرمنی مسلمان ہونے کے بعد اگر مرید ہوگا تو اپنے خواجہ حسن نظامی کا ورنہ وہ بے پیرا ہی پھرتا رہے گا اس بے راہ روی اور فکری آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اخبار نویسوں اور اخبار بین حضرات کی رائے میں وحدت نہیں، اور یہ بھی نتیجہ ہے عدم احتساب کا۔

ہماری رائے ۔ اس معاملہ میں جہانتک تجربہ ہوا ایس ایک ہم بہت محتاط انسان ہیں، قوم تو قوم انفرادی حیثیت سے بھی ہم کبھی اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے اور اس کے "جملہ حقوق بحق جمعیۃ العلماء" محفوظ رکھتے ہیں، اسکا بڑا فائدہ تو یہی دیکھا کہ آجتک ہم قوم کی نظر میں "بے وقوف قرار نہ پائے" اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خدا کے بے گناہ بندے ہماری رائے کی غلطی سے محفوظ رہے۔ مگر وہ جو فارسی زبان میں کہا ہے ؎

خدا پنج انگشت یکساں نکرد

سو ہمارے دوستوں میں ایک دوست مولوی سید محمد عسکری وکیل مصطفےٰ آبادی بھی ہیں جو علاوہ ایک بے مثل قانون داں ہونے کے "اہل الرائے" بھی ہیں، وکیل صاحب آج کل ریاست بھوپال میں وکالت کرتے تشریف لے گئے ہیں مگر ایک زمانہ تھا جب آپ کو علامہ شبلی اور اکبر الہ آبادی کے قریب تر بیٹھنے کا فخر حاصل تھا اور ممدوحین مغفور کی یہ انہی علمی، ادبی، تاریخی، و معاشرتی صحبتوں کا ماہوار اثر ہے کہ وکیل صاحب موصوف کو ہم سے اس وقت سے محبت ہے جب ہماری افلاس کی وجہ سے امیر آدمی ہماری عزت ذرا کم کیا کرتے تھے۔ مگر وکیل صاحب اس وقت بھی ہمارے پاس یہ کہکر تشریف لاتے تھے کہ

ملا صاحب!

"جس طرح ارباب ذوق و اصحاب علم و فضل علامہ شبلی اور اکبر کی خدمت میں کسب فیض کے لئے جاتے تھے میں بھی اسی حیثیت سے آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں"

وکیل صاحب کے اس خیال میں ایک بات مطلب فائدے کی بھی تھی یعنی وہ خود کو پہلے

ہی سے ارباب ذوق و اصحاب علم و فضل کے ہم پایہ سمجھکر ہمارے پاس آتے تھے۔ وکیل صاحب کا دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ میں علاوہ قانون دانی کے مذہب اور سیاست دانی میں بھی فرد ہوں گویا گاماں پہلوان سے لڑنے والے زبسکو بھی ہیں جو وکیل تھا اور پہلوان بھی، غرض وکیل صاحب کی ملاقات کا خلاصہ یہ ہوا کرتا تھا کہ ہر بات کے شروع میں وہ فرماتے تھے کہ

"مگر میری رائے میں تو کانگریس کا وجود ہی بے کار ہے"

تو ادھر ہر بات کے خاتمہ پر ہم فرماتے تھے کہ

"جی ہاں مگر میری رائے میں بھی یہ اسلامیہ کالج قوم کی ذہنی حالت کو تباہ کرنے والے ہیں اور میری رائے میں اخلاق و مذہب تو ان کالجوں کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے"

غرض لفظ "میری رائے میں" کا ہم دونوں اس کثرت سے استعمال کرتے تھے کہ ایک دوسرے کو فضیلت اور فتح کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا تھا۔ مگر آخر میں وکیل صاحب نے ایک بصیرت افروز نکتہ یہ بتلایا کہ

"ملا صاحب!

"یہ جو کچھ اظہار رائے ہوتا ہے اسے صرف "خانگی" ہی رہنے دیجئے"

پہلے تو ہم نے کسی قدر غصہ سے اس "خانگی" پر غور کیا مگر فوراً ہی سمجھ گئے کہ وکیل صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی رائے کو صرف ایک ذاتی خیال سمجھے اور قومی و ملکی مسائل میں ہمیشہ اپنے لیڈروں اور اپنی ملکی و قومی مجالس کی رائے کو قابل اتباع سمجھے تاکہ قوم کے متفقہ اور اجتماعی مسائل میں افتراق و برہمی نہ پیدا ہو۔ مگر یہ تو ہوا اس لئے کہ ہم دونوں قابل ترین انسان تھے لیکن باقی ۳۳ کروڑ ہندوستانیوں کا کیا بندوبست ہوگا جو ہر ایک اپنی ذاتی رائے کے موافق اجتماعی مسائل میں رخنہ انداز ہوتا ہے ترکیب یہ ہے کہ جب تک سوراج نہ ملے اُس وقت تک قوم کے متفقہ فیصلہ کو اپنی تنہا رائے سے ٹھکرا دینے والوں کا مقاطعہ عرف "بائیکاٹ" کیا جائے جس کے خوف سے وہ

کسی متفقہ فیصلہ کے خلاف اپنی رائے ظاہر نہ کرسکیں اور جب سوراج مل جائے تو پھر ایسے لوگوں کے لئے وہی - وارنٹ - گرفتاری، حوالات، گالیاں، چانٹے، گھونسہ، بید، چالان، قید با مشقت بے نمک مرچ کا سالن - پھر بعبور دریائے شور اور آخر میں گلے میں باریک سا پھندا -

خدا ان سزاؤں سے ہمیں اور بڑے مولوی صاحب کو بچائے - آمین ضرورت ہے کہ قوم و ملک کے متفقہ فیصلوں پر پورے غور و احتیاط سے اظہار رائے کیا جائے اور بہتر یہ ہے کہ اتباع کی کوشش کیجائے -

---

یورپ اور ایشیا

اقتباسات

(۱)

عجیب اتفاق ہے کہ ایشیا اور یورپ کی تہذیبیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر غالب رہی ہیں۔ ایشیا اور یورپ مختلف دور میں اپنا کام کرتے ہیں، انکے مختلف خصائص ہیں۔ ایشیا کا میلان یورپ کی واقعیت کے خلاف عینیت کی جانب ہے۔ ایشیا نرم رو ہے یورپ تیز گام ایشیا کی مدت حیات یورپ سے زیادہ لمبی ہے۔ اس کی قوت سائنس میں ہے اُس کی مذہب میں۔ ہم زندگی پر بلا واسطہ نظر نہیں ڈالتے۔ اسکے مادی نتائج کے ذریعہ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔

زندگی اور فطرت اپنے اپنے طریق عمل میں مماثل ہیں یورپ اور ایشیا کی زندگی بھی، اپنے چشمہ حیات، اپنے اظہار نمو، اور اپنے رفتار ترقی اور موسم حرکت وحیات کے لحاظ سے بعض فطری مظاہر سے مشابہ ہے۔ یہ دو ندیاں ہیں، ایک اپنی حرکت وحیات کے لئے بارش کی منتظر رہتی ہے تو دوسری فلک بوس پہاڑوں کے برف کی۔

ایشیا کی زندگی کا منبع پہاڑ کی چوٹیوں پر، برفستان میں ہے، یہیں سے گرمیوں میں ندی بہہ نکلتی اور سرزمین کی سرسبزی کا باعث ہوتی ہے ایشیا کی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے جو پہاڑ کی بلندی کے برف کی مثال، آسمانوں سے قریب تر، مصفا اور پاکیزہ ہے۔ جاڑوں میں یہاں خزاں ہوتی ہے گرمیوں میں بہار۔ زندگی کی لہر یہاں سے بہتی اور تمام نواح کو شاداب بناتی ہے جاڑوں میں یہ چشمہ بند ہو جاتا ہے، ایشیا اس موسم میں برف کا پہاڑ ہے۔ یہ اپنے بہار (گرمی) میں بھی بہت نرم رفتار ہے اور دیکھنے والوں کو اپنے سکون کا یقین دلاتا ہے،

یورپ کی زندگی بارش کی ایک منتظر ندی کی سی ہے۔ وہاں ایشیا کی طرح برف کا کوئی خ

موجود نہیں۔ بادل امنڈ امنڈ کر آتے اور زمینوں کو ہرا بھرا چھوڑ جاتے ہیں۔ یونان اٹھتا ہے تو مصر آرٹ اور علم حکمت کی بارش کر دیتا ہے۔ یونان اپنے علم و حکمت کا وارث روما کو بناتا ہے احیائے علوم ہوتے ہی تو یورپ قدیم لازوال موتی برس پڑے یورپ کی زرخیز زمین میں یہ بیج کو پلیں لائے۔ اور سائنس کی ایک عمدہ فصل تیار ہو گئی۔ لیکن وہی پانی جنے کھیتی کو سیراب کیا اب اس کو بہالیجانا چاہتا ہے۔ گرمیوں میں ندی اپنے منبع پر خشک ہو کر ایک ساکن چشمہ یا پرنالہ بن جاتی ہے عہد وسطیٰ میں یورپ پر یہی کچھ گزرا بعض مفکرین کے نزدیک بارش اور طغیانی کے بعد یورپ کا یہی حشر ہونے والا ہے۔

اس وقت یورپ اور ایشیا بہت سی باتوں میں باہم مختلف نظر آتے ہیں، یورپ ایک وحدت رکھتا ہے جو ایشیا میں نہیں لیکن بہار میں جو گرمی کا موسم ہے ایشیا حیات کا ایک دل اور لبریز چشمہ ہوتا ہے۔ ہندوستان چین اور دوسرے ملکوں کا تمدن اتنا ہی مکمل اور حیات افروز اور اتنا ہی متنوع تھا اور اسی وحدت کے ساتھ جیسا کہ اب یورپ کا ہے۔

جاڑوں میں (ایشیا کی خزاں) یورپ ایک تیز بہنے والا دریا ہے۔ ایشیا اُس وقت ایک گلیشیر ہوتا ہے۔ گرمیوں (موسم بہار) میں بھی ایشیا آہستہ رو ہے۔ یورپ کا تمدن جب زندہ ہوتا ہے تو رفتار بہت تیز ہوتی ہے مگر ایشیا آہستہ آہستہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیا کی حرکت زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔

یورپ اور ایشیا حیات عالم کے مختلف موسم میں حرکت کرتے ہیں۔ تمثیل کی رو سے یورپ دنیا کی سردی (یا موسم برسات) میں حرکت پذیر ہوتا ہے، ایشیا دنیا کی گرمی (برسات نہ ہو) میں۔ ایشیا کی برف اُس وقت پگھلتی ہے جب زمین خشک ہوتی ہے یورپ کے دریا بارش کے موسم میں بہتے ہیں، ایشیا کے کینہ حرکت و خیال میں یورپ کی بہ نسبت زیادہ کچھ باقی رہتا ہے جب زندگی کی بہار جاتی رہی ہو، زمین پیاسی اور خشک ہو تو اُس وقت ایشیا کے پہاڑوں کے برف پگھلتے ہیں یہاں طلب و رسد، کا توازن قائم رہتا ہے۔ یورپ میں زمین ہی میں پانی موجود ہوتا ہے۔

بارش جتنی زیادہ ہو پانی کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے مگر یورپ کے دریا زیادہ پانی لیتے ہیں۔ اس سے یورپی تمدن طغیانی میں ہے۔ یورپی فاعلیت افراط سے خود اپنے لئے ایک خطرہ بنگئی ہے۔ ایشیا کی فاعلیت قابو کے اندر ہوتی ہے اور ایک انداز ے کے ساتھ۔ اسکا خطرہ اس کی قوت کی کمی ہے۔

(۲)

جنگ، جنگ کے نام نہاد ناگزیر اسباب اور اس کی ہولناکی پر آئے دن یورپ میں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جنگ عظیم سے قبل ہی یورپ میں اس مسئلہ پر بہت بڑا لٹریچر جمع ہو گیا تھا۔ اور اب اس پر نہایت تیزی کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے جرمنی، فرانس انگلستان میں آنے والی جنگ ایک عام موضوع گفتگو بن گئی ہے کیپٹن ہامان، برن ہارڈی وغیرہ جیسے مصنفین کے خیالات بحیثیت امور مسلمہ کے تسلیم کئے جاتے تھے، آخرالذکر کے اس قول نے کہ جنگ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے، ایک قانون فطرت ہے، جس سے مفر نہیں انگلستان میں فریڈرک ہیریسن، جیسی عافیت خواہ اور امن پسند شخصیت کو بھی آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیا تھا انہوں نے بھی آخری جنگ کے لئے برطانوی تیاریوں کو حق بجانب قرار دیا۔ جنگ کے خلاف کسی نے نہایت پرزور آواز بلند کی تو وہ مسٹر نارمن انجل تھے انہوں نے اپنی مشہور عالم کتاب "فریب عظیم" میں جنگ پر ایک نئے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی انہوں نے دکھلایا کہ جنگ ایک ناگزیر چیز ہے انکے نزدیک جنگ جن اغراض کو پیش نظر رکھکر کی جاتی ہے وہ ظفرمندی کے بعد بھی پورے نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اتحاد کے رشتے اختلاف کے رشتوں سے زیادہ استوار اور مستحکم ہیں۔ اور دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے چند نظریوں کے پیچھے وہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔ اشتراکیت، تحریک عمال، سرمایہ داری کی تحریکیں جو دن بدن بین الاقوامی رنگ اختیار کرتی جاتی ہیں جنگ کے انسداد میں سب سے بڑے حوائج ثابت ہونگی، نارمن انجل کی آواز، صدا بصحرا ثابت ہوئی اور یورپ جنگ عظیم کی آگ میں

--

کو دیڑا۔ جنگ عظیم جو تمام جنگوں کا خاتمہ کرنے والی تھی، ایک عرصہ ہوا کہ ختم ہو چکی۔ لیکن کیا آئندہ کے لئے جنگوں کا امکان بھی ختم ہو گیا؟ اسکا جواب خود مسٹر لائڈ جارج کی زبان سے جنہوں نے جنگ عظیم جیتی، نفی میں ملتا ہے۔ اور اس وقت ہم پھر ۱۹۱۴ء میں ہیں۔ یوروپ میں ہر طرف جنگ کے بادل امنڈ رہے ہیں۔ امریکہ کا بیس سالہ بحری پروگرام فضا کو اور بھی مکدر کر رہا ہے۔

یوروپ اور ایشیا میں روس برطانیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقاصد میں ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن ہیں۔ خصوصاً گزشتہ سال سے ان دو ملکوں کے تعلقات بہت نازک ہو گئے ہیں اور مستقبل قریب میں جنگ کا احتمال قوی تر ہے۔ بحیرۂ روم میں ایطالیہ موسیولینی کی قیادت میں جارحانہ اقدام کے لئے مضطرب ہے۔ فرانس اور ایطالیہ اس وقت دونوں رقیب ہو رہے ہیں، اتحاد اور جارحانہ اتحاد کا سلسلہ جاری ہے؛

اب تک یہ دو مستقل محاذ جنگ تھے، مگر جنیوا کانفرنس نے جو تخفیف اسلحہ کی غرض سے منعقد ہوئی تھی اور برطانیہ کی روش سے ناکام ہوئی، امن عالم کے لئے ایک تیسرا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ اب دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہو جانا چاہتا ہے، جس کو وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہے۔ اتحاد نسل، اتحاد زبان، یہ چیزیں امریکہ اور انگلستان کی دو عظیم الشان قوموں کو متحد کئے ہوئے تھیں لیکن اس کانفرنس نے بجائے اتفاق و اتحاد کے اختلافات پیدا کر دیے برطانوی مدبر علانیہ اعتراف کرنے لگے ہیں کہ مستقبل میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان جنگ ہونا ضروری ہے۔

امن عالم میں خلل انداز ہونے والے یہ تین خطرے ہیں، دیکھئے امن کے حامی اور شیدائی ان خطرات کو کیونکر دور کرتے ہیں۔

یوروپ میں اب پھر ان مسائل پر گفتگو ہونے لگی ہے۔ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ کہیں کوئی کسی ملک کو ملزم قرار دیتا ہے۔ کہیں کوئی کسی دوسرے کو۔ کوئی تخفیف اسلحہ پر زور دیتا ہے

کوئی انجمن الاقوام پر۔ ابھی حال میں لفٹننٹ کمانڈر کنیو ر ڈی نے اپنی کتاب "کیا تمدن مٹ جائے گا؟" میں اتحاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب جنگ میں خطرہ عارضی خلل کا نہیں رہا بلکہ اس کے مہلکات کا ہے، اس کی قیمت کا ہے جو فاتح اور مفتوح دونوں کو دینا پڑتی ہے۔ جنگ سے خطرہ اب صرف ملکوں اور قوموں کو نہیں بلکہ تمدن کو ہے۔ ہوا پر قابو پالینے کے ساتھ ہمیں جنگ پر بھی پوری فتح حاصل کر لینا چاہئے۔ دنیا کے سامنے اب جنگ اور امن کا سوال نہیں رہا بلکہ جنگ پر فتح پانے یا ہر اُس شے کی جو زندگی کو بامزہ بناتی ہے تباہی و بربادی کا سوال ہے۔ سائنس کی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ رقبۂ جنگ کی نامحدود توسیع خود جنگ کے خاتمہ کا اعلان ہے یا متمدن انسان کی تباہی کا۔ تمدن و تہذیب کی خاطر کسی بڑی طاقت کو قربانی کے لئے آمادہ ہو جانا چاہئے۔ اُسے چاہئے کہ تخفیف اسلحہ کے معاملہ میں خود اقدام کرے۔ اگر کسی بڑی طاقت نے یہ مثال قائم کر دی تو موصوف سمجھتے ہیں کہ تمدن شاید تباہی سے بچ جائے۔"

(۳)

یوروپ اور مذہب! دو متضاد چیزیں ہیں۔ مشرق میں زندگی کی جان مذہب ہے اور اس کے ہر شعبہ میں سمایا ہوا ہے۔ یوروپ میں لامذہبیت ہے۔ وہاں کے کسی موقر رسالہ یا کسی باوقعت اخبار کو اٹھا لیجئے، مذہب اور مذہب کی روح کا فقدان ہے اور وہ چیز جسے ہم مشرقی مذہب کہتے ہیں وہاں اگر ہے تو ایک بے کیف صورت میں ہے۔ مشرق میں مذہب کی بیجا دست درازی نے ترکی یا اور چند ممالک میں رد عمل کی ایک لہر پیدا کر دی ہے۔ یوروپ میں لامذہبیت نے طغیانی پیدا کر دی ہے اور اب وہاں نجات کا سہارا مذہب سمجھا جانے لگا ہے۔ یوروپ میں ایک جماعت اس فردوس گم گشتہ کی جانب لوٹنا چاہتی ہے۔ اسکا مذہب سیاست و معیشت ہے۔ اس تگ و دو میں ناکامی کے بعد اب یوروپ مذہب کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ برنارڈ شا نے اخبار کے نمائندے سے مذہب کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں مذہب کے بغیر نجات کا تخیل نہیں کر سکتا۔ مذہب سے ناآشنا اخلاقی حیثیت سے بزدل ہوتے ہیں۔ تمدن بھی اپنی آبیاری

کے لئے مذہب کا محتاج ہے۔ الوہیۃ کو خواہ ہم کسی نام سے تعبیر کریں، روح حیات، روح عالم، مبدا ارتقا کسی نام سے پکاریں۔ زندگی کو اگر ایک بے معنی سلسلہ اتفاقات کی لغویت سے بچانا ہے تو ہمیں مذہب کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ نجات کا تخیل صرف مذہب کے ساتھ ممکن ہے۔

بیسویں صدی ایک سائنٹفک صدی ہے یہ سچ ہے کہ اس صدی میں ایک سائنٹفک مذہب کی ضرورت ہے۔ (ارتقائے تخلیقی) اس قسم کا ایک مذہب ہے اور مسٹر شا کہتے ہیں میرا مذہب یہی ہے۔ ارتقا ایک سلسلہ خفی اور ڈاروینیت ایک میکانکی نظریہ ہے جس نے مذہب اور اسکی روح کو فنا کر دیا۔ تعمیر کے میدان میں ڈاروینیت ناکام رہی۔ اس نے اخلاقی اور سیاسی (وقت پرستی) کو علمی رنگ دیدیا اور کل ہی ہم نے دیکھ لیا، یوروپ عالمگیر جنگ کی مصیبت میں گرفتار ہو گیا، یوروپ سائنٹفک مذہب کی تلاش میں کہاں تک کامیاب ہوگا خود اُس کی صداقت و دیانت پر منحصر ہے۔ کامیابی کی ضمانت صدق طلب ہے۔ یوروپ کی عام ذہنیت ابھی بدلی نہیں، وہ کوئی تبدیلی چاہتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ موجودہ حالت سے بیزار ہے اور در اصل تمام انقلابی خواہشات کے لئے یہ موجودہ بیزاری لازمی شے ہے۔ یوروپ نے مذہب کی سچی مسرت کو ابھی محسوس نہیں کیا۔ مگر یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یوروپ میں ایسے افراد موجود ہیں، جو ایک حد تک اس سے آشنا ہیں، اور اپنی اپنی جگہ پر اس مذہب کی جستجو و تلاش میں مصروف ہیں۔

ہندوستانی یا غیر برطانوی کے ساتھ ساتھ اب انگریز اہل قلم بھی، ہندوستان میں مروجہ طرز تعلیم کے نقائص کا علانیہ اعتراف کرنے لگے ہیں۔ ذریعہ تعلیم، مدت تعلیم، اور اُس کی قیمت (صحت اور روپیہ) یہ کھلے ہوئے چند موٹے موٹے عنوان ہیں جن کے تحت میں انہیں جمع کیا جا سکتا تھا مگر خوش قسمتی سے یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمدنی حیثیت سے بھی یہ تعلیم سراسر غیر مفید ہے۔ ایک منصف مزاج مصنف نے ہندوستان کے تعلیمی حالات کا گہرا مطالعہ کرنیکے بعد مندرجہ ذیل پانچ امور پر خاص طور پر توجہ دلائی ہے۔ موصوف نے نقائص کے ذکر کے ساتھ ہی چند مناسب تجویزیں

بھی پیش کی ہیں جن پر کاربند ہو کر حکومت، ملک کو بہت فائدہ پہونچا سکتی ہے۔

(۱) ہندوستان میں ہماری تعلیم نے چند مادی وسیاسی فوائد تو پہنچائے ہیں مگر تمدنی وتہذیبی ترقی میں بجائے معاون ہونیکے حارج ہو رہی ہے۔ بے شبہ ہندوستان میں علم کی رفتار تو بڑھ گئی۔ مگر کیا ہم نے زندگی کو پر لطف بنانے کے لئے بھی کوئی سعی کی؟

(۲) ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش اور اسکا بہاؤ مشرق ومغرب کی زندگی اور طرز خیال کے اتصال کے خلاف ہے۔

(۳) تعلیم مذہب سے علحدہ ہو کر دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ نہیں پائی اور نہ معاشرتی اصلاح کی تحریک میں مدد ہو سکی۔

(۴) اعلیٰ تعلیم کو جہانتک ہو سکے، حکومت کے اثر واقتدار سے بالکل آزاد ہونا چاہیے ابتدائی تعلیم اور خصوصیت کے ساتھ عام تعلیم حکومت اپنے ہی ہاتھ میں لے۔ اس معاملہ میں اقدام حکومت کی جانب سے ہونا چاہیئے۔

(۵) ہندوستان کو بلاسرکاری واسطہ کے، انگریز ماہرین تعلیم کی ضرورت ہوگی اور بالخصوص مستقبل میں ہندوستانی اس ضرورت کو بہت محسوس کرینگے۔

صاحب موصوف کے یہ خیالات بیشتر درست ہیں ماہرین تعلیم کی ضرورت سے کس کو انکار ہے ہر تعمیر نو میں ایک نئی ابھرنے والی قوم کے لئے اس قسم کے خارجی امداد ومعاونت کی ضرورت ظاہر ہے۔ رفتار زمانہ کے دوش بدوش چلنا، صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے۔ ہندوستانی یقیناً نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کے تمام ملکوں سے اس قسم کے مشاورت کا رشتہ قائم کرنیکے لئے آمادہ ہونگے

ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش سے متعلق انکا خیال ایک حد تک بالکل صحیح ہے اور یہ لازمی نتیجہ ہے اس کوشش کا جو ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے ماضی سے نفرت پیدا کرنیکے لئے عمل میں لائی گئی۔ اور انہیں اسپر متعجب بھی نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ تعلیم نے ہندوستانیوں کی تہذیب وتمدن کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا، قومیت خود ایک

تمدنی مظہر ہے، ہمارے خیال میں جس چیز کو وہ قومیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ قومیت نہیں بلکہ "نفرت" ہے۔ ہر تمدنی بیداری کی طرح قومیت کی تعمیر بھی تعلیم ہی سے ہوتی ہے۔ ہندوستان قومیت سے بیگانہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے اس کی نشوونما میں حصہ نہیں لیا۔ امریکہ میں اول وقت سے تعلیم نے قومیت کی تعمیر میں بنیادی حصہ لیا ہے۔ فرانس اور جرمنی میں اسی طرح ہوا ہے۔ تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ ہے جو قوم میں تمدنی احساس پیدا کرا سکتا ہے۔ ہمارے مروجہ نظام تعلیم نے کبھی اُس بلند تمدنی مظہر کو جو قومیت کہلاتا ہے، نہیں چھیڑا۔ ہماری ضرورت ایک فلسفۂ وطنیت تھی۔ تعلیم و عمل کی ایک بانگ درا جو ہمیں دنیا کی حرکت حیات میں پورا پورا حصہ لینے کے قابل بناتی۔ ہمارے مدارس و کالج کو معاشرتی معمل ہونا چاہئے، ہندوستان میں ساری خرابی شروع سے یہ رہی ہے کہ تعلیم کے مفہوم ہی کو نظر انداز کر دیا گیا، ہونا یہ چاہئے تھا کہ انفرادی و اجتماعی مفاد کے مفروضہ تناقض دور کرنے کی کوشش کی جاتی، تعلیم تو دراصل اس کوشش کا نام ہے جو اجتماعی و انفرادی مفاد میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا چاہتی ہے اور یہ کوشش سرے سے یہاں مفقود ہے اس لئے قومیت کا ہونا معلوم۔ اس مخالفانہ روش کی شکایت بجا ہوتی اگر حکومت نے اس چیز کی پرورش میں حصہ لیا ہوتا۔ یہ احساس کہ قومیت خود ایک بڑے کل انسانیت کا جزو ہے، بعد کی چیز ہے۔

انجام بخیر

مصنفہ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

در ۱۸۲۱ء

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں بی۔ اے، کیمبرج، سابق متعلم جامعہ

ولاڈی میئر میں ایک نوجوان سوداگر رہتا تھا، جس کا نام تھا آئیوں ڈمٹرچ ایکسایاناف، اُسکی دو دکانیں تھیں اور ایک رہائشی مکان۔

ایکسایاناف حسین تھا، بال اُس کے بھورے رنگ کے تھے، اور گھونگر والے، اور طبیعت بشاش ہر وقت گاتے رہنے کا اُسے بہت شوق تھا۔ عنفوان شباب میں اُسے شراب خوری کی لت رہی تھی، اور جب بہت وہ مخمور ہوتا تو الھڑپن کی باتیں کرتا۔ شادی کے بعد اُس نے شراب خواری چھوڑ دی، پھر بھی کبھی کبھی "روز ابر و شب ماہتاب میں" پی لیا کرتا تھا۔

گرمیوں کے موسم کا ذکر ہے وہ ایک روز ازنی کے میلے کو چلا۔ جب وہ بیوی کو الوداع کہہ رہا تھا تو وہ بولی "آئیوں ڈمٹرچ، آج روانہ نہ ہو، میں نے تمہاری بابت بُرا خواب دیکھا ہے۔"

ایکسایاناف ہنسا اور کہنے لگا "تمہیں ڈر ہے کہ میں جب میلے پہونچا تو خوب شراب پیوں گا"

اس کی بیوی کہنے لگی "یہ میں خود نہیں جانتی کہ ڈر کا ہے کا ہے، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے بُرا خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ شہر سے جب تم لوٹے اور تم نے اپنی ٹوپی اتاری تو تمہارے بال سب کے سب سفید ہو چکے تھے۔"

ایکسایاناف ہنسا، اور بولا "یہ تو نیک فال ہے، دیکھ لینا میں سارے کا سارا مال بیچ آؤں گا

اور تمہارے لئے میلے سے تحفے لے کر لوٹوں گا ،،

اپنے گھر والوں کو الوداع کہتا ہوا ، وہ میلے کو چل دیا ،

جب وہ نصف راستہ طے کر چکا تھا ، تو وہ ایک سوداگر سے ملا جسے وہ جانتا تھا ، اور وہ دونو رات بسر کرنے کے لئے ایک ہی سرائے میں مقیم ہوگئے ، پہلے تو انہوں نے ساتھ ساتھ چائے پی ، پھر وہ دو کمروں میں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جا کر سو رہے ۔

ایکسایانف کو دیر تک سونے کی عادت نہ تھی اور اس خیال سے کہ سویرے سویرے سفر طے ہو جائے ، اُس نے طلوع آفتاب سے پیشتر ہی اپنے کوچبان کو جگا کر گاڑی جوتنے کا حکم دیا ۔

پھر سرائے کے مالک کی جھونپڑی کی طرف گیا جو سرائے کے پیچھے تھی اور اسکا حساب چکا کر روانہ ہوگیا ۔

جب وہ کوئی پچیس میل جا چکا تو گھوڑوں کو دانا کھلانے کے لئے اُس نے گاڑی کو رکوایا ، خود ذرا دیر سرائے کی ڈیوڑھی میں بیٹھا ، پھر برامدے کیطرف جا کر سرائے کے خادم کو ایک سماوار میں چائے گرم کرنے کا حکم دیا اور اپنی سارنگی نکال کر بجانے لگا ۔

اچانک ایک تین گھوڑوں والی گاڑی جس کے گھنگھروں کی جھنکار دور سے سنائی دیتی تھی ، آموجود ہوئی اور اُس میں سے ایک افسر برآمد ہوا جس کے پیچھے پیچھے دو سپاہی تھے ، وہ ایکسایانف کے پاس آیا اور اُس سے سوال کرنے شروع کئے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو ، ایکسایانف نے ہر سوال کا معقول جواب دیا اور یہ بھی کہا " میرے ساتھ چائے نہیں پیجیئے گا ؟ ،،

لیکن وہ افسر پھر بھی سوال کرتا رہا اور اس نے پوچھا " گزشتہ شب تم کہاں تھے ؟ ،، " تم اکیلے تھے یا کوئی اور سوداگر بھی تمہارے ساتھ تھا ؟ ،، " تم نے اس سوداگر کو آج سویرے دیکھا یا نہیں ؟ ،، " تم اتنے سویرے کیوں سرائے سے چلدیے ؟ ،،

ایکسایانف حیرت میں تھا کہ اُس سے یہ سوال کیوں پوچھے جا رہے ہیں ، لیکن اُس نے جو جو کچھ ہوا تھا پورا پورا کہہ دیا اور پھر ساتھ ہی اس بات کا بھی اضافہ کر دیا " آپ مجھ سے اس طریقہ

سے کیوں سوال کرتے ہیں، کیا میں کوئی چور یا ڈاکو ہوں؟ میں اپنے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کو مجھ سے اس طرح جواب سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔

پھر افسر نے سپاہیوں کو بلا کر کہا "میں اس ضلع کا پولیس افسر ہوں، اور میں تم سے جواب سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ جس سوداگر کے ساتھ رات تم تھے اُس کا گلا کاٹا گیا ہے۔ ہم تمہاری تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

وہ مکان کے اندر چلے گئے، سپاہیوں اور پولیس افسر نے اکسیا یانا ف کا اسباب کھولا اور اُس کی تلاشی لینی شروع کر دی، اچانک افسر نے ایک تھیلے میں سے ایک چھرا نکالا اور چلا کر پوچھنے لگا "یہ چھرا کس کا ہے؟"

اکسیا یانا ف نے ادھر نگاہ دوڑائی، اور جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے تھیلے سے ایک خون آلودہ چھرا نکالا ہے تو وہ ڈر کے مارے سہم گیا،

"اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ چھرا خون آلودہ ہے"

اکسیا یانا ف نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، ہکلا ہکلا کر اس نے جواب دیا "م۔ مجھے تو م۔ مع ۔۔ معلوم نہیں۔ م۔ میرا نہیں"

پھر پولیس کے افسر نے کہا "آج سویرے سوداگر اپنے بستر پر مقتول پایا گیا، سوائے تمہارے کسی پر اس جرم کا شبہ نہیں ہو سکتا، گھر کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا، اور وہاں تھا بھی کوئی نہیں، یہ خون آلودہ چھرا بھی تمہارے ہی سامان سے نکلا ہے، اور تمہارے چہرے اور تمہارے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ مجرم تم ہی ہو، یہ تو بتاؤ تم نے اُسے مارا کس طرح اور روپیہ کتنا چرایا؟"

اکسیا یانا ف نے ہزاروں قسمیں کھائیں کہ میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ چائے پینے کے بعد سوداگر کو دیکھا تک نہیں۔ اُس نے کہا کہ میرے پاس سوائے آٹھ ہزار روبل (سولہ ہزار روپیہ) کے جو میرا ذاتی ہے اور کوئی روپیہ نہیں اور نہ یہ چھرا میرا ہے" لیکن اُس کی آواز میں لکنت آ گئی تھی، اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، اور وہ ڈر کے مارے کانپ اس طرح رہا تھا جیسے وہ سچ مچ مجرم ہو۔

پولیس کے افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ایکسا یا ناف کی مشکیں باندھ کر اُسے چھکڑے میں ڈال دیں، جب انہوں نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کے اُسے چھکڑے میں پھینکا تو ایکسایا ناف کو خدا یاد آگیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اسکا روپیہ اور مال اسباب اُس سے چھین لیا گیا اور وہ قریب کے شہر میں لیجا کر قید کر دیا گیا۔ ولا ڈی میرسی میں اس کے چال چلن کی بابت تفتیش کی گئی، وہاں کے سوداگروں اور دیگر باشندوں نے کہا کہ ابتدا میں وہ شراب پینے کا عادی تھا، اور آوارہ گردی کیا کرتا تھا، لیکن اب وہ شریف آدمی بن چکا تھا، پھر مقدمہ کی پیشی کا وقت آیا، اُس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے ریاضان کے ایک سوداگر کو قتل کیا ہے اور اُس کے بیس ہزار روبل (چالیس ہزار روپیہ) چرائے ہیں،

اُس کی بیوی انتہائی مصیبت میں تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے یقین کرے یا نہ کرے اُسکے بچے سب کے سب چھوٹی عمر کے تھے، بلکہ ایک تو ابھی دودھ پیتا تھا، ان سب کے ساتھ لے کر وہ اُس شہر میں گئی جہاں اُسکا خاوند جیل میں تھا، پہلے تو اُسے خاوند سے ملنے کی اجازت ہی نہ ملی، لیکن جب اُس نے بہت منت سماجت کی تو افسروں نے اُسے اجازت دے دی اور وہ خاوند سے ملی، جب اُس نے خاوند کو جیل کے لباس اور بیڑیوں میں چوروں اور مجرموں کے ساتھ ساتھ دیکھا، تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑی اور بڑی دیر تک اُس کو ہوش نہ آیا، پھر اُس نے اپنے بچوں کو اپنے قریب کر لیا اور اُس کے ساتھ بیٹھ گئی، اُسے گھر کا حال بتایا اور اس سے پوچھا کہ اُس پر کیا گزری یہ معلوم کر چکی تو اُس نے پوچھا، "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"

ایکسایاناف "زار روس سے درخواست کرنی چاہیے کہ ایک بے گناہ شخص کو موت سے بچالے"

اس کی بیوی نے اُسے بتایا کہ وہ زار کے ہاں تو ایک درخواست بھیج چکی تھی، لیکن اُس کی شنوائی نہ ہوئی،

ایکسایاناف نے جواب تو نہ دیا۔ لیکن پژمردگی اس کے چہرے سے ظاہر تھی،

پھر اُس کی بیوی نے کہا "میرا خواب غلط نہ تھا کہ تمہارے بال سفید ہو گئے۔ تمہیں یاد ہے

تمہیں اس روز روانہ نہ ہونا چاہئے تھا" اور اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں دے کر وہ کہنے لگی "ونیا، میری جان، اپنی بیوی کو سچ سچ بتا دو، کیا تمہیں نے قتل کیا تھا؟"

"اچھا، تو تم کو بھی مجھ پر شک ہے" ایکسایاناف نے جواب دیا، اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر وہ رونے لگا اس وقت ایک سپاہی آیا اور اس نے کہا کہ بیوی بچوں کو اب جانا چاہیے اور ایکسایاناف نے اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہی۔

جب وہ جا چکے تھے، ایکسایاناف کو سب کچھ جو کہا گیا تھا یاد آ گیا، اور جب اُسے یاد آیا کہ اس کی بیوی کو بھی اس معاملہ میں اُس سے بدظنی تھی، تو وہ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے کہ حق کو صرف خدا ہی جانتا ہے، ہمیں اپنی التجائیں اسی کی حضور میں لے جانی چاہیئں اور رحم کی توقع بھی اسی سے رکھنی چاہیئے"

اور ایکسایاناف نے اس کے بعد کوئی اور عرضیاں نہ لکھیں، سب امیدیں ترک کردیں اور صرف خدا کی حضور میں دعا کرتا رہا۔

ایکسایاناف کو یہ سزا سنائی گئی کہ اس کے درّے لگائے جائیں اور وہ کان کھودنے کے لئے بھیجا جائے۔ چنانچہ پہلے دُرّوں کی سزا دی گئی اور جب درّوں کے زخم اچھے ہو گئے تو دوسرے قیدیوں کی ہمراہی میں وہ بھی سائبیریا بھیج دیا گیا۔

چھبیس سال تک ایکسایاناف قیدی کی حیثیت سے سائبیریا میں رہا کیا، اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے اور اُس کی داڑھی لمبی اور پتلی اور سفید ہو گئی، اس کی بشاشی رخصت ہو چکی تھی، اسکی پیٹھ کبڑی ہو گئی، اور رفتار سست، وہ بولتا چالتا کم تھا، ہنستا کبھی نہیں تھا، لیکن دعا میں اکثر مصروف رہتا۔

جیل میں ایکسایاناف نے جوتے بنانے کا کام سیکھا، اور کچھ تھوڑی بہت نقدی جمع کر لی اس سے اس نے ایک کتاب خریدی جس کا نام تھا "اولیا اللہ کی سوانح عمریاں" جب جیل میں کافی روشنی ہوتی تھی تو وہ یہ کتاب پڑھا کرتا تھا۔ اتوار کے دن وہ جیل کے عبادت خانہ میں جا کر پڑھا

کرتا تھا اور عبادت میں شریک ہوتا تھا، آواز اُس کی ابھی تک نہایت شیریں تھی۔

جیل کا سارا عملہ ایکسایانف سے اُس کی نرم دلی کی وجہ سے نہایت مانوس تھا، اور اُس کے قیدی رفیق اُسکی بہت عزت کرتے تھے اور اُسے "دادا" اور "ولی" کہہ کے مخاطب کیا کرتے تھے، جب جیل کے عملے سے انہیں کوئی درخواست کرنی ہوتی تھی تو اپنی سفارت وہ ہمیشہ ایکسایانف ہی کے سپرد کیا کرتے تھے، اور جب قیدیوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوتا تو اسے چکانے کے لئے اور اُسکا فیصلہ کروانے کے لئے وہ ہمیشہ اسے ایکسایانف ہی کے پاس لایا کرتے تھے۔

گھر کی ایکسایانف کو کبھی کوئی خبر نہ پہونچی، وہ اب یہ تک نہیں جانتا تھا کہ اُسکے بیوی بچے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ایک روز نئے قیدیوں کی ایک ٹولی جیل میں آئی۔ شام کے وقت پرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد حلقہ بنا کے بیٹھ گئے اور اُن سے پوچھنے لگے کہ وہ کس کس شہر یا گاؤں کے ہیں اور کن کن جرائم کی بنا پر قید ہوئے ہیں، دوسروں کے ساتھ ہی ساتھ ایکسایانف بھی نئے قیدیوں کے قریب آبیٹھا، اور پژمردگی کی حالت میں جو جو کچھ کہا گیا سُنتا رہا۔

ایک نیا قیدی جو بہت طویل قامت اور مضبوط ڈیل ڈول کا تھا، جس کی داڑھی خشخاشی تھی اور عمر کوئی ساٹھ سال، دوسروں کو بتا رہا تھا کہ وہ کیونکر قید ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"دوستو۔ میں نے ایک گھوڑا لیا تھا جو ایک گاڑی کے ساتھ بندھا ہوا تھا، مجھ پر چوری کا الزام عائد کیا گیا، میں نے کہا کہ میں نے گھوڑا محض جلدی پہونچنے کے لئے لیا تھا۔ اور پھر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ علاوہ اس کے، اسکا کوچوان بھی میرا ذاتی دوست تھا اور اس لئے میں نے کہا کہ "اس میں حرج کی کوئی بات نہیں"، لیکن جواب مجھے یہی دیا گیا کہ "نہیں، تم نے گھوڑا چرایا"، یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس طرح اور کیونکر میں نے گھوڑا چرایا۔ ایک دفعہ میں نے واقعی ایک سنگین جرم کیا تھا، اور اُسکی وجہ سے مجھے یہاں مدتوں سے ہونا چاہئے تھا لیکن اس دفعہ تو مجھے کسی نے نہیں پکڑا۔ اب کے بلا سبب ہی میں یہاں بھیج دیا گیا ہوں،.... نہیں نہیں دوستو،

میں سب کچھ جھوٹ تم سے کہہ رہا ہوں ، میں سائبیریا ایک دفعہ پہلے بھی آ چکا ہوں ، لیکن اُس وقت میں زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہا "

کسی نے پوچھا "تم کہاں کے ہو "

" ولاڈی میَر کا ۔ میرا خاندان وہیں بستا ہے ، میرا نام ماکار ہے ، اور لوگ مجھے سیمیونچ بھی کہتے ہیں "

ایکسایانف نے سر اٹھایا اور کہا "سیمیونچ ، مجھے یہ تو بتاؤ تم ولاڈیمیر کے ایکسایانف تاجروں کو بھی جانتے ہو یا نہیں ؟ کیا اُن میں سے کوئی ابھی زندہ بھی ہے ؟ "

"کیا خوب ، بھلا نہ جاننے کی کیا وجہ ہے ، ایکسایانف تو بڑے دولتمند ہیں ، گو اُنکا باپ یہیں سائبیریا میں ہے اور معلوم ہوتا ہے ہماری ہی طرح مجرموں میں سے ہے ، ہاں اور بابا جان یہ تو فرمائیے آپ یہاں کیونکر تشریف لائے "

ایکسایانف نہیں چاہتا تھا کہ اپنی بدبختی کا ذکر کرے ، اس نے محض ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "میں اپنے گناہوں کے بدلہ میں گزشتہ چھبیس سال اس قید خانے میں رہا ہوں "

"ماکار سیمیونچ نے پوچھا "کن گناہوں کے "

ایکسایانف نے جواب دیا "ہاں ، ہاں ، میں شاید اسی کا مستحق تھا " وہ تو نہیں چاہتا تھا کہ اور کچھ ذکر کرے ، لیکن اُس کے ساتھیوں نے نو وارد کو بتلا دیا کہ ایکسایانف کیونکر سائبیریا آیا تھا ، کسی نے ایک تاجر کو قتل کر دیا تھا ، اور جس چھرے سے قتل کیا تھا وہ اُس کے سامان میں رکھ دیا تھا ، اور سزا بے انصافی سے ایکسایانف کو مل گئی تھی ،

جب ماکار سیمیونچ نے یہ سرگزشت سنی ، اس نے ایکسایانف کی طرف دیکھا ، اپنے گھٹنے پر زور سے ہاتھ مار کے بلند آواز میں بولا " دوستو ، حیرت انگیز ہے یہ بھی واقعی حیرت انگیز ، لیکن بابا جان آپ بوڑھے کس قدر ہو گئے ہیں "

دوسرے اُس سے پوچھنے لگے کہ تم کو اتنی حیرت کیوں ہوئی ہے ، اور ایکسایانف سے تم

پہلے سے کہاں ہو، لیکن ماکار سیمیونچ نے جواب نہ دیا، اس نے بس اتنی بات کہی "دوستو ہمارا یہاں ملنا واقعی حیرت انگیز ہے"

ان الفاظ نے ایکسایاناف کے دل میں یہ شبہ پیدا کیا کہ شاید یہ آدمی جانتا ہے کہ تاجر کو دراصل کس نے قتل کیا تھا، اور اس نے کہا "سیمیونچ، شاید تم نے اس واقعہ کی بابت کچھ سنا یا شاید تم نے مجھے کہیں دیکھا ہو؟"

"میں سنتا کس طرح نہ؟ دنیا افواہوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس واقعہ کو مدتیں گذر گئیں، اور مجھے تو یاد بھی نہیں میں نے کیا کیا سنا۔"

ایکسایاناف نے کہا "شاید تم نے سنا کہ تاجر کو قتل کس نے کیا"

ماکار سیمیونچ ہنسا، اور بولا "وہی ہوگا جس کے سامان سے چھرا برآمد ہوا، لیکن اگر چھرا وہاں کسی اور نے رکھا تو مثل ہے "جب تک کوئی پکڑا نہ جائے وہ چور نہیں" لیکن جب تمہارا تھیلا تمہارے سر کے نیچے تھا تو کوئی کیونکر چھرا اس میں رکھ سکتا تھا۔ تم جاگ نہ پڑتے؟"

جب ایکسایاناف نے یہ الفاظ سنے تو اُسے یقین ہوگیا کہ اسی شخص نے تاجر کو قتل کیا تھا، وہ اٹھ کر چل دیا، اس روز ایکسایاناف تمام رات جاگتا رہا، اس کی طبیعت بہت غمگین رہی اور طرح طرح کی تصویریں اس کے دماغ میں آتی اور جاتی رہیں، اُس کی بیوی کی تصویر جس روز وہ میلے جانیکے لئے اُس سے جدا ہوا ایکسایاناف کی آنکھوں میں اس طرح پھر گئی گویا وہ خود موجود ہے اُسکا چہرہ اور اُس کی آنکھیں بھی اُسے نظر آگئیں، اور اُسے ہنستے اور گفتگو کرتے بھی اُس نے سن لیا، اپنے بچے بھی اُسے یاد آگئے، ننھے ننھے جیسے کہ وہ اس زمانے میں تھے، ایک تو ایک چھوٹا سا کوٹ پہنے اور دوسرا اپنی ماں کی چھاتی پر، پھر اُسے اپنی پرانی زندگی بھی یاد آگئی، وہ کس قدر نوجوان طبیعت اور کس قدر بشاش رہا کرتا تھا، اس کو یاد آگیا کہ جب وہ گرفتار ہوا وہ کس طرح سے سرائے کے برآمدے میں سارنگی بجا رہا تھا، اور کس قدر بے فکری میں اُس وقت کیا کرتا تھا، جہاں پر اُسے دُرّے مارے گئے تھے وہ جگہ اور جلّاد اور ارد گرد جو تماشائی کھڑے ہوئے

تھے ان کی تصویریں بھی اُسے نظر آنے لگیں، اُسکی زنجیریں، اور دوسرے قیدی اور وہ چھبیس سال جو اُس نے قید میں گزارے تھے، اور اُس کا قبل از وقت بڑھاپا، سب کچھ اُسے یاد آ گیا۔ ان سب خیالات نے اُس کی حالت اتنی بُری کردی کہ وہ اپنے آپ کو مار ڈالنے کے لئے تیار تھا۔

ایکسایانف کے دل میں خیال آیا "اور یہ سب اس بدمعاش کی کارستانی ہے" اور ماکار سیمیونچ پر اس کو اس قدر غضب اور غصہ آ رہا تھا کہ وہ انتقام کے لئے بیتاب ہوا جاتا تھا چاہے اُسکی اپنی جان ہی اس میں ضائع کیوں نہ ہو جائے، تمام رات وہ دعاؤں میں مصروف رہا لیکن اطمینانِ قلب اس کو حاصل نہ ہوا، دن بھر وہ سیمیونچ کے پاس نہ گیا اور نہ اُس کی طرف نگاہ تک کی۔

اسی طرح سے چودہ روز گزر گئے، ایکسایانف راتوں کو سو نہ سکتا تھا، اور اس قدر مغموم تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔

ایک رات جب وہ قید خانے میں پھر رہا تھا اُس نے دیکھا کہ جن تختوں کے نیچے قیدی سوتے تھے، اُن میں سے ایک کے بیچ میں سے تھوڑی تھوڑی مٹی باہر آ رہی تھی، وہ یہ دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا کہ بات کیا ہے، اچانک ماکار سیمیونچ تختے کے نیچے سے اچھل کر باہر نکل آیا اور سہمے ہوئے چہرے سے ایکسایانف کی طرف دیکھنے لگا، ایکسایانف نے چاہا کہ بن دیکھے اس کے پاس سے گزر جائے، لیکن ماکار نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے بتلانے لگا کہ میں نے اس دیوار کے نیچے سے ایک سرنگ کھود لی ہے، مٹی نکلتی تھی اُسے میں اپنے جوتوں میں بھر لیتا تھا اور جب قیدی اپنے کام کے لئے چلے جاتے تھے میں نظر بچا کر اُس کو سڑک پر پھینک دیتا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"بڈھے خبردار کسی سے کہنا نہیں میں تم کو بھی بھاگنے میں مدد دے سکتا ہوں، لیکن جو تم نے میرا راز فاش کیا، تو میں تو دُرّوں سے نیم جان کر ہی دیا جاؤں گا۔ لیکن تمہیں بھی قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

ایکسایاناف اپنے دشمن کی طرف دیکھ دیکھ کر غصہ سے کانپ رہا تھا، اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "مجھے بھاگنے کی کوئی خواہش نہیں، نہ تمہیں کوئی ضرورت ہے کہ مجھے قتل کرو، تم نے مدت ہوئی مجھے قتل کر ڈالا تھا،۔۔۔ رہا تمہارا راز افشا کرنا، سو میں جو کچھ خدا کا حکم ہوا وہ کروں گا۔ ممکن ہے بتا دوں ممکن ہے نہ بتاؤں"۔

دوسرے روز جب قیدی کام کے لئے جا رہے تھے، پہرہ دار سپاہیوں نے دیکھا کہ کسی قیدی نے جوتوں سے کچھ مٹی نکال کر باہر پھینکی، قید خانے میں تلاش کی گئی، اور سرنگ مل گئی، داروغہ نے آکر سارے قیدیوں سے ایک ایک کرکے پوچھا تا کہ معلوم ہو سرنگ کس نے کھودی، سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، جو جانتے بھی تھے انہوں نے بھی ماکار سیمو نیچ کا راز فاش نہ کیا کیونکہ جانتے تھے دروں سے اس کو نیم مردہ کر دیں گے، آخر داروغہ ایکسایاناف کی طرف جس کو وہ ایماندار جانتا تھا متوجہ ہوا، اور کہنے لگا۔

"تم ایک راست گو پیر مرد ہو، خدا کو حاضر ناظر جانکر مجھ سے تم ہی کہو کہ سرنگ کس نے کھودی"

ماکار سیمو نیچ اس طرح سے کھڑا تھا گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور داروغہ کی طرف دیکھ رہا تھا، ایکسایاناف کی طرف اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ ایکسایاناف کے ہونٹ اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، اور بہت دیر تک اُس کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا، اس نے سوچا "میں کیوں اس شخص کی پردہ پوشی کروں جس نے میری زندگی برباد کر دی، کیوں نہ اس کو اُن مصائب کا بدلہ دوں جو میں نے جھیلے ہیں، لیکن جو میں بتا دوں تو اُس کی یہ کھال ادھیڑ دیں گے، اور ممکن ہے میرا یہ شبہ کہ مجھے اسی نے پھنسایا تھا غلط ہو، اور آخر مجھکو اس سے فائدہ کیا ہوگا"

داروغہ نے دُہرایا "اچھا تو بڈھے، کہو نا، سرنگ کس نے کھودی ہے؟"

ایکسایاناف نے ماکار سیمو نیچ کیطرف دیکھا اور داروغہ سے کہا "حضور میں نہیں بتا سکتا کس نے کھودی ہے۔ خدا کی مرضی نہیں کہ میں بتاؤں، مجھے جو سزا چاہے دیجئے، میں آپ کے

ا تھ میں ہوں۔

گوداروغہ نے بہت کوشش کی مگر ایکسایاناف نے اور کچھ نہ کہا، اور یہ معاملہ یوں ہی گوگو میں رہ گیا۔

اُس شب کو جب ایکسایاناف اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا، اور اونگھنا شروع کر چکا تھا، کوئی شخص بہت دبے پاؤں آیا اور اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اندھیرے میں سے دیکھا اور ماکار کو پہچان لیا اور اس نے کہا۔

"اور اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، یہاں تم کیوں آئے ہو۔"

ماکار سیمیونچ خاموش رہا اس لئے ایکسایاناف بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تم کیا چاہتے ہو چلے جاؤ ورنہ میں پہرہ والے کو بلاؤں گا۔"

ماکار نے ایکسایاناف کیطرف جھک کر بہت آہستہ آواز میں کہا "آئیون ڈمیٹریچ، مجھے معاف کر دو۔"

ایکسایاناف نے پوچھا "کون قصور۔"

"میں نے ہی اُس تاجر کو قتل کیا تھا اور چھرا تمہارے سامان میں چھپا دیا تھا میں تم کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا، لیکن باہر سے مجھے ایک آہٹ سنائی دی، اس لئے میں نے چھرا تمہارے تھیلے میں چھپا دیا اور خود کھڑکی کے رستے نکل گیا۔"

ایکسایاناف خاموش تھا۔ اور نہ جانتا تھا کہ کیا کہے، ماکار بستر سے اُٹھ کر دوزانو ہو گیا اور کہنے لگا "آئیون ڈمیٹریچ مجھے معاف کر دو، تمہیں خدا کی محبت کا واسطہ، مجھے معاف کر دو۔ . . . میں اقبال جرم کروں گا کہ تاجر کو میں نے ہی قتل کیا تھا، اور تم رہا ہو سکو گے اور پھر گھر جا سکو گے۔"

ایکسایاناف نے کہا "تمہارے لئے باتیں بنانا بہت آسان ہے لیکن میں نے پچھلے چھبیس سال تمہاری بدولت مصیبتیں برداشت کی ہیں، اب میں کہاں جا سکتا ہوں؟ میری بیوی مر گئی، میرے بچے مجھے بھول گئے، میرے جانے کو اب کون جگہ رہ گئی۔"

ماکار سیمیونچ اٹھا نہیں لیکن وہ فرش سے اپنا سر ٹکرا رہا اور کہتا تھا "آئیون ڈمیٹریچ

مجھے معاف کردو، جب مجھے درے مارے گئے تو انہیں برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اس پشیمانی کا برداشت کرنا جو تمہاری صورت دیکھ کر مجھے ہوتی ہے، . . . پھر بھی تم نے مجھ پر رحم کیا اور بتایا نہیں، اللہ کے لئے مجھے بخشدو، میں بڑا بدبخت ہوں" اور روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

جب ایکسایا نوف نے اُسے سسکیاں لیتے سنا تو اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے اُس نے کہا "خدا تمہیں معاف کریگا، میں تو شاید تم سے بھی سیکڑوں درجہ برا ہوں" اور ان الفاظ سے اُس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا، اور گھر کے لئے اسکے دل میں جو بیتابی بھی تھی وہ یکایک رفع ہو گئی، اب اُسے قید خانہ چھوڑنے کی مطلق کوئی خواہش نہ تھی، محض اپنی عمر کی آخری گھڑی کا منتظر تھا۔

ایکسایا نوف نے جو کچھ کہا تھا اس کے باوجود ماکار سیمونچ نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا، لیکن جب اُس کی رہائی کا حکم آیا تو ایکسایا نوف کو موت پہلے ہی قید حیات سے آزاد کر چکی تھی۔

غزل

مصور جذبات جناب مرزا ثاقب لکھنوی مدظلہ العالی

دل اچھا چاہئے مقبول عام ہو کہ نہ ہو
اگر درست نگیں ہے تو نام ہو کہ نہ ہو

حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہ الفت پر
سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو

یہ قید الفت گل کم نہیں ہے اے صیاد
پھنسا ہوا ہوں ازل سے میں دام ہو کہ نہ ہو

بنا لیا ہے نشیمن محبت گل میں
یہ اپنی سعی تھی دیکھوں مقام ہو کہ نہ ہو

نہیں ہے فاصلہ مابین انحطاط و عروج
غروب مہر ضروری ہے بام ہو کہ نہ ہو

کمان لئے ہوئے ہے قسمت قدر انداز
ہدف ہوں میں فلک نیل فام ہو کہ نہ ہو

عوض جفا کے جفا دل سے ہو نہیں سکتی
حرام عشق تو ہے وہ حرام ہو کہ نہ ہو

جہان میں آتے ہی چھیڑا ہے دل نے قصۂ غم
مگر طویل ہے دیکھوں تمام ہو کہ نہ ہو

زمین قبر بھی ملکیت فقیر نہیں
یہاں بھی دیکھئے اپنا مقام ہو کہ نہ ہو

شراب نوشی الفت میں میکدہ نہیں شرط
لہو کا پینا ہے آسان جام ہو کہ نہ ہو

چراغ داغ ابھی سے جلا دئے میں نے
نصیب میں تری وعدے کی شام ہو کہ نہ ہو

قریب رہ کے نہ سننا دلیل الفت ہے
پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو

غروب مہر کے ہمراہ دل بھی ڈوبا ہے
شروع شام ہے دیکھوں تمام ہو کہ نہ ہو

ابھی سے سن سے میں محتاج عفو و رحمت ہوں
کہ تیرے سامنے تاب کلام ہو کہ نہ ہو

یہ جو ہے دامن کاغذ یہ قلب ثاقب کا
لہو ضرور ہے سودائے خام ہو کہ نہ ہو

وله

کہوں کیونکر کہ میں کچھ بھول آیا ہوں نشیمن میں
مرا صیاد کہتا ہے کہ کیا رکھا ہے گلشن میں

وہ کانٹے جن کو چن لاہوں میں وادیٔ وحشت سے
نکالوں گا اگر وسعت ہوئی صحرا کے دامن میں

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

چراغ و شمع کیا روداد کہتے اہلِ مرقد کی
وہ ظلمت تھی کہ کوئی روشنی اُتری نہ مدفن میں

مرے دل کی لگی کب زندگی میں بجھنے والی تھی
دبا دی دوستوں نے مدتوں کی آگ مدفن میں

وله

کل وحدتِ فرقت کا سماں ہوش رُبا تھا
نالہ بھی مرے منہ سے نکلتے ہی ہوا تھا

آتے تو سوادِ شبِ غم تم کو دکھاتے
وہ سب تھا جو کچھ اپنے مقدر میں لکھا تھا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت
وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

وہ کر گئے تھے مجھکو بلاؤں کے حوالے
سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا تھا

دعوائے محبت تھا وہ جس نے مجھے مارا
بس اسکے سوا کچھ نہ کہا تھا نہ سنا تھا

دل سوختگانِ لحد اچھے تو ہیں یارب
اک ابر سا کل گورِ غریباں سے اٹھا تھا

ثاقبؔ انہیں کیا حالِ شبِ ہجر سناؤں
خود اُن پہ جو یہ رات گزرتی تو مزا تھا

تنقید و تبصرہ

اسلام اور تعداد ازدواج | مولوی ابو الفیض محمد سلیمان صاحب فاروقی بی۔ اے اڈیٹر رسالہ الفیض امرتسر نے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں مسئلہ تعداد ازدواج پر نہایت سیر کن بحث ہے۔ اسلام میں تعداد ازدواج کی اباحت کی جو حقیقت ہے وہ دکھلائی ہے، پھر اس مسئلہ پر فطری حیثیت سے بحث کی ہے اور اس کے جواز کی ضرورت ثابت کی ہے۔ کتب قدیمہ اور انبیاء سابقین کے طرز عمل سے بھی ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد ویدک دھرم سے تعداد ازدواج کو ثابت کیا ہے۔ حکماء یورپ و فلاسفہ اہل نظر کے اقوال اس مسئلہ کے متعلق فراہم کئے ہیں۔ الغرض اس مبحث پر بسط و تفصیل کے ساتھ ہر پہلو سے گفتگو کی ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ معترضین کا جو اسلام کے اس مسئلہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ جواب دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے متعلق بھی بہت شافی و کافی بحث ہے اور معقولیت کے ساتھ اس کی وجوہات بیان کر دئے ہیں جس کے بعد کسی اعتراض کی مطلقاً گنجائش باقی نہیں رہجاتی۔

سلسلہ کلام چونکہ مناظرانہ ہے اس لئے مناسب یہ تھا کہ عبارت خطیبانہ نہ ہوتی۔ لیکن نوجوان مصنف اپنے جوش کو جو اسلام کی محبت اور مخالفین کے غلط اعتراضات سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا ضبط نہ کر سکا۔ اور اس کے بیان میں باوجود معقولیت کے بھی جذبہ کا جوش نمایاں ہو گیا۔ اس کے ساتھ بعض غیر ضروری چیزیں بھی معرض بیان میں آ گئی جن کا اس میں موقع نہ تھا۔ مثلاً ایک پورا باب "اسلام اور علماء فرنگ"، اس کتاب کے مبحث سے غیر متعلق ہے اس کو اس میں درج کرنے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

کتاب کی قیمت ۱۲/ ہے۔ اور ملنے کا پتہ۔ الفیض دار الاشاعت۔ چوک فرید۔ امرتسر (پنجاب)

خلافت بنی اُمیّہ | تاریخ الامت حصہ سوم کا ترجمہ ملیالم زبان میں تیسرا مہینہ ہی کہ شائع ہوکر ہمارے پاس موصول ہوگیا اب مترجم صاحب حصہ چہارم کے ترجمہ میں مشغول ہیں۔

ہم کو ایک ملیباری علمی انجمن کے سکرٹری صاحب کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ الامت کے حصص کے تراجم کناری زبان میں بھی ہور ہے ہیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ اُن کو ہمارے پاس بھیجیں گے۔

دیوان ولایت | مطبوعہ ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ۔ حجم ۲۸۲ صفحہ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ سید محمد احسان علی صاحب سوداگر ہانسی روڈ۔ مقابل گرجاگھر۔ کانپور

پنج رقعہ ولایت | مطبوعہ ادبی پریس لکھنو۔ حجم ۶۲ صفحہ قیمت درج نہیں غالبًا جناب مصنف محمد عزیز اللہ شاہ عزیز معروف بہ ولایت علیخاں صاحب ولایت رئیس قصبہ صفی پور ضلع اناؤ سے مل سکتی ہو۔

منشی ولایت علیخاں صاحب ایک کہنہ سال بزرگ ہیں جو موجودہ زمانہ کے شور وشر سے دور ایک کنج عافیت میں تصوف اور شاعری کی قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ موصوف کی ذات ہمارے قدیم ایشیائی تمدن کا ایسا خالص اور پاکیزہ نمونہ ہے جس کا مثل اسوقت ہندوستان میں مشکل سے ملے گا۔ ایسے بزرگوں کو دیکھنے کے لئے کچھ دن بعد ہماری آنکھیں ترسا کرینگی اس لئے ہمارا فرض ہے ان سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اسوقت اٹھالیں۔ موصوف کو فارسی زبان پر پورا قابو ہے اور آپکے اشعار میں لطف زبان کے علاوہ درد وحسرت اور صوفیانہ وقت نظر سننے والے کے لئے ذوق وبصیرت کا سرمایہ ہو۔ پنج رقعہ کی نسبت اتنا لکھدینا کافی ہو کہ اسے غالب مرحوم نے سہ نثر ظہوری پر بدرجہا مرجح قرار دیا ہے اسکے ساتھ سید اشرف علی صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل بی نے موصوف کی زندگی کے حالات تتمہ کے طور پر لکھدئے ہیں جن حضرات کو فارسی زبان سے مذاق ہو انکے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔

شذرات

اجمل خاں میموریل فنڈ کے لئے چندہ کی وصولی کا کام دہلی میں شروع ہو گیا۔ ۱۲ر فروری سے ۱۹ر فروری تک کا ہفتہ اجمل خاں ہفتہ کے نام سے موسوم کر کے چندہ کی وصولی کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ہفتہ ختم ہونے تک بیس ہزار کے وعدے ہو چکے تھے لیکن شہر کے بعض حصے باقی رہ گئے تھے اس لئے مدت میں توسیع کی گئی۔ امید ہے کہ رمضان کے آخر تک دہلی سے ایک معقول رقم وصول ہو جائے گی۔ بعد رمضان ملک کے مختلف حصوں میں وفود بھیجے جائیں گے۔

اردو اکادمی کے ممبروں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ۲۰ر فروری تک ۸۰ درخواستیں آ چکی تھیں اور اس کے بعد بھی برابر آ رہی ہیں، رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم ممبروں کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ دو نئی کتابیں یعنی خواجہ عبدالحی صاحب کی تفسیر پارہ عم موسوم بہ "ذکر لے" اور نذیر نیازی صاحب کا ترجمہ "عربوں کا تمدن" اسی مہینہ میں تیار ہو جائیں گی اور مارچ میں ممبروں کے پاس بھیج جائیں گی۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامت کا چھٹا حصہ جو تاریخ مصر پر ہے وہ بھی ابتدائے مارچ میں تیار ہو جائے گا لیکن چونکہ یہ کتاب ایک سلسلہ کی کڑی ہے اس لئے ہم اسے ممبروں کے پاس بھیجنا نہیں چاہتے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ ہم ان حضرات کے ساتھ تجارتی چال کر کے انہیں بقیہ پانچ حصوں کی خریداری پر مجبور کر رہے ہیں۔ البتہ جو صاحب خود خواہش کریں گے اُن کو دوسری سہ ماہی کا وی پی کا وصول ہونے کے بعد یہ کتاب بھی بھیجدی جائے گی۔

دسمبر کا آخری ہفتہ ہندوستان میں کانفرنسوں کا زمانہ ہے، اکثر سیاسی، اقتصادی، معاشرتی تعلیمی انجمنیں اس زمانہ میں اپنا اجلاس کرتی ہیں۔ بعض لوگ اس پر افسوس کرتے ہیں

کہ قریب قریب یہ سب جماعتیں محض تحریکوں اور تقریروں پر اکتفا کرتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انکا وجود محض بیکار رہے۔ اس میں شک نہیں کہ کانفرنس کا اصلی مقصد تو یہی ہے کہ ہر تحریک کی تعمیل ہو اور ہر تقریر تاثیر دکھائے لیکن موجودہ صورت میں بھی اگر ان کانفرنسوں میں قومی زندگی کے مختلف مسائل پر وہ لوگ جو اس کے اہل ہوں محض نظری غور وفکر کریں تو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگ جو اجتماعی مسائل سے دلچسپی بھی رکھتے ہوں، بہت کم ہیں۔ یہی چند صورتیں جو سیاسی جلسوں کی شمع محفل ہیں عموماً اور سب انجمنوں میں بھی رونق افروز ہوتی ہیں۔ دوسرے گرمیٔ محفل کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ حاضرین کی تعداد زیادہ ہو اور ان کی دلچسپی کے لئے پرجوش تقریروں کے بغیر کام نہیں چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی کانفرنسوں کی روداد اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ کچھ مقرر جن میں سے اکثر کانفرنس کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایک مجمع کے سامنے تقریریں کرتے ہیں جس میں زیادہ تر افراد کو تقریر کے موضوع سے زیادہ مقرر کی صورت، لباس، ڈیل ڈول اور آواز کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ سیاسی انجمنوں کے لئے موجودہ صورت ناگزیر ہو کیونکہ انہیں اس وقت پیچیدہ مسائل حل کرنے سے زیادہ عام سیاسی احساس پیدا کرنیکی ضرورت ہے لیکن تعلیمی اور معاشرتی انجمنوں کے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ محفل مشاعرہ کا سماں پیش کریں۔ تعلیم اور اصلاح معاشرت کی ضرورت کا احساس ملک کے بہت بڑے طبقہ میں پیدا ہو چکا ہے۔ اب موقع اس کا ہے کہ ارباب فکر اس احساس کی صحیح رہنمائی کریں۔ بجائے اس کے کانفرنسوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اصولی باتوں پر بالکل غور نہیں کیا جاتا اور فروعی چیزوں پر چند فصلی اور زیادہ تر دوامی رزولیوشن پاس ہو جاتے ہیں۔

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس مدراس اس لحاظ سے تو کامیاب رہا کہ صوبہ مدراس کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق بہت سے ضروری رزلیوشن پاس ہوئے (اگرچہ ان میں بھی "حکومت سے درخواست کیجائے" کا فقرہ نتیجہ سے بے نیاز کرنیکے لئے کافی ہے) مگر مسلمانوں کی تعلیم کے پیچیدہ اصولی مسائل کی طرف یہاں بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ گزشتہ سال کانفرنس نے جو کمیٹی ماہرین تعلیم کی بنائی تھی اس کے سپرد اس بار بھی سوائے ایک تعلیمی رسالہ نکالنے اور چند کتابیں چھپوانے کے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس فضا میں یہ کانفرنس ہوتی ہے اُس میں سوائے رزولیوشنوں اور بے مغز تقریروں کے کسی اور چیز کی گنجایش ہے بھی نہیں۔

البتہ صدر کانفرنس سر عبدالقادر کے قابل قدر خطبہ میں ایک فقرہ ملتا ہے جسے کانفرنس کے سخن فہموں نے تو "برائے بیت" سمجھا لیکن ممکن ہے کہ "بطن شاعر" میں یہ معنی سے خالی نہ ہو "اب وہ وقت آگیا ہے کہ آپ کو اس تعلیم پر اکتفا نہ کرنا چاہئے جس کا مقصد محض معمولی معیار کی حرف شناسی اور اس سے بھی نیچے درجہ کی عام معلومات ہے۔ آپ کو اپنے مدرسوں کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں کرنا چاہئے کہ آپ کے طلبہ حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے سے بے نیاز ہو کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں"۔

ہمیں یقین ہے کہ جب فاضل صدر نے یہ الفاظ ادا کئے تھے اس وقت اگر حاضرین بیدار ہوتے تو کانفرنس کا یقیناً وہی نقشہ ہو جاتا جو علامہ اقبال کے "دیوانہ" نے "کارگہ شیشہ گر" میں پیدا کر دیا تھا۔

ہمیں نہایت خوشی ہے کہ کانفرنس میں اس مرتبہ شعبہ اصلاح تمدن کا علیحدہ اجلاس ہوا۔ جس کے صدر ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب تھے۔ ممدوح کا خطبہ صدارت جس میں زیادہ تر تعلیم نسواں اور نسوانی زندگی کی عام اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ ہماری معاشرتی حالت کا آئینہ ہے۔ خدا کرے

جو کام خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے شروع کیا تھا اُسے اب شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ تکمیل تک پہونچائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ موصوف نے "رہِ منزل لیلیٰ" میں قدم رکھنے سے پہلے تمام خطروں کا اندازہ کر لیا ہے اور "شرطِ اول قدم" قبول کر لی ہے۔

ہمعصر ماڈرن ریویو نے اپنے فروری نمبر میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے ہڑتال میں شریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مدارس کے منتظمین طلبہ کو اُن سیاسی مظاہروں سے تو سختی کے ساتھ روکتے ہیں جو حکومت کے خلاف ہوں۔ لیکن حکومت کی حمایت میں مظاہرے کرنے کے لئے اُنہیں ہر طرح کی ترغیب دلاتے ہیں۔ واقعی اُنکا یہ طرزِ عمل نہ صرف اصول منطق کے خلاف ہے بلکہ دیانتداری کے بھی منافی ہے۔ سیاسی جلسوں اور مظاہروں کی شرکت سے جو نقصان ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی ناہموار طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے جس سے اُنکے ارتقائے دماغی کی سلامت روی قائم نہیں رہ سکتی وہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔

حقائق اسلام

مصنفہ مفتی انوار الحق صاحب ایم۔اے (محکمہ تعلیمات (بھوپال)

اس کتاب میں اسلام کے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اسلامی مسائل کی عقلی تشریح کی ہے۔ نیز ان غلط عقائد کو جو مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں جتایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ " اسلام کے روشن چہرے پر سے ان بدنما داغوں کو دور کر دیں جو معترضین کی نکتہ چینیوں اور مخالفین کی حرف گیریوں نے اس پر لگا دئے ہیں اور جن سے حقیقت میں اسکا دامن بالکل پاک ہے" تو انہیں چاہیئے کہ باطل خیالات کو جلد دور کر دیں اور سچے مسلمان بن جائیں یہ کتاب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ ۲۷۲ صفحے قیمت دو روپے (عـ۲)

الفوز الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی وہ اولین بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کتاب وسنت کیطرف توجہ دلائی اور قرآن کریم کے اسرار و معارف معلوم کرنیکے لئے اصول تفسیر پر یہ عدیم النظیر رسالہ لکھا جس کے مطالعہ سے ہر مسلمان قرآن کریم کے مباحث پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ کے چار ابواب ہیں۔

(۱) پہلا باب ان علوم پنجگانہ کے بیان میں جن کی طرف قرآن عظیم نے صراحت کے ساتھ رہنمائی کی ہے اور گویا کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد در اصل وہی علوم پنجگانہ ہیں۔

(۲) دوسرا باب وجوہ خفا نظم قرآن کے بیان میں اور اُن وجوہ کا علاج نہایت وضاحت کیساتھ۔

(۳) تیسرا باب نظم قرآنی کے لطائف اور اُس کے اسلوب بدیع کی تشریح۔

(۴) چوتھا باب فنون تفسیر کے بیان میں۔

اصل فارسی سے مولانا رشید احمد انصاری مرحوم نے اردو میں ترجمہ کیا قیمت ۸

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرولباغ دہلی

جامعہ

زیر ادارت
مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

جلد ۱	بابتہ ماہ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق مارچ ۱۹۲۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

حسن بن صبّاح[1]

(ماخوذ از معتقدات عجم (زیر طبع) مصنفہ مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی)

حسن بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن صباح الحمیری کا خاندان کوفہ کا متوطن تھا۔ ہفتم صدی ہجری کا مشہور سیاح مارکوپولو اسکا نام اور ولدیت علاؤ الدین محمد بن الحسن بتاتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اس کا باپ طوس میں آیا اور یہیں حسن پیدا ہوا۔ اپنا سلسلہ نسب کسی یمنی عرب صباح حمیری سے ملا کر اس نے اس نام کو مشہور انام کر دیا۔ اسکا خاندان اور یہ خود اثنا عشری شیعہ تھا۔ بقول بعض اسکا باپ سنّی تھا اور اس نے اسکی تعلیم پر خاص توجہ صرف کی معلوم ہوتا ہے کہ دینیات کے علاوہ حکمت و فلسفہ میں اس نے غیر معمولی مہارت حاصل کی تھی۔

اس کے عہد طالبعلمی کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ عمر خیام قیام الدین (نظام الملک) طوسی اور حسن بن صباح لڑکپن کے لنگوٹیے یار اور نیشاپور کے مدرسہ میں ہم سبق تھے ایکبار ان تینوں ذہین و فطین بچوں نے آپس میں یہ طفلانہ معاہدہ کیا ہم میں سے جو کوئی بڑا ہو کر کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے وہ باقی دونوں یاروں کی امداد کرے۔ قسمت اور قابلیت نے قیام الدین کو سلجوقیوں کی وزارت دلوا کر نظام الملک بنا دیا۔ اس نے حسب معاہدہ عمر خیام کو دس ہزار دینار

---

[1] مولانا شرر مرحوم کا رسالہ حسن بن صبّاح طبع آخری اس حیرت انگیز شخص کی سوانح اعقائد اور عجیب و غریب کارناموں کا ایک مرقع ہے۔ اس کے ساتھ مولانا کے ناولی فردوس بریں نے باطنیوں اور کارستانیوں کی تصویر میں جان ڈال دی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ محققانہ تذکرہ صرف آمیزش عشق و حسن کے جرم میں اُس نگاہ قدر سے محروم ہے جس کا یہ واقعی مستحق ہے۔ باطنیوں کی تصویر شاید کسی زبان میں "فردوس بریں" سے زیادہ صحیح اور کامل نہیں کھینچی گئی۔ یعنی اس شخص کے تذکرہ کے زیادہ تر انہیں حصوں سے بحث کی ہے جن کا تعلق تاریخ معتقدات عجم سے ہے۔ باقی حالات زندگی کے لئے جو بجائے خود نہایت دلچسپ ہیں۔ میں ناظرین کو "فردوس بریں" کیطرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

سالانہ وظیفہ دلوایا۔ حسن بن صباح کو بھی ایک اعلیٰ عہدہ دیا گیا مگر اس نے رشک و حسد سے نظام الملک کو بادشاہ کی نظر سے گرانے اور خود وزیر اعظم بننے کی سازش کی جو ناکام رہی اور جان بچا کر مصر بھاگ گیا۔ اکثر تذکرے جنہیں جامع التواریخ مولفہ رشید الدین فضل اللہ جو آٹھویں صدی ہجری کی تالیف ہے اس روایت کی شہرت عام کے ذمہ دار ہیں۔ مگر عمروں کے مقابلہ سے یہ تینوں ناموران تاریخ ہمجولی نظر آتے ہیں۔ سنین ولادت معلوم نہیں۔ سال وفات نظام الملک کا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء، عمر خیام کا تقریباً ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء، اور حسن بن صباح کا ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء اور تینوں نے عمر طبیعی پائی۔ نظام الملک اگرچہ ایک باطنی فدائی کے ہاتھ شہید ہوا مگر ۷۴ سال کی عمر میں۔ اس حساب سے حسن بن صباح اور عمر خیام تو ہمعمر تھے مگر نظام الملک کم سے کم پچیس تیس سال ان تینوں میں بڑا تھا۔ لہٰذا ان میں یہ طفلانہ معاہدہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔[۵۱]

حسن بن صباح کی طبیعت فطرۃً نہایت حوصلہ مند اور کیا دواقع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باطنی داعی مختلف اوضاع و لباس میں ممالک اسلامیہ میں پڑے پھرتے تھے۔ قاہرہ ان کا مرکز تھا۔ حکومت فاطمیہ کی طرف سے یہ نقیب خفیہ سازشوں میں سرگرم کار رہتے تھے۔ انکی کثرت اور ریشہ دوانیوں سے کسی شخص پر وثوق کے ساتھ سچی دینداری کا اعتماد نہ ہوتا تھا۔ دوستوں آشناؤں بیٹوں، بھائیوں پر بھی بھروسا نہ تھا۔ کیونکہ بہتیرے لوگوں کا یہ حال تھا کہ ظاہری مذہب کچھ ہوتا تھا اور باطن میں کچھ۔ پوشیدہ طور پر یہ کوشش بڑے پیمانہ پر جاری تھی کہ عوام اور ناتجربہ کار جوانوں میں سے جس قدر ممکن ہو اسماعیلیہ مصر کے مطیع و مرید بنا لئے جائیں۔ حسن کی اتفاقی ملاقات ایک اسماعیلی داعی[۵۲] سے ہو گئی جس نے حسن کو ایک مفید مطلب دماغ پا کر اُسے اپنے ڈھب پر لگا لیا۔ حسن کو بھی اپنے غیر معتدل حوصلوں کے لئے ایک وسیع جولانگاہ ہاتھ آگئی۔ وہ قاہرہ کے فاطمی دربار

---

۵۱ مستشرق ہوٹزمہ کا قیاس ہے کہ حسن بن صباح اور عمر خیام کا تیسرا ہمجولی نظام الملک نہیں بلکہ ایک دوسرا سلجوقی وزیر نوشیرواں بن خالد ہو سکتا ہے جو نظام الملک سے پچیس تیس برس بعد سلجوقی فرمانروا محمود بن محمد بن ملک شاہ کا وزیر ہوا۔ محمود نے ۱۱۱۷ء سے ۱۱۳۱ء تک حکومت کی۔ دونوں ہی دولت سلجوقیہ کے وزیر تھے اور شاید یہی وجہ التباس ہے۔

۵۲ بعض مورخ اس فاضل داعی کو ناصر خسرو علوی بتاتے ہیں۔

میں حاضر ہوا اور نہایت عزت و احترام سے لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فاطمی خلیفہ المستنصر کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں مستعلی اور نزار میں خلافت کے لئے رقیبانہ کش مکش تھی حسن نے نزار کا ساتھ دیا جو مشرقی ایران اور شام کا خلیفہ بنا۔ چنانچہ یہی ممالک حسن بن صباح کی جولانگاہ رہے۔ رفتہ رفتہ اس نے وہ اقتدار حاصل کر لیا کہ حکومت میں فاطمیوں کا حریف بن گیا۔

حسن نے اپنے مشن میں سخت سے سخت مصیبتیں اٹھائیں مگر اس الوالعزم شخص نے حیرت انگیز پامردی کے ساتھ انکا مقابلہ کیا۔ وہ ہمت واستقلال، ذہانت وفطنت کا مجسم نمونہ تھا۔ سلطنتوں کا بنانا اور بگاڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اگر وہ چاہتا تو جیسا بدنامی میں مشہور آفاق ہے نیکنامی میں یکتائے روزگار ہوتا مگر ؏ درکوے نیکنامی مارا گزر نہ دادند۔

جہاز میں سمندری طوفان سے بچتا بچاتا، جلاوطنی کی مصیبتیں اٹھاتا، ملک ملک کی ٹھوکریں کھاتا، وہ سواحل افریقہ سے شام پہنچا اور ایشیائے کوچک اور ایران کے تمام مشہور بلاد میں مذہب اسماعیلیہ کی اشاعت کرتا پھرا لاکھوں آدمیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیا۔ آخر برسوں کی آوارہ گردی کے بعد قزوین پہنچا اور ایک ویران قلعہ التمونت میں سکونت گزیں ہوا۔

آلہ اموت یا التمونت | یہ کوہ البرز کے سلسلہ میں رودبار کے اس حصہ میں جسے طالقان کہتے تھے قزوین سے رشت کو جانیوالی سڑک پر ایک پرانا قلعہ تھا۔ مدت سے اجڑا پڑا تھا اور ایسی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں واقع تھا کہ نظروں سے پوشیدہ تھا۔ حسن عیاری سے اس پر قابض ہو گیا اور اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت شروع کر دی۔ اپنی شدید ریاضتوں اور زہد وتقویٰ سے تمام علاقہ میں اپنا وقار جما لیا۔ کہتے ہیں کہ تیس سال کی خلوت نشینی میں اس نے صرف دو دفعہ زینے سے نیچے قدم رکھے۔ اپنی شریعت واخلاق کے احکام میں ایسا متقشف تھا کہ ان سے ادنی سے ادنیٰ تجاوز اسکی نظر میں ناقابل عفو جرم تھا جس کی سزا میں کسی قسم کی رعایت دیا سداری روا نہ رکھتا تھا۔ اس کے بیٹے حسین نے ایک اسمٰعیلی داعی کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے قصاص میں بے تامل بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے بیٹے نے شراب پی تھی۔ صرف اس جرم پر اسے بھی قتل کر دیا۔ اس کی شریعت میں امام

یا شیخ کی نافرمانی کی سزا قتل تھی۔ اس خونین سیاست کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے تمام سپاہی، مرید و ملازم اسکی ہیبت و جلال سے ایسے فرمانبردار بندے بنے ہوئے تھے کہ ادنیٰ اشاروں پر سب کچھ کر گزرتے تھے۔

یہ جان نثار داعی درویشی کے لباس میں صرف دعوت و ارشاد کی خدمات انجام نہ دیتے تھے بلکہ خفیہ چالوں اور زیر آستین خنجروں سے حسن کے دائرۂ اقتدار و حکومت کو وسیع کرتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ طالقان کے چاروں طرف ایک وسیع خطہ بلکہ سارا علاقہ رودبار رفتہ رفتہ انکے دست تصرف میں آگیا۔ حسن کے نائبین نے جابجا قلعے تعمیر کئے اور سارا ملک انکی دست درازیوں سے خطرہ میں پڑ گیا۔ ملک شاہ سلجوقی کو بھی اندیشہ پیدا ہوگیا اور اسکے کامل استیصال کا فیصلہ کرکے اس نے آلہ اموت کا محاصرہ کرلیا۔ اپنی مدافعت میں حسن کے ترکش کے سب تیر ختم ہوگئے تو ایک آخری ہلاکت بار تیر نکالا۔ ایک فدائی کو تعینات کرکے ملک شاہ کے مشہور کارآزمودہ مدبر کبیر السن وزیر اعظم نظام الملک طوسی کو قتل کرا دیا۔ پھر ایک ماہ کے اندر اندر خود ملک شاہ سلجوقی کا کام زہر سے تمام کرا دیا۔ اس زبردست دشمن سے مطمئن ہوکر حسن نے اپنی قوت کا اجتماع اور حکومت کا استحکام شروع کردیا۔

اسی زمانہ میں صلیبی جنگ چھڑ گئی۔ صلیبی حملہ آوروں کے پہلے سیلاب نے بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام مچا دیا۔ دنیائے اسلام میں ایک ہیجان برپا تھا۔ دینی جوش کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ عین اسی وقت حلب کا حاکم رضوان جو در پردہ باطنی ہوگیا تھا عیسائیوں سے مل گیا۔ فدائیوں کی امداد سے اس نے بھی مسلمانوں کو قتل کرانا شروع کیا۔ مسلمانوں کے جوش غضب کی انتہا نہ رہی رضوان تو مرگیا مگر جتنے باطنی فدائی ہاتھ آئے ایک ایک کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ ادھر فدائیوں نے بھی نئے جوش کے ساتھ مسلم حکام و سلاطین کی خونریزی شروع کردی۔ اس وقت خلافت عباسیہ ایک تبرک رہ گئی تھی۔ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے فرمانبردار اس قدر خوف زدہ ہوگئے تھے کہ حسن کا مقابلہ درکنار اس کے مطالبہ کے خوف سے اپنے قلعے آپ مسمار کردئے۔

حسن کی بہشت | آلہ اموت یا الموت کا موقعہ قدرۃً غیر معمولی تھا۔ گرد و نواح، سبز سبز وادیوں، چراگاہوں اور قدرتی چشموں سے بہشت نگاہ بنے ہوئے تھے۔ حسن نے ان چشموں کو جھیل بنا کر خوش قطع مصفا

نہریں نکالیں، وادیوں میں نہایت نفاست سے باغ لگائے۔ عالیشان اور دل فریب قصر تعمیر لئے جن پر زنگسازیوں اور ملمع کاریوں سے لعل و زمرد نیلم، سونے چاندی کے محل تیار کئے بیش سامان اور اثاثہ سے انکو آراستہ کیا۔ ماہجبیں لڑکوں اور پری جمال لڑکیوں کو دور دور سے حیرداکم ان میں بسایا، انہیں زاہد فریب ناز و انداز اور رقص و سرود کی تعلیم دلوائی۔ فوارے تعمیر کئے وقتاً فوقتاً خالی نہروں کو دودھ، شہد یا شراب سے بھروا کر ان میں خوبصورت کشتیاں چھوڑ وادیتا خوشنما، خوش قطع درختوں پر سدھائی ہوئی خوش لحن چڑیاں دلکش ترانے گاتی پھدکتی پھرتیں غرض ایسے سامان مہیا کردے کہ بیخبر آدمی ایک دفعہ ان میں پہنچ جائے تو اپنے آپ کو سچ مچ بہشت میں سمجھے۔ آلاموت کے مدخل پر ایک ایسا مستحکم قلعہ تیار کیا جو بقول مارکو پولو ساری دنیا کی مجموعی طاقت کے مقابلہ میں مدافعت کے لئے کافی تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس ناقابل عبور پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادی کو نہ تھا۔

فدائیت | یہ زبردست جال اس لئے پھیلایا گیا تھا کہ حسن کے جو نئے شکار رہا تھ آتے تھے انکو راسخ العقیدہ بنایا جاے۔ ان سے دنیا میں بہشت کی سیر کرانے کا وعدہ کرکے حشیش (بھنگ) کا شربت پلایا جاتا اور بے ہوشی کی حالت میں انہیں خود ساختہ بہشت میں پہنچا دیا جاتا۔ ہوش آنے پر وہ اپنے آپ کو بہشتی محلوں اور باغوں میں حور و غلماں کے پہلو میں پاتے۔ دودھ کی نہروں میں حسینوں کے ساتھ کشتی پر سیر کرتے۔ پری جمال محبوبوں کی ہمکناری انہیں سرشار کردیتی۔ اس پر انکے ہاتھ سے شراب کے جام بے خود بنا دیتے۔

وہ اور مرے پہلو میں! یہ خواب کہ بیداری؟ گر ہو یہ غشی یارب تا حشر رہے طاری

اخیر میں حشیش کے پیالے سے بیہوش ہو کر پھر جو آنکھ کھولتے تو اپنے تئیں اسی دار الحزن اور عالم کشمکش میں پاتے۔ بہشت کے مزے اور حوروں کی یاد بے چین رکھتی۔

جیتے جی بہشت کی دوبارہ سیر کسی نہایت سخت شرط پر مشروط رکھی جاتی مگر جانداده حور طالب ہر امتحان در ابتلا پر آمادہ ہو جاتا۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید۔

کسی امیر، وزیر، بادشاہ، عامل، عالم، فقیہ، مفتی کا کام تمام کر دینے کی خدمت سونپ دیجاتی اور یہ جاندادہ حور بے تامل کرگزرتا۔ اس عیاری سے حسن ایسی ایسی جلیل القدر ہستیوں کی فنا میں کامیاب ہوتا جن کو اپنی راہ میں مزاحم پاتا۔ بے باکانہ خون آشامیوں سے ابنائے زماں کے دلوں میں باطنیوں کی ہیبت چھا جاتی اور ان سے الجھتے یا ناراض کرتے ہوئے خوف کھاتے چنانچہ نظام الملک طوسی کی شہادت سے ملک شاہ نے خوف زدہ ہو کر المتونت کی مہم ملتوی کر دی۔

الغرض شریعت جاریہ کی بیخ کنی کی تعلیم و تلقین، نئے دین کا قدرتی جوش و غلو، باطنیت کا فریب، حسن کی بظاہر پارسایانہ زندگی کا اثر اس کی سیاست و تعزیرات کا خوف، خود ساختہ بہشت کا عیش و جشن کی چاٹ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ حسن کے پاس اُسکے مریدوں کی ایک چیدہ زبردست سرفروش فوج تیار رہتی تھی جو اپنی جانبازیوں اور عیاریوں سے بڑے بڑے سورما سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیتی تھی۔ ایکبار ملک شاہ کے ایک قاصد کو اپنی طاقت کی نمائش کیلئے اس نے اپنے ایک فدائی کو اشارہ کیا کہ پہاڑ کی چوٹی سے کود پڑے اُس نے معاً تعمیل کی اور ہڈی ہڈی سرمہ ہوگئی۔

حسن کے مریدوں کے تین طبقے تھے۔ داعی۔ رفیق۔ اور فدائی۔ **داعی** مشنری تھے جو دور دراز اقطاع عالم میں باطنیت کی خفیہ تبلیغ کرتے تھے **رفیق** مجلس خاص کے معتمد و مشیر تھے اور دین باطنی میں مجتہدانہ اختیار رکھتے تھے۔ **فدائی** وہ جاں نثار مرید تھے جن کے ہاتھوں اکابر عہد کی جانیں لینے کی خدمت انجام پاتی۔ یہ گروہ سب سے خطرناک اور حسن کی طاقتوں کا اصلی مرکز تھا[1]

عقائد | حسن نے کسی نئے دین یا عقائد کی تعلیم نہ دی اسکا اصلی مطمح نظر سیاسی اقتدار و حکومت تھا جس کے حصول کے لئے وہ زیادہ تر سیاسی چالوں اور عیاریوں سے کام لیتا تھا تبلیغ کے لئے اس کے بیشتر قرامطہ اور اسمعیلیوں نے جن تعلیمات کی بنیاد ڈال دی تھی وہ اس کے لئے کافی ہتکھنڈے تھے اسمعیلی مسئلہ تاویل میں اتنی لچک موجود تھی کہ اسے جس قسم کے فتووں کی ضرورت ہوتی صادر کر دیتا

---

[1] حسن بن صباح کی بہشت اور طریق کے متعلق مارکوپولو پر میں نے زیادہ اعتماد کیا ہے اس نے یہ حالات آلہ اموت کی تباہی کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھے ہیں مرتبہ صفحہ ۱۳۹ و ملحقات

ہر حلال ادنیٰ تصرف سے حرام اور ہر حرام حلال کر لیا جاتا سفسطہ ہے اسے خاص دوں تھا۔ ا ن

ذات باری تعالیٰ کو مجرد عن المادہ ہی نہیں بلکہ وجود معطل قرار دیدیا۔ یہاں تک کہ اس نے ذات باری میں صفات کی ہستی سے بھی انکار کر دیا۔ صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے کو اس نے تشبیہ مخلوقیت سے تعبیر کیا، کیونکہ رزاقی، ربوبیت، ستاری، وہابی، غفوری یہ جملہ صفات خصوصیات انسانی اور قابل تغیر و زوال ہیں پس خدا کو ان صفات سے اسی معنی میں متصف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کو یہ قدرتیں بخشی ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ انکا فاعل ہے۔ انتہا یہ کہ وجود کی نسبت بھی خدا کیطرف جائز نہ رکھتا تھا۔ اس امر میں اسکی تشکیک کا یہ عالم تھا کہ خدا کو نہ موجود کہنا چاہتا تھا نہ غیر موجود۔ اس عقیدہ کا مقابلہ اُن وحدۃ الوجودی صوفیہ کے عقیدہ سے کیجئے جو لا الہ کے بعد الا اللہ کہنے کو شرک تصور کرتے ہیں۔

حسن نے ۳۵ برس کی فرمانروائی کے بعد ۱۱۲۴ء میں ایک بے تاج کے مقتدر و جابر بادشاہ کی حیثیت سے اپنے دار الحکومت قلعہ آلہ اموت میں وفات پائی۔ ایک آوارہ، بیکس مفلوک الحال نوجوان اپنی عزیمت، استقلال، علم، قابلیت اور عیاریوں کی بدولت ایک ایسا حکمران بن گیا جس کے نام سے ممالک مشرقی کے بڑے بڑے سلاطین تھراتے اور جس کے خوف سے کسی مسلمان کو سکھ نیند نصیب نہ تھی لوگ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں اور ظالم کی عمر کوتاہ۔ لیکن قرامطہ اور حشیشین کی پونے چار سو برس کی کامیابیوں پر نظر کریں، تاریخ میں ایک یہودی النسل یا عجمی نژاد کے فاطمی مشہور ہو جانے پر غور کریں اور دوسرے تاریخی ظالموں کی طویل حکومت پر نگاہ ڈالیں تو ماننا پڑیگا کہ ملکی فتحمندی و اقتدار کے لئے جو قابلیت درکار ہے وہ محض مادی ہے۔ حق و صداقت نہیں۔ اور کامیابی کی درازیِ مدت کسی شخص یا جماعت یا دین یا حکومت کی صداقت یا حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

دنیا ہماری دماغی کیفیات کا عکس ہے

(ماخوذ از جیمس ایلن)

جیسے "ہم" ہیں ویسی ہی ہماری دنیا ہے۔ عمل خیال کا محکوم ہے۔ دنیا پر خیال کی حکمرانی ہے یہی نہیں بلکہ عالم ایک بزم خیال ہے، یا ہمارے باطنی تجربات کا ایک شیرازہ۔ جو کچھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے یہ سب ہمارے تاثرات قلبی اور واردات دماغی کی سامان طرازی ہے۔ تمام تر اہمیت کی مالک دل و دماغ کی اندرونی کیفیات ہیں کیونکہ تمام بیرونی چیزیں انہیں کیفیات کے آئینہ میں رونما ہوتی ہیں اور انہیں مختلف الالوان کیفیات سے اکتساب رنگ و بو کرتی ہیں۔

جو کچھ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں وہ ہمارے تجربوں سے مرکب ہے اور جو کچھ ہم آئندہ جانیں گے اسے بھی لازمی طور پر تجربہ ہی کے دروازہ سے گزرنا ہوگا۔ اس طرح یہ سب ہماری ذات کا جزو بن جائے گا۔

خود ہمارے خیالات، ہماری خواہشات اور تمنائیں ہماری دنیا بناتی ہیں اور ہر انسان خود ساختہ دنیا میں رہتا ہے۔ بزم شہود ہمارے دل و دماغ ہی کی جلوہ گری ہے۔ نشاط و حسن یا حزن و لال اور بصارت سوز کریہ مناظر کی دنیا خود ہمارے اندر آباد ہے۔ انکے وجود کا راز خود ہماری ات ہے ؎

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد   آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

ہماری زندگی کی کامرانی اور نامرادی، ہماری دنیا، ہماری کائنات سب خیال کی کرشمہ سازی ہے اور غالب مرحوم کا دنیا میں خیال کے سوا ہر چیز کی نفی کرنا اور تمام عالم کو "حلقہ دام خیال" نا ایک حقیقت کبری کا اظہار ہے۔ ہماری ظاہری اور بیرونی زندگی کی تعمیر ہمارے باطنی تصورات کے لابق ہوتی ہے۔ ہمارے خیالات روح ہیں اور دنیا جسم ہے۔ یہ دنیا ہمارے خیالات کی مادی صورت

ہے۔ جو خیالات ہمارے دماغ میں پرورش پا رہے ہیں وہ یقیناً ردعمل کے ناگزیر قانون کے ماتحت، جلد یا بدیر، ہماری بیرونی دنیا میں متشکل ہو جائیں گے۔ آغوشِ حسن مراد اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جس نے طہارت نفس اور ایثار سے اپنی روح کو بھی جمیل اور دلاویز بنا لیا ہے۔ اور کثیف ارواح وہاں آفات کا لقمہ ہیں۔ یہ فطرت کا دستور ہے اور قدرت کے کارپرداز اس قانون کی بجا آوری میں کبھی خطا نہیں کرتے۔ ہر روح اپنی عادات و خواص کے لحاظ سے ہر شے کو رد یا قبول کرتی ہے اور یہ محال ہے کہ وہ اس چیز کی مالک بن سکے جس کی وہ صلاحیت نہیں رکھتی۔

دہر لبریز مکافات است اما کو تمیز۔ کم کسے اینجا بحال خود ترحم می کند

جس انسان نے اس حقیقت کو پا لیا اس نے گویا آئین فطرت کی ہمہ گیری اور عمومیت کو سمجھ لیا باطنی ظرف کی تنگی اور وسعت کے اعتبار سے حادثات دنیاوی انسانی روح کو متاثر کرتے ہیں۔ ہر روح تجربات اور افکار کا مجموعہ ہے اور جسم انکے اظہار و افشا کی ایک گاڑی جو ہر وقت استعمال کے لئے تیار رہتی ہے۔ اس لئے جو کچھ ہمارے خیالات ہونگے دراصل "ہم" وہی ہیں۔ ہمارے گرد و پیش کی تمام ذی روح چیزیں ہمیں اسی لباس میں نظر آتی ہیں جو ہم انہیں پہناتے ہیں بدھ کا قول ہے "کہ ہم اپنے تفکرات اور خیالات کا نتیجہ ہیں، ہماری ہستی کی بنیاد خیالات پر استوار اور پھر ہماری ہستی کی تعمیر بھی خیالات ہی کی رہین ہے۔ حوادثات کی تعمیر و تخریب ہماری خیالی زندگی" پر مبنی ہے اگر انسان خوش ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پُرنشاط تصورات کی دنیا میں رہتا ہے اور اگر وہ غمناک ہے تو اسکا سبب یہ ہے کہ وہ پست اور یاس انگیز خیالات کی دنیا میں رہتا ہے۔ تم خوف اور بے باکی، حماقت و عقلمندی اور اطمینان و اضطراب کی وجہ اپنے ہی اندر تلاش کرو۔ اور اگر تم نے انکو اپنے آپ سے جدا کہیں اور تلاش کیا تو باور کرو کہ تم ضرور ناکام رہو گے۔ ہر شے کی اصل تم ہی ہو اور تم سے باہر کچھ نہیں ہے۔

برقے زد و بردار و ہنگامۂ تجلی　　　اے بیخوداں بہ بیند دل جلوہ گر نباشد

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ جواب طلب آوازیں یہ کہہ رہی ہیں کہ آیا درحقیقت میرا یہ عقیدہ ہے

غیر فانی حقیقت یقین کرتا ہوں کہ بیرونی حالات و حوادث اسی حد تک ہم میں اثر و نفوذ کی صلاحیت رکھتے ہیں جس حد تک ہم انہیں اجازت دیں۔ ہم حوادثات کے سیلاب میں اس لئے بہہ جاتے ہیں کہ ہم خیال اور ارادہ کی اہمیت اور استعمال سے ناآشنا ہیں۔ ہم یقین (یقین کا یہ مختصر لفظ ہی رنج و راحت کا خلاق ہے) کرتے ہیں کہ بیرونی چیزیں ہماری زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں دخل رکھتی ہیں اور اس طرح ہم بیرونی چیزوں کے سامنے اپنی سپر ہمت ڈالدیتے ہیں اور اقرار کر لیتے ہیں کہ ہم انکے غلام ہیں اور وہ ہمارے غیر مشروط اور مطلق العنان آقا اور پھر اس طرح ہم ان میں وہ قوت پیدا کر دیتے جو پہلے ان میں نہ تھی اور فی الحقیقت ہم صرف حوادث کے مطیع نہیں ہوتے بلکہ ہم اس ظلمت و تعدی یاس و امید یا ضعف و قوت کے ماحول کے فرمانبردار ہوتے ہیں جو ہماری قوت متخیلہ ان حادثات کے گرد ہمیں دکھلاتی ہے۔

میں دو آدمیوں کو جانتا ہوں جن کی برسوں کی کمائی دست برد زمانہ کے ہاتھوں ناگہانی طور پر ضائع ہوگئی۔ ان میں سے ایک شخص کے ہوش و خرد کو اس صدمہ نے سلب کر لیا۔ مایوسی، اضطراب اور ترش روئی جو ایسی حالت کے لوازم ہیں اس کی فطرت بن گئے اور مصائب کی آہن پوش اور غیر مفتوح سپاہ نے یمین و یسار سے اس پر نرغہ کر لیا دوسرے شخص نے جب صبح کے اخبار میں یہ روح فرسا خبر دیکھی کہ وہ بینک جس میں اسکا روپیہ جمع تھا ٹوٹ گیا۔ اور اب ایک پائی بھی واپس ملنے کی امید نہیں کیجا سکتی تو اس نے اپنا باطنی سکون قائم رکھا اور اپنے حواس کو اس حادثہ کے نذر نہ کیا۔ بلکہ ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ کہا کہ حزن و ملال اس تباہی کو واپس نہیں لوٹا سکتے مگر جان توڑ کوشش سے ان مصیبت کے دنوں کا پھر جانا ممکن ہے۔ اگلے روز اس نے تازہ جوش اور قوی تر عزم کا سرمایہ لیکر اپنا کام شروع کر دیا اور قلیل مدت میں اس نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی خود اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مصیبت کا حائل شدہ پہاڑ کس آسانی سے ٹل گیا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ دولتمند اور تجربہ کار تھا۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

اگر سانحات اور واقعات نحوست اور برکت کے حامل ہوتے تو انہیں تمام انسانوں پر اپنا اثر یکساں ڈالنا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت کہ ایک ہی قسم کے واقعہ کا دو انسانوں پر مختلف اثر ہوتا ثابت کرتا ہے کہ بھلائی اور برائی نفس حالات واقعات میں نہیں ہوتی بلکہ صرف اس شخص کے دماغ میں ہوتی ہے جو ان سے دوچار ہوتا ہے۔ ناکامیاں پست خیالی اور غلامانہ ذہنیت کا خمیازہ ہیں اور اتفاقات کو ان میں بہت ہی کم دخل ہے، اتفاقات ہمیشہ نہیں پیش آتے پیہم ناکامی اور متواتر شکست و ہزیمت کی وجہ ہرگز اتفاقات کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جس طرح ہم حوادثات اور سوانح کو اپنے خیالات کے رنگین چشمہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم مری دنیا کو بھی خیال کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ایک خود رو پھول جس پر ایک معمولی رہرو نگاہ غلط انداز بھی صرف کرنا گوارا نہیں کرتا اور جسے وہ اپنے پیروں کے نیچے روندڈالتا ہے شاعر کی نگاہ رمز شناس میں عالم غیب کا ایک قدسی صفت قاصد ہے۔ وہ اس پھول کو دیکھتا ہے اور ہنگامہ ہستی کی شرح سمجھتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے

بہت سے انسانوں کے خیال میں سمندر صرف پانی کی ایک ناپیداکنار وسعت ہے جس پر جہاز تیرتے ہیں اور اکثر اوقات امواج کی برہمی کی تاب نہ لاکر لقمۂ آب ہوجاتے ہیں، لیکن یہی قلزم بے پایاں اور محیط اعظم ایک صاحب ذوق کی نظر میں زندہ چیز ہے وہ اس کے تمام تغیرات میں ایک آسمانی نغمہ اور ایک صوت سرمدی سنتا ہے اور وجد کرتا ہے۔ اسکی یہ پہنا اس کے لئے کوئی مہیب چیز نہیں بلکہ اس کے تموج کا شور اس کے لئے نوا پرداز ساز ہے۔ گوش محرم کے لئے ہر گل ایک نغمہ ہر پتی زبانِ گویا اور ہر حباب پردۂ مضراب ہے۔ جہاں ایک عام انسان انتشار اور پراگندگی دیکھتا ہے وہاں ایک فلسفیانہ دماغ، اسباب و نتائج، علت و معلول اور فعل و انفعال کا ایک منضبط سلسلہ مشاہدہ کرتا ہے۔ جہاں ایک منکر روح اور مادہ پرست انسان دائمی

اور بے پایاں موت وگمنامی تصور کرتا ہے ۔ وہیں ایک عارف حق ابدی اور غیر فانی حیات کی شہادت دیتا ہے ۔ ہماری آنکھیں کیوں وہاں کچھ نہیں دیکھتیں جہاں ایک صاحب نظر کو جلوہ محبوب نظر آتا ہو گرمی بزم کا نتیجہ تم بھی رقص شرر سے معلوم کر سکتے اور قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل تم بھی مشاہدہ کر سکتے ہو۔ اگر یہ حقائق تمہارے دماغ میں منعکس نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے تعلیم و تربیت سے اپنے دماغ کو جلا نہیں دی ہے ۔ اگر دیدۂ بصیرت وا ہو تو تم دیکھو گے کہ دنیا کی ہر شے اور ہستی کا ہر ہنگامہ ایک فلسفہ ہے لیکن ہر انسان نہیں جانتا ۔

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ ۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

فراوانی حسن تو صرف رعنائی خیال کا نتیجہ ہے اور حسن عمل حسن خیال پر مبنی ہے اگر تمہارے دماغ کی شمع روشن ہو تو پھر کسی بیرونی آفتاب کی چنداں ضرورت نہیں ۔ مست عرفان کو کسی دوسری شراب کی حاجت نہیں اس کو تو

جز طواف خویش دور ساغرے درکار نیست

دنیا کے راز تم اپنی ذات سے پوچھو کہ تم خود مضراب حقیقت ہو ۔ از خود بشنو کہ ترجمانی ہمہ را ۔

جس طرح ہماری دماغی کیفیات کا واقعات اور اشیاء پر اثر پڑتا ہے اسی طرح ہم دوسروں کے بطون کو بھی اپنے دماغ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں ۔ بدگمان ہر شخص کو مشتبہ خیال کرتا ہے ۔ کاذب گمان کرتا ہے کہ یہ یقین کرنا حماقت ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی عجیب ہستی ہے جس کو راست بازی کا مکمل نمونہ کہا جا سکے ۔ حاسد ہر آدمی کو بد اندیش یقین کرتا ہے اور خسیس سمجھتا ہے کہ دنیا کا ہر متنفس اس کی دولت کی طرف چشم آز سے تاک رہا ہے ۔ ایک متمول آدمی ہمیشہ اپنے تکیہ کے نیچے ریوالور رکھکر سوتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ دنیا مردہ ضمیر کے انسانوں سے آباد ہے جو ہر وقت اس کے لوٹ لینے کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں دوسری طرف جو لوگ شیریں اور محبت آمیز خیالوں میں استغراق رکھتے ہیں دنیا کو ہمدردی اور محبت سے لبریز پاتے ہیں اور مغالطہ کے شکار نہیں ہوتے ۔ نیک سیرت اور فیاض طبع لوگ دوسروں کی خوش نصیبی پر خوشی مناتے

ہیں اور حسد کے مفہوم سے بھی بیگانہ ہوتے ہیں جو شخص اپنے اندر خدا کو دیکھتا ہے وہ دنیا کی تمام چیزوں میں حتیٰ کہ درندوں کی شکل میں بھی اُسی کو جلوہ آرا پاتا ہے۔ قدیم اور مشہور ضرب المثل "کند ہمجنس باہمجنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز" جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اس سے اہم تر بصیرت افروز نکتہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ دنیائے مادہ اور دنیائے خیال دونوں میں یہ آئین فطرت کارفرما ہے اور ہر چیز اپنی جنس کی طرف رجوع ہوتی ہے۔

اگر تم ان لوگوں میں سے ہو جو دعا کرتے ہیں اور اس تمنا میں جیتے ہیں کہ قبر کی منزل موجودہ دور زندگی سے زیادہ خوش فضا ہو تو میرے پاس تمہارے لئے خوشخبری ہے کہ تم اس راحت و نشاط سے بھی ہم کنار ہو سکتے ہو اور کائنات کا ہر ذرہ اس سے معمور ہے۔ یہ بہار نظر اور وادی جنت تمہاری منتظر ہے کہ تم اسے ڈھونڈھ نکالو شناخت کرو اور حاصل کر لو۔ ایک عارف کا قول کہ اگر لوگ تم سے کہیں کہ ادھر دیکھو تو تم اپنی نگاہوں کو انکا تعاقب کرنے سے باز رکھو۔ خدا کی بادشاہت تو خود تمہارے اندر ہے اور خدا کی جلوہ گاہ خود تمہارا دل ہے تو پھر تم خدا کو اپنے ہی دل میں کیوں نہیں ڈھونڈھتے۔

گویند کہ کنہ ذات او نتواں یافت ۔ ما یافتہ ایم ایں کہ کنہش مائیم

تم اس نکتہ کو اپنا موضوع فکر بنا لو پھر تم خود اپنے اندر کعبہ تعمیر کر سکتے ہو جب تم ایک بصیرت سے دوسری بصیرت تک اور ایک مشاہدے سے دوسرے مشاہدہ تک گزر و گے تو اپنی ذات سے جدا اور بیرونی چیزوں کی بے بسی و بیچارگی اور خود مختار باطنی قوت کی ساحرانہ قدرت اور اختیار مطلق کی صداقت تم پر منکشف ہو جائیگی۔ تم اپنے دل و دماغ کو صرف محبوب کے خیالات سے پُر کر لو تمہارے قدم خود تمہیں محبوب کے پاس پہونچا دینگے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپ چلکر تمہارے پاس آجائے۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ عزم اپنا راستہ خود صاف کر لیتا ہے۔ خیال ہی تو عمل کا محرک ہے اگر تمہارے خیالات بلند ہیں تو کیا وہ تمہیں بلندی پر نہیں چڑھا لیجائیں گے پس ثابت ہوا کہ عظمت اور ذلت کی بنا صرف ہمارے خیالات ہیں "جیسے" ہم "ہیں ویسی ہی" ہماری دنیا "ہے۔ اور دنیا ہماری "دماغی کیفیات کا عکس ہے"

دانیالی بشارتیں

(۳)

سنہ ولادت

اب جبکہ ہم نے متعین کر دیا کہ بخت نصر کا پہلا سال ۱۳۶۸ق ھ یا ۶۴۷ق م تھا تو اب آیئے ہم ان بشارتوں پر غور کریں جن میں آنحضرت صلعم کی ولادت، بعثت، ہجرت وغیرہ اہم ایام زندگی کی خبریں موجود ہیں۔

سنہ ۳ جلوس خسرو گشتاسب میں فرشتہ نے دانیال کو خبر دی کہ اب ایران میں چار بادشاہ اور ہونگے، اس کے بعد یونان کا سردار آئے گا جس کے مرنے کے بعد اسکی حکومت چار حصوں میں منقسم ہو کر مٹ جائے گی۔(۱۱: ۱تا۵)

اس کے بعد شاہ جنوب اور شاہ شمال کی جنگوں کا تذکرہ کیا ہے پھر (۱۱:۳۱) میں پیش گوئی ہے شاہ شمال کے ساتھی بیت المقدس کو ناپاک کرینگے اور دائمی قربانی پھر موقوف کر دیں گے اور اس میں تباہ کرنے والی مکروہ چیز دھر دینگے چنانچہ انطوکیوس کے عہد میں یہ ہوا اور خاص الہام گاہ میں اولمپس دیوتا کی مورت نصب کی گئی۔

اس کے بعد بھی شاہ شمال اور شاہ جنوب کی جنگ کا تذکرہ جاری رکھا ہے اور آخر میں فرماتے ہیں کہ

"اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری حفاظت کے لئے کھڑا ہے اٹھیگا" (۱۲:۱)

میکائیل کی آمد سے مراد یقینی طور پر کسی نبی کی آمد ہے، مسیح حضرت میکائیل موعود حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو سمجھتے ہیں لیکن انصاف تو یہ فرماتا ہے کہ اس سے مراد کوئی اور ہے۔

اسی آیت کی بنا پر عہد نبوت کے یہود ایک پیغمبر کا انتظار کرتے تھے اور اس کی بعثت کی

تاریخ بھی بتایا کرتے تھے، حضرت محمد صلعم جب مبعوث ہوئے تو ایاندار یہود نے آپ کو قبول کیا، جاہ پسند اور ازلی بدبخت رکے رہے، کچھ یہود ایسے بھی تھے جو پوری طرح جانچ کر کہ وہی موعود ہیں ایمان لاتے تھے۔

اس قسم کے لوگ اکثر اپنے علما سے چند امتحانی سوالات دریافت کرکے آتے اور آنحضرت صلعم کے سامنے پیش کرتے بالآخر صحیح جواب پاکر مان لیتے۔ اس لئے تیز فہم علمائے یہود نے یہ جانکر کہ یہودیوں کا دانیال باب ۱۲ کے باعث یہ خیال ہے آئندہ پیغمبر پر وحی لانیوالے فرشتہ کا نام میکائیل ہے اور حضرت رسول خدا اپنے فرشتہ کا نام جبرئیل بتاتے ہیں اس لئے انہوں نے کچھ نیم خواں لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ محمد صلعم پر ایمان لانے سے پہلے یہ تو دریافت کرلو ان پر کونسا فرشتہ پیام لاتا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں آئے اور سوال کیا تو جواب ملا کہ "جبرئیل"، مفسرین نے باسناد لکھا ہے کہ یہ نام سنکر انہوں نے کہا کہ میکائیل پیام لاتے تو ہم ضرور ایمان لاتے جبرئیل تو ہمارے دشمن ہیں (یعنی فرشتہ قہر وعذاب ہیں) اس پر ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ مصدقا لما بین یدیہ وھدی وبشری للمومنین۔	کہدو کہ جبرئیل کا دشمن جو بھی ہو، انہیں نے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے پچھلی کتابوں کی تصدیق اور ایمان والوں کی ہدایت اور خوشی کے لئے اس کو اتارا۔

آیت کا آخری ٹکڑا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کتب سابقہ میں بھی یہ پہلے سے متعین تھا کہ آخری پیغمبر پر جبریل ہی پیام لائیں گے۔

یہود کی غلط فہمی کیوجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے میکائیل کو یہاں علم یعنی ایک فرشتہ کا نام سمجھ لیا حالانکہ یہ لفظ یہاں اسم صفت ہے۔ یہ لفظ تین لفظوں کا مجموعہ ہے (۱) پہلا کا عربی تلفظ ما یا من ہے (۲) یہ دوسرا عربی کاف تشبیہ ہے (۳) ایل کے معنی ہیں خدا

اس پورے مرکب کے معنی ہیں وہ وہ جو خدا جیسا (واجب الاطاعت) ہو" اور یہی معنی یہاں مراد ہیں ورنہ خود دانیال کی کتاب سے ظاہر ہے کہ انکے پاس بھی حضرت جبریل ہی پیغام لاتے

تھے، اسی طرح ہی فرشتہ جبریل ہر پیغمبر کے پاس بشارت لایا کیا ہے۔

بہرحال حضرت دانیال فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے ان کو ہیکل کی تباہی اور پھر مسلسل جنگوں کے بعد ایک خدا جیسے واجب الاطاعت بزرگ کے آنے کی بشارت دی اور انکے آنے کے زمانہ کے متعلق فرمایا۔

اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہو گا جو امت کی ابتدا سے اس وقت تک کبھی نہ ہوا تھا (۱:۱۲)

یہ آیت صاف اشارہ کرتی ہے کہ آمد میکائیل کا زمانہ ۷۰ء کے بعد ہے کیونکہ ۷۰ء سے پہلے کوئی وقت ایسا نہ گزرا جو یہود کے لئے ۲۱ء ق م سے زیادہ سخت ہو۔

میکائیل موعود کے خاص فرائض یہ ہیں :۔

(۱) نجات ابدی بخشنا چنانچہ فرمایا" اس وقت تیری امت سے ہر ایک جس کا نام کتاب تقدیر) میں لکھا ہو گا نجات پائیگا (۱:۱۲)

(۲) ابدی زندگی دینا" بہتیرے جو زمین پر خاک میں سوئے ہیں جاگ اٹھیں گے بعض حیات ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت ابدی کے لئے" (۲:۱۲)

(۳) اہل دانش کو چاند سورج اور ستاروں کی طرح چمکانا" اہل دانش فلک کی چمک (منار یعنی سورج) کی مانند چمکیں گے اور وہ جن کی کوشش سے بہتیرے صادق ہونگے ستاروں کی مانند" (۲:۱۲) اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم۔

آگے چل کر، دیں، گیارہویں اور بارہویں آیتوں میں میکائیل موعود کی آمد کے مختلف زمانے بتائے ہیں جو آنحضرت صلعم کے سال ولادت سال بعثت اور سال اعلان نبوت پر ختم ہوتا ہے۔

چنانچہ ۱۲ دیں باب کی گیارہویں آیت میں فرمایا کہ" جس وقت سے دائمی قربانی موقوف ہوگی، اور مکروہ چیز جو خیرات کرتی ہے قائم کیجائے گی ۱۲۹۰ دن ہونگے "،

" دن" سے مراد مسیحیوں کے نزدیک سال ہے، اور انہوں نے " موقوف ہو گی" اور

"قائم کیجائے گی" ترجمہ کر کے ہم کو مجبور کر دیا کہ ۱۲۹۰ دنوں کا شمار اس بربادی سے کریں جس کی خبر دانی ایل نے ۱۲: ۱۱ میں دی ہے۔

اس معنی کے لحاظ سے یہ بشارت (نعوذ باللہ) جھوٹی ہوگئی اور موعود زمانہ گذر گیا نہ تو سنہ ۱۷۰ ق م کے بعد ۱۲۹۰ سال گزرنے پر سنہ ۱۱۲۱ء میں اور نہ سنہ ۷۰ء کے بعد ۱۲۹۰ سال بعد سنہ ۱۳۶۱ء میں کوئی میکائیل آیا اور نہ اب امید ہے۔

"جس وقت سے دائمی قربانی موقوف کیجائیگی اور مکروہ چیز جو خراب کرتی ہے قائم کیجائیگی" کے بجائے عربی نسخوں میں ذیل کی عبارت ہے۔

من وقت ازالۃ المحرقۃ الدائمۃ واقامۃ رجس المخرب

دائمی قربانی کے موقوف ہونے اور برباد کرنے والے کی ناپاکی کے قیام زمانہ سے

یہ ترجمہ تو صحیح ہے مگر عربی میں بھی "یوم" کا لفظ اردو کی طرح محدود قرار دیا گیا ہے حالانکہ اصل عبری میں یوم کا لفظ عدد کیطرف مضاف ہے اور سامی زبانوں میں جب یہ لفظ کسی واقعہ کی طرف مضاف ہوتا ہے تو زمانہ کے معنی دیتا ہے اور گنتی کی طرف مضاف ہوتا ہے تو کسی سنہ کو نامزد کرتا ہے، دوالعرب کے مصنف نے لکھا ہے کہ عبری کے علمانے مترجموں کی کمیٹی کو اس آیت کے ترجمہ کیطرف توجہ دلائی مگر انہوں نے یہ تکلیف گوارا نہ کی، صحیح ترجمہ عبارت کا یوں ہونا چاہئے۔

دائمی قربانی کی موقوفی اور برباد کرنے والے کی نجاست (مشرکانہ حکومت) کے قیام سے اسوقت تک ۱۲۹۰ سال کا زمانہ گزر چکا ہوگا۔

اس ترجمہ کے مطابق سنہ ۱۲۹۱ اسیری یکونیاہ وہ زمانہ ٹھہرتا ہے جس میں خدا جیسے واجب الاطاعت کو آجانا چاہئے

ابھی ہم ثابت کر آئے ہیں کہ بخت نصر کا پہلا سال حکومت سنہ [illegible] ق م تھا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ابتدائے سنہ ہجری سے ۱۳۶۸ سال ۱۳۵ دن قبل اس کی حکومت قائم ہوئی۔

ان ۱۳۶۸ سالوں اور دنوں میں سے (۱۲۹۰) برس گھٹا دو تو ۷۸ برس ۱۳۹ دن بچتے ہیں جلوس بخت نصری اور اسیری یکونیاہ کے سنین میں کچھ دن کم یا بیش ۲۶ برس کا فرق ہے کیونکہ یکونیاہ ہ سالہ یہویاقیم کے آخری مہینوں میں گرفتار رہا، اور اس کی گرفتاری سے ۲۶ برس پہلے بخت نصر حاکم بابل ہو چکا تھا۔

۷۸ برسوں میں سے ۲۶ برس نکال دو تو ۵۲ برس کا فرق نکلتا ہے۔

حضور صلعم ۴۰ برس کی عمر میں مبعوث ہوئے بارہ برس تک مکہ میں مقیم رہے تیرہویں برس ہجرت کی اس لئے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے سنہ ۲۹۱ اسیری یکونیاہ اور حضور صلعم کا سنہ میلاد ایک چیز کے دو نام ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے سنہ مسیحی کی ابتدا سے ۷۴۷ برس اور ۳۱۲ دن پہلے بخت نصری سال شروع ہوتا ہے، اس کے ۲۶ برس بعد ۷۲۱ ق م یکونیاہ گرفتار رہا، اور خانہ خدا برباد ہوا، ان سنین کے بعد ۱۲۹۰ کا زمانہ ۵۶۹ء یا ۵۷۰ء پر ختم ہوتا ہے، اور ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میکائیل موعود کی آمد کا زمانہ ٹھہرتا ہے، یہ زمانہ آنحضرت صلعم کے زمانہ ولادت کے مطابق ہے دنیا جانتی ہے کہ آپ نے ۵۷۱ء میں ظہور اجلال فرمایا، فقہا آپ کو عموماً شارع علیہ السلام کہا کرتے تھے، لفظ "شارع" (۵۷۱) گویا آپ کا تاریخی نام ہے۔

افسوس ہم حساب کی غیر دلچسپ الجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہئے ورنہ شاید یہ بتانا بھی ممکن ہو کہ یہ ۱۲۹۰ کی میعاد عین اس روز اور عین اس وقت ختم ہوتی ہے جس کے بعد والے دن، بلکہ بعد والی ساعت میں حضور صلعم نے دنیا کو منور فرمایا۔

سنہ بعثت

اس باب ۱۲ کی ساتویں آیت حضور صلعم کا سن بعثت بتاتی ہے فرشتہ جب شاہ شمال کے ہاتھوں ہیکل کی ہونیوالی بربادی کی اطلاع دے چکا اور کوہ مقدس پر اسکی گلال باڑی کے قیام اور میکائیل موعود کی آمد کا تذکرہ کر چکا تو ایک فرشتے کے سوال پر دوسرے نے کہا کہ یہ باتیں

ایک مدت اور مدتوں اور نصف مدت رہیں گی جب وہ پورا کر چکے گا تو ساری باتیں ہونگی (۱۲:۷)

اس مدت کا شمار ۱۱:۳۰ میں مذکور شاہ شمال کے ہاتھوں سے ہونیوالی بربادی کے سال سے کرنا چاہئے جو سنہ ۱۷۰ ق م میں ہوئی۔

اس موقع پر "مدت" "دور" کا ترجمہ ہے جو ایرانی چرخ کیش ۱۲ ویں گردش کا زمانہ ہے ایران میں ۱۱۹ سال ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا۔ ۱۲۰ واں سال کبیسہ کا ہوتا تھا، جس میں پچھلے سالوں کے ایام کی کسر کو جوڑ کر ایک ماہ کبیسہ کرتے اور ایک گردش کیش پوری ہوجاتی ایسی ۱۲ گردشوں کے بعد جب ایک چرخ کیش پورا ہوجاتا تھا تو موسموں کا حساب بھی از سر نو درست ہوجاتا تھا۔

حضرت دانیال چونکہ اس بشارت کے وقت ایران کے محکوم تھے اور ایرانی سال استعمال کرتے تھے اس لئے انہوں نے ایرانی ہی تقویم کے اصول پر بشارت دی۔

اس موقع پر عربی میں "مدتوں" کے بجائے "زمانین" کا لفظ ہے اس قرأت کے مطابق ۱۲:۷ کی مذکور میعاد صرف ۳½ دور یعنی ۴۲۰ سال ہوتی ہے

سنہ ۱۷۰ کے بعد ۴۲۰ سال کی مدت سنہ ۲۵۰ء پر ختم ہوتی ہے، سنہ ۲۵۱ء میں میکائیل کو آنا چاہئے مگر یہ زمانہ گزر گیا اور کوئی میکائیل نہ آیا۔

فرض کرو ۱۱:۳۰ میں سنہ ۷۰ والی بربادی مذکور ہے پھر بھی سنہ ۴۹۰ء میں یہ مدت گزر گئی اور کوئی مدعی نبوت نہ آیا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ انگریزی، اردو، ہندی اور فارسی ترجمہ جس میں تثنیہ کے بجائے جمع کا ترجمہ کیا گیا ہے صحیح ہے،

جمع عبری میں ۳ سے لیکر ۹ تک دلالت کرتی ہے، اس بنا پر ایک اور کئی اور نصف دور کے معنی ۴½، ۵½، ۶½، ۷½، ۸½، ۹½ اور ۱۰½ دور میں سے کوئی ایک ہوسکتا ہے

اگر ہم ۱۱:۳۰ والی بربادی کو سنہ ۷۰ کی سمجھیں تو بھی (۷۰ + ۴½ × ۱۲۰ = ۶۱۰) موعود مدت سنہ ۶۱۰ء پر ختم ہوتی ہے اور اگر سنہ ۱۷۰ ق م والی بربادی کو سمجھیں تو بھی (۱۷۰ - ۶½ × ۱۲۰ = ۶۱۰) مدت

سنہ ۶۱۱ء ہی پر ختم ہوتی ہے اور سنہ ۶۱۱ء آمد میکائیل کا زمانہ ٹہرتا ہے اور اس سال آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے۔

اگر ہم ۴½ اور ۶½ دور مطلب سمجھنے کے بجائے ۵½ دور یا کوئی اور معنی مراد لیں تو میکائیل کا زمانہ ذیل کے سنین میں سے کوئی ایک پڑے گا، ان میں سے کوئی سنہ نہ تو دانیال ۱۲: ۱۱ اور دانیال ۱۲: ۱۲ میں مذکور زمانہ سے مطابق ہوتا ہے اور نہ ان میں سے کسی سنہ میں کوئی میکائیل آیا۔
نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

سنہ ۷۱ء سے ۵۴۰ سال بعد والا برس سنہ ۶۱۱ء ہے اسمیں آنحضرت مبعوث ہوئے = ۴½ دور

〃 〃 ۶۶۰ 〃 〃 〃 سنہ ۷۳۱ء کوئی مبعوث نہوا = ۵½ 〃
〃 〃 ۷۸۰ 〃 〃 〃 سنہ ۸۵۱ء 〃 〃 = ۶½ 〃
〃 〃 ۹۰۰ 〃 〃 〃 سنہ ۹۷۱ء 〃 〃 = ۷½ 〃
〃 〃 ۱۰۲۰ 〃 〃 〃 سنہ ۱۰۹۱ء 〃 〃 = ۸½ 〃
〃 〃 ۱۱۲۰ 〃 〃 〃 سنہ ۱۲۱۱ء 〃 〃 = ۹½ 〃
〃 〃 ۱۲۶۰ 〃 〃 〃 سنہ ۱۳۳۱ء 〃 〃 = ۱۰½ 〃

سنہ ۷۱ ق سے ۵۴۰ سال بعد والا برس سنہ ۳۷۱ء ہے اسمیں کوئی نبی نہ آیا

〃 〃 ۶۶۰ 〃 〃 سنہ ۴۹۱ء 〃
〃 〃 ۷۸۰ 〃 〃 سنہ ۶۱۱ء آنحضرت مبعوث ہوئے
〃 〃 ۹۰۰ 〃 〃 سنہ ۷۳۱ء کوئی نبی نہ آیا
〃 〃 ۱۰۲۰ 〃 〃 سنہ ۸۵۱ء 〃
〃 〃 ۱۱۴۰ 〃 〃 سنہ ۹۷۱ء 〃
〃 〃 ۱۲۶۰ 〃 〃 سنہ ۱۰۹۱ء 〃

اعلان نبوت کا سال (۶۱۵ء)

۱۲ ویں باب کی بارہویں آیت میں میکائیل موعود کی آمد کا جو زمانہ بتایا گیا ہے، اگرچہ بظاہر (۱۲: ۱۱ اور ۱۲: ۷) میں مذکور مدت کے خلاف پڑتا ہے لیکن آنحضرت کے زمانہ میں آکر اس آیت کا زمانہ آنحضرت صلعم کے اعلان نبوت کے سال پر منطبق ہوتا ہے۔

حضرت دانیال فرماتے ہیں "مبارک ہے وہ جو انتظار کرتا ہے اور ۱۳۳۵ دن تک آتا ہے" اصل عبری کے مطابق صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے، بشارت ہے اس کے لئے جو انتظار کرتا ہے اور ۱۳۳۵ کے زمانہ میں آتا ہے۔ یہ ۱۳۳۵ گرفتاری بکونیاہ مطابق ۶۱۵ء ہے جو آنحضرت صلعم کے اعلان نبوت کا سال ہے۔

آنحضرت صلعم دانی ایل (۱۲: ۱۱) کی بشارت کے مطابق ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے اور (۱۲: ۷) کی بشارت کے مطابق ۶۱۱ء میں مبعوث ہوئے پھر ۶۱۲ء ۶۱۳ء ۶۱۴ء میں سال تک فترت وحی اور شعب ابی طالب میں نظر بند رہنے کا زمانہ ہے ۶۱۵ء میں یایہا النبی بلغ ما انزل الیک اور فاصدع بما تؤمر وغیرہ آیتیں نازل ہوئیں اور آپ نے دعوت شروع کی اس لئے یہ قطعی ہو گیا کہ میکائیل موعود سے مراد یقیناً آنحضرت صلعم تھے۔

سنہ ہجرت

دانیالؑ نے نویں باب میں حضور صلعم کا سنہ ہجرت بھی بتایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے ان سے کہا کہ "اے دانیال! میں اس لئے نکل آیا ہوں کہ تجھے دانش اور سمجھ بخشوں ..... سو اس بات کو بوجھ اور اس رویت کو سمجھ، ستر ہفتے تیرے لوگوں اور تیرے شہر مقدس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تاکہ اس مدت میں شرارت ختم ہو، اور خطا کاریاں آخر ہو جائیں اور بدکاری کی بابت کفارہ کیا جائے، اور ابدی راستبازی پیش کی جائے اور اس رویت پر اور نبوت پر مہر ہو اور اس پر جو سب سے زیادہ قدوس ہے مسح کیا جائے"۔ (دان ۹: ۲۴)

اس موقع پر ترجمہ کی ایک غلطی کو سمجھ لینا چاہئے "اس رویت" ترجمہ صحیح نہیں، "اس"

کی جگہ عبری ہیں (הַ) ہے، اس کی انگریزی (The) اور عربی (اَلْ) ہے اردو میں اس کے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان آیتوں میں ۷۰ ہفتے توبہ و استغفار کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، اس کے بعد سب سے زیادہ قدوس مسیح (خلیفۂ الٰہی) مبعوث ہوگا۔

یہود میں ایک ہفت سالہ عید بھی ہوتی ہے، اس بنا پر اسبوع یا ہفتہ کا لفظ سات برس کے معنی بھی دیتا ہے، اس لئے ۷۰ ہفتوں کے معنی ۴۹۰ برس کے بھی ہوتے ہیں، یہود اور نصاریٰ دونوں اس موقع پر لفظ کے یہی معنی مراد لیتے ہیں، اس لئے اس مفہوم کی صحت ثابت کرنے سے ہم سبکدوش ہیں۔

چونکہ اس آیت میں یہ مذکور نہیں کہ ۴۹۰ دنوں یا ۴۹۰ برسوں کی میعاد کب سے شروع ہو اس لئے بعد کی آیتوں میں فرمایا۔

سو تو بوجھ اور سمجھ، کہ جس وقت سے یروسلم کی دوبارہ تعمیر کا حکم نکلے مسیح بادشاہزادہ تک ۷۰ ہفتے اور ۶۲ ہفتے (۹: ۲۵)

مسیحی اس شاہزادہ مسیح اور (۹: ۲۴) کے سب سے زیادہ قدوس مسیح (خلیفہ خدا) دونوں کو ایک سمجھتے ہیں، لیکن اول تو القاب کی دوئی ثانیاً زمانہ کا اختلاف بتاتا ہے کہ یہ دونوں دو بزرگ ہیں، وہ جو سب سے زیادہ قدوس ہے یوحنا لاہوتی اس کے گواہ ہیں کہ یوحنا کے بعد آنیوالا ہے۔ علاوہ بریں اسی موقع پر یہ مذکور ہے کہ سب سے زیادہ قدوس مسیح تو ۷۰ ہفتے توبہ و استغفار کے گزر جانے پر آئے گا لیکن مسیح بادشاہزادہ، دوبارہ تعمیر کی اجازت سے ۶۹ ہفتوں کے اندر پیدا بھی ہوگا اور اسی مدت کے بعد دنیا سے اٹھ بھی جائے گا کیونکہ فرشتہ نے بتایا

اس وقت بازار پھر تعمیر کئے جائیں گے، اور دیوار بنائی جائے گی مگر تنگی کے دنوں میں اور ۶۲ ہفتوں کے بعد[۱] مسیح بادشاہ زادہ قتل کر دیا جائے گا پر نہ اپنے لئے (۹: ۲۵، ۲۶)

---

[۱] "کے بعد" کی جگہ "تک" صحیح ترجمہ ہے، اور عربی کے مطابق ہے۔ (نوٹ کے لئے دیکھو صفحہ ۲۳)

زمانہ
پیش گوئی ۳۳ء میں پوری ہوئی۔ اس کے بعد کا نقشہ یہ ہے۔
اور بادشاہ جو آئے گا اس کے لوگ شہر مقدس کو غارت کریں گے۔ اور اسکا آخر آئے گا گویا طوفان کے زور سے اور آخر تک لڑائی رہے گی اور مقرر کی ہوئی خرابیاں ہوں گی (۹: ۲۶)

۷۰ء میں رومیوں نے شہر (یروشلم) اور مقدس (ہیکل سلیمانی) کو غارت کیا۔ اس کے جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے متعلق فرمایا۔

"اور وہ ایک ہفتہ کے لئے اس عہد کو بہتوں کے لئے قائم کریگا۔

چنانچہ بربادی کے بعد ایک زمانہ تک حکومت روما مسیحیوں پر مہربان رہی۔

اور ہفتہ کے بیچ ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا اور فصیلوں پر اُجاڑنے والی مکروہات (یعنی بت) دھری جائیں گی یہاں تک کہ اس کی بالکل غارت ہو، اور وہ بلا (نہیں بلکہ قضائے مبرم) جو مقرر کی گئی ہے اس اجاڑنے والے پر واقع ہوگی۔

یہ پیش گوئی ۱۳۱ء کے قریب ایلیا قیصر کے زمانہ میں پوری ہوئی
۷۰ء میں طیطوس نے ہیکل کو مسمار کر دیا اور یہود کو جلاوطن کر دیا، لیکن قیصر نارون کے عہد میں بنی اسرائیل دوبارہ واپس آکر یروشلم میں آباد ہوئے، طیباریوس قیصر کو جب معلوم ہوا کہ یہود کی تعداد یروشلم میں روز بروز بڑھ رہی ہے تو پھر اس نے انکا قتل عام شروع کیا۔ اس کے بعد اندریانوس قیصر ہوا، اسکا بیٹا ایلیا بیمار رہا تو اس نے خدا کو خوش کرنے کے لئے پھر سے شہر بیت المقدس کو تعمیر کیا، یہ خبر پاکر کچھ یہود پھر یروشلم میں آبسے، اندریانوس

(نوٹ صفحہ ۲۲) ؎ یہ ترجمہ ہمارے عقیدہ کے خلاف ہے، عبری میں (تقطع) ہے اور عربی ترجمہ "یقطع" ہے
اصل عبری کے مطابق اس کے دو ترجمے ممکن ہیں۔
(۱) قتل ہو جائیگا۔ (۲) دنیا سے کٹ جائیگا۔

کے بعد جب ایلیا، تخت قیصری پر بیٹھا اور اس کو یہ خبر ہوئی کہ یہود پھر یروشلم میں آ رہے ہیں تو اس نے دوبارہ شہر کو مسمار کر دیا اور حکم دیا کہ یونانیوں کے سوا کوئی یہودی یہاں بسنے نہ پائے اور اس نے یونانیوں کو اجازت دی کہ وہ ہیکل کے دروازہ پر برج بنائیں اور اس میں زہرہ دیوی کا بت نصب کریں۔ یہ برج مسلمانوں کے زمانہ تک موجود رہا۔ ۷۰ء سے پورے ۵۳ برس بعد ۱۲۳ء میں ایلیا نے دوسری مرتبہ یروشلم کو برباد کیا اور کم از کم اس کے چھ سات برس کے بعد برج ایلیا تیار ہوا ہوگا جس میں زہرہ دیوی کا بت نصب کیا گیا، تقریباً ۱۳۱ء کا واقعہ ہے۔

اسی سنہ کے بعد سے ۴۹۰ سال انتظار کے بتائے ہیں، جو تقریباً ۶۲۱ یا ۶۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ زمانہ حضور صلعم کی ہجرت کا ہے۔

حسرت موہانی کی شاعری

جلیل قدوائی صاحب بی۔ اے نے کلام حسرت کا انتخاب کیا ہے جو انشاء اللہ بہت جلد مکتبہ جامعہ کیطرف سے شائع ہوگا۔ یہ مضمون اُسکا مقدمہ ہے

مدیر

جس طرح اُردو شاعری میں استادِ سخن میرؔ کا مرتبہ مسلم ہے اسی طرح حسرت موہانی کے اعجاز کا بھی موجودہ دورِ شاعری میں کوئی منکر نہیں ہو سکتا۔ وہ روحِ عالی جو قیدِ جسم سے آزاد ہو کر آسمانی اور تخیلی فضاؤں میں محوِ پرواز ہوتی ہے، وہ نغمۂ لطیف جو آوازِ ساز سے ماورا دل کی گہرائیوں اور جذبات کی تہوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے!

شلرؔ کہتا ہے: "ہر آرٹ کا مقصد افزایش مسرت ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ اہم اور سنجیدہ کوئی مسئلہ نہیں کہ انسان کو کس طرح خوش رکھا جائے۔ صحیح آرٹ صرف وہ ہے جو سب سے زیادہ آسایش اور خوشی پیدا کرے"۔ اسی لئے دنیا میں فنونِ لطیفہ کی بنیاد پڑی جو ہمارے ذوقِ لطیف اور احساساتِ رقیق کو متاثر کرتے ہیں اور ہم عالمِ خیال میں پہونچکر اُن سے ایک ایسا پرکیف اور لذت آفریں لطف اٹھاتے ہیں جو ہمیں عالمِ واقعات میں حاصل نہیں ہوتا۔ شاعری کو ان فنونِ لطیفہ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور بعض خصوصیات کی بنا پر یہ ان سے کہیں زیادہ پرتفوق اور قابلِ قدر فن ہے۔ شاعری کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اتنا ہی دشوار ہے جتنا حسن و عشق کی تعریف کرنا۔ شاعری کی مختصر و جامع، طویل و تشنہ اس قدر تعریفیں کی گئی ہیں کہ اگر انہیں مرتب کر دیا جائے تو کئی جلدوں کی ایک مبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن ان سب کو پڑھنے کے لئے اگر موقع اور فرصت مل بھی جائے تو بھی یہ سوال کہ شاعری کیا ہے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس لئے اس سوال کو اسی طرح تشنہ جواب چھوڑ کر

اپنے مضمون کے حدود میں ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہوں۔

لی ہنٹ کہتا ہے "ہر شاعر ایک ناظم ہے، ہر اچھا شاعر ایک اچھا ناظم اور بہترین شاعر وہ ہے جس کے کلام میں زور، شیرینی، بے تکلفی، تنوع لیکن اسی کے ساتھ یکجائی یعنی ربط سب سے زیادہ پایا جائے" حسرت موہانی اس معیار پر پورے اترتے ہیں، انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جو صنف سخن اختیار کی ہے وہ مشرقی ادب میں انہیں خصوصیات کے لئے مشہور ہے۔

سال بھر ہوا رسالہ معارف اعظم گڑھ میں حسرت کی شاعری کے متعلق ذیل کے خیالات ظاہر کئے تھے:۔

اے وہ کہ ترے سخن نے کی ہے ۔۔۔ غمازی سوزش نہانی
تیرے جو سے سخن سے ابلا ۔۔۔ سرچشمہ بادۂ جوانی
پژمردہ رگوں میں ہے ترے خون ۔۔۔ اور خون میں گرمی روانی
صحرا کو بنا دیا ہے گلزار ۔۔۔ اللہ ری تیری خوں فشانی
تو رمز شناس عاشقی ہے ۔۔۔ ہے درد بھری تری کہانی
ہر نقش میں زخم دل ہویدا ۔۔۔ اللہ ری سوزش نہانی
نغموں میں بھی اک تڑپ ہے پیدا ۔۔۔ اللہ رے ترا غم نہانی
تیرے ہر شعر میں ہے پنہاں ۔۔۔ پیغام حیات جاودانی
نالوں میں ترے نہ کیوں اثر ہو ۔۔۔ ہے داغ جگر کی یہ نشانی
تیری رنگینیوں میں پنہاں ۔۔۔ انداز نظیری و فغانی
تیری صناعیوں کے آگے ۔۔۔ وہم باطل ہے نقش مانی
اس ملک سخن میں تو ہے یکتا ۔۔۔ اردو میں ہے کون تیرا ثانی؟
اس دل کو ترے سخن کی گرمی ۔۔۔ ہے ماحصل حیات فانی
ارباب کمال میں تری قدر ۔۔۔ افسوس یہ ہے کہ کم نے جانی

ناقدر شناس ہند میں کون   سنتا ترے درد کی کہانی!
ہے حسن ہے ابھی فضائے اردو   ہوگی کبھی تیری قدر دانی
تو خلد بریں کا یہاں ہے   اے طوطی گلشن معانی
پھر روح کو محو ساز کر دے   پھر چھیڑ کوئی نئی کہانی
ہو جائیں دلوں سے دور صدمے
خاموش فضا میں بھر دے نغمے!

میں سمجھتا ہوں باوجود کوشش کے حسرت کی شاعری کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ مشکل سے کہہ سکوں گا، لیکن ذرا دیکھئے اس اجمال کی تفصیل کیسی حسین ہو سکتی ہے۔

حسرت کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اُن کی شاعری عشق کی شاعری ہے اور جس طرح عشق اپنی ابتدائی کیفیات اور درمیانی منازل طے کرتا ہوا انتہائے اصلی تک پہنچتا ہے اسی طرح حسرت کی شاعری عشق مجازی سے شروع ہو کر اُس کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر حاوی ہو کر حسن کے تخیلی پیکر کی تلاش میں آخر روحانیت رضا جوئی حق عشق ملت اور حب قوم پر ختم ہوتی ہے، اُنکے عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی جوش اور شعلے ہیں اسی وجہ سے اُنکا ہر شعر سرتاپا اثر میں ڈوبا ہوتا ہے، زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے شام وسحر کی ہزارہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں اور حسرت کا ترجمہ چاہے کسی زبان میں ہو اُن کے اشعار کی قدروقیمت نہیں کم ہو سکتی، اُن کی شاعری زبان ومقام کی قید سے آزاد ہے۔ حسرت انسانیت کا ترجمان ہے، ان جذبات، اُن لطیف وپاکیزہ احساسات کا ترجمان ہے جو رہتی دنیا تک قائم ہیں اور اس دن سے پہلے ختم نہیں ہوتے جب یہ "خاکدان اضطراب" جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائے . . . . اور کون جانتا ہے اس کے بعد بھی خاک کو سکون اور آسودگی میسر ہوگی۔ عشق کی زندگی گزار کر اپنی شاعری پر ایک پر وجد اور والہانہ کیفیت اور اثر طاری کر لینا حسرت کا کمال ہے۔ محبت کی کیفیت کوئی ادنے سے ادنے کیفیت ایسی نہیں جس سے حسرت ناواقف ہو اور جس کی ترجمانی ایک

سچے شاعر کی زبان میں اس نے نہ کی ہو۔ اس سلسلہ میں ایک دوست نے کیا چبھتی ہوئی بات کہی "حسرت کے پہلو میں اب دل کی جگہ تھوڑی سی راکھ ہوگی!"

حسرت کی شاعری کی جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک سب سے بڑی خوبی اُنکا انداز بیان ہے۔ اُن کی زبان شستہ، رفتہ اور اُنکا طرز بیان رواں، شگفتہ اور خوش نما ہے۔ اُن کی نرالی ترکیبیں، اُنکے بولتے ہوئے فقرے، اُنکے بانکے اور اچھوتے ٹکڑے از بس پرکیف اور وجد آور ہیں جو سننے والے کے دل میں تیر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ ٹالسٹائے کے نظریۂ آرٹ کے مطابق آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص طبقہ کی ملکیت نہ رہ جائے بلکہ اُسکا فیض عام و خاص، جاہل و تعلیم یافتہ چھوٹے اور بڑے سب کے حق میں یکساں ہو۔ اُس سے ہر روح میں روشنی، ہر دل میں سرور اور ہر دماغ میں نشہ یکساں چھا جائے۔ حسرت موہانی کے کلام میں اُن کی روانی، بے تکلفی، بانکپن، اور پھر ان سب چیزوں کے امتزاج سے ایک خاص قسم کا اثر اس درجہ دل پذیر ہے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے لوگوں میں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔

اردو شاعری کی پرانی رسم کے مطابق حسرت کا جولانگاہ شوق ایک محدود صنف شاعری یعنی غزل ہے اور انگریزی مذاق شعر سے متاثر و مرعوب احباب غزل کو کتنا ہی برا کہیں اُس کی قیدوں اور بندشوں کو زبان اور ادب کے لئے کتنا ہی خطرناک خیال کریں کم از کم اُس رنگ شاعری کے لئے جو حسرت کا ہے وہ غزل کی صنف کی پابندی کو ناگزیر ماننے پر مجبور ہوں گے۔ حافظ نے اسی محدود زمین پر مستانہ وار جادہ پیمائی کی اور اپنے عالم گیر پیام کو غزل میں دنیا تک پہنچایا۔ سعدی نے جو پھول اس خشک اور بنجر زمین میں کھلائے ہیں ابھی تک اُن کی خوشبو سے مشام جان و تن معطر ہے۔ غالب نے زندگی کی گتھیاں اور اسرار و معارف کی گرہیں غزل میں سلجھائیں۔ خود انگریزی زبان کے موجودہ دور شاعری میں غزلوں کے کمال کا اعتراف دیکھنا ہو تو مسٹر جیمس فلے کر کا کلام پڑھیئے۔ جدید مشرق کے سب سے بڑے شاعر اور قوم پرست شاعر نے پیام مشرق کا ایک معتدبہ حصہ غزلوں کے لئے وقف کیا۔ جو حکیمانہ نزاکت خیال اُن کی غزل کے ایک ایک شعر

میں پائی جاتی ہے وہ اُن کی پوری پوری نظموں پر بھاری ہے۔ حسرت نے بھی اس حقیر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی خوش بیانی اور خوش فکری سے دنیا کی مسرتوں اور آسائشوں میں اضافہ کیا ہے۔ جو لوگ غزل کی طرف سے اپنی سوء ظنی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں فرسودہ، پرانی اور سنی سنائی ہوئی چیزوں کے علاوہ نہ کچھ ہے اور نہ کچھ ہونے کی گنجائش وہ ذرا حسرت کی غزلیں دیکھیں اور تحیر اور استعجاب سے کہیں "کیا ہے جو غزل میں نہیں"۔ خود حسرت کہتے ہیں۔

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ آئیے اب ہم اور آپ دیکھیں حسرت کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حسرت کی شاعری عشق کی شاعری ہے عشق ایک وسیع جامع لفظ ہے۔ آپ دیکھیں عشق کے تمام پہلوؤں پر حسرت کی نظر پہونچ گئی ہے یا نہیں۔

پہلا جلوہ :۔

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بیخبر خوبی یہ روئے یار کے پہلے پہل گئی

بے خبر پہلے مصرعہ میں جان ہے۔ پہلی نگاہ بغیر جانتے ہوئے بلا کسی ارادہ کے بیخبر ہی پڑتی ہے، یا

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آنکلے تھے کہیں اُس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

بھولے سے، بالکل ابتدائی درجہ ہے، بے خبری ثابت ہے ابھی اُنکا غیر ارادی طور پر "ادھر آنکلنا"، صرف "ماجرا"، کی حد تک ہے۔ یہ "ماجرا"، بار بار یاد آتا ہے "بھولتا ہی نہیں" ہے۔ وہ کون تھے یہ نہیں معلوم نہ عاشق نے پوچھا۔

ہم سے پوچھا بھی گیا نام ونشاں بھی انکا جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

لیکن وہ جلوہ پیش نظر ہے۔

بار بار آتا ہے پرسش کا خیال — بے خودی بتلا مجھے کیا ہو گیا

امید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند — آنکھوں سے مگر شوق تماشا نہیں جاتا

دل بہر حال کسی نہ کسی طرح محبوب کا سراغ لگا لیتا ہے

کوچہ اُس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

محبت شروع ہوتی ہے لیکن پیرایہ عجیب ہے

نہ مجھکو اس کی خبر ہے نہ خود انہیں یہ خیال — کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے

یہ بے خبری دونوں طرف سے ہے کسی کو نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے لیکن غیر محسوس طریقہ پر محبت نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اب واقفیت پیدا ہوتی ہے، ایک کا حال دوسرے پر روشن ہوتا ہے

تقریب محبت کی کیا خوب تھی وہ ساعت — جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہ جبیں واقف

لیکن کیا دل فریب دپرلطف زمانہ ہے، اُس طرف حجاب ہے اور تکلف،

نہ پوچھئے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت — سنی جو پہلے پہل عشق ناصبور کی بات

سن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا — ہیں وہ بدنام کہیں ہم کو بھی رسوا نہ کریں

آہ، کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

عشق کی ناصبوری

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں — اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

اُس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے — دل میں گویا سما گئیں آنکھیں

لیکن جذبات صادق بالآخر رنگ لائے۔

آج سن کر میرے نالوں کو زراہ التفات — زیر لب اُس نے بھی کھینچی ایک آہ التفات

"آہ التفات" وہ بھی "زیر لب" کے لطف کو عشاق شاد کام سمجھ سکتے ہیں، اس ابتدائی دور کے کیسے کیسے بامزہ اور پرکیف شعر حسرت نے نکالے ہیں۔

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسم جفا
اور مجھے حاصل تھے لطف بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں نا واقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماس عذر و تمہید شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

اس ابتدائی دور محبت کے اشعار اس قدر مسلسل، مربوط اور رنگین و شگفتہ ہیں کہ مستقل نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجود حسن تو آگاہ رعنائی نہ تھا

عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی
جلوہ رنگیں پہ تجھ کو ناز یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری

غضب رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی
ہوئی ہے جن سے دامان محبت پر یہ گل کاری

اس کے بعد معاملات محبت اور واردات قلب کا ایک "کاروبار" شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار حسرت کے کلام میں بڑے جاندار اور سحر فن ہیں۔ وصل و ہجر، شکوہ شکایت، نامہ و پیام حسن و محبت کے لطیف اور نہایت ہی باریک معاملات سب موجود ہیں۔ دیکھئے اور حیرت کیجئے کہ حسرت کی دور رس نظریں کہاں کہاں پہونچتی ہیں اور کیسے کیسے پہلو، معاملات محبت کے وہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گزرا

شوق کا حسن عقیدت دیکھنا اکثر ہوا
تیری بے پروائیوں پر اشتباہ التفات

دوستی اس فتنۂ دوراں سے ہے یا دشمنی
جانِ برباد کرم ہے دل تباہ التفات

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ ناشاد کا
اُن سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا
داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا

اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن اُنکا
خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

دل کچھ اس ڈھب سے لیا اس نے کہ رسوا کوئی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

اس چشم نے دل بری کے شیوے
سب سیکھ لئے بغیر استاد

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

حسنِ نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہونچے
سب دل پذیر پہونچے سب دل پذیر پہونچے

بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جو شاید اُردو شاعری کے لئے بالکل نئی ہیں اور حسرت کے سوا کسی نے نہیں لکھیں لیکن وہ حقیقت سے اس قدر قریب ہیں کہ فوراً دل میں کھب جاتی ہیں۔

لوگ سب جان گئے چھپ نہ سکی شوق کی بات
میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا

ہم سے روٹھو بھی تو لازم ہے کہ اک ناز کیساتھ
قہر بھی ہم پہ کرو تم تو دل آویز کرو

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

دیکھا جو کہیں گرمِ نظر بزمِ عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

مجھ پر گدا سمجھ کے بھی کرتا نہیں نظر
دیکھے تو کوئی اس شہ خوباں کی احتیاط

میں بے خبرِ غم تھا مگر وہ دمِ رخصت
دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

معلوم ہو گئی مرے دل کو ز راہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی

حالانکہ ابتدا بھی نہیں ہے شباب کی
اُن کو کمالِ حسن کا دعوےٰ ابھی سے ہے

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات اُن میں اور بھی کچھ ہے سوائے ناز

دیکھ لیتے ہیں اب وہ نامۂ شوق
ہے مگر پھر بھی اختصار کی شرط

تمہیدِ صلحِ شوق کے سامان ہو گئے
جتنے تھے اُن کے جور سب احسان ہو گئے

حالت قبولِ عذر سے برعکس ہو گئی | ہیں شوخ ہو گیا وہ پشیمان ہو گئے
تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں | شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا | پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

یہ چار شعر ہزار دل نظموں کے ہم پلہ ہیں، صحیح جذبات کی اس قدر پُر سحر طریقہ پر مصوری اور پھر تسلسل و روانی، اللہ اللہ!

مل کے ہم سے کبھی وہ مل نہ سکے | با وجود کمالِ دل سوزی

دوسرا مصرعہ ملاحظہ ہو" با وجود کمالِ دل سوزی" ہر ہر لفظ کو علحدہ علحدہ کر کے ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے "مل کے" ملاقات نہ ہو سکی باوجود اس کے کہ محبوب محبت کی آگ سے پھنکا جا رہا ہے۔ ہر حرف نشتر ہے "کمالِ دل سوزی" کی وسعت پر غور کیجیے۔ پورا شعر ایک مرقع ہے جذبات کا جس قدر غور کیجیے اسی قدر ایک شریف پردہ نشین محبت کرنے والی کا تخیلی پیکر نظروں کے سامنے صاف و شفاف آ جائے گا۔

عظمت مرحوم (مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے، سابق مددگار ناظم تعلیمات حیدرآباد جنہوں نے اردو شاعری میں ایک اجتہادی شان پیدا کی تھی اور جن کے افادات سے افسوس کہ اردو ادب اس قدر جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا) نے اپنے شاعری والے مضمون میں ایک مشہور موجودہ انگریز ادب پرست کی سند پر لکھا تھا: "شاعری نام ہے تخیلی پیکر پیدا کرنے کا" اور اسی کے ساتھ مثنوی میر حسن سے کچھ اشعار پیش کئے تھے۔ اگر شاعری کی یہ تعریف صحیح مانی جائے (اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں اسے شاعری کی تمام تعریفوں کی صفِ اول میں جگہ نہ دی جائے) تو غور کیجیے حسرت موہانی نے کیسا پیکر پیش کیا ہے۔ میر حسن نے تو اپنے پیکر کو چوٹی، دوپٹہ، اور کمر کے ذکر سے ایک حد تک محدود کر دیا تھا لیکن حسرت کے اس شعر میں ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جو بقول افادی الاقتصادی امام مہدی حسن مرحوم "اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی"، حسرت نے محبوب کے خدوخال کو نہیں پیش کیا اس کے بجائے محبوب کے اخلاقی وصف اس طرح گنانے

ہیں کہ شعر ہمارے طائر خیال کو پرواز بخش دیتا ہے اور ہم اپنے مذاق کے مطابق اس سے ایک ایسا خاکہ تیار کر سکتے ہیں جو ہمیں مرغوب ہو، دنیا میں معیار حسن مختلف ہیں اور خد و خال کی تشریح سے جو تصویر آنکھوں کے سامنے آئے گی وہ نہیں کہا جا سکتا سب کو یکساں طور پر مرغوب ہوگی حسرت نے ایک زبردست صناع کی حیثیت سے اپنی تصویر کا خاکہ چند نقطوں، چند منحنی اور مدہم خطوط کے مدد سے تیار کیا ہے۔ ان خالی جگہوں کو آپ اپنے خیال سے پُر کیجئے اور دیکھئے تو یہی کیسی پاکباز، باحیا جاں نثار شریف خاتون کی تصویر اس میں سے ابھر آتی ہے۔ یہ خالص مشرقی چیز ہے۔

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسنِ شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکس مے سے شیشہ گلابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی — ہیں وصف جس کے سارے کتابی

متعلقات حسن کے انتہائی لطیف جزئیات :-

عجیب اس کی خوشبو ہے کچھ روح پرور — وہ پوشش جو تھی اُس تن نازنیں پہ
اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بیقرار — کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا
اک رنگ التفات بھی اس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اُس نگہِ سحر فن میں تھی

خوشبوئے دل بری، یہ ترکیب سمندِ خیال کے لئے "تازیانہ" سے کم نہیں۔

اس روئے جمیل میں ہیں یکجا — انوارِ مغارب و مشارق
مجبوبی و رنگینی ہیں حسن و بدن تیری — سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

محبوب کے باطنی اوصاف بھی دیکھئے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت — وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بہ لطف ہوشمندی

تجھ سے ہے حسن و جمال دو جہاں کی رونق ۔۔۔ لے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق
تیرے حسن نظر افروز کے جلوے اے شوخ ۔۔۔ ہو گئے ہیں نگہ دیدہ وراں کی رونق

ملٹن شاعری میں تین چیزوں کا طالب ہے " سادگی، جوش، اصلیت " حسرت کی غزلیں آپ پڑھیں تو اس کے جذبات میں یہ تینوں چیزیں آپ کو ملیں گی حقیقت یہ ہے کہ یہ وصف آج کل کی شاعری میں حسرت کے علاوہ آپ کو کہیں اور مشکل سے ملے گا۔ ملاحظہ ہوں :

کس قدر دشوار تھی ہم پر جدائی آپ کی ۔۔۔ یار سے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی
بدگماں کا ہے کو ہوتا آپ کا حسن غیور ۔۔۔ ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی
نے نواز عاشقی نے نغمہ ہائے حسن میں ۔۔۔ بارہا آواز کانوں کو سنائی آپ کی
رہ گئی اہل ہوس میں یادگار حسن و عشق ۔۔۔ ناز برداری ہماری، دل ربائی آپ کی

ذیل کی غزل ملاحظہ ہو بقول حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم :
انہیں غزلوں سے حال آتے ہیں میخانوں میں رندوں کو ۔۔۔ انہیں شعروں کو میکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

برکتیں سب ہیں عیاں دولت روحانی کی ۔۔۔ واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی
شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہر جمال ۔۔۔ کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی
مجھ سے وہ سگ بھی ہے افضل جسے عزت ہو نصیب ۔۔۔ آستان حرم یار پہ دربانی کی
جب سنا یاد کیا کرتے ہو تم بھی تو مجھے ۔۔۔ کیا کہوں حد نہ رہی کچھ مری حیرانی کی
سعی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال ۔۔۔ اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی
وہ تبسم بھی قیامت ہے ترا بعد جفا ۔۔۔ تو نے دی ہو جسے خدمت نمک افشانی کی

اللہ اکبر، معلوم ہوتا ہے احساسات کا ایک دریا ہے جو موجزن ہے۔ ہمارا خیال ہے حسرت کے تمام کلام میں اس قدر سادہ لیکن پرکار غزل جس کے لفظ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے اعماق دل سے نکلی ہے مشکل سے ملے گی۔

جیسے کارتھے با صفا ہو گئے ہم ۔۔۔ ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے | کہ مستغنیِ ماسوا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا | تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرت | نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ و کینہ
دل مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے | گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو باخدا کر دے
فکر دنیا سے دل رہا آزاد | اے ترا غم رہے مجھے روزی
مل گیا نور عاشقی سے ہمیں | طرفہ سرمایۂ دل افروزی
محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن | کہ ہم ہو گئے جسم خاکی سے نوری
ہو گئے نور عشق سے روشن | دل پہ ارض و سما کے جملہ طبق

یہی وہ درجہ ہے جہاں محبت کسی کی پابند نہیں رہتی، جہاں قیس کو لیلیٰ سے، دشینت کو شکنتلا سے، رومیو کو جولیٹ سے محبت نہیں ہوتی بلکہ عشق کو حسن سے محبت ہوتی ہے، جہاں قیس عامر صحرا میں ناقہ سوار لیلیٰ کے لئے دیوانہ وار سرگرداں نہیں پھرتا بلکہ عشق حسن مطلق کی جستجو میں دربدر خاک چھانتا ہے اور ہر حسین چیز کو حسن مطلق کا جز و سمجھتا ہے اور اس پر سر دھنتا ہے اور اس سے اپنی پیاس بجھاتا ہے، تمام قوتیں اسی ایک راہ میں صرف ہوتی ہیں

عشق تلاش حسن میں | خاک بسر ہے دربدر
ہر طرف ہیں عیاں نقوش جمال | دیدنی ہے نگار خانۂ روح
ہر صبح جہاں وہ جلوہ گر ہوں | جاتے ہیں وہیں رواں دواں ہم
ضیائے مہر ہے نور قمر ہے | جمال یار ہر سو جلوہ گر ہے

اس راہ میں دل ہلکا اور نحیف ہو جاتا ہے نظر وسیع ہو جاتی ہے، مسرت و غم میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔

جنوں نے دل سے وہ حس بھی مٹا دی | کرے جو امتیاز رنج و شادی

خدمت خلق اور رضا جوئی حق ایمان رہ جاتا ہے۔

پڑھے اس کے سوا نہ کوئی سبق   خدمتِ خلق و عشق حضرت حق
اسیری میں ہو یا فقیری میں حسرت   بہرحال ڈھونڈیں گے اُنکی رضا ہم

یہاں تک کہ خود قوتِ احساس اُس ایک ذات حق میں منجمد اور فنا ہو کے رہجاتی ہے۔

رہ گئے ذاتِ حق میں ہو کے فنا ۔   اب نہ ہم ہیں نہ دل نہ سوز نہ ساز

حسرت کی شاعری پر خالص شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اتنا کچھ لکھا اور اُنکی اُستادی اور زبردست قوت بیان کی داد دی لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم ہے کہ حسرت نے عمر بھر صرف شاعری نہیں ہے بلکہ ملک و ملت کی خدمت بھی کی ہے ، ایک عمر جیلخانہ میں گزاری ہے ہمیں انکے اس جذبۂ خدمت قوم کا ممنون ہونا چاہیے جس نے انہیں بار ہا زندان میں محبوس کیا۔ انکا تمام کلام زمانہ نظر بندی میں لکھا گیا اور مرتب ہو کر ہم تک پہنچا ہے ۔ اُنکے پولیٹیکل خیالات کے متعلق مختلف رائیں ہیں ۔ کسی کو اُن کی پالٹیکس "عقل و فہم سے بالا" نظر آتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس جذبہ سے حسرت کا سینہ تڑپ رہا ہے اور جس کی خاطر اُس نے اپنی عمر ، دولت ، اپنا کاروبار ، اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے وہ قابلِ رشک ہے ، جس ایثار سے ، جس خاموشی اور سکون کے ساتھ حسرت نے مظالم اور مخالفتیں برداشت کیں ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے ، دنیا میں جہاں لوگ واقعات اور حقائق کے طالب ہونے کے باوجود اس قدر کور کورانہ کام کرتے ہیں ۔ حسرت کے اس جذبہ کی قدر ہو یا نہ ہو لیکن وہاں جہاں ہم اور آپ رائے دینے والے نہیں ہیں جہاں کا ممتحن ایک عالم غیب ہے جو دلوں کے رازوں اور انسان کے ہر فعل کی حقیقت سے خبر دار ہے وہاں جذبات اور نیت کی قدر ہے ۔ ہم فانی انسان کسی کام کو پورا اور سرانجام کرنیکے لائق نہیں جب تک دست ایزدی کی مدد شاملِ حال نہ ہو لیکن بہرحال ایک خدمت کی آرزو دل میں رکھنا ہماری نجات کے لئے کافی ہے ۔

حسرت کے سیاسی عقائد سے علیحدہ ہو کر یہاں اُنکے صرف وہ جذبات پیش کئے

جاتے ہیں جو اُنکے خیال میں ہماری بیداری اور فتح کے لئے ازبس ضروری ہیں

جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سر بلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اُس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر

خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اٹھے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں اُن سے بیزار ہو کر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جاؤ دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

غرضکہ حسرت عجیب وغریب شاعر ہین میں جانتا ہوں کہ آخر میں جو اشعار میں نے اُنکے لکھے ہیں وہ ایک ایسے مضمون میں جہاں انکی شاعرانہ خوبیاں دکھائی گئی ہوں بے جوڑ سے ہیں لیکن میں کیا کروں میں مجبور تھا کہ اُن چیزوں کو پیش کروں جو حسرت کے دل سے نکلی ہیں۔

اتنا لکھا گیا مگر معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں لکھا، حسرت کے کمال شاعری پر عشر عشیر روشنی بھی میں نہیں ڈال سکا اور اُس کے بیسیوں پہلو ابھی دکھانے کو باقی ہیں، مجھے اپنی کوتاہیوں اور اپنی نااہلی کا اعتراف ہے لیکن مجھ سے زیادہ استعداد والے موجود ہیں وہ اس کام کو کرینگے میں سمجھتا ہوں میرے لئے اس قدر افتخار ہی بس ہے کہ ایک ایسی زبردست وجامع کمالات ہستی کے ساتھ میں نے اپنے نام کو نسبت دی اور اپنے خیالات گو ایک غیر مربوط طریقہ پر سہی ظاہر

کئے۔ میں دیوانہ ہوں لیکن اسکا احساس ہے کہ مجھ سے بڑے دیوانے موجود ہیں۔ خدا کرے سرت کی بارگاہِ سخن میں میری یہ نحیف آواز اُن دیوانوں کو "ہو" ثابت ہو اور وہ اس کے کلام پہچانیں اور دنیا کو مجبور کریں کہ وہ حسرت کے نام پر مٹ جانے کو تیار ہو جائے۔ حسرت کا اپنی ت فیصلہ خود حسرت کی زبان سے سنئے۔

گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں   میں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں
عجب انداز ہے میرے مزاجِ لاابالی کا   نہ ممنونِ تمنا ہوں نہ مشتاقِ مسرت ہوں
میری بے تابیوں کا قول ہے ہم جانِ تمکیں ہیں   مری افتادگی کہتی ہے تاجِ فرقِ عزت ہوں
مرا شوقِ سخن پروردۂ آغوشِ حرماں ہے   میں خود شیدائے غم ہوں فتنۂ دورِ محبت ہوں
نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا   تکلف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں

کمال خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں!

نہیں حسرت! یوں مایوس نہ ہو۔ تونے اپنی فطرت اس طرح کھوئی ہے کہ ہم تیری پرستش نے کو تیار ہیں، تو "بیگانۂ رسمِ شکایت" ہے یہ تیری عالی ظرفی ہے تونے "اپنی داد خود" ت دے لی لیکن اُردو کو ابھی اپنے جینے کا ثبوت دینا ہے، ہمیں ابھی ثابت کرنا ہے کہ ہم ایک ندہ زبان رکھتے ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس!

بلّی کے بچّے

از

روسی مختصر نگار چیخوف

مترجمہ جلیل احمد قدوائی بی۔اے

صبح۔ سورج کی کرنیں خواب گاہ کی شیشہ دار کھڑکیوں سے چھن کے کمرے کے اندر اور بستر پر آ رہی ہیں۔ وانیا، ایک چھ سال کا لڑکا جس کے بال برابر سے ترشے ہوئے ہیں اور بٹن کی سی ناک ہے اور اُس کی بہن نینا ایک چھوٹی، پھولے گالوں والی، گھونگریلے بالوں والی چار سال کی لڑکی، سو کر اُٹھے ہیں اور بستر پر پڑے پڑے چارپائی کی جالی سے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔

"اٹھو۔ او۔ او! لڑکو" اُن کی انّا انہیں دیکھکر کہتی ہے "اچھے لڑکے کب کے ناشتہ کر چکے اور تمہاری آنکھ نہیں کھلنے آتی"

سورج کی کرنیں کمبلوں، دیواروں اور انّا کے سایہ کے دامنوں پر کھیلتی اور تھرکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کو اپنے کھیل میں شریک کرنے کی دعوت دے رہی ہیں مگر بچے اس دعوت کو رد کر رہے ہیں وہ سو کے اُٹھے ہیں تو اُنکا مزاج بگڑا ہے اور تیوریاں چڑھی ہیں۔ نینا انگڑائی لیتی ہے اور انّا سے کہتی ہے:۔

"نا۔ آ۔ شتہ . . . بوا، ناشتہ!"

وانیا اپنی آنکھیں چڑھاتا ہے اور شور کرنیکے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے، اُس نے اپنی آنکھیں تلملانا اور مُنہ کھولنا شروع کر دیا ہے، لیکن اسی وقت ماں کی آواز ڈرائنگ روم سے سنائی دیتی ہے "بلی کو دودھ دینا نہ بھول جانا۔ اُس نے بچے دئے ہیں!۔

لڑکوں کے بگڑے ہوئے چہرے پھر اصلی حالت پہ آجاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ پھر دونوں ایکدم چلانا شروع کر دیتے ہیں، اپنے بستر سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے شور و پکار سے فضا میں جھنکار پیدا کرتے، ننگے پیر دوڑتے، رات کا لبادہ پہنے باورچی خانہ پہونچتے ہیں۔

"بلی نے بچے دئے!" دونوں چلاتے ہیں "بلی نے بچے دئے!"

باورچی خانہ میں ایک تپائی کے نیچے ایک چھوٹا ڈبا رکھا ہے جس میں اسٹمن آگ جلانیکے لئے کوئلے لاتا تھا۔ بلی اس ڈبے میں سے جھانک رہی ہے، اُس کے اُترے ہوئے چہرے پر ناتوانی ہے، اُسکی سبز آنکھوں سے جن کے گرد تنگ و تاریک حلقے ہیں، کمزور، شفقت میں ڈوبی ہوئی نظریں نکل رہی ہیں۔ . . . . وہ "میاؤں" کرنا چاہتی ہے اور اپنا منہ کھولتی ہے، لیکن اُس کے حلق سے صرف اک ناتواں، ہلکی، بے صدا سانس نکلتی ہے بلی کے بچے کل بل کل بل کر رہے ہیں، اُنکے کلبلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دونوں لڑکے ڈبے کے سامنے اینڈی کے بل کودتے ہیں اور اپنی سانس روکے بالکل بے حرکت بلی کو دیکھتے ہیں۔ . . . وہ متحیر اور خوش ہیں اور ان کے بکتے ڈانٹنے کی آوازوں کو نہیں سنتے۔ دونوں کی آنکھیں بے انتہا سچی خوشی سے چمک رہی ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور زندگی سُدھارنے میں پالو جانوروں کا بھی کتنا مفید حصہ ہے اس کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے کون طاقتور اور بھاری کتوں، سُست ادھ مری کتیوں، پنجرے میں محبوس چڑیوں، کم عقل مگر جوشیلی مرغیوں، حلیم نیک دل بڈھی بلیوں کو نہیں یاد کرتا جنہوں نے، اگر ہم نے کھیل میں اُنکے دُم پر پیر رکھ دئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے ہمیں معاف کر دیا! بلکہ میں تو بعض وقت فی الواقع یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صبر، رحم، شفقت، وفاداری اور اخلاص جو ان پالو جانوروں میں ہوتا ہے بچوں کے ذہن پر کسی بڈھے فلسفی یا ماؤں اور اُستادوں کی تربیت اور تعلیم سے کہیں زیادہ مفید و دیر پا اثر ڈالتا ہے۔

"کیسے ننھے ننھے ہیں!" ننیا اپنی آنکھیں اچنبھے میں خوب کھول کر ہنستی ہوئی کہتی ہے "جیسے چوہے ہوں!"

"ایک، دو، تین" دانیا گنتا ہے "تین بچے ہیں، اچھا تو ایک تمہارا، ایک میرا اور ایک کسی اور کے لئے بھی"۔

"ہائیں، ہائیں" ماں کہتی ہے "ہائیں . . ."

بلی کے بچوں کو خوب اچھی طرح دیکھ کے دونوں لڑکے انہیں بلی کے نیچے سے اٹھا لیتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں انہیں ملنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس سے بھی نہ مطمئن ہو کر انہیں اپنے رات کے لبادہ کے دامنوں میں رکھ لیتے ہیں اور دوسرے کمرے میں دوڑ کر جاتے ہیں۔

"امی، بلی نے بچے دیے!" وہ چلاتے ہیں۔

امی ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکوں کو بغیر منہ دھوئے بغیر صاف کپڑے پہنے، رات کے لبادے کے دامن اٹھائے دیکھ کر وہ گھبراتی ہے اور انہیں خفگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

"دامن گراؤ، بدتمیز کہیں کے" وہ کہتی ہے "کمرے سے باہر جاؤ نہیں تو پیٹے جاؤ گے"

لیکن لڑکے نہ ماں کی خفگی کی پرواہ کرتے ہیں نہ اجنبی کی موجودگی کی۔ وہ بلی کے بچوں کو چٹائی پر رکھ دیتے ہیں اور اپنے شور سے کان پھاڑ ڈالتے ہیں۔ بلی اُن کے چاروں طرف رحم کی طالب نظروں سے میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ جب تھوڑی دیر بعد لڑکے کپڑے بدلنے کے لئے، منہ دھونے کے لئے یا ناشتہ کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ غیر دلچسپ فرائض جلد ختم ہوں کہ وہ بلی کے بچوں پاس پھر بھاگ کر جائیں۔

اُنکے روزانہ کے کھیل اور دلچسپیوں کا پروگرام بالکل بالائے طاق ہے۔ بلی کے بچوں نے دنیا میں آکر ہر کام کو پس پشت ڈال دیا ہے اور دن کی سب سے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے ہیں اگر ننیا یا دانیا کو چالیس پونڈ مٹھائی یا دس ہزار کا چیک فی بچہ دیا جاتا تو وہ بغیر ذرا پس و پیش کے

ایسے سودے کو رد کر دیتے ، باوجود دانا اور باورچن کے سخت تاکید کے لڑکے مصر ہیں کہ باورچی خانے میں کھانا کھانیکے وقت بلی کے ڈبے کے پاس بیٹھے رہیں ، اُنکے چہروں سے شوق اور جستجو اور انہماک ظاہر ہوتا ہے وہ بچوں کے حال کے لئے اتنے فکرمند نہیں ہیں جتنا اُنکے مستقبل کے لئے ۔ وہ طے کرتے ہیں کہ اُن میں سے ایک بچہ تو گھر میں اپنی بڑھی ماں کی خبرگیری کے لئے رہے گا اور دوسرا اُن کے گرمی کے مکان میں بھیج دیا جائے گا اور تیسرا مودی خانہ میں رہیگا جہاں چوہے اتنی کثرت سے ہیں ۔

" مگر وہ ہماری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہیں ؟" ننیا کو تعجب ہوتا ہے "اُن کی آنکھیں بھکاریوں کی طرح اندھی ہیں "

دانیا کو بھی یہی تشویش ہے ۔ وہ ایک بچہ کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے اور دیر تک اُس کے پپوٹوں کو پھونکتا اور ہوا دیتا ہے ، لیکن اس کی کوشش بیکار جاتی ہے اور اس پر بھی دونو بہت متحیر ہوتے ہیں کہ بچے جو گوشت یا دودھ اُنہیں دیا جاتا ہے اُسے لینے سے انکار کرتے ہیں اُنکے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے وہ اُن کی ماں کھالیتی ہے ۔

" اچھا ان کے لئے گھر بنادیں " دانیا رائے دیتا ہے " یہ تینوں علیحدہ علیحدہ گھر میں رہینگے اور بلی ان سے ملنے آیا کریگی . . . . "

دفتی کے ٹوپی کے ڈبے باورچیخانے کے مختلف کونوں میں رکھدئے جاتے ہیں اور بچے اُن میں بٹھائے جاتے ہیں ، لیکن یہ تقسیم ناکام ثابت ہوتی ہے ۔ بلی اب بھی رحم کی طالب اور محبت بھری نظریں لئے سب ڈبوں کے گرد جاتی ہے اور اپنے بچوں کو پہلی جگہ پر لے آتی ہے ۔

" بلی انکی ماں ہے " دانیا نے کہا " لیکن انکا باپ کون ہے ؟ "

" ہاں انکا باپ کون ہے ؟ " ننیا دہراتی ہے

" کوئی ان کا باپ ضرور ہونا چاہیئے "

دانیا اور ننیا دیر تک سوچتے رہتے ہیں کہ انکا باپ کسے ہونا چاہیئے اور آخر میں اُن کی

نظر انتخاب ایک گہرے سرخ رنگ کے گھوڑے پر پڑتی ہے جس کے دم نہیں ہے اور جو زینہ کے نیچے کباڑ خانے میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر میں پڑا ہے۔ وہ وہاں سے اسے باورچیخانہ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں اور اُسے ڈبے کے پاس کھڑا کرتے ہیں۔

"سنتے ہو" وہ اس سے تاکید کرتے ہیں "یہاں کھڑے رہو اور دیکھو کہ بچے کوئی بدتمیزی نہیں کرتے۔"

یہ سب بڑی سنجیدگی سے کہا جاتا ہے، وانیا اور ننیا، سوا بچوں کے ڈبوں کے کسی اور دنیا کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن انہیں تکلیف دہ اور رنجیدہ لمحوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کھانے سے پہلے وانیا اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں خواب آلودہ نظروں سے میز کو دیکھ رہا ہے۔ لیمپ کے نزدیک پچھے ہوئے نوٹ پیپر پر ایک بلی کا بچا رینگ رہا ہے۔ وانیا اس کے حرکات کو خوب غور سے دیکھ رہا ہے اور اُس کے منہ میں پہلے ایک پنسل پھر دیاسلائی دے رہا ہے۔ . . . ایکدم جیسے زمین کو پھاڑ کر نہ معلوم کہاں سے اُسکا باپ میز کے پاس نمودار ہوتا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" وانیا ایک غصہ کی آواز میں سنتا ہے۔

"یہ . . . . یہ اباجان بلی کا بچہ ہے . . . . ."

"مار تو نہیں کھاؤ گے! دیکھو یہ تم نے کیا کیا! میرا تمام کاغذ خراب کر ڈالا!"

وانیا کے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اسکا باپ اس شوق میں کوئی حصہ نہیں لیتا جو وانیا کو بچہ کے ساتھ ہے اور بجائے بچہ کو دیکھ کر خوش ہونیکے وہ وانیا کے کان کھینچتا ہے اور چلاتا ہے:

"استفن، اس شریر کو یہاں سے لیجاؤ"

کھانے پر دوسرا منظر پیش ہوتا ہے . . . دوسرے دور کے درمیان ایک تیز میاؤں

کی آواز وقفہ وقفہ سے سنائی دیتی ہے۔ وہ اس آواز کا مخرج تلاش کرتے ہیں اور ننیا کے کپڑوں میں ایک بلی کا بچہ چھپا پاتے ہیں۔

"ننیا، بس بہت ہو چکا، میز پر سے اٹھ جاؤ" اسکا باپ خفا ہو کر کہتا ہے "بچوں کو موری میں پھنکوا دوں گا، میں ان گندی چیزوں کو گھر میں نہیں رکھوں گا!۔۔۔"

وانیا اور ننیا خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ موری میں پڑے پڑے بچوں کی موت علاوہ بے رحمی کے بلی اور گھوڑے کو جانکاہ صدمہ پہونچائے گی، بچوں کے ڈبوں سونا کر جائے گی، انکے مستقبل کے ارادوں پر پانی پھیر دے گی، وہ روشن مستقبل جب کہ ایک بچہ ماں کے آرام کے لئے اسکے پاس رہے گا، دوسرا دیہات میں رہے گا اور تیسرا کوٹھری میں چوہے پکڑے گا۔ لڑکے رونے لگتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں کہ بچوں کی جانیں بخش دی جائیں۔ انکا باپ مان لیتا ہے مگر اس شرط پر کہ وہ دونوں باورچی خانے نہ جائیں اور بچوں کو چھوئیں۔

کھانے کے بعد وانیا اور ننیا کمرے کمرے ایک بے کلی اور اداسی کے ساتھ پھرتے ہیں۔ باورچی خانے جانے کی ممانعت نے انہیں بے دل کر دیا ہے۔ وہ مٹھائی نہیں لیتے منہ پھیلائے ہوئے ہیں اور ماں سے بگڑے ہوئے ہیں جب انکا چچا پٹروشا شام کو آتا ہے وہ اُسے علیحدہ لے جا کر اس سے اپنے باپ کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو نالی میں پھنکوائے دیتے تھے۔

"چچا جان، امی سے کہہ دو کہ بلی کے بچوں کو ہمارے کمرے میں منگا دیں" لڑکے چچا سے خوشامد کرتے ہیں "کہہ دو ۔۔ دو"

"ہاں، ہاں ۔۔۔۔ اچھا" چچا جان انہیں جمکار کر کہتے ہیں "اچھا"

چچا پٹروشا کبھی اکیلے نہیں آتے، ان کے ساتھ انکا نیرو، ایک بڑا سیاہ کتا بھی جس کے کان جھکے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی کی طرح سخت دم ہے آتا ہے۔ کتا خاموش

غمگین اور اپنے وقار کو لئے رہتا ہے۔ وہ لڑکوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ جب اُن کی طرف سے گزرتا ہے تو اُن کے دم تارجاتا ہے جیسے وہ کاٹھ کی کرسیاں ہوں لڑکے اُس سے بڑی نفرت کرتے ہیں لیکن وقتی ضرورتیں جذبات پر غالب آتی ہیں۔

"سنو، ننیا" واتیا اپنی آنکھیں خوب پھیلا کر کہتا ہے "نیرو کو اُن کا باپ بناؤ، گھوڑے کو نہیں، گھوڑا بے جان ہے اور یہ جان دار ہے سمجھیں؟"

پوری شام وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ابا جان تاش کھیلنے بیٹھیں گے اور نیرو کو بغیر کسی کے دیکھے ہوئے باورچی خانے لیجا ناممکن ہوگا۔ . . آخر کار ابا جان تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ امی سماوار گرم کرتی ہیں اور لڑکوں کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔

وہ مبارک وقت آجاتا ہے۔

"آؤ!" واتیا چپکے سے ننیا کے کان میں کہتا ہے۔

لیکن اسی وقت اسٹفن اندر آتا ہے اور خبر سناتا ہے۔

"بیگم صاحبہ! نیرو نے بچے کھالئے۔"

ننیا اور واتیا زرد پڑ جاتے ہیں اور اسٹفن کو خوف سے دیکھتے ہیں۔

"سچ کہتا ہوں اُس نے کھالئے . . . . . ." نوکر ہنستا ہے "وہ ڈبوں کے پاس گیا اور ہڑپ کر گیا"

لڑکے منتظر ہیں کہ گھر بھر بدحواس ہو جائے گا اور بدمعاش نیرو کو سزا ملے گی۔ لیکن سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں اور اُس بیٹو کتے کی بھوک پر صرف حیرت ظاہر کرتے ہیں۔ امی اور ابا جان ہنستے ہیں۔ نیرو میز کے پاس چکر لگاتا ہے، دُم ہلاتا ہے اور اپنے ہونٹ مزے مزے چاٹتا ہے . . . بلی ہی ایک ہے جسے چین نہیں ہے، اپنی دم ہوا میں اٹھائے وہ کمرے کمرے بھٹکتی ہے اور لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور درد سے کراہتی ہے۔

"لڑکو نو بج چکے" امی کہتی ہیں "اب سونے کا وقت ہے"
دانیا اور ننیا بستر پر جاتے ہیں آنسو گراتے ہیں اور بڑی دیر تک بیار و نڈھال بلّی
اور بے رحم و بدتمیز نیرو کے حال پر جسے کوئی سزا نہیں دی گئی کف افسوس ملتے ہیں۔

غزل

مصور جذبات جناب مرزا ثاقب لکھنوی مدظلہ

کل وحدتِ فرقت کا ساں ہوش ربا تھا
نالہ بھی مرے منہ سے نکلتے ہی ہوا تھا

آتے تو سوادِ شب غم تم کو دکھاتے
وہ سب تھا جو کچھ اپنے مقدر میں لکھا تھا

وہ کر گئے تھے مجھ کو بلاؤں کے حوالے
سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا تھا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شب فرقت
وہ جوش پر آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

دعوائے محبت تھا وہ جس نے مجھے مارا
بس اس کے سوا کچھ نہ کہا تھا نہ سنا تھا

دل سوختگان لحد اچھے تو ہیں یارب
اک ابر سا کل گور غریباں سے اٹھا تھا

ثاقبؔ انہیں کیا حال شب ہجر سناؤں
خود اُن پہ جو یہ رات گزرتی تو مزا تھا

مرثیہ

حشر تک اجمل مرحوم کا ماتم ہوگا

از جناب برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی

آج دلی میں قیامت کی سنائی آئی　　جس سے ماتم کی گھٹا شہر کے دل پر چھائی
تار برقی نے یہ غمناک خبر پہونچائی　　کہ وطن چھوڑ چلا آج وطن شیدائی
چوٹ غم کی دل ہر اہل وطن کھاتا ہے
کہ وطن چھوڑ کے شیدائے وطن جاتا ہے

کہتے ہیں نام کو باقی ہے نشان دہلی　　چل بسے لوگ جو تھے روح و روان دہلی
مٹ چکی گرچہ بہت شوکت و شان دہلی　　کچھ ہو تھی ذات مقدس تری جان دہلی
جان دہلی میں نہیں۔ وہ سہی اجڑا سا دیار
آج پھر کس لئے کل ملک ہوا ماتمدار

تجھ سے دلی کی نہیں ہند کی دلداری تھی　　ہر رگ و پے میں ترے حب وطن ساری تھی؟
دوستداری تھی، رواداری تھی غمخواری تھی　　ال تعصب سے تری طبع بہت عاری تھی
جن میں ہوں جمع یہ کل وصف وہ کم انساں ہیں
یہی اوصاف حسن حب وطن کی جاں ہیں

ذکر حکمت کا ہی کیا؟ وہ تو ہے گھر کی لونڈی　　ہاتھ میں شافی مطلق نے شفا بخشی تھی
موت اور زیست تو ہے تابع حکم ربی　　معترف خلق ہوئی اس کی شفا بخشی کی
انگلیاں نبض پہ رکھتے ہی مرض دھر پکڑا

شیر نے پنجے میں روباہ کو جیسے پکڑا

فرد تھا مشرقی ملکوں میں وہ ایسا تھا طبیب　　یہ حذاقت تو نہیں ہوتی ہے ہر اک کو نصیب
خلق وہ پڑھ کے نہ پاؤ گے کوئی اس سے نجیب　　الغرض، ایسا طبیب، ایسا نجیب اور حبیب

دوسرا آج زمانے میں کوئی کم ہوگا
حشر تک اجملؔ مرحوم کا ماتم ہوگا

ایک سر حلقۂ اربابِ صفا تھا نہ رہا　　ایک روحِ تنِ اخلاص و وفا تھا نہ رہا
محفلِ شعر میں جانِ فصحا تھا نہ رہا　　خدمتِ ملک پہ دل جس کا فدا تھا نہ رہا

تو نہ ہوگا تو تری یاد رہے گی دل میں
شمعِ محفل ہو ترا ذکر ہر اک محفل میں

عطر تھا مشرقی تہذیب کا تیرا برتاؤ　　روح تھا دلّی کی کلچر کا ترا نیک سبھاؤ
کوئی کچھ ہی کہے آتا تھا طبیعت کو نہ تاؤ　　ایک تھا تجھکو زمانے کا اتار اور چڑھاؤ

ملک میں ہوتے رہے روز نئے ہنگامے
تھا تو اُٹھتے ہوئے طوفان کو روکے تھامے

نام کیا شستہ مذاقی میں تھا مرحوم اجمل　　اس کی خود داری میں تھی تمکنت کوہ جبل
پچھلے ایام میں کیا کیا نہ ہوئی جنگ ملل　　نام کو اس کی رواداری میں آیا نہ خلل

دعوت ابنائے زماں کو جو عمل کی دی تھی
لائحۂ کار میں اُسکے نہ ہوئی تبدیلی

تھا امیدوں کا کھلا ایک گلستاں دل میں　　ملک آزاد ہو تھا ایک یہی ارماں دل میں
گرچہ رکھتا تھا وہ اک کعبۂ ایماں دل میں　　تھے برابر اسے ہندو و مسلماں دل میں

ایک آنکھ اُن کو بس اس مردِ خدا نے دیکھا
کفر و اسلام کا تھا ایک ہی میں لیکھا

گرچہ کہنا کبھی گاندھی کا بھی مانا نہ گیا   حفظِ لی کا وہ مصنوعی بہانا نہ گیا
لب سے تیرے وطنیت کا ترانہ نہ گیا   تھا غمِ عشقِ وطن دل سے نہ جانا نہ گیا

غمِ وطن کا رہا دل میں ترے ارماں ہوکر
یہ گیا بھی تو گیا ہم نفسِ جاں ہو کر

آن پہ وہ۔ اس پہ سب احرارِ وطن مرتے تھے   فرش رہ دیدۂ دل اسکے لئے کرتے تھے
شیخ اور برہمن اُسکا ہی تو دم بھرتے تھے   اس کے ہی نقش قدم پر وہ قدم دھرتے تھے

کم ملے گا تمہیں اس دور میں اجل ایسا
نہیں ممکن کہ ملے جوہر اکمل ایسا

پائیں گے خلق و موالات ترے ہم کس میں   آخری تیری صدارت ہوئی جس مجلس میں
اتفاق آکے پڑا دیکھئے کیسا اس میں   صلح ہندو و مسلماں کی ہوئی تھی جس میں

تھیں کھلیں بہتری قوم کی راہیں تجھ پر
جب پڑا وقت تو اٹھتی تھیں نگاہیں تجھ پر

آشرم صدق و صفا کا جو وہ گجرات میں ہے   صدر اسکا کہ کشش جس کے مقالات میں ہے
عشق و ایثار بھرا جس کے خیالات میں ہے   اک قیامت کا اثر جس کی ہر اک بات میں ہے

اُسکی وطنیت اس احرار کے سرنام سے پوچھ
دوستداری و خلوص اُس کا سریرام[1] سے پوچھ

شادی و رنج وطن سینہ میں جاگیر بھی تھا   عشق گھمبیر بھی دل میں غم شبیر بھی تھا
کام کرنے میں جواں۔ رائے میں وہ پیر بھی تھا   شدت جوش میں جذبوں کا عنانگیر بھی تھا

دل سنانِ غم ملت سے چھدا رہتا تھا
تن بدن سوز محبت سے پھنکا رہتا تھا

رہنما راہ ترقی کا ہو۔ رہ گیر بھی ہو   دیش بھگتی کا کلیجہ میں کھبا تیر بھی ہو

---

[1] لالہ سریرام صاحب ایم۔ اے مؤلف تذکرہ خمخانہ جاوید

دل میں آہِ سحری - نالۂ شب گیر بھی ہو   درد ہو دل میں اور الفاظ میں تاثیر بھی ہو

جمع یہ وصف تو ہوتے نہیں ہر انساں میں

ہاں یہ موجود بہ حدِ درجہ تھے اجمل خاں میں

خون رلوائیں گی پسماندوں کو تیری باتیں   وہ دل افزائی کی ہمدردی کی پیاری گھاتیں

فکر میں قوم کی کٹتے ترے دن اور راتیں   ملک میں ایسی نہ نکلیں گی بہت سی ذاتیں

غیر کے درد کو سینہ میں جو اپنے لیں

جان تک نذر جو اس دردِ دلی کو دیدیں

تو ہمیشہ وطنیت پہ فدا رہتا تھا   غم وطن کا نہ کبھی تجھ سے جدا رہتا تھا

سازِ دل زخمۂ الفت سے چھڑا رہتا تھا   ملک کا درد ترے دل میں بھرا رہتا تھا

جان اس دل پہ فدا ہو کے نہ کیونکر رہتی

دل پر درد کی چوٹوں کو وہ کب تک سہتی

ہیں بہت راگ اخوت کا سنانیوالے   قلم اور لب سے طلسمات رچانے والے

قومی خدمت کے تھیٹر کے چلانے والے   کم ہیں جو کہدیں وہ کر کے بھی دکھانیوالے

دردمندانِ وطن ایسے تو ہوں گے تھوڑے

جن کے دل سوزِ وطن سے ہوے پک کے پھوڑے

سیکھتا تجھ سے کوئی قوم پہ قرباں ہونا   درد سہنے کو وطن کا - ہمہ تن جاں ہونا

قول اور فعل کا آساں نہیں یکساں ہونا   جوہر انسان کا ہے ہمدردیٔ انساں ہونا

سروری چیست بگو خادم اخواں بودن

غم ابنائے وطن خوردن و شاداں بودن

ہے وہ ایثار طلب قوم کی ذمہ داری   شیر دل جن کے ہیں - ہو جاتی ہیں اس سے عاری

خدمت ملک کا ہے بوجھ بہت ہی بھاری   کس سے اٹھتا ہے - اٹھائیں بس اسے انصاری

باوفا دوست کے کاموں کا سرانجام کریں
روح مسرور رہو مرحوم کی وہ کام کریں
بارگاہ صمدی میں ہے دعا با رقت — روح اجل کو ملے تیرا جوار رحمت
کام چھیڑے تھی جو اس نے وہ جلیں بدقت — اُس کی تقلید کی ہو اہل وطن کو ہمت
اُس کا فرزند جو ہے خلق پدر کی تمثیل
کر عطا بارِ خدایا تو اُسے صبر جمیل!



اقتباسات

لارڈ آکسفورڈ

لارڈ آکسفورڈ کا برطانوی سیاست پر گزشتہ نصف صدی سے بہت بڑا اثر تھا۔ انکی موت سے برطانیہ کو اور خصوصاً لبرل پارٹی کو جو عظیم الشان نقصان پہنچا ہے اسکی تلافی ایک عرصہ تک نہ ہوسکیگی جس دور اندیشی اور قابلیت کے ساتھ انہوں نے متعدد مرتبہ بحیثیت وزیر اعظم فرائض انجام دئے ہیں وہ انہیں برطانیہ کی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز جگہ دے گی۔ مسٹر رمزے میکڈونلڈ نے ''نیوز لیٹر'' اور ''ایتھینیم'' میں ان کی موت پر رقمطراز ہیں کہ ''ایسکویتھ کا انتقال ہوگیا اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی عظیم الشان یادگار تباہ ہوجائے۔ اس شخص میں غیر معمولی قوت استقلال اور شان تھی۔ اس شخص کی عظیم الشان زندگی تھی جس میں اول سے آخر تک کوئی چیز چھوٹی اور حقیر نظر نہیں آتی۔ نازک ترین موقعوں پر اس نے غیر معمولی کام انجام دئے مصائب سے یہ شخص کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ لیکن ہم اس وقت اسکے کارناموں پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اس حقیقی عظمت کو بتانا چاہتے ہیں جو اس کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی۔ یہ الفاظ غیر ذمہ دارانہ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ ہر شخص نے جسے اس سے سابقہ پڑا اسکی اس عظمت کو محسوس کیا۔''

''اس کی سیاسی فتوحات کا اسقدر جلد صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کی فتوحات کی جگہ انگریزی سیاست کے قدیم میدان کابینہ اور ہاؤس آف کامنس ہی تھے۔ پلیٹ فارم پر وہ بہت زیادہ کامیاب نہ تھا وہ اپنے مزاج اور تربیت سے شہرت طلبی کا مخالف تھا۔ کابینہ میں اس کے خلاف وہ بہت زیادہ کامیاب رہا کرتا تھا۔ یہ ٹھیک کہا گیا ہے کہ پیل کے عہد سے اس وقت تک کابینہ پر کسی نے اس قدر اثر نہیں رکھا حالانکہ پیل کا زمانہ اسقدر مصائب اور پیچیدگیوں کا زمانہ نہ تھا جس قدر کہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ تھا۔ ہاؤس آف کامنس

میں بھی اس سے شاید ہی کوئی بازی لیجا سکتا تھا۔ جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں لبرل وزرات کے وقت اور میزانیہ اور پارلیمنٹ ایکٹ پر اس کی تقریریں سنی ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے۔ مصائب میں اس کے انتہائی جوہر دکھائی دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ اپنی تدبیر پر اس قدر اعتماد کیا کرتا تھا کہ آئندہ آنیوالے خطرات سے بھی بے خبر ہو جاتا تھا۔ غالباً یہی سبب تھا جس نے اس کی پارٹی کو ۱۹۲۴ء میں مصیبت میں مبتلا کر دیا جس سے اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔"

"یہ افسوس کی بات ہے کہ اس کی زندگی کے آخری ایام غلط فہمیوں کی نذر ہو گئے جس نے اس کے بہترین مداحوں کو اس سے علحدہ کر دیا۔ ان باتوں نے اسے ضرور رنجیدہ کیا ہوگا۔ اور کون ایسے واقعات سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔ آپس کے ان تنازعوں نے قوم کو اسکی دانشمندانہ نصائح سے محروم کر دیا۔ لیکن اس سبب سے ہمارے دلوں میں اس کی عظمت کا احساس کم نہیں ہوا ہے اور ہم اس احسان کو جو اس نے ایک عرصہ تک خدمت عامہ انجام دے کر کیا ہے بھلا نہیں سکتے۔ ——————————————"

"تاریخ میں اس کے لئے ایک ممتاز جگہ قطعی محفوظ ہے چونکہ یہ وہ شخص ہے جس نے ہاؤس آف لارڈس کے اختیارات کم کر کے اس نازک مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا جو ۱۸۳۲ء سے ہر لبرل مدبر کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ بحیثیت وزیر اعظم کے اس نے وہ اجتماعی اصلاحات کی ہیں جس کی ہمت اس وقت تک کبھی پارلیمنٹ نہ کر سکی تھی بہ حیثیت قوم پرست کے اس نے قوم کی تاریخ کے انتہائی مصیبت کے زمانہ میں رہنمائی کی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی یاد اس لئے کیجائے گی کہ وہ اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ اخلاق رکھتا تھا ایک بڑا دل رکھنے والی شخصیت تھی جس نے دوستوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔ جس نے ذمہ داری سے کبھی جان نہیں چرائی اور جس نے کبھی کوئی بعید از شرافت فعل نہیں کیا۔"

سر فیروز ستھنا نے انڈین ریویو میں ہندوستان کے لئے اعلیٰ مجلس مقننہ

کی تشکیل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اسقدر اہم مسئلہ ہے کہ آئین ہند بناتے وقت ہندوستان کے بہترین مدبرین کو پریشان کریگا۔ سرفیروز سیٹھنا نے دنیا کی تمام اعلیٰ مجالس مقننہ کی خصوصیات بتائی ہیں اور ہندوستان کے لیے آئرش سینٹ کی تقلید زیادہ مفید تبلائی ہے۔ مسز بسینٹ نے اپنے کومن ولتھ آف انڈیا بل میں بھی یہی ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی کونسل آف اسٹیٹ کو آئرلینڈ کی سینیٹ کی وضع پر ہونا چاہئے عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر ایسی انقلاب انگیز تجاویز ہیں جو آئرش سینٹ کے آئین کو بالکل بدل دینا چاہتی ہیں چونکہ اب ثابت ہو چکا ہے کہ اس آئین کی نظری خوبیاں کسیقدر کیوں نہوں لیکن عملا وہ بالکل ناقابل عمل ہے۔ سینٹ کے انتخابات آئندہ ستمبر میں ہونیوالے ہیں اور حکومت برابر اسی کوشش میں مصروف ہے کہ ابکے وہ غلطیاں نہ ہونے پائیں جو ۱۹۲۵ء میں سرزد ہوگئی تھیں۔ اور جس کے سبب بہت دقت اٹھانی پڑی۔ کوسگریو حکومت سینٹ کے آئین میں دو قسم کی تبدیلیاں کرنا چاہتی ہے۔

(۱) سینٹ کے ممبرون کی تعداد میں تخفیف جس کو حکومت کی مخالف جماعت نے بھی تسلیم کرلیا ہے

(۲) بلاواسطہ انتخاب کی بجاے بالواسطہ انتخاب۔

وہی خصوصیات جو آئرلینڈ کی مجلس اعلیٰ کے لئے باعث امتیاز تھیں اب اس کی کمزوریاں ثابت ہو رہی ہیں۔ انتخاب کے لئے تمام آئرلینڈ ایک حلقہ انتخاب قرار دیدیا گیا تھا۔ ممبرون کا انتخاب ایک مخصوص طبقہ میں سے جس نے بقول سرفیروز ایک عرصہ تک خدمت عامہ سے قوم کو عزت دی ہے ہوتا تھا یہ خیال کیا گیا تھا کہ اس طرح مقامی تعصبات اور مفاد کا اثر کم ہو جائے گا اور تمام ملک میں سے صرف بہترین افراد منتخب ہوسکیں گے۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں عملی نتیجہ یہ ہوا کہ پیشہ ور سیاست داں اور اکثر ناکارہ لوگ منتخب ہوگئے غرضکہ آئرلینڈ کی سینٹ کی تمام خصوصیات جو آئین والوں کو اس قدر مفید دکھائی دیتی تھیں بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ اعلیٰ مجلس مقننہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اسے بلاواسطہ

لوگ منتخب کریں چونکہ اس کا مقصد صرف قوانین پر دوبارہ غور کر کے ترمیم کرنا اور اگر ضرورت ہو تو کچھ عرصہ تک روک رکھنا ہے۔

آئرش حکومت اس پر غور کر رہی ہے کہ سینٹ کے اراکین ایک محدود جماعت میں سے ہوں جس میں تمام ضروری مفاد کی نیابت ہو اور جس کا انتخاب دونوں مجالس مقننہ مل کر کریں۔"

"ہندوستان کی عورتوں کی کانفرنس کا دوسرا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جو اس امر کا شاہد ہے کہ ہندوستان کی عورتیں اپنی صنف کی ترقی میں کس قدر کوشاں ہیں۔ لیڈی ریڈنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ تعلیم کا مقصد زندگی کی عظیم الشان کشمکش کے لئے اخلاق، ذہن اور جسم کی تربیت کرنا ہے۔ ہر اکسلنسی نے کہا کہ ہندوستان میں عورتیں قدیم روایات کی نگہبان ہیں اور دعا کی کہ وہ اسے ایک عرصہ تک محفوظ رکھیں۔ جن لوگوں کے ذمہ بچوں کی تربیت کا کام اس عمر میں ہے جب کہ انکی طبیعتیں بہت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہیں ان کو کم از کم تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیئے۔ لیڈی اردن نے پھر استانیوں کی ضرورت کیطرف توجہ دلائی اور کہا کہ معلمی اس وقت معاش کیلئے ایک پیشہ خیال کیا جاتا ہے جس کے سبب اعلیٰ خاندان کی مستورات اسے اختیار نہیں کرتیں ہیں اس خیال کو جلد از جلد دور کر دینا چاہیئے۔ لیڈی اردن کا یہ قطعی خیال ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں فرق ہونا چاہیئے اور اس لئے ان کے خیال میں خانگی امور کی عملی واقفیت اور قوانین صحت کا علم لڑکیوں کے نصاب کا ضروری جز ہونا چاہیئے۔ آخر میں لیڈی اردن نے کہا کہ کانفرنس کو انتہائی غور و فکر کے بعد تعلیم نسوان کے متعلق اپنی اسکیم پیش کر دینی چاہیئے۔

ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ تعلیم نسوان جیسے اعلیٰ مقصد نے مذہبوں اور ملتوں کے امتیازات مٹا دیئے ہیں۔ تعلیم نسوان کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل

وہ غربت۔ پردہ اور کم عمری کی شادی ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ غربت کے متعلق ہر ہائنس نے غیر ضروری اخراجات کم کرنیکی ہدایت کی اور آمد و خرچ کا توازن قائم رکھنے کی تاکید کی ہیں متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا نصاب ایک ہونا چاہیئے یا جداگانہ ہر ہائنس نے کہا کہ لڑکیوں کو ایسی تعلیم دینی چاہیئے جو خانگی زندگی کو کامیاب بنانے میں معاون ہو۔ استانیوں کے مسئلہ کے متعلق ہر ہائنس نے ان عورتوں سے جو تعلیم دے سکتی ہیں اپیل کی کہ وہ اعزازی خدمت کریں۔ آخر میں بیگم صاحبہ نے کانفرنس کو متنبہ کیا کہ وہ صرف چند دل خوش کن تجاویز پاس کر کے اور بڑی بڑی امیدوں کا اظہار کر کے خاموش نہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد عمل بھی کرے۔ ہم کانفرنس کو اس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دیتے ہیں کہ اسکی صدارت ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال جیسی تجربہ کار اور دانشمند خاتون نے فرمائی۔"

مسودۂ قانون اُردو شاعری ۱۹۲۸ء

از رپورٹر

مضمون زیر بحث کی مناسبت سے آج مجلس واضعان قوانین نے جسے پیار میں اسمبلی کہتے ہیں رات کے وقت اجلاس کیا نشست بجائے کرسیوں کے فرش پر تھی اور جناب صدر ایک مسند زرنگار پر میر فرش بنے بیٹھے تھے۔ جس ممبر کو تقریر کی اجازت ملتی تھی اُس کے سامنے ایک شمع کافوری رکھ دی جاتی تھی اور وہ کھڑا ہو کر نہیں بلکہ بیٹھ کر تقریر کرتا تھا (یا اگر مدراس کا مسلمان ممبر ہوا تو تحریر پڑھتا تھا)

جناب صدر کے حکم سے آنریبل ممبر فنون لطیفہ المتخلص بہ آرٹ پیپر کے سامنے شمع رکھی گئی اور اُنھوں نے نیچے سُروں میں قانون کا مسودہ آلاپنا شروع کیا "از آنجا کہ حکومت نے پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں تعلیم کو نالۂ عشاق کی طرح ملک کی فضا میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا دیا ہے۔ جس کے فیض سے دفتر کے کلرکوں سے لیکر ممبران اسمبلی تک حرف آشنا اور معنی فراموش ہو گئے ہیں (سرکاری بنچوں کی آواز۔ بیشک بیشک سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کیا معنی آفرینی ہے) اپنے فرائض اور حکومت کے حقوق کو پہچان لیتے ہیں بلکہ بعض بعض معرفت کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں جو " من تو شدم تو من شدی من سر شدم تو کمیشن شدی" کہلاتا ہے، لیکن از آنجا کہ (مخالف سرکار بنچوں کی آواز۔ لیکن از آنجا کہ " خلاف محاورہ ہے)۔ (سرکاری آواز۔ محاورہ نہیں تھا مگر اب ہو گیا) لیکن از آنجا کہ اس تعلیم میں جمالیاتی تربیت شامل نہ تھی اس لئے فنون لطیفہ میں اہل ہند ابتک لکیر کے فقیر یا کولھو کے بیل ہی رہے اور از آنجا کہ " فنون لطیفہ غلامان" اس اعتبار سے بڑی اہم چیز ہے کہ اسکا جادو دماغ کی سطح سے گزر کر دل کی گہرائی میں اثر کرتا ہے اور خیالات کے علاوہ جذبات و احساسات کو بھی مسحور کر لیتا ہے۔

اس لئے حکومت کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ معقولات کی طرح اس میں بھی دخل دے کر اپنی عزیز رعایا (مخالف آواز۔ چوں بار ہی بر دعزیز است) کی تعلیم کا کام تمام کرے پس بہت غور کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ فنون لطیفہ کی ایک علیحدہ وزارت قائم ہوا ور چونکہ "اک کمیشن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے" اس لئے اسی سال سے ابتدا بھی ہوگئی۔ اور یہ خاکسار جس نے جعفر زٹلی کے دیوان کا ایک مصور ایڈیشن شائع کیا ہے اور کئی "سالنامے" بہ قلم خود نہ سہی بہ قلم دیگراں تصنیف کر چکا ہے۔ اس بار کا حامل قرار دیا گیا۔ (سرکاری آواز۔ حق بہ حق دار۔ مخالف آواز۔ "الخبیثات . . . . ") احقر مختلف فنون کے اساتذہ سے مشورہ اور اصلاح لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سارے فنون لطیفہ میں سب سے خراب حالت اُردو شاعری کی ہے لہٰذا یہ مسودہ قانون بہ ثبات عقل و ہوش ترتیب دیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کے کام آئے۔

مطلع۔ اس قانون کا نام قانون اُردو شاعری سنہ ۳۶ء ہوگا۔

حسن مطلع۔ اسکا نفاذ سارے ہندوستان میں مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک ہوگا۔

بیت اول۔ ہر شخص کو جو اُردو میں شعر کہنا چاہے پولیس کی چوکی سے ایک لائسنس حاصل کرنا ہوگا جس کی مدت ایک سال ہوگی۔

بیت دوم۔ ہر نظم یا غزل قبل اس کے کہ مشاعرہ میں پڑھی جائے یا کسی رسالہ میں شائع ہو صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش ہوگی۔

بیت سوم۔ سامعین یا ناظرین کو داد دینے کی ممانعت ہے۔ داد سرکاری گزٹ میں شائع ہوا کرے گی۔

بیت چہارم۔ ہر مشاعرہ میں میر مشاعرہ کوئی ایسا شخص ہوگا جو مجسٹریٹ درجہ اول کے اختیارات رکھتا ہو۔ اور پڑھنے والوں کا انتخاب فرقہ وارانہ انتخاب کے اصول پر ہوگا۔

مقطع - ہر دیوان یا ایسی کتاب جو اشعار پر مشتمل ہو آرٹ پیپر پر طبع ہوگی۔

یہ مختصر مسودہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ میں نے خونِ جگر کھا کر جو مضامین پیدا کئے ہیں اُن کی آپ پوری قدر کرینگے۔

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ظلم ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آنریبل ممبر نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی حامیانِ سرکار کی بنچوں سے احسنت۔ مرحبا۔ آمنا صدقنا کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مخالفین کی طرف سے "شعر فہمی حکام بالا دست معلوم شد" کی آوازیں آنے لگی۔ جب یہ غوغا کسی قدر فرو ہوا تو شمع حریفوں کے لیڈر المتخلص بہ وصلی کے سامنے آئی اور موصوف نے اپنے نتائج افکار یوں سنانا شروع کئے۔

"جنابِ میر محفل۔ میرے معزز دوست آرٹ پیپر صاحب کا مسودہ قانون جو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا ایک ایسا دامِ فریب ہے جس سے طائر دل کا بچنا بہت دشوار ہے مگر خدا کے فضل سے ہماری پارٹی میں ایسے ایسے مرغ قفس دیدہ (جو اصطلاح میں بھیدیت کہلاتے ہیں) موجود ہیں جنہیں سوائے سلسلۂ زلف کے کسی بند میں گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ یہ عقاب المانیہ نہ ہوا ایک بار پر نچوا کر بھی نہ چیتا اور پھر مجلس اقوام کے ٹاپے میں بند ہونے کو تیار ہے (سرکاری آواز۔ یہ غیر طرح ہے پڑھنے کی اجازت نہیں، مخالف آواز۔ نالہ پابند نے نہیں ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ ان چالوں میں آنے والے نہیں۔ ہمارے معزز دوست کو خوب معلوم ہے کہ ہم سب اردو شاعری کی عام روش کو ناپسند کرتے ہیں (ایک آواز گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است) اور ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس پر سخت قیود عائد کریں اس لئے انہوں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایسے اہم شعبۂ زندگی کو حکومت کے اثر میں لے لیں۔ معزز دوست نے جو غزل پڑھی مجھے اس کے ہر بیت کے مضمون سے اتفاق ہے۔ مگر بندش سے کلی اختلاف ہے۔ بیشک شاعروں کے لئے لائسنس ہونا چاہئے اور ان کی غزلوں کا احتساب ہونا چاہئے۔ مشاعرہ اور داد پر خاص قیود عائد ہونا چاہئے لیکن سوال

یہ ہے کہ لائسنس دینے والا، احتساب کرنے والا، قیود لگانے والا کون ہو۔ ہماری پارٹی میں بدقسمتی سے اس معاملہ میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ اُردو شاعری کی نگرانی سائنس والوں کی ایک مجلس کے سپرد ہونا چاہئے تاکہ اشعار کے ذریعہ سے جو غلط خیالات لوگوں میں قوانین فطرت کے متعلق پھیلتے ہیں اُنکی روک تھام ہو سکے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ علما کا ایک طبقہ شاعروں کا احتساب کرے۔ تاکہ خلاف شرع باتوں خصوصاً واعظ اور شیخ کی مذمت کا انسداد ہو جائے، جو لوگ شدت سے قوم پرست ہیں وہ چاہتے ہیں کہ لیڈروں کی ایک سب کمیٹی جس میں صدر محض برائے بیت ہو، ہر شاعر کے کلام کو جانچا کرے اور جو شعر قومی جذبات اور ملکی درد سے خالی ہو اُسے نکال دیا کرے۔ پھر بعض دقیانوسی خیال کے حضرات ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اشعار کی اصلاح اور انتخاب کا کلام سخن فہم اور با مذاق اصحاب کے سپرد ہو تاکہ اچھے شعر شائع ہوں اور برے شعر بطن شاعر میں واپس کردئے جائیں۔ غرض اسقدر مختلف خیالات کے لوگ ہماری پارٹی میں موجود ہیں اور ان میں سے ہر جماعت اپنا علٰحدہ مسودہ قانون پیش کرنا چاہتی ہے لیکن الحمدللہ اس پر سب متفق ہیں کہ حکومت کا دخل ہماری شاعری میں ہرگز نہ ہونے پائے ورنہ جس طرح سرکاری سرپرستی میں نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان پیدا ہو رہے ہیں اُسی طرح نیم شاعر خطرۂ زبان پیدا ہونے لگیں گے جن کے کلام کا زہر زبان سے دل میں اور دل سے روح میں پھیل جائے گا۔

جناب صدر ان مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر میں مسودۂ قانون کی مخالفت کرتا ہوں اور امید ہے کہ سب اہل دل میرے ہمزبان ہونگے۔

تقریر کے ختم ہونے پر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ جناب صدر لوگوں کو بہ مشکل خاموش کرتے ہیں۔ رائے لیجاتی ہے۔ مسودۂ قانون کثرت رائے سے نامنظور ہوتا ہے۔

تاریخ عالم کی تعبیر

(۲)

انسانی تاریخ کی جو تصویر فاؤسٹ کی نظر میں تھی اُس کی لوح پر ہمیں کیا نظر آتا ہے۔ انسانوں کا ایک گروہ تعداد و شمار سے باہر، ایک دریائے بیکراں جو ماضی کی ظلمات سے نکلا ہے (جہاں احساس زمانہ کی ترتیب آفرینی بے دست و پا ہے اور بیچین تخیل۔ یا خوف۔ ہمیں طبقات ارض کی ساخت کا طلسمی منظر دکھاتا ہے تاکہ ہمارے عقدۂ مالاینحل کو اس پردے میں چھپا دے) اور مستقبل کی ظلمات میں جاکر غائب ہو جاتا ہے۔

سنا جو قصۂ ہستی تو درمیاں سے سنا نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس دریا کی وسیع سطح پر بے شمار نسلوں کا سلسلہ موجوں کے جال کی طرح گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چمکدار لہریں اٹھتی ہیں اور پھیلتی ہیں۔ روشنی کی عارضی کرنیں پانی کی شفاف سطح پر دوڑتی ہیں اسے پریشان اور تہہ و بالا کر دیتی ہیں اپنا رنگ بدلتی ہیں، ایک آخری چمک دکھاتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں ہم اُنہیں قرن، قبیلے، قومیں، نسلیں کہتے ہیں اور اُن سے تاریخی سطح کے وہ محدود دائرے مراد لیتے ہیں جن میں کئی پشتوں کا ایک سلسلہ شامل ہو۔ جب ان میں قوت تشکیل نہیں رہتی (یہ قوت مختلف قوموں میں مختلف ہوتی ہے اور اسی پر ان کے کارناموں کی خوبی اور مدت حیات کا دار و مدار ہوتا ہے) تو اُن کی صورت، اُنکی زبان اور اُنکا ذہن اپنی مخصوص علامات کھو دیتا ہے اور یہ پھر مٹ کر بے نشانی کی ظلمات میں غائب ہو جاتی ہیں۔ آریا، مغل، جرمن، کیلٹ، پارتھیا والے، فرنیک، اہل کارتھیج، بربر، بنٹو، یہ اس قسم کی نسلوں میں سے چند کے نام ہیں جو ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔

لیکن بڑے تمدنوں کی عظیم الشان لہریں اس سطح سے آگے گزر جاتی ہیں۔ وہ یکایک اٹھتی ہیں

دور دور تک پھیلتی ہیں پھر گر کر ہموار ہو جاتی ہیں اور سطحِ آب کو سنسان اور خوابیدہ چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہیں۔

کسی تمدن کی تخلیق اس لمحہ میں ہوتی ہے جب کوئی بڑی روح بنی نوعِ انسان کی ازلی طفل طبعی کی حالت سے چونکتی ہے۔ اپنے آپ کو روحِ اولےٰ سے جدا کرتی ہے یعنی جب نامحدود اور باقی زندگی میں سے کوئی محدود اور فانی شکل جلوہ آرا ہوتی ہے۔ یہ روح زمین کے ایک خطہ میں جس کی صحیح حدود معین کی جا سکتی ہیں، پھلتی پھولتی ہے اور پودوں کی طرح اُس کی زندگی اسی زمین سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس تمدن کو موت اُس وقت آتی ہے جب یہ روح اپنی تمام صلاحیتوں کو اقوام، السنہ، عقائد، فنونِ لطیفہ، ریاست و حکومت اور علوم کی شکل میں قوت سے فعل میں لا چکی ہو اور پھر روحِ اولےٰ کی طرف لوٹ جائے۔ اُس کی زندگی یعنی زمانہ کا وہ دور جس میں وہ نشو و نما پاتا ہے اور تکمیل کو پہونچتا ہے ایک نہایت سخت روحانی جنگ ہے جس میں وہ "عین" کی خاطر دو دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے باہر کیطرف ظلماتی قوتوں کا اور اندر کی طرف خود اپنے روح کے لاشعوری پہلو کا۔ صرف آرٹسٹ کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ایک طرف مادے اور دوسری طرف اپنی روح کے دشمن عین عناصر سے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ ہر تمدن کو مادے اور مکان سے جس کے اندر اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو مکمل کرنا چاہتا ہے ایک گہرا معنوی بلکہ پُراسرار باطنی تعلق ہوتا ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے اسکا عین یعنی اس کی صلاحیتوں کا مجموعہ مکمل ہو جائے اور خارج میں حقیقت کا جامہ پہن لے تو اس تمدن کی حرکت رک جاتی ہے وہ دم توڑنے لگتا ہے، اسکا خون خشک ہو جاتا ہے اور اُس کی قوتیں سلب ہونے لگتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ "تمدن" سے "تہذیب" بن کر رہجاتا ہے یہی حقیقت ہے جسے ہم اس طرح کے الفاظ میں جیسے مصریّت، بازنطینیت، ماندرینیت، محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عظیم الشان درخت خشک ہونے کے بعد بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک کھڑا رہتا ہے۔ اس کی مثال دیکھنا ہے تو چین، ہندوستان، دنیائے اسلام پر نظر ڈالئے۔ اسی طرح

قیاصرہ کے زمانہ میں روم و یونان کا قدیم تمدن بظاہر جوانی کی آن بان سے موجود تھا اور مشرق کے نوجوان عربی تمدن سے ہوا اور روشنی حاصل کرتا تھا۔

تاریخ میں تمدنوں کے زوال کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان سب کا راز یہی ہے کہ اندرونی اور بیرونی حیثیت سے پختہ اور مکمل ہو جانے کے بعد انحطاط شروع ہوتا ہے۔ یہ دن ہر زندہ تمدن کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ان میں سب سے واضح مثال ہمارے سامنے یونانی رومی تمدن کی ہے اور ہم ایک دوسرے زوال کی جو بیسویں صدی کے ابتدائی صدیوں میں رونما ہوگا یعنی "زوال مغرب" کی ابتدائی علامتیں اپنے اندر اور اپنے گرد دیکھ رہے ہیں جو زمانہ اور ترتیب کے لحاظ سے تمدن قدیم کے زوال سے بالکل مشابہ ہوگا۔

ہر تمدن شخص واحد کی طرح عمر کی مختلف منازل سے گزرتا ہے ہر تمدن کے لئے بچپن جوانی، سن کہولت اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ ایک نوجوان، حجاب آگیں، روح جو حقیقت کی جھلک پردے میں سے دیکھتی ہے رومانی طرز زندگی اور گوتھک طرز تعمیر رکھتی ہے . . . . . . جس سرزمین میں یہ رہتی ہے اس میں موسم بہار کی ہوائیں چلتی ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے "پرانے جرمن طرز تعمیر کے نمونوں میں ایک غیر معمولی تمدن کا شباب نظر آتا ہے جو شخص ایک پودے کے اندرونی پراسرار زندگی کا غور سے مطالعہ کرتا ہے کہ کس طرح اس کی قوتوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور کس طرح آہستہ آہستہ پھول بنتا ہے وہ اس معاملہ کو دوسری آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور جو کچھ دیکھتا ہے اسے سمجھتا ہے،، اسی طرح ہومر کے ابتدائی زمانہ کی ڈورک موسیقی آخری مسیحی یعنی ابتدائی عربی دور کے فنون لطیفہ اور ان صناعی کے نمونوں سے جو مصر کی قدیم سلطنت میں چوتھے خاندان کے زمانہ سے ظہور میں آنے لگے صاف بچپن ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں دنیا کا اساطیری احساس نفس اور فطرت کی ہر تاریکی کو ایک جرم سمجھتا ہے اور اس سے برسر پیکار رہتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ اس کی تیاری کرے کہ زندگی کو جان بوجھ کر قابو میں لائے اور خالص روشنی میں بسر کرے جوں جوں کوئی تمدن اپنی زندگی کی دوپہر سے قریب ہوجاتا ہے اس کی معینہ "صورت"

میں زیادہ مردانگی سختی، ضبط اور سیرابی پیدا ہو جاتی ہے احساس قوت بڑھتا جاتا ہے اور اُس کے خد و خال نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ سب چیزیں دھیمی اور دھندلی تھیں اور ان پر بچوں کی طرح آرزو اور خوف کا عالم طاری تھا۔ سیکسنی اور جنوبی فرانس کے پرانے گرجوں کے مخلوط رومانی اور گوتھک طرز تعمیر کو دیکھیے اور قدیم مسیحی تحت ارضی مقبروں وغیرہ کو یاد کیجیے۔ وسطی سلطنت کے آغاز کے زمانے ، ، ، جسٹینین اول کے عہد، اصلاح مذہبی کے ردعل کے دور کو مشاہدہ کیجیے تو اب جب کہ قوت تشکیل کا احساس پختہ ہو چکا تھا یہ نظر آئے گا کہ طرز تعمیر کے ہر جزوی پہلو میں انتخاب، صحت، تناسب سے کام لیا گیا ہے اور عجب طرح کا اطمینان اور بے تکلفی ٹپکتی ہے۔ اس زمانہ میں سب کہیں تکمیل کے روشن نمونے نظر آتے ہیں شلاً . . . . . . ٹیشین کی تصویریں۔ اس کے بعد . . . . . . ڈریسڈن کی عمارتوں واٹو کی تصویروں اور موزارٹ کی موسیقی میں وہ نزاکت اور باریکی نظر آتی ہے جو اکتوبر کے آخری دنوں کی دلکشی اور حسرت سے مشابہ ہے۔ آخر کار تمدن کے بڑھاپے میں جو شروع ہو رہا ہے روح کی آگ بجھ جاتی ہے۔ گھٹتی ہوئی قوت پھر ایک بار جرات کرتی ہے کہ قدیم تمدن کو زندہ کرے (اس کی مثالیں ہر تمدن میں ملتی ہیں) اور کوئی بڑا کارنامہ دکھائے لیکن اس میں اسے بہت محدود کامیابی ہوتی ہے۔ روح نہایت حسرت کے ساتھ اپنا بچپن کا زمانہ یاد کرتی ہے اور اسکا اظہار روحانی تحریک سے ہوتا ہے آخرکار وہ تھک کر اور ہار کر لطف زیست کھو دیتی ہے اور (جس طرح قیاصرہ روم کے زمانہ میں ہوا تھا) یہ آرزو کرتی ہے کہ ہزار سال کی روشنی کے بعد پھر اسی روح اولی کی باطنی پر اسرار زندگی میں آغوش مادر میں یعنی قبر میں واپس جائے۔ یہی احیائے مذہبیت کا عمل تھا جس نے یونانی تمدن کے آخری زمانہ میں آئیسیس متھراس اور رسول کے پرستاروں کو پیدا کیا۔ یہ وہ مذاہب تھے جن کے ذریعے سے کسی زمانہ میں مشرق کی ایک نوخیز روح (مصری تمدن) نے اپنے احساس تنہائی کا خواب آسا اور پرخوف اظہار کیا تھا اور جس نے ان میں ایک نئی معنویت پیدا کر دی تھی۔

تنقید و تبصرہ

نکات رموزی

شائع کردہ "کتابستان" فرنگ لاہور۔ حجم ۱۲۶ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عہ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجہ کا۔

کسی قوم کے ادبی مذاق کی صحت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے ذوق ظرافت کو دیکھئے۔ اگر اسے بے تکلف، ستھری، معنی خیز ظرافت پسند ہو تو سمجھئے کہ وہ اعلیٰ ادب کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اگر اُس کی ظرافت میں آورد، بازاری پن یا محض تمسخر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ذہنی تہذیب سے محروم ہے اور سچے ادب کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔ ہمارے ملک کی دماغی پستی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ عموماً ظرافت کے نام سے سفاہت کے بدترین نمونے پیش کئے جاتے ہیں جنہیں عوام بلکہ بعض خواص بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کلیہ کے بعض استثنا بھی ہیں۔ ملا رموزی صاحب بھی ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنہیں خدا نے یہ جوہر عطا کیا ہے کہ زندگی کے اہم مسائل پر سچی اور پاکیزہ ظرافت کے انداز میں بحث کرتے ہیں اور اپنے ناظرین کو ایک طرف تو ہنسا کر خوش کرتے ہیں اور دوسری طرف غور و فکر کی ترغیب دیتے ہیں۔ موصوف کے بعض مضامین کا مجموعہ نکات رموزی کے نام سے شائع ہوا ہے اور اسمیں متعدد مضامین ایسے ہیں جن کے پڑھنے سے واقعی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ہنسی ہنسی میں انسان ملا صاحب کی "رائے"، جو عموماً چھپی ہوئی ہوتی ہے معلوم کر سکتا ہے۔ اور خواہ اُس سے اتفاق کرے یا نہ کرے اس کی قدر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت۔ (کمیٹی ماہرین تعلیم آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کا سہ ماہی رسالہ۔ زیر ادارت

اکبر ظفر الحسن پی ایچ ڈی، ڈی فل۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی اور خواجہ
غلام السیدین صاحب ایم ایڈ علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی
کاغذ اوسط درجہ کا۔ چندہ سالانہ صہ)

خدا کا شکر ہے کہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کی مدت کی آرزو پوری ہوئی اور ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ایک ایسا رسالہ نکلا جو مسلمانوں کے بہترین تعلیمی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلے سال میں تعلیم کے لئے بہت کچھ تگ و دو کی لیکن چونکہ ان کی کوشش کسی اصول کے ماتحت نہ تھیں اور ان کا عمل غور و فکر پر مبنی نہ تھا اس لئے نتائج کچھ قابل اطمینان نہ نکلے۔ اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان تعلیمی مسائل پر علمی نقطہ نظر سے غور کریں اور خوشی کی بات ہے کہ ایک حد تک ایسا ہو بھی رہا ہے۔ رسالہ تعلیم و تربیت کا پہلا نمبر اس بات کی کافی شہادت ہے کہ مسلمانوں میں بعض افراد واقعی تعلیم پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور مجموعی تمدنی زندگی کی نسبت سے اسکا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رسالہ میں حسب ذیل مختلف عنوانات ہیں۔

۱۔ مضامین خاص
۲۔ نئے تعلیمی تجربات
۳۔ اقتباسات
۴۔ بزم معلمین
۵۔ شذرات

ان کی تحت میں بارہ تیرہ مضامین جو تقریباً سب کے سب نہایت مفید اور دلچسپ ہیں بہت سلیقہ اور ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ ہم کانفرنس کو اس رسالہ کے اجرا پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تمام معلمین اور محبان تعلیم اس رسالہ سے استفادہ کرینگے۔

ہماری شاعری۔ (سلسلہ انجمن ترقی اردو۔ مصنفہ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم

اے - حجم ۱۸۴ صفحہ لکھائی چھپائی بہت نفیس ہر صفحہ کے گرد سرخ بیل کی جدول - کاغذ عمدہ قیمت دو روپے)

اردو زبان میں اب تک شاعری کی حقیقت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں غالباً علاوہ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری اور مولانا شبلی کے مختلف مقالات کے جو شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر میں ملتے ہیں کوئی مستند چیز موجود نہیں - خصوصاً ان اعتراضات کے جواب میں جو اہل مغرب یا مغرب پرستوں کی طرف سے اردو شاعری پر کئے جاتے ہیں کوئی معقول بحث اب تک دیکھنے میں نہ آئی تھی - سید مسعود حسن صاحب رضوی سارے قدر دانان اردو کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے "ہماری شاعری" کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھدی ہے جسے ہم بے تکلف یوروپ کے بہترین نقادوں کی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں - اس کتاب میں شاعری کی عام ماہیت سے محققانہ بحث کی گئی ہے اُس کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ اُردو شاعری اپنے فطری اور تمدنی ماحول کے اثر سے کیا خصوصیات رکھتی رکھتی ہے - کتاب کے اصل حصہ میں مصنف نے اُن اعتراضات کو ایک ایک کرکے جانچا ہے جو عام اردو شاعری پر کئے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات شاعری کی حقیقت سے ناواقفیت اور یوروپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہیں - آخر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ہدایت کی ہے کہ انہیں اردو شاعری کے مطالعہ میں کن باتوں کو مدنظر رکھنا چاہئے - مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ادب اردو میں ایسا گراں قدر اضافہ ہے جس سے کسی با مذاق شخص کا کتب خانہ خالی نہ رہنا چاہئے -

لمعات اختر -

مجموعہ اشعار قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی - حجم ۶۰ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اوسط درجہ کا قیمت ۸ر - مصنف سے حسب ذیل پتہ پر مل سکتی ہے -

اختر منزل۔ قاضی واڑہ۔ جوناگڈھ۔ کاٹھیاوار

قاضی احمد میاں صاحب ان باکمال لوگوں میں سے ہیں جو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ مختصر مجموعہ جس میں غزلیں۔ مختلف قطعات۔ مسلسل نظمیں اور بعض مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے شامل ہیں نہایت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے خصوصاً انگریزی نظموں کے ترجمے نہایت خوبی سے کئے گئے ہیں۔

استقلال حجاز

مصنفہ اسمٰعیل غزنوی صاحب۔ حجم ۲۰ صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت درج نہیں اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں جو حسین سابق شریف مکہ کے طرفدار ابن سعود کی حکومت پر کرتے ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ اسمٰعیل غزنوی صاحب امرتسر۔

ہنرمند۔ (ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت شیخ محبوب آلہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی پلیڈر لاہور۔ حجم ۴۸ صفحہ۔ قیمت سالانہ ۱عہ)

یہ رسالہ "تجارت صنعت و حرفت اور زراعت" کی عملی تعلیم دینے کے لئے جاری کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو وہ تدابیر بتاتا ہے جس کے ذریعہ وہ "قومی تنزل اور ادبار" کو دور کرکے خوشحال اور باعزت زندگی بسر کرسکیں۔ ہماری موجودہ حالت کے لحاظ سے یہ رسالہ محض صنعت پیشہ لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ہر شخص کے لئے مفید ہے۔ مضامین اچھے ہیں مگر انکی ترتیب اور رسالہ کی لکھائی چھپائی میں زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ ہنرمند حویلی کابلی مل لاہور۔

امداد باہمی۔ (ماہوار اقتصادی رسالہ زیر ادارت شیخ یعقوب علی عرفانی حجم بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحہ۔ لکھائی معمولی چھپائی اچھی۔ کاغذ اوسط درجہ کا قیمت سالانہ ۱عہ مقام اشاعت تراب منزل

قادیان)

اس رسالہ کا مقصد بھی مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے سے لوگ موجود ہیں جن کے نام سے اُردو رسائل کے ناظرین بہ خوبی واقف ہیں۔ مضامین تقریباً سب اچھے ہیں اور ترتیب بھی مناسب ہے مگر باوجود ان سب خوبیوں کے چھ روپیہ چندہ کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

زمانہ (جوبلی نمبر)

زمانہ اردو کے مایہ ناز رسالوں میں سے اور اس اعتبار سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کئے ہیں۔ جوبلی نمبر میں ہندوستان کے بہترین مضمون نگاروں کے ۵۲ مضامین اور مشہور شعرا کی ۴۵ نظمیں اور ۶۲ مختلف تصویریں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض رنگین ہیں۔ تصویریں زیادہ تر اردو کے ممتاز شعرا اور مصنفین کی ہیں۔ اور ہمارے ملک کے بہترین نقاشوں کی صناعی کے کچھ نمونے بھی ہیں۔ رسالہ کا مجموعی حجم ۲۱۶ صفحہ ہے۔ ان سب خوبیوں کے مقابلہ میں عہ قیمت بہت کم ہے۔

مخزن (سالگرہ نمبر)

بڑی تقطیع کے ۱۶۰ صفحہ پر لکھائی معمولی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲/

مخزن کے دور جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت اچھے افسانے اور پاکیزہ نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیت سالگرہ نمبر میں بدرجہ اولی موجود ہے۔ کل مضامین ۳۸ ہیں مگر سب منتخب "تصویریں صرف چار ہیں دو آرٹ کی دو مشاہیر ادب کی" یہ شاید کسی کے نزدیک قابل اعتراض بات ہو مگر ہمارے خیال میں مدیر کی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

شذرات

اردو اکادمی کے ممبروں کی تعداد میں اس مہینہ میں بہت کم اضافہ ہوا اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ رمضان کے سبب سے حامیان اکادمی کو فرصت نہیں ملی کہ ممبروں کے بڑھانے کی کوشش کریں۔ رمضان کے بعد اجمل میموریل فنڈ کے سلسلہ میں جس کا نام اب جامعہ اجمل فنڈ قرار پایا ہے صوبہ متحدہ کے بعض حصوں میں مثلاً بنارس، غازی پور، جونپور، اعظم گڈھ، مرادآباد بجنور، بریلی، شاہجہانپور وغیرہ میں جامعہ کا وفد جائے گا اور ان اطراف میں ارباب ذوق کو ممبر بنانے کی کوشش ہوگی۔

وہ دونوں کتابیں جن کا پچھلے پرچہ میں ذکر کیا گیا تھا یعنی تفسیر پارہ عم موسوم بہ ذکرے اور عربوں کا تمدن تیار ہیں اور اس پرچہ کے پہونچنے سے پہلے ممبران اکادمی کو پہونچ جائیں گی بعض حضرات کو ان کے اصرار پر ذکرے کی جگہ سال گزشتہ کی مطبوعات میں سے تاریخ فلسفۂ اسلام بھیجی جا رہی ہے اگر اتفاقاً کسی ممبر کو اس پرچہ کے پہونچنے تک دو کتابیں اکادمی کی طرف سے نہ پہونچی ہوں تو توقع ہے کہ فوراً اس کی اطلاع دیں گے تاکہ تحقیقات کی جائے کہ نہ پہونچنے کا کیا سبب ہے اور کتابیں دوبارہ بھیجی جاسکیں۔

ہم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری اس کوشش میں کہ ہر مہینہ کا جامعہ اسی مہینہ کے آغاز میں شائع ہو جائے۔ ہماری بڑی مدد کی۔ موصوف نے اپریل کے پرچہ کی ترتیب اپنے ذمہ لے لی ہے اور اب امید ہے کہ مارچ کا پرچہ حسب معمول ۰ ار اپریل تک شائع ہونیکے بعد اپریل کا پرچہ قارئین کرام کو ۵ ار اور ۲۰ ر اپریل کے درمیان

پہونچ جائے گا اور مئی کا انشاء اللہ ۸ رمئی تک نکل سکے گا۔

جامعہ اجمل فنڈ کا جو چندہ دہلی میں ہو رہا تھا اس میں وعدوں کی تعداد تیس ہزار روپیہ تک پہنچ گئی ہے۔ رمضان کے سبب سے وصولی میں پوری کوشش نہ ہوسکی۔ پھر بھی پانچ ہزار سے زیادہ نقد وصول ہو چکا ہے اور بقیہ میں سے انشاء اللہ ایک معقول حصہ آئندہ ماہ میں وصول ہو جائے گا۔ رمضان کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں میں دورہ بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوگا اور امید ہے کہ ہر شہر دہلی کا مقابلہ کرنے بلکہ اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کریگا۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ رقمطراز ہے کہ پروفیسر اے۔ جے۔ وینزنگ نے جو لائیڈن یونیورسٹی میں السنہ سامیہ کے پروفیسر ہیں حدیث کی ایک انڈکس شائع کی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس عظیم الشان کام کا حوصلہ کیا ہے کہ یوروپ کے محصلین علوم اسلامی کے لئے احادیث کا ایک مکمل مجموعہ شائع کریں۔ یہ انڈکس اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مؤلف نے کمال عرق ریزی سے یہ انڈکس تیار کی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کا ماخذ بھی معلوم ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ ابن اثیر کی نہایہ سے زیادہ مفید ہے۔ حدیث کے مطالعہ کو آسان کرنے میں اس کتاب کا وہی حصہ ہے جو ڈاکٹر اسٹینٹن کی انڈکس کا قرآن کے بارے میں ہے۔ یہ کتاب لائیڈن سے برل کے مشہور مطبع نے شائع کی ہے۔

اسی رسالہ میں ڈاکٹر یعقوب صروف مرحوم مدیر المقتطف کی زندگی کے حالات شائع ہوئے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۸ رجولائی ۱۸۵۲ء کو لبنان میں ہوئی اور انہوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ۱۸۷۰ء میں بی۔ اے۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ پہلے وہ چند سال

تک شام وغیرہ میں امریکن کالجوں میں لکچرر اور پرنسپل ہے۔ پھر بیروت کی یونیورسٹی میں ریاضی اور سائنس کے پروفیسر ہو کر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ہر طرح کا سائنس کا تجربہ خواہ وہ کیسا ہی خطرناک کیوں نہ ہو دکھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کیمیا وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور بہت سی مفید انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس میں ایک حد تک ڈاکٹر فرنیس نمر بھی ان کے شریک تھے۔ سب سے زیادہ شہرت انہوں نے بہ حیثیت مدیر مقتطف حاصل کی۔ یہ رسالہ انہوں نے اور ان کے دوست نے ۱۸۷۶ء میں بیروت سے جاری کیا ۱۸۸۵ء میں یہ دونوں بیروت سے قاہرہ چلے گئے اور ۱۸۸۹ء میں جب روزانہ مقطم جاری ہوا تو ڈاکٹر فرنیس نمر اس کے مدیر ہو گئے اور یعقوب صروف مقتطف کا کام کرتے رہے۔ مقتطف انگلستان کے مشہور رسالہ "نائینٹینتھ سینچری" کے نمونہ پر نکالا گیا تھا اور اکثر اس کے مضامین ترجمہ کر کے شائع کرتا تھا۔ اس کے سبب سے مصر اور شام کے لوگوں کو مغربی علوم و فنون سے بہت اچھی واقفیت ہو گئی اور اس نے عربی زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

انجمن اقوام کے ادارۂ اتحاد ذہنی سے ہمیں کئی رسالے موصول ہوئے ہیں جو اس ادارہ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ ہم کسی پچھلی اشاعت میں اپنے خیالات اس ادارہ کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ پھر بھی قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کی کچھ مختصر کیفیت اور اس کے مقاصد بیان کر دئے جائیں۔ انشاء اللہ مئی کے پرچہ میں ہم ایک مضمون اس کے متعلق شائع کریں گے۔

دہلی میں پچھلے مہینہ آل انڈیا خواتین کانفرنس زیر صدارت ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ منعقد ہوئی۔ جس میں تمام ہندوستان کی ممتاز خواتین شریک ہوئیں۔ مختلف مسائل

پر خصوصاً تعلیم نسواں پر قابل قدر تقریریں کی گئیں اور مفید تحریکیں پاس ہوئیں۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین میں اتنی بیداری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ خود اپنی فلاح و بہبود کی تحریکوں پر غور کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان سے یہ عرض کرنا ہے کہ بیشک کانفرنس مفید چیز ہے لیکن اس کا فائدہ بہت محدود ہے۔ موجودہ صورت میں اس کا اصل مقصد تبادلہ خیالات ہے اور اس کی بیشک ہماری خواتین کو بہت ضرورت ہے لیکن اس تبادلہ خیالات سے جو نتائج نکلتے ہیں اُن کو عملی جامہ پہنانا بھی بہت ضروری ہے ورنہ خواتین کانفرنس کا بھی وہی حال ہو جائے گا جو مردوں کی بہت سی کانفرنسوں کا ہے۔ ہم کانفرنس کو سچے دل سے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ یا تو خود عورتوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے مفید تحریکیں کرے یا جو تحریکیں پہلے سے موجود ہیں انہیں اپنی نگرانی میں لے تاکہ اُس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کانفرنس کو ایک شعبۂ اشاعت قائم کرے جو اہل فکر سے خواہ وہ عورتوں میں سے ہوں یا مردوں میں سے ایسے مسائل پر جو خواتین کے لیے اہمیت رکھتے ہیں رسائل اور مضامین لکھوائے اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن چیزوں پر اب فوری جوش اور عارضی جذبات کے ساتھ نظر ڈالی جاتی ہے ان کا غور و فکر اور مآل اندیشی کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکے۔ اس طرح ترقی پسند خواتین کو خود اپنے خیالات واضح کرنے کا موقع ملے گا اور دوسروں میں اُن کے مقاصد کی اشاعت بھی ہو سکے گی۔

ہم عصر ماڈرن ریویو نے وی۔ ڈی ادک صاحب پروفیسر ڈلبر فورس یونیورسٹی ڈلبر فورس، اوہیو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک تحریر شائع کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

کہ وہ آج کل اپنی کتاب "ہندوستان میں انگلستان کی تعلیمی پالیسی" پر نظر ثانی کر رہے ہیں انہیں ہندوستان کی جدید تعلیمی تبدیلیوں سے واقفیت نہیں ہے اس لئے وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں ایسی کتابوں، رسالوں رپورٹوں کے نام بھیجیں جن کے ذریعہ سے ہندوستان کے پچھلے چند سالوں کے تعلیمی انتظامات سے واقفیت ہو سکے یا ممکن ہو تو یہ چیزیں پروفسر صاحب کو بھیجدیں۔ اس کتاب میں یہ اضافہ کیا جائے گا کہ ہندوستان کی قومی تعلیم پر اور بعض دوسرے ملکوں خصوصاً امریکہ کے تعلیمی نظام پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے گی۔ ہمیں امید کہ ہمارے ناظرین میں سے جو حضرات پروفسر صاحب کی مدد کر سکتے ہیں وہ اس میں بخل نہ کریں گے۔

پروفسر جادو ناتھ سرکار کے خطبہ ہائے صدارت عموماً قابل غور اور قابل قدر ہوتے۔ حال میں موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں یونیورسٹی کے مقاصد پر محققانہ نظر ڈالی اور نہایت خوبی کے ساتھ یہ بیان کیا کہ اعلیٰ تعلیم کو بنی نوع انسان کو تمدنی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔ پروفسر صاحب نے فرمایا کہ یونیورسٹی کا پہلا مقصد یہ ہے کہ قوم کے لئے قائد پیدا کرے جو زندگی کے پیچ در پیچ راستوں میں اس کی راہنمائی کر سکیں اُسکا فرض ہے کہ قابل نوجوانوں کو خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں ابھارے اور اقتدار اور ذمہ داری کی بلندیوں پر پہنچائے تاکہ حقیقی مساوات قائم ہو سکے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں سے فرقہ دارانہ تعصبات کو دور کر کے اُن میں وہ اعلیٰ اور شریفانہ جذبہ پیدا کرے جو "انسانیت" کہلاتا ہے۔ تاکہ وہ دنیا کے تمام مہذب لوگوں سے اتحاد ذہنی پیدا کر سکیں۔ اور تیسرا (اور غالباً سب سے اہم) مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں میں صحیح تربیت سے ایسا ضبط نفس پیدا کیا جائے کہ وہ کسی خواہش، کسی جذبے، کسی جوش سے متاثر ہو کر حق و باطل کے فرق کو نظر انداز نہ کریں۔

آخر میں پروفسر صاحب نے حسب معمول نوجوانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جو قوم پرستی

کے غلط معنی سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ طلبہ کو چاہئے کہ وہ قوم پرستی سے مسحور ہوکر اپنی تعلیم کو ادھورا نہ چھوڑ دیں کیونکہ سچا قوم پرست اور خادم ملک بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان پہلے کسی قابل ہو جائے۔

جو باتیں پروفیسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں اُن سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف نہیں کر سکتا البتہ جن باتوں سے انہوں نے عمداً یا سہواً چشم پوشی کی ہے ہم ان کی طرف موصوف کو توجہ دلاتے ہیں۔ جہاں آپ نے تنگ خیالی کو ترک کرنے اور وسیع عالمگیر ذہنی اتحاد کی کوشش پر زور دیا ہے وہاں اس پہلو پر بھی نظر ڈالتے کہ فرد کی تہذیب نفس کے لئے اپنے قومی تمدن کا احترام اور اپنی قوم کی محبت کس حد تک ضروری ہے۔ اسی طرح جہاں آپ نے طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ قوم پرستی کے جوش میں تعلیم کو ترک نہ کریں وہاں یہ کہنا بھی ضروری تھا کہ تعلم کے نشے میں اسے نہ بھول جائیں کہ وہ ایک جماعت کے افراد ہیں جس کی فلاح اور بہبود ان کی ساری زندگی کا نصب العین ہے یا ہونا چاہیئے کیونکہ ایسے طلبہ جو قوم کی محبت میں بجا یا بیجا طور پر اپنے مدرسے چھوڑ دیں کم ہیں اور ایسے جو صحیح یا غلط تعلیم کے غرور میں قوم کو بالکل بھلا دیں زیادہ ہیں۔

شمع

پسند فرمائیے

کیا جناب کو علم و ادب کا ذوق ہے ؟

کیا جناب کو سیاست سے دلچسپی ہے ؟

کیا جناب کو تاریخ سے شوق ہے ؟

کیا جناب اپنی زبان میں یوروپ کا لٹریچر دیکھنا پسند کرتے ہیں ؟

کیا جناب ہندوستان کے بہترین شعرا کا پاکیزہ کلام ہر ماہ دیکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اخلاقی و تمدنی مضامین سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اعلیٰ پیمانہ کے افسانوں سے نیک سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب زمانہ کی جدید ترین ترقیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب جدید ترین مطبوعات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب مصوری کے لاجواب نمونے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب تاریخی اور کیاب تصاویر کے شائق ہیں ؟

کیا جناب اپنے فاضل وقت کو بہترین مشغلہ میں صرف کرنا چاہتے ہیں ؟

اگر آپ انمیں سے ایک بھی خواہش کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو رسالہ "شمع" کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اور آج ہی ۱۰ ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب فرمائیے۔ لکھائی چھپائی بہترین چندہ سالانہ ۶ ششماہی ہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء سے مصوری کے بہترین نمونوں کے شاہان اودھ کی نہایت قیمتی اور بیش تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

منیجر رسالہ شمع، حسن منزل شاہگنج آگرہ

اعلان

جامعہ ملیہ کا "شعبۂ تصنیف و تالیف" جدید انتظام کے بعد "اُردو اکادمی" کہلاتا ہے "اکادمی" کا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کر شائع کرے۔ اب تک یوروپ کی مختلف زبانوں سے بہترین کتابوں کے چند تراجم اور متعدد اوریجنل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ آئندہ کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ کم سے کم چھ نئی کتابیں ہر سال لکھی جائیں "اکادمی" نے اپنے قدردانوں کی آسانی اور اپنے فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ جو حضرات للعہ روپیہ سال اکادمی کو عطا فرمائیں وہ اس کے رکن قرار دئے جائیں اور انکی خدمت میں رسالہ "جامعہ" اور "اکادمی" کی سال بھر کی جملہ مطبوعات نذر کے طور پر پیش کیجائیں۔

زرچندہ کی وصولی کا یہ طریقہ ہے کہ ہر سہ ماہی کے شروع میں للعہ کا وی پی بھیجا جائے گا اور اُس کے وصول ہونے پر ہر رکن کے نام رسالہ "جامعہ" ماہوار بھیجا جائیگا اور "اکادمی" کی جو کتاب تیار ہوگی وہ فوراً روانہ کیجائیگی، اگر کسی سہ ماہی میں وی پی وصول نہ کیا گیا اور واپسی کے بعد پندرہ دن کے اندر زرچندہ منی آرڈر سے نہ پہنچا تو مجبوراً رسالہ جامعہ اور کتابوں کی روانگی بند کر دیجائیگی۔

اسکا خیال رکھا جائیگا کہ رسالہ جامعہ اور سال بھر کی مطبوعات کی مجموعی قیمت للعہ سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ پندرہ روزہ رسالہ "پیام تعلیم" جس کی سالانہ قیمت عہ ہے تحفۃً ہر رکن کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ جو صاحب ان شرائط پر "اکادمی" کا ممبر بننا منظور فرمائیں وہ اپنا نام معہ پورے پتہ کے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی، ایچ ڈی

ناظم اُردو اکادمی۔ جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی

جامعہ

زیر ادارت

مولینا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ؛ پی ۔ ایچ ۔ ڈی

جلد ۱ بابتہ ماہ ذیقعد ۱۳۴۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۲۸ء نمبر ۴

فہرست مضامین

پانچہزار سال قبل ہندوستان کی تہذیب

سندھ اور پنجاب کے حیرت انگیز انکشافات

سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ایک مقام ہے جو آج کل موہنجو دارو کے نام سے موسوم ہے اور اُس سے کوئی ساڑھے چار سو میل شمال کی جانب منٹگمری کے ضلع میں ایک دوسرا مقام ہے جس کا نام ہڑپا ہے اِن دونوں مقامات پر گزشتہ چند سال سے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے کھدائی کا کام جاری ہے۔ اِس سلسلہ کی ہر کھدائی کے موسم میں ان مقامات سے کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں نکلتی رہی ہیں جن سے ایک نہایت قدیم اور عالیشان تہذیب کا پتہ لگتا ہے۔ گزشتہ کھدائی کے اختتام پر جتنی اشیاء برآمد ہوئیں اُن سب کو پہلی برآمد شدہ اشیاء کے ساتھ رکھنے اور اُن پر بالفعل ایک سرسری نظر ڈالنے سے محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ تقریباً ۳ ہزار سال قبل مسیح یعنی اب سے کوئی پانچہزار برس پہلے اس علاقہ میں ایک ایسی قوم آباد تھی جس کے مکانات و عمارتیں، معاشرت و تمدن، لباس و وضع، آلات و اوزار، مذہب و عقاید، تجارت و سیاست غرض زندگی کے تمام لوازمات آج بڑی سے بڑی متمدن قوموں سے بھی کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ دنیائے تاریخ میں اِن تازہ انکشافات سے جو حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوا ہے، اُس کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آج اس موضوع پر تقریباً ہر اُس زبان میں جسے ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے کچھ بھی تعلق ہے، بہ کثرت مضامین و مقالات نکل رہے ہیں اور یہ علاقہ جہاں اب سے قبل قدم رکھنا قطعاً ممنوع سمجھا جاتا تھا، آج سیاحین اور محققین کا مرکز توجہ ہو رہا ہے۔

سع لاڑکانہ کا یہ مقام جہاں سے یہ چیزیں برآمد ہوئی ہیں، ایک بہت غیر معروف اور گمنام خطہ ہے ۔ اب سے پیشتر کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوا تھا کہ یہاں کسی عالیشان قدیم تہذیب و تمدن کے آثار مدفون ہیں، البتہ روایتہً اس قدر مشہور ضرور تھا کہ اس طرف قدیم زمانہ میں کچھ لوگ بستے تھے جو تباہ اور برباد ہوگئے اور اب اس طرف رُخ کرنا خود اپنی تباہی و بربادی کے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر صرف اس قدر پتہ چلتا تھا کہ بڑے بوڑھوں نے اس طرف جانے سے منع کیا ہے ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرف جانے کی ممانعت رسول اکرمؐ نے کی ہے ۔ غرض ایک تو خود اس علاقہ کا غیر معروف ہونا، دوسرے ان خطرناک روایات نے اس خطہ کو اور بھی قعر گمنامی میں ڈالدیا جس سے کوئی شخص اس کی طرف کبھی بھولے سے بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ اسی حالتمیں کسی مقامی ذریعہ سے محکمہ آثار قدیمہ کو یہ اطلاع ملی

---

[1] اسکے گمنام اور غیر معروف ہونے کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ ابتک اسکے صحیح نام کا بھی کسیکو علم نہیں ہے۔ موہنجو دارو جو علمی طبقہ میں اس کا معروف نام ہے وہ سب سے پہلے اس کام کے شروع کرنیوالے کی ایک اپنی اختراع ہے جو انکے اس علاقہ کی زبان اور حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے ایک سندھی دوست کا خیال ہے کہ یہ نام موہنجو ڈیرو ہوسکتا ہے اس لئے کہ شہروں کے نام وہاں اس قسم کے اکثر ہوتے ہیں۔ ڈیرو بمعنی ڈیرہ یا مستقر کے ہیں اور موہنجو اُس والی یا سردار کا نام ہوگا جسکا وہ مستقر تھا، جسطرح صوبہ سرحدی کے بعض اضلاع کے نام ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان ہیں لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں، موہنجو کے نام ہونے میں اب بھی وہی شک باقی ہے اور اگر یہ کسی شخص کا نام تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ غیر متعین ہے کہ یہ نام اس جگہ کا اُس وقت بھی رہا ہو جب اس تہذیب و تمدن کا فروغ تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس جگہ کا اصل نام اُس وقت سے چلا آتا ہو جبکہ خود وہاں کی ہر چیز تباہ و برباد ہوگئی ہو۔ زیادہ صحیح نام اس کا 'موئنجو دڑو' ہوسکتا ہے جو ایک دوسرے مکرم کا خیال ہے۔ 'موئنو' کے معنی سندھی زبان میں 'مردے' کے ہیں۔ 'جو' کے معنی 'کا' اور 'دڑو' کے معنی 'ڈھیر' کے ہیں، گویا پورے لفظ کے معنی ہوئے 'مردوں کا ڈھیر' جسے انگریزی میں Mound of the dead کہہ سکتے ہیں اور ان کھنڈرات اور آثار کو دیکھتے ہوئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

کہ یہاں قدیم عمارات کے کچھ آثار نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ محکمہ کی طرف سے پہلے مسٹر بنرجی ایک بنگالی بھیجے گئے۔ بنگالی بابو کو سب سے پہلی اور نمایاں چیز ایک ستوپ[1] نظر آئی جسے آپ نے موریا عہد کا قرار دیا اور اس سے بطور کلیہ یہ نتیجہ نکالا کہ اور یہاں پر جتنے آثار ہیں سب اسی عہد حکومت کے ہوں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کھدائی کا مزید کام شروع ہوا اور اس وقت جو چیزیں برآمد ہوئیں، اُن سے مفتشین اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہاں قدیم زمانہ میں کسی بہت بڑے تمدن کا وجود تھا۔ غرض اب آخری بار سرجان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ کی سرکردگی میں جو کام شروع ہوا ہے اُس میں بہت کثرت سے چیزیں نکلی ہیں اور اس آخری کوشش نے صاف طور پر لاکر لوگوں کے سامنے اس امر کو عیاں کردیا ہے کہ یہ تمدن ایک بہت بلند پایہ اور عظیم الشان تمدن ہے اور اس کا زمانہ حضرت مسیح سے کوئی تین ہزار سال قبل یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار برس پہلے ہے۔

ان کھدائیوں کے دوران میں یکے بعد دیگرے متعدد تہیں نکلی ہیں، جن میں سے ہر ایک تہ پر ایک ایک زمانہ کے آثار نکلتے ہیں۔ سب سے بالائی تہ پر موریا عہد کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کے بعد دوسری اور تیسری تہ پر کشن کے زمانہ کی عمارتیں ہیں اور اسی طرح سب سے آخری تہ کی اشیاء سب سے قدیم زمانہ کی نشانیاں ہیں۔ چیزیں جو عموماً زمین کے اندر سے نکلتی ہیں، وہ بالکل مسلم اور صحیح حالت میں ہوتی ہیں۔ موہنجو دڑو، میں چیزوں کی تعداد اگرچہ نسبتاً کم ہے لیکن وہ زیادہ صحیح وسالم حالت میں ہیں۔ برعکس اس کے ہڑپا میں چیزیں کثرت سے برآمد ہوئی ہیں لیکن زیادہ شکستہ اور غیر سالم حالت میں ہیں۔ موہنجو دڑو، میں جو آثار نکلے ہیں اُن کے متعلق مفتشین نے تین مستقل اور ایک دوسرے سے جداگانہ شہر ہونے کا فیصلہ کیا ہے جنمیں سے پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا ابتر حالت میں ہے۔ تینوں شہر نہایت پکی ہوئی اینٹوں کے بنے معلوم ہوتے

---

[1] یہ ایک گنبد نما عمارت ہوتی ہے جس کے اندر گوتم بدھ کی راکھ یا اُن سے منسوب اور دوسری یادگاریں بطور تبرک کے مدفون ہوتی ہیں اور اس وجہ سے یہ عمارت بودھوں میں مقدس و محترم سمجھی جاتی ہے۔

ہیں جنہیں عموماً مٹی کا اور کہیں کہیں کھریا مٹی اور چونے کا گارا استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی بنیادیں نہایت مضبوط اور انہیں دھوپ کی پکی ہوئی اینٹوں کی بھرائی کیگئی ہے۔ عمارات کے مختلف مجموعے جو نکلے ہیں ان سب میں ایک جھرمٹ خاص طور سے نمایاں ہے جو 'ستوپ' کے قریب ہے۔ گمان یہ ہے کہ اس ستوپ کے اندر کوئی مندر رہا ہوگا جس میں گوتم بدھ کی مورتیاں ہونگی اور یہ عمارتیں اسی سے متعلق ہیں۔ ان عمارتوں میں خاص طور سے قابلِ ذکر ایک حمام یا حوض ہے جو مندر کے قریب پوجا پاٹ کی غرض سے نہانے دھونے کے لئے بنایا گیا ہوگا، نیز یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مچھلیاں یا دوسرے پانی کے جانور رکھے جاتے ہوں گے جس کا قدیم ہندوستان میں اکثر دستور تھا۔ یہ حوض طول میں ۳۹ فیٹ، عرض میں ۲۳ فیٹ اور گہرائی میں کوئی ۸ فیٹ کے قریب ہے۔ اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے ہیں، سامنے ایک چبوترہ ہے اور پشت پر کئی عمدہ چھوٹے اور بڑے کمرے بنے ہیں۔ باہر کی دیواریں جو چوڑائی میں ۸ فیٹ سے زیادہ ہے، جنوب کی جانب دو بڑے بڑے پھاٹک ہیں اور شمال و مشرق کی طرف کئی چھوٹے چھوٹے دروازے ہیں۔ اس عمارت کے مشرق کی جانب جو کمرے ہیں، ان میں بیچ کے کمرے میں ایک کنواں ہے جس سے اس حمام کا پانی آتا تھا۔ حمام کے دونوں سروں پر پانی تک جانے کے لئے زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے فرش کی جوڑائی پختہ اینٹوں سے نہایت مضبوطی کے ساتھ کیگئی ہے۔ دیواروں کی تعمیر میں بھی جو چوڑائی میں تقریباً ۸ فیٹ ہیں نہایت ہوشیاری اور کاریگری سے کام لیا گیا ہے۔ ان دیواروں کی تعمیر کے تین حصے ہیں، اندر اور باہر دونوں جانب کی اینٹیں نہایت پختہ ہیں، درمیان کا تیسرا حصہ دھوپ کی پکی ہوئی اینٹوں سے بنا ہے۔ اس غرض سے کہ دیواروں کے اندر پانی نہ رسنے پائے، اندر کی جانب اینٹوں کی جوڑائی بجائے مٹی کے چونے کے گارے سے کیگئی ہے، مزید احتیاط کے لئے اندر کی جانب دیوار پر تقریباً ایک انچ موٹا بٹومن کا پلاستر بھی ہے۔ ایک اور خاص چیز جو اس حمام کے سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے وہ نالی ہے جو ۶ فیٹ گہری اور اوپر سے ڈھکی ہوئی ہے اس کے ذریعہ تمام گندہ پانی شہر سے باہر بہ جاتا تھا۔

اِس کے علاوہ عام رہنے کے مکانات کی بھی ایک بڑی تعداد نکلی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ امن وعافیت کے ساتھ یکجا رہتے سہتے تھے، ان مکانوں کے ساتھ گندگی اور غلاظت کو بہالیجانے کے لئے متعدد ایک دوسرے سے ملی ہوئی نالیوں کا جو سلسلہ ہے، اُسے دیکھکر اُن کی معاشرت اور زندگی پر اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ مکانوں کا تمام گندہ پانی ان نالیوں کے ذریعہ گلی کے حوضوں میں چلا جاتا تھا، جہاں سے بھنگی نکالکر پھینکدیا کرتے تھے۔

ہڑپا میں جو موئنجودڑو سے کوئی ۴۰۰ میل شمال کی جانب واقع ہے، کھدائی کا کام اس سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوا ہے۔ یہاں یکے بعد دیگرے ۸ یا ۹ تہیں نکلی ہیں اور انہیں سے کوئی تیسری صدی قبل مسیح سے بعد کی نظر نہیں آتی۔ یہاں جو چیزیں نکلی ہیں ان میں بعض بہ لحاظ زمانہ موئنجودڑو کی چیزوں سے زیادہ قدیم اور دیرینہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں ایک تانبے کا بہت بڑا برتن نکلا ہے جس کے اندر بہت سے تانبے کے آلات اور ہتھیار ملے ہیں مثلاً ایک گرز کا سرا، دو دورخی کلہاڑیاں، سات تیغے، دو نیزے کے سرے، ۱۶ بھالوں کے سرے، ۱۲ ٹانگیاں، ایک آرہ، دو ٹانگے اور ۱۳ کلھائیاں۔ ان میں سے دو تیغوں اور دو ٹانگیوں پر تصویروں کی شکل میں کچھ لکھا ہوا ہے

اسی ابتدائی تہ میں ۱۵۰ سے اوپر مہریں اور تختیاں بھی نکلی ہیں جن میں سے اکثر ان مہروں سے چھوٹی اور شکل میں مختلف ہیں جو اس سے پیشتر اوپر کی تہ پر پائی جا چکی ہیں۔ ان مہروں اور تختیوں پر تصویروں کی شکل میں کچھ تحریریں ہیں جو اس سے پیشتر کبھی نہیں نظر آئی ہیں۔ یہ مہریں اور تختیاں پتھر، ہاتھی دانت اور تانبے کی بنی ہوئی ہیں، شکل میں اکثر انہیں سے چوکور ہیں بعض گول اور بعض نصف گول ہیں۔ ان مہروں کا عموماً رقبہ (۱ملی میٹر = ۰۴ء) ۳۰ x ۳۰ ملی میٹر یعنی ۱٫۲ مربع انچ ہے اور حجم ۶ ملی میٹر سے لیکر ۱۰ ملی میٹر تک ہے۔ انہیں سے ہر ایک کے اوپر کوندھا ہے جو تحریر کے اوپر عمودی شکل میں ہے۔ اکثر مہروں پر جانوروں کی تصویریں ہیں جن میں سے بیل کی تصویر سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ جن مہروں پر تحریر اور تصویر دونوں ہیں ان میں عبارت اوپر کی جانب ہے اور اس کے نیچے تصویر۔ انہیں سے ایک مہر پر سب سے عجیب چیز جو پائی گئی

ہے وہ سات آدمیوں کا ایک جلوس[۵] ہے جو باقاعدہ طور سے کوٹ اور خود پہنے ہوئے ہیں اور ایک قطار میں داہنے سے بائیں کو چل رہے ہیں۔ ایک دوسری مہر پر ایک شخص مچان پر سے شیر کا شکار کر رہا ہے، ایک تیسری مہر پر ایک شخص جھنڈا لئے ہوئے اور جھنڈے پر جو نشان بنا ہے وہ ایک ناند کا ہے جس میں بعض اچھی مہروں میں جانوروں کو دانہ کھلایا جاتا[۵۲] ہے۔

ان مہروں کے علاوہ ایک اور عجیب وغریب چیز جو نکلی ہے، وہ تانبے کے برتن پر دو پہیوں کی ایک گاڑی کی تصویر ہے جو اوپر سے چھائی ہوئی ہے اور آگے گاڑی بان بیٹھا ہوا ہے۔ اب تک سمجھا جاتا تھا کہ پہیئے دار گاڑیوں میں رتھ سب سے پرانی قسم ہے جس میں چار پہیئے ہوتے ہیں لیکن اب اس جدید انکشاف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے قدیم قسم کی گاڑی چار پہیوں کی نہیں بلکہ دو پہیوں کی گاڑی ہے۔

ہڑپا میں مکانات وغیرہ کی قسم سے اور بھی بہت سی چیزیں نکلی ہیں جنہیں سے اکثر زمانہ کی دستبرد سے نہایت خراب وخستہ ہو گئی ہیں لیکن ایک عمارت بالکل صحیح وسالم حالت میں نکلی ہے جو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اور جس کے مقابلہ کی موئنجو دڑو میں ابتک کوئی عمارت نہیں برآمد ہوئی ہے۔ اس عمارت کا طول شمالاً وجنوباً ۱۶۸ فیٹ اور عرض شرقاً وغرباً ۱۳۶ فیٹ ہے۔ اس میں متعدد ہال ہیں جنکے آگے غلام گردشیں بنی ہوئی ہیں۔ اس عمارت کے طول وعرض کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہال غالباً غلہ یا اسی قسم کی دوسری چیزیں رکھنے کے لئے کھتے کا کام دیتے رہے ہونگے اور بہت ممکن ہے کہ جس زمانہ میں سکے نہیں چلتے تھے اور ادائیگی لگان یا تجارت اجناس کے ذریعہ ہوتی تھی، اُس وقت یہ ہال یا تو لگان کا غلہ جمع کرنے کے کام میں آتے رہے ہوں گے یا پھر ان میں مال تجارت کا ذخیرہ رکھا جاتا ہوگا۔

مکانات کے ایسے ہی سلسلے دریائے نیل کے کنارے اور جنوبی عراق کے علاقہ میں بھی

---

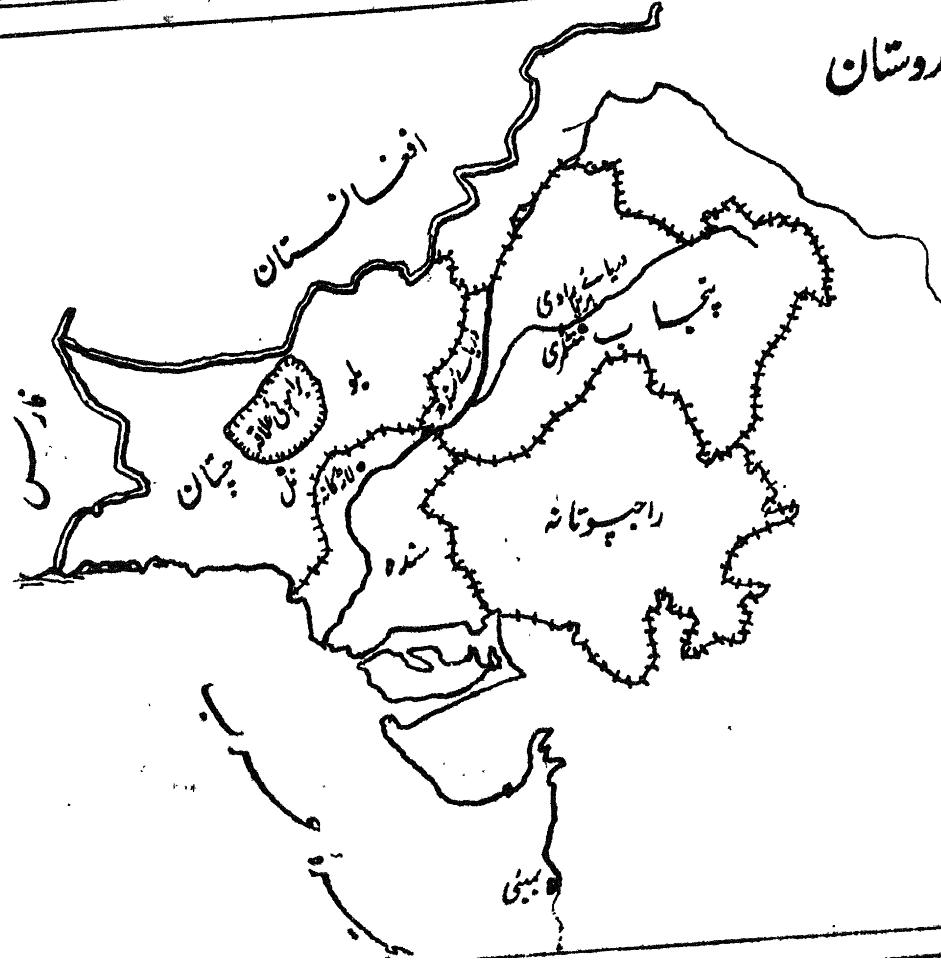
[۵] ملاحظہ ہو تصویر نمبر۱   [۵۲] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۷-۶

ملے ہیں لیکن تعمیر کی جو خوبی اور نہروں کا جیسا مکمل سلسلہ یہاں نظر آتا ہے، وہ ان عظیم الشان تہذیبوں کے دور میں کہیں نہیں ملتا۔

تصویروں اور ہڈیوں وغیرہ کے ملنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ کے اہلی جانوروں میں بیل بہت عام طور سے پایا جاتا تھا جس کے سینگ خاص طور پر بہت لمبے ہوتے تھے اور جس کی گردن پر کوبہ ہوتا تھا اور چونکہ اکثر ان کی ہڈیاں وغیرہ یکجا کثیر مقدار میں ملی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کے گلّے کے گلّے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے سینگ کے بیل بھی ہوتے تھے، بھینسے بھی پائے جاتے تھے، ہاتھی اور گھوڑے کے آثار بھی ملتے ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی کے گھوڑے عموماً چھوٹے قد کے ہوتے تھے۔ چھوٹے جانوروں میں بھیڑ، سوّر، اور کتا پایا جاتا ہے لیکن اونٹ اور بلی کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ کتوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں جنہیں ایک قسم تو عام کتوں کی ہے دوسری قسم ان کتوں کی ہے جسے انگریزی میں Mastiff کہتے ہیں۔ غالباً وہ اسی قسم کے کتے تھے جو دو ہزار برس بعد سکندر اعظم کو نظر آئے اور جن کا ایلین نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ "اگر کوئی کتا شیر کو پکڑ پاتا تو وہ اس پر اپنی گرفت اس مضبوطی سے رکھتا کہ اگر کوئی کتے کی ٹانگ چاقو سے بھی کاٹ ڈالتا، جب بھی وہ اسے اس وقت تک نہ چھوڑتا خواہ درد اُسے کتنا ہی شدت کا محسوس ہوتا جب تک کہ موت اُسے مجبور نہ کر دیتی۔"

ان اہلی جانوروں کے علاوہ وحشی جانوروں کے آثار بھی ملتے ہیں لیکن بہت کم۔ مہروں پر عموماً صرف چیتے، گینڈے اور ہاتھی کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اس خطہ کی آب و ہوا قدرے مرطوب اور نباتات آج کی بہ نسبت زیادہ کثرت رہی ہوگی۔ ان جانوروں کے ساتھ شیر کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ خشک آب و ہوا کا جانور ہے اور عموماً ایسے خطوں میں پایا جاتا ہے جو بہت زیادہ گھنے اور گنجان نہیں ہوتے۔

علاوہ اُن بڑی بڑی چیزوں کے کہ جن سے وہاں کی عام تہذیب و تمدن کا حال معلوم ہوتا ہے، بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی برآمد ہوئی ہیں کہ جن سے ان لوگوں کی معاشرت اور

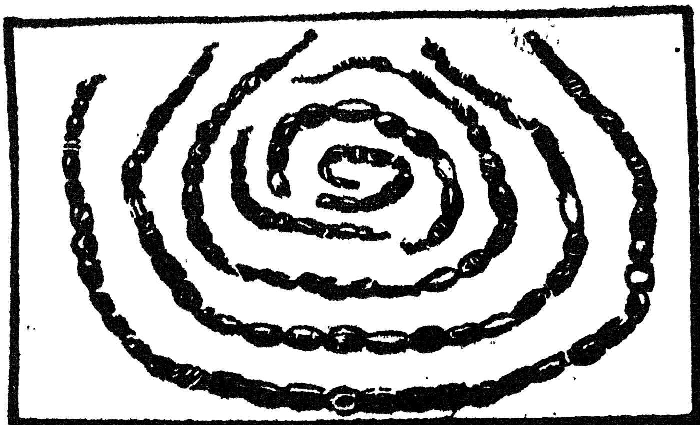

نقشہ شمالی ومغربی ہندوستان
افغانستان
فارس
بلوچستان
براہوی علاقہ
پنجاب
راجپوتانہ
سندھ
بمبئی



نمبر ا- یہ دھرتی ماتا کی مورتی ہے جو سر پر تاج رکھے ہوئے ہے اور باقی جسم سونے چاندی کے زیورات سے لدا ہے۔



نمبر ۲ - یہ وہ چاندی کا برتن ہے جسمیں بہت سے نقرئی وطلائی زیورات رکھے ہوئے ملے ہیں۔



نمبر ۳ - یہ وہ سونے کے ہار ہیں جو عورتیں پہنا کرتی تھیں اور جن کے طمع اور خوبی کو دیکھکر آج بڑے سے بڑے جوہری بھی دنگ ہیں۔



نمبر۵- دو سنگوں کا بیل جس کی پیٹھ پر کوبہ بھی ہے۔



نمبر۴- سات آدمیوں کا وہ جلوس جو باقاعدہ وردی پہنے جا رہے ہیں۔



نمبر۷- اوپر کے نشانات ملاکر دیکھئے باہم کسقدر مشابہت رکھتے ہیں۔



نمبر۶- جانوروں میں ہاتھی بھی پایا جاتا تھا جسکی یہ تصویر ہے



نمبرا- یہ دو

لدا-

نمبر۸- ایک سینگ کا بیل جس کی پیٹھ پر کوئی کوبہ نہیں ہے۔

یہی وہ مہریں یا تعویذیں ہیں جنکے اوپر عبارتیں ہیں اور نیچے جانوروں کی تصویریں اور انہی عبارتوں کے پڑھنے پر آئندہ بہت کچھ دارومدار ہے۔

زندگی پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم میں منجملہ اور اشیاء کے جو برآمد ہوئی ہیں، ایک بڑی تعداد عام استعمال کے برتنوں کی نکلی ہے جو زیادہ تر مٹی کے ہیں۔ یہ برتن مختلف اغراض کے لئے مختلف شکلوں کے بنے ہوئے ہیں، انہیں ایک سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جنہیں پکڑنے یا اٹھانے کے لئے دستے وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز نہیں لگی ہے۔ یہ ظروف عموماً سادہ اور بغیر کسی نقش و نگار کے ہیں لیکن رنگین اور منقش برتن بھی بہت کافی تعداد میں نکلے ہیں جن کے نقوش عام طور پر سیاہی مائل سرخ زمین پر سیاہ رنگ کے بنے ہوئے ہیں اور یہ بیشتر پھول پتیاں ہیں، کہیں کہیں جانوروں کی تصویریں بھی آجاتی ہیں۔ ایسے ہی سرخ اور سیاہ رنگ کے ظروف سر آرل اشٹائن[1] کو شمالی بلوچستان، وزیرستان کے سرحدی علاقوں اور کہیں کہیں سیستان میں بھی ملے ہیں۔ موہنجوداڑو میں سرخ، سفید، سیاہ غرض مختلف رنگوں کے نمونے پائے گئے ہیں، یہاں اور ہڑپا دونوں جگہوں میں سادہ گلی اور نقشی طرز کے ظروف نکلے ہیں جن سے کبھی عراق اور بلوچستان کے ساتھ تعلقات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بعض تصویریں اور مجسمے وغیرہ جو ہاتھ آئے ہیں، اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ میں مردوں کا لباس عموماً دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا، ایک مرزئی یا کرتی ہوتی تھی جو صرف کمر تک ہوتی تھی اور دوسری سادہ یا چھپی ہوئی چادر ہوتی جو بائیں شانے کے اوپر سے دائیں بازو کے نیچے لپیٹی جاتی اور جس سے داہنا ہاتھ بالکل خالی ہوتا۔ ادنیٰ طبقہ میں مرد عموماً ناف سے اوپر برہنہ رہتے تھے اور عورتیں گھٹنوں سے اوپر تک صرف ایک کپڑا پہنتی تھیں اگرچہ ایک رقاصہ لڑکی کا چھوٹا سا ایسا مجسمہ ہاتھ آیا ہے جس میں وہ اس سے بھی بے نیاز ہے۔ ان سب کے باوجود زیورات تمام طبقوں میں پہنے جاتے تھے اور مرد اور عورتیں دونوں طبقے کے لوگ ہار[2] اور انگوٹھیاں پہنتے تھے عورتیں خاصکر بالیاں، بازو، کمر زیب اور پازیب وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔

---

[1] یہ ایک جرمن محقق ہے جس نے وسط ایشیا میں آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام کیا ہے [2] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۳

مکانات کے اندر رہیاں اور بہت سی چیزیں پائی ہیں جن سے اُن کی وضع قطع اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے، وہاں بہت سی قسم کی ہڈیاں بھی نکلی ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اُن کی کیا غذا رہی ہوگی۔ علاوہ روٹی اور دودھ وغیرہ کے کہ جسکی یہاں اُس زمانہ میں کوئی قلت نہیں معلوم ہوتی، مختلف جانوروں کے گوشت اور بعض دریائی جانور بھی داخلِ طعام تھے۔ ان ہڈیوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ گائے، بکری اور سور کا بھی گوشت کھاتے تھے، نیز دریائی جانوروں میں کچھوا اور گھڑیال بھی داخلِ غذا تھے۔ خشک اور تر دونوں طرح کی مچھلیاں بھی استعمال کیجاتی تھیں۔

انہی زیورات اور آرائش کی چیزوں سے ہم یہ بھی قیاس کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں معدنیات میں سے وہ کن کن چیزوں سے واقف تھے۔ امراء کے زیورات عام طور سے چاندی اور سونے کے ہوتے، یا تانبے پر سونے کا ملمع کیا ہوتا تھا اور انہیں ہاتھی دانت، عقیق اور دوسرے مختلف قسم کے رنگین اور منقش قیمتی پتھروں کا جڑاؤ کام کیا ہوتا تھا۔ غرباء کے زیورات عموماً سیپ، گھونگے یا ایک قسم کی پکائی ہوئی مٹی کے ہوتے تھے۔ ہر دو قسم کے زیورات کافی تعداد میں برآمد ہوئے ہیں بالخصوص عقیق اور تانبے کی کردھنیاں جن پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً بالیاں، خالص سونے کی بنی ہوئی جالیاں، کاڑھنے کی سوئیاں، جنکے اوپر کا ملمع آج بڑے بڑے جوہریوں کو بھی حیرت زدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پائی گئی ہیں۔ چاندی اور سونے کے علاوہ یہ لوگ تانبے، ٹین اور سیسے سے بھی باخبر تھے۔ تانبے سے عام طور پر آلاتِ حرب، اوزار، زیورات اور خانگی استعمال کے ظروف بنتے تھے مثلاً تیغ، چاقو، کلہاڑیاں، ہنسیے، رکھانیاں، چھینیاں، برتن اور تعویذ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر چیزیں ہتھوڑے سے پیٹکر بنتی تھیں، گو ڈھال کر بنانے کی مثالیں بھی ناپید نہیں ہیں۔ تانبا نہایت آسانی سے دستیاب ہوتا تھا، یہ مغرب کی جانب بلوچستان سے آتا تھا، مشرق کی جانب راجپوتانہ اور شمال کی جانب افغانستان سے آتا تھا۔ ٹین البتہ مشکل سے ملتی تھی اور یہ بیشتر خراسان یا اس سے مغرب سے آتی تھی۔ یہ خالص شکل میں نہیں ہوتی تھی بلکہ تانبے کے ساتھ ملاکر بنائی جاتی تھی اور اس صورت میں اس سے

سخت اور تیز دھار کے آلات بنتے تھے مثلاً استرے، رکھانیاں، چھینیاں اور آرے وغیرہ۔ اس مرکب دھات سے ظروف، مجسمے، جوشن، مالائیں، بٹن، اور مختلف قسم کے زیورات بھی بنتے تھے۔ کانسی ایک بہت اعلیٰ قسم کی دھات ہوتی تھی جس میں ۶ سے لیکر ۱۲ فی صدی تک ٹین کا جزو شامل ہوتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ یہ تانبے سے بہتر خیال کیجاتی تھی پھر بھی اس کی بنی ہوئی چیزیں تانبے سے کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً ٹین کی کمیابی اور گرانی ہو گی۔ باوجود اس کے کہ تانبے کا عام استعمال تھا پھر بھی چقماق کی قسم سے پتھر کے بنے ہوئے چاقو کثرت سے ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجری عہد کا بالکل خاتمہ نہیں ہو گیا تھا۔ یہ ایک نہایت سخت قسم کا پتھر ہوتا ہے جو جلا دینے یا تولنے کے لئے بٹوں کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا۔ کوڑیاں بھی کثیر مقدار میں ملتی ہیں جو ساحلی علاقوں سے آتی تھیں اور ان سے چمچے، ڈوئیاں، چوڑیاں، ہار اور دوسرے زیورات بنائے جاتے تھے۔ یا پھر ان سے لکڑی کے اندر جڑاؤ کا کام لیا جاتا تھا۔ نیلے رنگ کی ایک دھات جو عراق اور مصر میں بھی اکثر پائی گئی ہے، یہاں زیورات، چھوٹے چھوٹے گلدانوں اور تعویذوں وغیرہ کے بنانے میں کام آتی تھی اور اسی مسالے کی ایک عمدہ اور سخت قسم ہوتی تھی جو مہروں کی سطح کے ہموار اور چکنا کرنے کے کام میں آتی تھی۔

لیکن جہاں معدنیات اور اُن کے مختلف استعمالات کا یہ حال تھا، وہاں یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے کہ آلاتِ جنگ کے بنانے میں ان سے بہت کم کام لیا جاتا تھا۔ اب تک جو کچھ بھی جنگ کے آلات مل سکے ہیں وہ چند گرزوں کے سرے، کلھاڑیاں، تیغے، تیروں، اور نیزوں کے سروں کے علاوہ اور کوئی بڑے ہتھیار دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ آلاتِ حرب کی اس کمیابی اور عدم وجود سے گمان ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنگ وجدل کے زیادہ عادی نہ تھے، بلکہ ایک پُرسکون اور پُرامن زندگی بسر کرتے تھے، ورنہ جہاں تمدن اور تہذیب کے دوسرے آثار اس کثرت سے ظہور میں آئے ہیں، وہاں اس کی قلت اور کمی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

انہی آثار سے جہاں ان کے اخلاق وعادات اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے، وہاں ان سے

پر بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کن کن فنون سے واقف تھے۔ کھدائی میں جو مکانات نکلے ہیں اُن میں منجملہ اور چیزوں کے کچھ تکلے اور نہایت باریک بُنے ہوئے کپڑوں کی کچھ چیزیں بھی ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا بہت کافی رواج رہا ہوگا۔ بابل میں روئی کو 'سندھو' اور یونان میں 'سنڈون' کہتے تھے جس سے ہمیشہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم زمانہ میں روئی کی پیداوار کا مرکز دریائے سندھ کی وادی کا علاقہ تھا لیکن ان انکشافات سے اس خیال کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ البتہ ایک شبہ یہ باقی تھا کہ آیا وہ روئی جو بابل اور یونان میں استعمال کی جاتی تھی، سیمل کی روئی ہوتی تھی یا کپاس کی۔ مُونجو دڑو کے اس جدید انکشاف سے یہ شبہ بھی جاتا رہا ہے اور یہ مسلّم ہو گیا ہے کہ وہ کھیتوں کی پیداشدہ کپاس ہوتی تھی جس کے ریشے سیمل سے بالکل جداگانہ کپاس سے ملتے جلتے ہیں۔

مہروں، تختیوں اور تعویذوں پر جو تحریر کندہ ہے اور نشانات کی کشش اور خم میں جو سلیقہ پایا جاتا ہے اس کی بنا پر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ تحریر و کتابت کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے، اور ان مہروں اور تعویذوں کا جو اتنی تقریباً ایک ہزار دستیاب ہو چکی ہیں ہر گھر میں پایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ فن کچھ محدود نہ رہا ہوگا اور اس قدر عام ہونے کی صورت میں اس سے کاروباری اور دوسرے معاملات میں بھی کام لیا گیا ہوگا گو اس امر کا کوئی صحیح پتہ نہیں کہ جس طرح عراق میں مٹی پر لکھنے کا دستور تھا، یہاں لوگ کس چیز پر لکھتے تھے گمان غالب یہ ہے کہ لکڑی یا صنوبر وغیرہ کی قسم سے کسی درخت کی چھال پر یا مصر کی طرح بردی پر لکھنے کا رواج رہا ہوگا، اس لئے کہ ان چیزوں کا علم اس وقت تک ہو چکا تھا۔

علاوہ تحریروں کے انہی مہروں اور تختیوں پر جو جانوروں کی تصویریں بنی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں ایسی شبیہوں اور تصویروں کا بنانا بغیر اس فن میں کمال حاصل کئے ہوئے ناممکن تھا اور نہ صرف یہی بلکہ یہ فن اُسی زمانہ کی دوسری قوموں یعنی عراق اور مصر کے فنون سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ علاوہ

ان کندہ تصویروں کے جو مہروں اور تختیوں پر ہیں مینڈھے، بندر، کتے، اور گلہریوں کے جو چھوٹے چھوٹے مجسمے مٹی کی قسم کی ایک دھات پر ملے ہیں، وہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ برعکس اس کے انسانوں کی جتنی تصویریں ملی ہیں، خواہ وہ پتھر، مٹی، کانسی یا کسی اور چیز پر پائی گئی ہوں، نہایت بھدّی اور خراب قسم کی ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مصور اور سنگتراش جو جانوروں کی شکلیں اس قدر صحیح اور عمدہ بنا سکتے تھے، اپنی صورتوں کے معاملہ میں کیوں اس درجہ ظلم سے کام لیتے تھے۔ اس باب میں ان کی کوشش اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی تھی کہ ایک انسانی شبیہ سی پیدا ہو جائے۔

موئنجو دڑو میں دو بڑے ڈھیر انسانی لاش کے ڈھانچوں کے بھی نکلے ہیں، ایک ڈھیر مکان کے اندر ملا ہے اور دوسرا سڑک پر۔ ہر دو مجموعوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ غالباً کسی آفتِ ناگہانی کا شکار ہوئے ہیں، خواہ وہ آپس کی قتال و جدال کی صورت میں نازل ہوئی ہو یا کوئی وبائی بیماری ہو۔ لیکن اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ مُردوں کی تجہیز و تکفین کے معاملہ میں عموماً کیا رواج تھا، البتہ ایک مثال ایسی ملی ہے جس میں مردہ جسم کا کچھ حصہ مدفون پایا گیا ہے جس طرح نیل (بلوچستان)، اور سیان (مغربی ایران) میں کیا کرتے تھے، اس قسم کی تدفین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ لاش کے کچھ حصوں کے ساتھ مٹی کے چند خوشنما ظروف اور بعض اور چھوٹی موٹی ایسی چیزیں جو اس کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں، اُس کے ہمراہ رکھ دی جاتی تھیں۔ نعش پہلے یا تو گدھوں کو کھلا دی جاتی تھی یا بعض حالتوں میں کچھ عرصہ تک زمین کے اندر مدفون رکھنے کے بعد پھر پرندوں کی نذر کر دی جاتی تھی۔ اس قسم کی تدفین کا طریقہ آیا عام تھا یا مخصوص، اس کے متعلق ابھی تک قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہڑپا میں ہندؤوں کے 'سمادھوں' کی طرح اینٹ کی بنی ہوئی ایسی عمارتیں نکلی ہیں جن میں راکھ اور کچھ جلی ہوئی ہڈیاں پائی گئی ہیں، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مُردوں کے جلانے کی بھی رسم تھی اور یہ چبوترہ اسی غرض کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ موئنجو دڑو اور ہڑپا دونوں جگہوں میں بعض پتھر کے ایسے گھڑے بھی پائے گئے ہیں جس کے اندر چھوٹے چھوٹے برتن اور بعض میں راکھ اور ہڈیاں بھی نکلی

ہیں۔ یہ گھڑے بلاشبہ راکھ وغیرہ رکھنے کے برتن ہوں گے۔

لوگوں کے مذہب دعقاید کے متعلق بھی انہیں آثار سے بہت کچھ پتہ چلسکتا ہے۔ ایک قسم کی مورتی[۱] ایک سے زائد تعداد میں دستیاب ہوئی ہے جس کے سر پر تاج وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز ہے اور باقی جسم زیورات سے لدا ہوا ہے، گمان غالب ہے کہ یہ مورتی دہرتی ماتا کی ہوگی جو عراق اور دوسرے مغربی ممالک کی مورتیوں سے بہت مشابہت رکھتی ہے، علاوہ اس کے بعض اور مورتیاں بھی نکلی ہیں جو بابل کی مورتیوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔

ان مورتیوں کے علاوہ ایک اور ثبوت ایک مہر کی صورت میں ملا ہے جس پر ایک قطار میں چار آدمیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جو اپنے اپنے ہاتھوں میں جھنڈے لئے ہوئے ہیں اور ہر ایک شخص اپنے جھنڈے پر ایک ایک دیوتا اٹھائے ہوئے ہے جو اسکے قبیلہ کا محافظ مانا جاتا تھا۔ اسی قسم کی تصویریں مصر کے آثار میں بھی پائی گئی ہیں اور ان دونوں میں اسدرجہ مشابہت ہے کہ اگر اس مہر کی پشت پر ایک خالص ہندی تخیل کی تصویر نہ ہوتی تو یہ قطعاً کہا جاسکتا تھا کہ "یہ مہر مصر سے آئی ہوگی۔ اس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں "ٹوٹم" کی پرستش بہت ہوتی تھی، اس لئے کہ مختلف ایسے مجسمے اور تصویریں پائی گئی ہیں جنمیں نصف تصویر تو کسی جانور (مثلاً مینڈھا، بیل، ہاتھی وغیرہ) کی ہے اور باقی نصف حصہ انسان کا ہے۔ دو تصویریں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کے سر گدھے سے مشابہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ لوگ کس نسل سے تھے؟ اور ان کا کیا تعلق تھا؟ ان امور کا پتہ لگانے کے لئے جتنا مواد اب تک دستیاب ہوسکا ہے، وہ افسوس ہے کہ ناکافی ہے لیکن پھر بھی بعض قرائن ایسے ہیں جن سے ایک حد تک اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مونیجو دڑو میں مردہ لاشوں کے جتنے ڈھانچے نکلے ہیں، اُن کے سروں کی ساخت اور لمبائی چوڑائی دیکھکر

---

[۱] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۵

تعین کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ علم الانسان کی اصطلاح میں Dolicho Cephalic نسل کے لوگ ہونگے یعنی جنوب ایشیا اور یورپ کی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن علاوہ اس نسل سے تعلق رکھنے کے ان میں بہت کچھ آریوں سے قبل دراوڑی نسل کے لوگوں کا عنصر بھی شامل ہے Brachy Cephalic قسم کا سر اگر کوئی ہاتھ آیا ہے تو وہ ان جگہوں سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اور اس سر میں وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو موہنجودڑو کے ان مجسموں میں پائی جاتی ہیں جن کے متعلق ماہرین کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ مذکورہ صدر قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ آثار اگرچہ بہت بعد کے زمانہ کے ہیں لیکن پھر بھی جس تہ میں یہ ملے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس زمانہ سے قبل کے ہیں جبکہ تیسرے شہر کو لوگوں نے چھوڑا، پھر بھی یہ معلومات اس قدر ناکافی ہیں کہ ان کی بنا پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔

اب تک ان مقامات سے جتنی چیزیں نکل چکی ہیں اور اُن کا وہاں کی تہذیب و تمدن پر جو اثر پڑا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز وہ مہریں اور تعویذیں ہیں جو اب تک کوئی ایک ہزار کی تعداد میں برآمد ہوئی ہیں۔ موجودہ اور آئندہ کی معلومات کا بڑا دار و مدار انہیں مہروں اور تعویذوں کے صحیح پڑھنے پر ہے۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ ابھی تک یہی طے نہیں ہو سکا ہے کہ ان مہروں کے نشانات کوئی بامعنی عبارتیں ہیں یا وہ خیالات کی تصویریں ہیں۔ بہر صورت ان مہروں پر جو نشانات ہیں وہ یکساں اور برابر نہیں ہیں بلکہ ۲ ملی میٹر سے لیکر ۱۱ ملی میٹر تک مختلف لمبائیوں کی ہیں۔ ان تحریروں کا درست پڑھنا تو بہت دشوار ہے اور اب تک جو کچھ ان کے معانی و مطالب نکالے جا سکے ہیں وہ ایک قیاس کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بعض محققین نے ان عبارتوں میں معانی پہنانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ قابل توجہ ہیں اور اس لحاظ سے انہوں نے ان مہروں کے نشانات اور تصویروں کی جو تقسیم کی ہے، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ جرمن زبان کے ایک رسالہ زڈ، ڈی، ایم، جی میں اسی موضوع پر ایک نہایت محققانہ مضمون نکلا ہے جسمیں فاضل مضمون نگار نے ان مہروں

کی ترتیب و تقسیم اس طرح کی ہے۔

۱	بار آنے والے نشان تعداد میں							۶۷	ہیں
۲	"	"	"	"	"	"	"	۱۹	"
۳	"	"	"	"	"	"	"	۵	"
۴	"	"	"	"	"	"	"	۶	"
۵	"	"	"	"	"	"	"	۳	"
۶	"	"	"	"	"	"	"	۲	"
۷	"	"	"	"	"	"	"	۲	"
۸	"	"	"	"	"	"	"	۱	"
۱۱	"	"	"	"	"	"	"	۲	"
۲۱	"	"	"	"	"	"	"	۱	"
۲۴	"	"	"	"	"	"	"	۱	"

مہروں اور ان کے نشانات کی اس ترتیب و تقسیم کے بعد ان سے معنی و مطلب نکالنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ بھی عجیب ہیں۔ ایک جرمن محقق کا خیال ہے کہ یہ کوئی عبارت نہیں ہے بلکہ مختلف خیالات ہیں جو تصویروں کی شکل میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا نقشہ دینے کے بعد وہ کہتا ہے کہ صرف یہ امر کہ تمام نشانوں میں ۶۷ نشانات ایسے ہیں جو ایک بار سے زائد نہیں آئے ہیں، میرے اس خیال کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر یہ حروف تہجی سے مرکب کوئی تحریر ہوتی تو نا ممکن تھا کہ بار بار آنے والے حرفوں کی تعداد اس قدر (یعنی ۲۴ بار) ہوتی، درانحالیکہ حروف تہجی کا اسوقت کم تعداد میں ہونا اور بھی قرین قیاس ہے۔

اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی میں کی ایک مہر کنگھم نامی ایک انگریز محقق کو ملی تھی جس نے بڑی کوشش و محنت کے بعد اپنی مہر کو "پچھمیہ" پڑھا تھا جس سے اُس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ یہ

مہریں ہندی الاصل ہیں اور ان کا باہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ہلیٹ نے اس بات سے انکار کیا اور اُس نے کننگھم کے نظریے کی سخت تردید کی۔ ۱۸۸۵ء میں ایک فرانسیسی محقق تیری دی لاکوپری (Terrien de la Couperie) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ بچہ یا شو تحریر ہے جو باختر سے تاجروں کے ذریعہ یہاں پہونچی لیکن فوراً ہی ڈیمس (Dames) نے اس کی تردید کردی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سکے ہیں، ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ یہ تعویذ ہیں اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم انحطاط پذیر ہوتی ہے تو اس کے قوائے عملیہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور اسوقت وہ جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اس قوم کے لوگوں نے بھی اپنے انحطاط کے زمانہ میں بلاشبہ یہی تدبیر اختیار کی ہوگی جسکی یہ نشانیاں ہیں لیکن بنرجی کے خیال کے مطابق جو ابتدا سے اس کام پر لگے ہوئے ہیں اور جن کا ذکر اس سے پیشتر آچکا ہے نہ یہ سکے ہیں اور نہ کوئی تعویذ وغیرہ کی قسم سے ہیں۔ غرض اصل حالات کے انکشاف کا بہت کچھ دارومدار ان مہروں کے پڑھنے پر ہے۔ محققین ایک عرصہ سے اس کی کوششیں کر رہے ہیں اور انہوں نے یکے بعد دیگرے متعدد خیالات پیش کئے ہیں لیکن ابھی تک اُن میں سے کوئی نظریہ ایسا اطمینان بخش ثابت نہیں ہوا ہے جو عام طور سے قابلِ قبول ہو سکے۔

اس مضمون میں جہاں تک برآمد شدہ اشیاء کے حالات کا تعلق ہے وہ سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثار قدیمہ کے اُن مضامین سے لئے گئے ہیں جو "ٹائمس اوف انڈیا" کے تین نمبروں میں نکلے ہیں لیکن جہاں تک اُن کے اثرات و نتائج کا تعلق ہے، ان کے متعلق بیشتر ایک جرمن مستشرق کے مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے جو جرمن زبان کے ایک رسالہ "زڈ، ڈی، ایم، جی" میں نکلا ہے۔ تصویروں کے بلاک خود اپنے ہاں کے شعبۂ نجاری میں تیار کرائے گئے ہیں جس کیلئے ہم ماسٹر عبدالحیٰ صاحب کے شکرگزار ہیں۔ ان اکتشافات کے نتائج و اثرات کی تفصیلی بحث آئندہ نمبر میں ہوگی۔

حقیقت اور افسانہ

میں اِس مضمون میں وہ بحث چھیڑ رہا ہوں جسے مشرقی تہذیب نے سنجیدہ اور مہذب تحریر اور گفتگو کے علاقہ سے باہر رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک ذہنی تعصب ہے جس نے ہماری قوم کو بہت نقصان پہونچایا ہے اور اب بھی پہونچا رہا ہے۔ لیکن میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اِس تعصب کی ضد میں جس قسم کی کتابیں یورپ میں جنسی مسائل پر لکھی جاتی ہیں اُن کا ایک نمونہ پیش کروں، نہ میرا مقصود دل بہلانا ہے۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے میں میرا مدعا صرف یہ ہے کہ اپنی سوسائٹی کو اُن فرائض سے آگاہ کروں جو اُسے عورتوں کے معاملہ میں پورے کرنے ہیں۔ میں نے اِس کی بھی کوشش کی ہے کہ اِس مسئلہ پر بحث کرنے کا صحیح نقطۂ نظر اور جو نصب العین ایک سچے مسلمان کو جنسی مسائل پر غور کرتے ہوئے مدنظر رکھنا چاہئے پیش کروں۔ اگرچہ پردہ کے سوال نے ہماری سوسائٹی کے ذہن میں کچھ کھلبلی مچائی ہے، پھر بھی مجھے یہ کہنا لازم ہے کہ ہم میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو جنسی جذبات کی اہمیت کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں۔ ہمارا عام رجحان خاموشی کی طرف ہے، اور جب کبھی کسی کی کم ظرفی سے یہ سوال ہمارے سامنے آبھی جاتا ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ اُسے ٹال دیں: رند ہیں تو مسکرا کر، خدا سے ڈرنے والے ہیں تو تیوری چڑھا کر، باضابطہ ہیں تو خاموشی سے۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ بغیر عورتوں اور مردوں کے رشتہ کو سمجھے ہم اچھے مسلمان نہیں بن سکتے، اور ہماری تعلیم بالکل نامکمل رہجاتی ہے۔

ہمارے اخلاقی رہنما نفس کو ناپاک اور گمراہ کرنے والا بتاتے ہیں، اور انکی ظاہری خواہش کم از کم ضرور ہے کہ ہماری زندگی پر نفس پرستی یا بداخلاقی کا دھبہ نہ لگنے پائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہونا

چاہیئے تھا کہ وہ ہماری ذہنیت کو سدھارنے کی کوشش کرتے، اور جس حد تک ممکن ہوتا ہمارے جنسی جذبات کو، جن کی وجہ سے ہمارا پیر سب سے زیادہ پھسلتا ہے، ایک روحانی شکل دیتے جس میں اُن کی ساری صورت چھپ جاتی۔ برخلاف اِس کے ہماری اخلاقی تعلیم نے اُنھیں یا تو اپنی توجہ کے لائق نہیں سمجھا اور ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا، یا اُن سے ڈرا ڈرا کر ہمیں بزدل اور کمزور کر دیا۔ دوزخ کا خوف ممکن ہے چند ہستیوں کو جنسی جذبات کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچالے، عام اخلاق اس بنیاد پر تعمیر نہیں ہو سکتے۔ عام اخلاق کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات کو ایک روحانی حیثیت دی جائے، جو لوگوں کو نیچے اور کمینہ جذبات کی پہونچ سے باہر رکھے۔ آج کل ہمیں شریعت کے احکام صرف رٹائے جاتے ہیں اور عورت کی ہستی سے ناواقف رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے، جو ہمارے اخلاق کمزور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر بحث شروع کریں ہمکو یہ چاہیئے کہ اپنی ذہنیت کو اُن وہموں اور غلط فہمیوں سے پاک کریں جو ہماری تہذیب میں رفتہ رفتہ شامل ہو گئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عورتوں کا سارا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میں نے انہیں افسانہ کہا ہے، اور درحقیقت اگرچہ یہ اکثر علمی نظریوں یا مذہبی عقیدوں کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو ان پر گہرا اعتقاد بھی ہوتا ہے، یہ محض افسانہ ہی افسانہ ہیں۔ ان کا معتقد ہونا کچھ ہندوستانیوں یا مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، یہ ہر ملک، ہر زمانہ، ہر قسم کی تعلیم کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے پہلا افسانہ، جو منجملہ اور آثار قدیمہ کے مصر میں زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے، ایک بھاوج کا قصہ سناتا ہے جو اپنے دیور کو بہکانا چاہتی تھی، اور جب وہ اس میں ناکامیاب ہوئی تو اُسی نے اپنے شوہر سے ایسی شکایت کی کہ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کا خون اپنے سر پر لیا۔ دنیا کا جدید ترین افسانہ، جو اس وقت یورپ میں بڑی دھوم سے سُنایا جا رہا ہے یہ ہے کہ حسن فیاضی سکھاتا ہے، عورت اپنے حسن میں مست ہوتی ہے، اور اُس کی دلی آرزو ہے کہ وہ یہ شراب دوسروں کو پلائے — یعنی صرف مرد نہیں بلکہ عورت بھی عیاشی

کی خواہاں ہوتی ہے، اور وہ مرد بڑے بیوقوف تھے جنہوں نے عورت کو یہ جذبات رکھنے کا اہل نہ سمجھا اور اپنے حسن سے فریفتہ کرنے کی اُسے اجازت نہیں دی۔ مصر کا افسانہ اُسی زمانہ میں لکھا گیا تھا جب مصری قوم تہذیب کی پہلی منزلوں پر تھی، یورپ کا افسانہ ایسی قومیں سنا رہی ہیں جو تمدن اور تہذیب کے عروج پر پہونچ چکی ہیں۔ دوسری قوموں نے بھی اپنی زندگی کے دوران میں اسی طرح افسانے سُنے اور سنائے ہیں، اور ہمیں مقابلہ کرنے سے فوراً معلوم ہوجائے گا کہ دراصل ایک ہی قسم کے افسانے ہیں جنھیں مختلف قومیں اپنے اپنے رنگ پر سناتی ہیں۔

جس زمانہ میں قوم خانہ بدوش ہوتی ہے اُس کو عورت کی اہمیت کا زیادہ احساس ہوتا ہے، اور جیسا کہ قدیم جرمن اور دوسری نوجوان خانہ بدوش قوموں کے حالات پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی عورتوں کی عزت کرتی ہیں، اور قومی معاملوں میں اُنہیں حصہ لینے کا کافی موقع بھی دیا جاتا ہے۔ مرد معاش اور زمین کی جستجو میں مشغول رہتے ہیں۔ اندرونی انتظام بڑی حد تک اُنہیں عورتوں کے سپرد کرنا ہوتا ہے، اور عورتیں خود بخود سماج کا مستقل اور پائدار عنصر بن جاتی ہیں۔ مگر جب قوم خانہ بدوشی ترک کرکے ایک مقام پر آباد ہوجاتی ہے تو قومی نظام میں عورتوں کی حاجت نہیں رہتی اور اسی زمانہ میں وہ افسانے تصنیف ہونے لگتے ہیں جنہوں نے عورت کی ہستی کو مٹایا نہیں تو بگاڑ ضرور دیا ہے۔ خاندان بنتا ہے تو اُس کے ساتھ افسانوں کے ذریعہ سے تعلیم دیجاتی ہے کہ وہی عورت جو گھر کو آباد کرتی ہے اُسے ویران بھی کرسکتی ہے، اور خاندان کی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ اُسے پابند رکھا جائے، اور اُس کی طبیعت پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ یہ افسانے عموماً اُس مصری کہانی کے طرز پر ہوتے ہیں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

آگے چل کر جب قوم میں اپنی طاقت کا احساس اور جوانی کا جوش پیدا ہوتا ہے تو عورت ماں اور بیوی کی بجائے معشوقہ بن جاتی ہے، جنسی جذبات پر راج کرنے کا اُسے حق مل جاتا ہے اور اُس کا حسن مردوں کو دیوانہ کرنے لگتا ہے۔ یہ زمانہ "شیولری" (Chivalry) کا ہے، جس کے افسانوں میں عورت اپنی خوبصورتی کو خون کے مول بیچتی ہے، اپنی زندگی کو بیکار اور لینے

جمال کو بے اثر سمجھتی ہے اگر وہ خون نہ بہا سکے۔ دنیا کی تمام "ایپک" (Epics) اسی دور میں تصنیف کی گئی ہیں، اُن میں حسن اور جوانمردی کا ڈھنڈورا پٹا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ذہنیت بھی پائی جاتی ہے جو عورت کو نہایت حقیر اور ناچیز ہستی قرار دیتی ہے، اس لئے کہ وہ میدانِ جنگ میں مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اُس میں پہلوان بننے کی صلاحیت نہیں۔ چنانچہ درمیانی صدیوں کا ایک انگریز رئیس (nobleman) اپنی بیوی کی تعریف میں کہتا ہے:-

" A little better than my horse,
A little dearer than my dog."

جسمانی قوت اس زمانہ میں احترام کے لئے شرط تھی، اس لئے عورت کی عزت کرنے کی کوئی اور وجہ نظر نہیں آئی، اور اس وہم نے جڑ پکڑلی کہ عورت کے لئے حسین ہونا لازم ہے، اور جس عورت کا جسم خوبصورت نہیں اُس کی ہستی نامکمل ہے۔ اس ایک افسانہ نے فطرت کے نظام کو پلٹ دیا ہے اور قوموں کو ایک غیر فطری اور نہایت مضر اصول پر چلایا ہے۔ فطرت نے خوبصورتی نر میں رکھی ہے، اور انتخاب کا حق مادہ کو دیا ہے۔ ہم خوبصورت عورت کو بتاتے ہیں اور پسند کرنے کا حق مرد کو دیتے ہیں۔ اس دانستہ کجروی کا انجام ہر قوم نے بھگتا ہے، یورپ کے اخلاق پر جو اثر ہوا ہے اُس کا اندازہ ہم ٹالسٹائے کی کتاب "کرائٹسر سوناٹا" (Kreuzer Sonata) سے کرسکتے ہیں[1]۔ یہ تو تہذیب کے دوسرے دور میں قوم کے ایک حصہ کا حال ہوتا ہے۔ شاعروں کی

---

[1] ٹالسٹائے نے دکھایا ہے کہ چونکہ مرد انتخاب کرتے ہیں، لڑکیاں اس پر مجبور ہوتی ہیں کہ مردوں کو پسند آنے کی کوشش کریں۔ اُن کو اپنا لباس، اپنے اخلاق، اپنی تعلیم سب چیزیں مردوں کی پسند کے مطابق رکھنا ہوتی ہیں، اور اگر وہ اس میں کوئی کمی کرتی ہیں تو انہیں شادی اور گھرانے کی زندگی سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لباس میں بے حیائی، اخلاق میں آزادی اور تعلیم میں ظاہری نمائش اُن کے لئے لازم ہوجاتی ہیں۔ عزت کی زندگی بسر کرنا اُن کے واسطے اسی شرط پر ممکن ہوتا ہے کہ وہ عصمت اور عفت سے ہاتھ دھوئیں۔ اُن کے جسم میں کوئی تقدس (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ

فتنہ انگیزی اور جوانمردوں کی جنگجوئی سے سبق لے کر قوم کے مذہبی رہنما یعنی اُس کے پنڈت، مولوی، اور پروہت عام لوگوں کو اپنے افسانے سُناتے ہیں۔ یہ خوبصورتی کو ایک بلا بتاتے ہیں، جو عورت کو گمراہ اور گناہگار بنا دیتی ہے، خود رائی کو ایک ایسا اخلاقی جرم جس کی وجہ سے دوسرا جنم کیا یہی زندگی عذاب ہو جاتی ہے، زندگی سے لطف اٹھانے کو شیطان کا ایک فریب جو دینداری بالکل ناممکن کر دیتا ہے۔ اپنی تعلیم میں اثر پیدا کرنے کے لئے وہ زبان اور خیالات میں ذرا بھی اعتدال یا انصاف کا خیال نہیں کرتے، اور جس قدر ان لوگوں نے عورتوں کو ذلیل کیا ہے اور عوام کو بیوقوف بنایا ہے اُس کا مقابلہ بدمعاش یا جرم پیشہ لوگ شاید ہی کر سکیں گے۔

مثال کے طور پر ہم یورپ کی درمیانی صدیوں میں رہبانیت اور کلیسا کی اخلاقی تعلیم لے سکتے ہیں، جس کے اثر سے عورت صرف اُن لوگوں کے لئے نہیں جو خدا کی راہ میں جنسی جذبات کو قربان کرنا چاہتے تھے بلکہ عوام میں بھی ابلیس کی ہمجنس ہو گئی۔ اس وہم کو تقویت دینے کے لئے حضرت آدم کے بہشت سے نکلنے کا قصہ بھی استعمال کیا گیا۔ جب با وجود پیغمبری کا رتبہ رکھنے کے ایک عورت اپنی فطرت سے اس قدر مجبور تھی تو معمولی عورتوں کا کیا اعتبار ہو سکتا تھا، اور جیسے حوّا نے آدم کو بہشت سے نکلوایا اور انسان کی ہبوط کی باعث ہوئیں، ویسے ہی ہر عورت مرد کو ورغلانے جھٹلانے، دھوکا دینے پر تیار رہتی ہے، اور کوئی تعلیم اُس کی فطرت کی خامی کو نہیں دور کر سکتی۔

رہبانیت کے اثر کے ضائع ہونے پر بھی یورپ کی قوموں میں بہت سے وہم باقی رہے۔ ان میں سب سے وحشیانہ یہ تھا کہ عورتیں اپنی روحیں شیطان کے ہاتھ بیچ کر جادوگرنیاں (witches) بن جاتی ہیں، اور معصوم لوگوں کو اپنے جادو کے ذریعہ سے نقصان پہنچاتی ہیں۔ یہ الزام ہر عورت

(بقیہ حاشیہ صفحہ) پاکیزگی نہیں باقی رہتی، اُن کا اثر صرف جنسی جذبات کے ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے۔ وہ نہ مردوں کی روحانی آرزوئیں پوری کر سکتی ہیں نہ اپنی فطری خواہشیں، اور آخر کار اُن کی انسانیت اسی طرح تباہ ہو جاتی ہے۔

پر لگ سکتا تھا جیسے بیل بوٹیوں یا دداؤں سے دلچسپی تھی، یا جو ذرا بھی نرالی یا سنکی تھی، اور خدا جانے کتنی بیچاریوں کو اس بیرحم خبطی نے زندہ جلوا ڈالا۔

اسلام میں رہبانیت کی طرف ترغیب نہیں دلائی گئی ہے، اس لئے ہماری تاریخ پر کوئی ایسا دھبہ نہیں۔ لیکن عورت کے شیطانی عنصر پر جس کا جی چاہے ہزاروں پارساؤں کے لکچر سن لے، یہ تعلیم، اگرچہ مذہب کے حدود سے باہر ہوتی ہے، رفتہ رفتہ مذہب کا ایک جزو بن جاتی ہے، اور اکثر مذہب کے احکام سے زیادہ احترام کی سزاوار مانی جاتی ہے۔[1]

دوسرے دور کا وارث ایک نیا زمانہ ہوتا ہے جس میں نہ نگاہ ناز کے امیدواروں کا خون ندیوں میں بہتا ہے نہ مذہب بدصورتی کو باعث فخر سمجھتا ہے۔ عیاشی بہادروں کا حصہ نہیں رہتی، نہ عاشق ہجر جانا جوانمردوں کا شغل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت کے ساتھ قوم میں حوصلہ بھی تقسیم ہوتا رہتا ہے، اور متوسط درجہ کے لوگ امیر غریب دونوں سے زیادہ با اثر ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانہ قوم کے عروج کا ہوتا ہے، اس کی ذہنیت آزادی کی خواہش کرتی ہے، اور اس کا سارا رجحان تعمیر کی طرف ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں ذاتی عنصر زیادہ ہوتا ہے، تجربہ تعلیم کا مدمقابل بن جاتا ہے، اور چونکہ قومی زندگی میں یک رنگی اور یک سوئی نہیں رہتی اس لئے چند بڑے افسانوں کی بجائے بہت سے ذاتی تجربہ اور تخیل کے تصنیف کئے ہوئے افسانے رائج ہو جاتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ذاتی ہوتے ہیں اور مخلصانہ اور ان کا مقصد محض جوش دلانا یا دل بہلانا نہیں بلکہ اکثر دل کڑھانا اور رلانا بھی ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سچے ہوتے ہیں یا عورت کی ہستی یا مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر کوئی خاص روشنی ڈالتے ہیں۔ وہی عشق جس کے نعروں سے امیروں کے محل گونجتے تھے اب متوسط درجہ کے گھرانوں میں آہ و نالہ کا باعث ہوتا ہے، وہی فتنہ سامان حسن جو سلطنتوں کو تباہ کرتا تھا اب معمولی لوگوں کی جوانی خراب کرتا ہے۔ یعنی اس دور

---

[1] اس مسئلہ پر پوری طرح سے بحث بعد کو ہوگی۔

کے افسانے وہی قصہ سناتے ہیں جو لوگ پہلے سنتے اور سننا چاہتے تھے۔ صرف ماحول کی مناسبت کے لئے آرائش بدل دی گئی ہے۔

ذہنی ترقی بھی اس دور میں پرانے افسانوں میں نئی جان پھونکنے کے لئے ذریعہ دریافت کرتی ہے۔ عورت کو سمجھنے، اُسے پرکھنے اور جانچنے والے پہلے شاعر، قصہ گو یا "تجربہ کار" لوگ ہوا کرتے تھے، اب اُن کے علاوہ "آرٹسٹ" بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو تصویروں اور مورتوں میں حسن کو نئے نئے رنگوں میں دکھاتے ہیں۔ عورت کا جسم اُن کی ملکیت ہو جاتا ہے، اُن کے ہاتھوں میں ایک اوزار ہو جس سے وہ جنسی جذبات کی آگ کو جتنا چاہیں بھڑکا سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ انسانیت کا ایک جوہر ہیں، اُن کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا۔ راز و نیاز کی باتیں صرف انھیں کی زبان سے ہو سکتی ہیں۔ یہی ایک ذریعہ ہو جس سے ایک دل کے لئے دوسرے کو اپنی حکایت سنانا ممکن ہے۔ مگر یہ صرف اُسی وقت تک جب فنونِ لطیفہ جمالیات کے اوچھے نظریوں کا تماشا گاہ نہ بنیں، اور دین اور دل سے اُن کا تعلق باقی رہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان پر بھی پرانے افسانوں کا بہت جلد اثر ہونے لگتا ہے، اور وہ بھی اپنے طور پر انھیں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔

شاعر کی سوچ صرف خیالات تک ہے، مصور اور صورت گر (Sculptor) خیالات کے ساتھ نظر کو بھی ناپاک کر دیتے ہیں۔ پرانے افسانوں نے عورت کو مجسمہ حسن، مرد کو ادا شناس مقرر کیا تھا اور عشق کے ہنگاموں میں قوم کو یہ بھلا دیا تھا کہ عورت کو مددگار، دوست اور غمگسار سمجھنا چاہئے۔ فنونِ لطیفہ کا نیا افسانہ اُسے مجسمہ جنسیت اور شہوت بنا کر اُس سے ایک باعزت ماں اور بیوی ہونے کا امکان بھی چھین لیتا ہے، اور علاوہ جنسی جذبات کے اُس کا ہماری زندگی کے اور تمام پہلوؤں سے قطع تعلق کرا دیتا ہے۔

اگر شاعری، قصہ، فنونِ لطیفہ اتنی روحانیت نہیں رکھتے کہ درمیان میں جو غلط فہمیاں حائل ہیں انھیں دور کر کے بچھڑوں کو ملا دیں، تو کم از کم علم اور عقل سے جو اس زمانہ میں خاص طور سے نشو و نما پاتے ہیں یہ امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن بجائے اس کے عالم اور علم قوم کو اپنے افسانے سناتے ہیں

جو اُسے کچھ کم گمراہ نہیں کرتے۔

ہندوستان میں تعلیم اور خصوصاً انگریزی تعلیم پانے کا لڑکے پر سب سے پہلے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے، اور اُن سے باتیں کرنا بھی اُسے ناگوار ہوتا ہے، کیونکہ اُس کے خیال میں اُن کی معلومات گفتگو کو دلچسپ اور سنجیدہ بنانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ یہی حال ہر قوم کے عالموں کا ہوتا ہے جب تک علم اُن کی نظروں میں ایک نئی اور نادر چیز ہوتا ہے۔ وہ عورتوں کو اپنی ذہنی عظمت کا اندازہ اور علم کی پوری عزت کرنے کا اہل نہیں مانتے، اور تحصیل علم اُن کے اور عورتوں کے درمیان میں ایک ایسی بیگانگی پیدا کر دیتا ہے جسے دور کرنا رفتہ رفتہ نہایت مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اُنہیں بعد کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت میں عالم بننے کی صلاحیت ہی نہیں، اور اگر وہ علم حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے تو اُس میں غیر عقلی عنصر اس قدر غالب ہے کہ وہ اُس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس افسانہ کے حامی افلاطون جیسے عظیم الشان فلسفی تک ہوئے ہیں۔

افلاطون اور اُس کے ہمخیال فلسفیوں کا نظریہ کہ عورت اپنے غیر عقلی عنصر کی وجہ سے علم اور عقل کو اپنا رہبر نہیں بنا سکتی ایک حد تک صحیح ہے۔ عورتوں میں واقعی غیر عقلی عنصر مردوں سے عموماً بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن ہمیں اپنی فطرت پر غور کرتے کرتے معلوم ہو گیا ہے کہ دراصل مردوں کی طبیعت پر بھی غیر عقلی عنصر ہی راج کرتا ہے، اور یہ کوئی شرمانے یا افسوس کرنے کی بات نہیں، کیونکہ انسانیت کے معجزے بھی اسی غیر عقلی عنصر نے دکھائے ہیں۔ افلاطون کا عقیدہ کہ عقل انسان کی رہبری کے واسطے کافی ہے تجربہ اور علم کی ترقی نے غلط ثابت کیا ہے۔ قومیں علمی ترقی کرتی ہیں، اس سے اُن کی عقلیت بجائے بڑھنے کے اور گھٹتی ہے۔

افلاطون کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مرد جنسی لحاظ سے بھی خود مختار بن سکتا ہے اگر اُسے جمالیات کی صحیح تعلیم دی جائے۔ یونانی طبیعت پر حسن کا بہت اثر تھا۔ اور "رواقیین" (Stoics) نے، جیسا کہ افلاطون کے فلسفہ سے ظاہر ہے، حسن کامل کو خدائی کا رتبہ دیا ہے؛ جہاں تک کہ انسان کی شکل وصورت سے تعلق تھا، یونانی آرٹسٹ (اور فلسفی) کا نصب العین عورت کا جسم نہیں بلکہ نوجوان

مرد کا تھا۔ یعنی اگر وہ حسن کامل کے تصور کو انسانی جسم میں ادا کرنا چاہتے تو وہ عورت کے جسم کو نہ بناتے، بلکہ ایک نوجوان مرد کا، جس کے بدن پر جنسیت کے آثار پوری طرح سے نمایاں نہ ہوئے ہوں۔ یونانی جب عورتوں کا نقش پتھر پر کھینچتے ہیں تو اُن کی بناوٹ مردانی ہوتی ہے، خوبصورت مردوں کی مورتوں میں برخلاف اس کے وہ نزاکت اور نرمی پائی جاتی ہے جو دوسرے ملکوں کے فن مصوری اور عام مذاق کے مطابق عورت کے جسم میں ہونی چاہئے۔ آرٹ کے اس رجحان نے فلسفی کی مدد کی اور جہاں عورت کے حسن سے انکار کیا گیا تھا وہاں اُس کی ہستی بھی غیر ضروری ثابت کی گئی، مگر فلسفہ اور فنونِ لطیفہ جیسے دشمنوں کا اتحاد بھی فطرت کے قانون کو نہ بدل سکا۔ اور وہ اخلاقی تعلیم جو فلسفہ اور جمالیات کا نچوڑ ہونے کا دعویٰ کرتی تھی، شہر سپارٹا کی ایک نجس رسم بن کر رہ گئی۔ ایرانی جمالیات پر ممکن ہے اس تعلیم کا اثر رہا ہو، مگر ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا گیا ہے۔

خود مختار مرد کے افسانہ کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود مختار عورت کے افسانہ کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ خود مختار عورت اُس وقت نمودار ہوتی ہے جب قومی زندگی کا آخری دور ہوتا ہے، جب وہ آرزوؤں اور جستجوؤں سے سیر ہو کر عیاشی میں مست ہو جاتی ہے۔ خود مختار عورت گویا قوم کی موت کا پیغام لاتی ہے۔

عورت کی خود مختاری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جنسی لحاظ سے وہ مرد کی ہستی کی محتاج نہیں رہتی یا جیسی یورپ میں اس وقت، عورت کی تعلیم اس قدر ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت اور افسانہ کا فرق سمجھنے لگتی ہے، اور اُن افسانوں کے ساتھ جو مردوں کی ناانصافی نے تصنیف کئے ہیں وہ اُن قوانین کی مخالفت شروع کر دیتی ہے جن پر انسان کی زندگی مبنی ہے۔ یعنی مردوں کی طرح وہ بھی آزاد اور بد اخلاق ہونا اپنا آئین بنا لیتی ہے، اور چونکہ فطرت کے فرائض ادا کرنا اس حالت میں مشکل ہوتا ہے، وہ ماں بننے سے انکار کرنے لگتی ہے یا جیسے مشرقی تمدنوں میں ہوا ہے قوم پر جنسیت کا بھوت اس طرح سے سوار ہوتا ہے کہ وہ اپنے پُرانے نصب العین، اخلاق، دین اور خدا کو بھول جاتی ہے، اور مرد اور عورت دونوں اس قدر آزاد ہو جاتے ہیں کہ انہیں اُن حدود کا

خیال نہیں رہتا جو فطرت نے مقرر کئے ہیں، اور قوم کو زندہ رکھنے کے جو ذریعے فطرت نے رکھے ہیں اُس کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔

خود مختار عورت، انسانیت سے بے خبر انسان، یہ دردناک مظاہر (Phenomena) اُسی دروغ گوئی اور دانستہ وہم پرستی کا نتیجہ ہیں جو قوم کی عورتوں کو پہلے ذلیل اور بعد کو گمراہ بنا دیتی ہے۔ مگر اُن افسانوں کے ساتھ جو مرد اپنی نفسی خواہشات پوری کرنے کے لئے ستاتے ہیں، اُس افسانہ کا بھی ذکر لازم ہے جو شروع سے آخر تک تمام بھلے مانسوں کو زندہ رکھتا ہے، وہم اور دروغ گوئی کے ریگستان میں ایک نخلستان کی طرح پریشان نگاہوں کو تسکین دلاتا ہے، اور جنسیت کے عالم میں محبت، سادگی اور پاک دلی کا آشیانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ افسانہ ہے جس میں لوگ حقیقت کی جھلک دیکھ کر اور دوسرے افسانوں سے بیزار ہو کر پناہ لیتے ہیں۔ یہ عورت پر نہ حسن لازم کرتا ہے نہ دلبری، عشق کے افسانوں سے گھبراتا ہے، جنسی جذبات کے اظہار کو منع کرتا ہے، اور ضرورت ہو تو علم اور عقل کو گھر کی اندر بالائی طاق رکھنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے مرد اور عورت کی زندگی کو امور خانہ داری کا ایک صیغہ قرار دیا ہے، اور جو کچھ گھر کے امن میں خلل پیدا کرتا ہے اُسے وہ اخلاقی گمراہی کہتا ہے۔ عورت کو خوش کرنے کے لئے وہ اُسے گھر کی رانی پکارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، مرد کو روزی کمانے اور راج کو قائم رکھنے کا فخر عطا کرتا ہے۔ اس کا مدعا بس یہی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے خوش رہیں، اور قوم کی آبادی میں اضافہ کرتے رہیں۔ یہ آرزو پوری کرنے کے لئے وہ سب کی پیٹھ ٹھوکنے پر راضی ہے، اور یہی اُس کو ہر دلعزیز بھی رکھتا ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ محض کھانا، پینا اور سو جانا انسان کے تمام فرائض پورے کرنے کے لئے کافی نہیں۔ حیوانِ کامل کے لئے یہ نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے، انسان سے اور امیدیں ہوتی ہیں۔ اس افسانہ میں حقیقت کے خلاف جو رجحان ہے وہ یہ ہے کہ یہ روحانی بیقراری اور حق کی جستجو کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ اگر دل میں امنگیں رکھنے کی اجازت اس نے دی ہے تو صرف مرد کو۔ عورت کی فلاح اس افسانہ کے مطابق اسی میں ہے کہ چولھا پھونکے، روٹی پکائے

اور ہر سال ایک بچہ دے۔ ممکن ہے کہ صدیاں گزر جائیں اور قوم کی کسی عورت کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اپنی انسانیت سے غافل ہے، لیکن یہ زندگی بے معنی ہوتی ہے، کیونکہ یہ انسانوں کی زندگی نہیں بلکہ حیوانوں کی ہے۔ آدمی کو انسان وہی بیقراری اور آرزوئیں بناتی ہیں جن کی وجہ سے گھرانے کی خوشی، عورت کے لئے کھانا پکانا اور مرد کے لئے کھانا کھا کر سو جانا انسانیت کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ جسے یقین نہ آئے وہ افریقہ کی وحشی قوموں کا حال پڑھ لے۔ وہ صدیوں سے زندہ ہیں، صدیوں تک زندہ رہیں گی، لیکن اُن کی زندگی بالکل ویسی ہی ہے جیسی اُن جانوروں کی جن کے درمیان وہ رہتے ہیں، اور اُنہیں نہ اپنی خبر ہے نہ اپنے دل کی نہ اپنے خدا کی۔

مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر صحیح طور پر ہم غور اُس وقت کر سکتے ہیں جب ہم اپنی ذہنیت کو اُن افسانوں سے پاک کر لیں جو ہم نے سُنے ہیں، اور جن میں سے اکثر پر ہم کو اپنے معمول کے اثر سے خود اعتقاد ہو جاتا ہے مگر ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ محض ایک افسانہ کو اپنا آئین بنا لینا غلط اور مضر ہے۔ اب ہم حقیقت کی جستجو شروع کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

امریکہ کی سیاستِ خارجہ

رسالہ جامعہ کی کسی گزشتہ اشاعت میں سلطنتِ برطانیہ کی سیاستِ خارجہ پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون شائع ہو چکا ہے۔ سلطنتِ برطانیہ کے دوسرے اندرونی سیاسی مسائل پر بھی اس جریدہ میں مضامین نکل چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانیوں کی قسمت بُری ہو کہ بھلی چونکہ اس سلطنت کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اس کے سیاسی مسائل کو سمجھنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر دنیا سلطنتِ برطانیہ سے بڑی ہے اور ہر اُس شخص کے لئے جو دنیا کی سیاست کو سمجھنا چاہتا ہے ضروری ہے کہ وہ اُن عناصرِ سیاسی کے عمل اور ردِ عمل سے بھی آشنا ہو جو خود اس عظیم الشان برطانوی سامراج کی قسمت پر اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں عناصرِ سیاسی میں سب سے اہم ریاستہائے متحدہ امریکہ ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ہم ان متحدہ ریاستوں کی سیاستِ خارجہ کی تاریخ اور اُس کے مقاصد پر سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ان کی خارجی سیاست کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی نظر ماضی میں دور تک لیجانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر سنہ ۱۸۹۳ء تک کے واقعات پر نظر ڈال لیجائے تو یہ تاریخ واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے تو ان ریاستوں کی سیاستِ خارجہ کا ذکر مشکل ہی سے کبھی دنیا کے سیاسی حلقوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتا تھا اور یہ اس لئے کہ اپنے وجود کی پہلی صدی میں امریکی اتحاد کو دنیا کی حکومتوں کی برادری میں کوئی مستقل حیثیت حاصل نہ تھی لیکن سنہ ۱۸۹۳ء میں اور اس سے بھی واضح طور پر پانچ سال بعد سنہ ۱۸۹۸ء میں اسپین کی نوآبادی توسان ریاستوں کے مقابلہ میں ٹوٹی تو اُس وقت یورپ نے حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ حقیقت محسوس کی کہ "چچا سام" جن کا ذکر کبھی زیرِ لب تبسم کے بغیر نہ ہوتا تھا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل چکے ہیں

اور ریاستہائے متحدہ اپنے سن بلوغ کو پہونچکر وہ تمام دعاوی پیش کرنے کو تیار ہیں جو کہ اقوام عالم کی جماعت میں ایک بالغ رکن کا حق ہیں۔

۱۸۹۳ء میں شکاگو کی عظیم الشان نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریت کلیولینڈ نے ریاستوں کے عہد شباب کا اعلان یوں کیا: "ہمارے چاروں طرف امریکن حوصلہ مندی اور محنت کے جو نتائج اس وقت موجود ہیں اور امریکن ہنرمندی اور ذہانت کے جو شواہد ہمارے سامنے ہیں انہیں دیکھنے کے بعد ہمیں ذرا اندیشہ نہیں کہ ہماری تبریک وتحسین کو کوئی مبالغہ آمیز بتا سکے گا۔ آج ہم دنیا کی قدیم ترین قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر انہیں اپنے کام دکھاتے ہیں اور اپنی کم سنی کا عذر پیش کر کے اُن سے کسی رعایت کے طالب نہیں۔"

یہ سچ تھا کیونکہ طفولیت اور صغر سنی کے فرائض کو اتحاد امریکہ نے نہایت خوبی سے انجام دیا تھا۔ دونوں سمندروں کے بیچ میں ایک طرف کنیڈا تک دوسری طرف ریوگرانڈ تک تمام رقبہ زمین آباد ہو چکا تھا۔ پردیسیوں کی مدد سے مغرب اوسط اور مغرب قریب کے عظیم الشان میدانوں میں ہل چلنے لگے تھے۔ اور غلہ کی ایسی کاشت شروع ہوگئی تھی کہ ۱۸۸۰ء سے یہاں کی پیداوار کا مقابلہ یورپ کی زراعت کو خوفزدہ کئے ہوئے تھا۔ دھرتی کے پیٹ میں جو خزانے تھے وہ نکالے جا رہے تھے اور اُن سے ایک بہت بڑی صنعت کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۹۳ء تک صنعت کو برابر فروغ ہو رہا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں میکنلے نے اور ۱۸۹۷ء میں ڈنگلے نے اپنی تامینی سیاست سے صنعت کو اور سہارا دیا اور اس حیثیت پر پہونچا دیا کہ تمام آبادی کی ضرورتیں خود ملک میں پوری ہونے لگیں اور زائد پیداوار کے لئے حدود کے باہر منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے ریاستہائے متحدہ نے جتنا پردیس سے خریدا اُس سے زیادہ پردیسیوں کے ہاتھ بیچا۔

ملک کے دستور اساسی میں جو متنازع فیہ مسائل تھے وہ بھی حل ہو چکے تھے۔ جنگ انقطاع میں شمالی ریاستوں کی فتح اتحادی رجحان کی فتح تھی۔ ادہر غلامی کے سدباب نے

مرکزی یا اتحادی ریاست کا مسئلہ بھی طے کر دیا تھا۔ اور اب وہ ۴۸ ریاستیں جن کے ستارے امریکن پھریرے کی زینت ہیں اگرچہ اپنی اپنی جگہ پر کافی خود مختاری رکھتی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو دوسروں سے جداگانہ وجود کا نہ احساس تھا نہ دعویٰ۔

لہٰذا جب ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں سیاست عالم کے مسائل تمام کرۂ ارضی پر پیدا ہونا شروع ہوئے اور عالمی سیاست اور پختہ سامراج کا دور شروع ہوا تو یہ اتحاد امریکی نہایت قوی اور متحد سیاسی طاقت کی حیثیت سے میدان میں موجود تھا اور اُس کی پشت پر نہایت عظیم الشان معاشی قوت تھی۔ یورپ نے دیکھا کہ یہ طاقت اس کے سیاسی کھیلوں سے الگ نہیں رہنا چاہتی اور اس کی صنعت نئے بازاروں کی تلاش میں ہے اور ضرورت ہو تو اُن کے حصول کے لئے فوجی قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہ کریگی۔ چنانچہ جب امریکن سرمایہ داری کے نمائندوں یعنی صدرِ جمہوریت میکنلے اور روزولٹ نے عالمی سیاست میں امریکہ کو داخل کیا تو اُسی وقت سے اُن کی سیاستِ خارجہ کے اصول بھی یکسر تبدیل ہو گئے۔

جارج واشنگٹن نے جب اپنے ملک کو آزاد کرنے کا کام ختم کر دیا تو ۱۹ ستمبر ۱۷۹۶ء کو اپنے الوداعی خطبہ میں اُس نے اپنی قوم کو یہ نصیحت کی تھی کہ وہ یورپ کے معاملات میں دخل نہ دے۔ "ایک قوم بنو، امریکن بنو، اور خود اپنے نفس کے ساتھ وفادار رہو"۔ اس نصیحت نے گویا سیاست خارجہ کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا اور بعد میں ۲ دسمبر ۱۸۲۳ء کو صدر جمہوریت جیمس منرو نے اس اصول کو امریکن سیاست کی بنیاد قرار دیدیا۔ اُس نے جب یہ اعلان کیا کہ "امریکہ امریکہ والوں کے لئے ہے" تو جہاں امریکن معاملات میں یورپ کی مداخلت کا دروازہ بند کیا وہیں یورپ کے مسائل میں امریکن مداخلت کو ممنوع قرار دیا۔ اس اعلان میں منرو نے براعظم امریکہ کا نام لیا تھا اور یہ اس آرزو کے اظہار کی ابتدا تھی کہ انگریزی اور رومانی امریکہ دونوں مل کر یورپ کے مقابلہ میں ایک وجودِ واحد بنجائیں اور یوں اس پان۔امریکی خیال کی بنیاد ڈالی تھی جسے بعد میں ہنری کلے نے بہت فروغ دیا۔ اس خیال

کی بہت کچھ حمایت ہوئی اور متعدد پان-امریکی کانگرسیں ہوئیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے واقعی کوئی خاص اہمیت حاصل ہو سکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ منرو کا مسلک کہ یورپ براعظم امریکہ کے معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتا رفتہ رفتہ تسلیم ہوتا گیا اگرچہ قانونِ بین الملک میں اس کی کوئی باضابطہ حیثیت نہ تھی۔ ۱۸۹۵ء سے تو خود یورپ کی حکومتوں نے اس اصول کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔

لیکن منرو کے مسلک کی ایک دوسری تعبیر بھی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ میں دولِ یورپ کی جو نوآبادیاں ہیں وہ بھی ختم ہو جانی چاہئیں۔ چنانچہ یہ کوشش شروع ہوئی کہ ہسپانی-امریکی ریاستوں سے تجارتی تعلقات بڑھائے جائیں اور ریاستہائے متحدہ کے لئے وہ تمام حقوق وفوائد حاصل کئے جائیں جو دولِ یورپ حاصل کر رہی تھیں۔ اس نئی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی گئی کہ سان ڈومنگو اور کیوبا حاصل کر لئے گئے اور مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان ایک نہر بنانے کے حق کو ریاستہائے متحدہ ہی کیلئے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ لیکن یہ سب باتیں ابھی ابتدائی تھیں۔ آرزوئیں تھیں جن کا پورا ہونا دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ نہر کی تعمیر میں کلے ٹن اور بلور کا عہدنامہ حائل تھا جو انگلستان سے ۱۸۵۰ء میں ہوا تھا۔ لیکن نقطۂ نظر میں تبدیلی برابر ہو رہی تھی۔ بحرالکاہل میں امریکہ کی دلچسپی برابر بڑھتی جاتی تھی، خود اپنی نوآبادیاں حاصل کرنے کے خیال کی کشش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اور تجارتی اغراض کی خاطر کل براعظم امریکہ کو یورپ سے علیحدہ کرنے کی خواہش قوی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ابھی یہ احساس کسی کو نہ تھا کہ ان خواہشات اور ارادوں میں وہ بنیادی ضرورتیں نہاں ہیں جو آگے چل کر سامراج کو امریکہ کی سیاستِ خارجہ کا بھی طغرائے امتیاز بنانے والی ہیں۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں امریکی سیاستِ خارجہ میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اندرونی معاشی طاقت کا احساس جوں جوں بڑھتا جاتا تھا، توسیع کی خواہش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ سے جو نوآبادیات کی جنگ ہوئی اور اُس میں کامیابی نصیب ہوئی تو یہ

سال امریکن تاریخ کا نہایت اہم سال بن گیا۔ اور اس سال سے امریکہ سمجھنے لگا کہ قدرت نے اب ظاہر طور پر بتلا دیا ہے کہ اس قوم کے لئے مقسوم ہے کہ وہ ایک خود مختار اور فاتحانہ سیاست معاشی و عالمی کی حامل بنے۔ اسی وقت سے انہوں نے واشنگٹن کے الوداعی خطبہ اور منرو کے مسلک سیاسی کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا اور یورپ کے معاملات اور معاشی امور میں برابر شامل ہونا شروع کیا جس کا خاتمہ آکر جنگ عظیم میں شرکت کی صورت میں ہوا۔ مغربی جزائر ہند اور وسطی امریکہ، جنوبی امریکہ، بحر الکاہل اور مشرق بعید ان سب میدانوں میں امریکہ کی سامراجی سیاست چلنے لگی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ ملک کے اندر سیاسی فرقوں کی باہمی رقابت نے ایک طرف اور دنیا میں توازن دول نے دوسری طرف واشنگٹن کے محکمۂ خارجہ کو باوجود اپنی بے حساب قوت کے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کوئی قابل ذکر کامیابی نصیب نہیں ہونے دی اور وسطی امریکہ اور مغربی جزائر ہند کے علاوہ اور کہیں قدم بڑھانے کا موقع تک نہ ملا۔

نقشہ علیحدہ ملاحظہ ہو

مغربی جزائر ہند کے قدیم میدانِ کارزار میں تو اتحاد امریکی نے پورٹو ریکو اور کیوبا فتح

کی بہت کچھ حمایت ہوئی اور متعدد پان۔امریکی کانگرسیں ہوئیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے واقعی کوئی خاص اہمیت حاصل ہو سکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ منرو کا مسلک کہ یورپ براعظم امریکہ کے معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتا رفتہ رفتہ تسلیم ہوتا گیا اگرچہ قانونِ بین الملک میں اس کی کوئی باضابطہ حیثیت نہ تھی۔ ۱۸۹۰ء سے تو خود یورپ کی حکومتوں نے اس اصول کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔

لیکن منرو کے مسلک کی ایک دوسری تعبیر بھی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ میں دولِ یورپ کی جو نوآبادیاں ہیں وہ بھی ختم ہو جانی چاہئیں۔ چنانچہ یہ کوشش شروع ہوئی کہ ہسپانی۔امریکی ریاستوں سے تجارتی تعلقات بڑھائے جائیں اور ریاستہائے متحدہ کے لئے وہ تمام حقوق و فوائد حاصل کئے جائیں جو دولِ یورپ حاصل کر رہی تھیں۔ اس نئی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی گئی کہ سان ڈومنگو اور کیوبا حاصل کر لئے گئے اور مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان ایک نہر بنانے کے حق کو ریاستہائے متحدہ ہی کیلئے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ لیکن یہ سب باتیں ابھی ابتدائی تھیں۔ آرزوئیں تھیں جن کا پورا ہونا دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ نہر کی تعمیر میں کلے ٹن اور بلور کا عہدنامہ حائل تھا جو انگلستان سے ۱۸۵۰ء میں ہوا تھا۔ لیکن نقطۂ نظر میں تبدیلی برابر ہو رہی تھی۔ بحرالکاہل میں امریکہ کی دلچسپی برابر بڑھتی جاتی تھی، خود اپنی نوآبادیاں حاصل کرنے کے خیال کی کشش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اور تجارتی اغراض کی خاطر کل براعظم امریکہ کو یورپ سے علیحدہ کرنے کی خواہش قوی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ابھی یہ احساس کسی کو نہ تھا کہ ان خواہشات اور ارادوں میں وہ بنیادی عنصر نہاں ہیں جو آگے چل کر سامراج کو امریکہ کی سیاستِ خارجہ کا بھی طغرائے امتیاز بنانے والی ہیں۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں امریکی سیاستِ خارجہ میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اندرونی معاشی طاقت کا احساس جوں جوں بڑھتا جاتا تھا، توسیع کی خواہش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ سے جو نوآدیات کی جنگ ہوئی اور اس میں کامیابی نصیب ہوئی تو یہ

سال امریکن تاریخ کا نہایت اہم سال بن گیا۔ اور اس سال سے امریکہ سمجھنے لگا کہ قدرت نے اب ظاہر طور پر بتلا دیا ہے کہ اس قوم کے لئے مقسوم ہے کہ وہ ایک خود مختار اور فاتحانہ سیاست معاشی وعالمی کی حامل بنے۔ اسی وقت سے انہوں نے واشنگٹن کے الوداعی خطبہ اور منرو کے مسلک سیاسی کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا اور یورپ کے معاملات اور معاشی امور میں برابر شامل ہونا شروع کیا جس کا خاتمہ آکر جنگ عظیم میں شرکت کی صورت میں ہوا۔ مغربی جزائر ہند اور وسطی امریکہ، جنوبی امریکہ، بحر الکاہل اور مشرق بعید ان سب میدانوں میں امریکہ کی سامراجی سیاست چلنے لگی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ ملک کے اندر سیاسی فرقوں کی باہمی رقابت نے ایک طرف اور دنیا میں توازن دول نے دوسری طرف واشنگٹن کے محکمۂ خارجہ کو باوجود اپنی بے حساب قوت کے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کوئی قابل ذکر کامیابی نصیب نہیں ہونے دی اور وسطی امریکہ اور مغربی جزائر ہند کے علاوہ اور کہیں قدم بڑھانے کا موقع تک نہ ملا۔

نقشہ علیحدہ ملاحظہ ہو

مغربی جزائر ہند کے قدیم میدانِ کارزار میں تو اتحاد امریکی نے پورٹو ریکو اور کیوبا فتح

کرکے قدم جمالئے تھے اور وہاں انگلستان کے اقتدار کو نقصان پہنچنے لگا۔ کیوبا یوں ہے تو خودمختار لیکن اس کی سیاستِ خارجہ تمامتر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے زیرِ اثر ہے۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ نہر پناما کی تکمیل ہوگئی اور اس کے متعلق جو سیاسی مسائل پیدا ہوئے اس میں انگلستان کے مقابلہ میں ریاستہائے متحدہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں ریاستوں نے اپنے کو "کلیٹن بلوز" عہد نامہ سے آزاد کر لیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ نہر پناما امریکہ نے بنائی اور امریکہ کے زیرِ اقتدار ایک خالص امریکن شاہراہ جہاز رانی بن گئی۔ بلکہ ۱۹۱۲ء میں تو یہ کوشش تک ہوئی کہ ۱۹۰۱ء کے معاہدہ کی بھی خلاف ورزی کرکے انگریزی جہازوں پر امریکن جہازوں کو ہر طرح ترجیح دی جائے۔ اور اس سے ہوا کے رُخ کا پتہ چلتا ہے کہ اگر خود ولسن کی جمہوری حکومت قانونی حق کو تسلیم نہ کرلیتی تو انگلستان اس کے خلاف کچھ نہ کرتا نہ کرسکتا۔ اور ولسن نے یہ اس لئے کیا کہ جغرافی موقع کی وجہ سے امریکہ کو جو فوائد حاصل ہیں وہ خود اس قدر کافی ہیں کہ کسی غیر معمولی ترجیح کی ضرورت نہیں۔ نہر پناما کی وجہ سے امریکہ کو غیر معمولی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نہر کا مقابلہ بلحاظ بین الاقوامی اہمیت نہر سویز سے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ریاستہائے متحدہ کے لئے اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کی وجہ سے مملکت کے مشرق و مغرب کا درمیانی فاصلہ بہت کم ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے جنوبی امریکہ کی مغربی ریاستیں شمالی امریکہ کے زیرِ اثر آگئی ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس کی وجہ سے بحرالکاہل میں امریکہ کی قوت جاپان کے مقابلہ میں بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو صدرِ جمہوریت نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس نہر کا افتتاح کیا تھا۔ اس نہر میں بعد کو زمین کے دھس جانے سے اکثر رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں اور ۱۹۱۹ء میں معلوم ہوگیا کہ نہر بڑے سے بڑے جنگی جہازوں کے گزرنے کے لئے کام میں آسکتی ہے۔

اس نہر کے جاری ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ جمہوریہ پناما تقریباً بالکل ریاستہائے متحدہ

کے ہاتھ میں آگئی اور اس کی حیثیت اس نہر پر "چچا سیم" کے چوکیدار کی سی ہوگئی۔ اُدھر نائیکاراگوا کی نہر کا قصہ ختم ہوا لیکن مزید اطمینان کے لئے ریاستہائے متحدہ نے ۱۹۱۳ء میں حکومت نائیکاراگوا سے ایک عہد نامہ بھی کرلیا جس کی رُو سے انہیں ایک بحری مرکز، مداخلت کا حق اور خارجی سیاست پر پورا قابو حاصل ہوگیا۔

میکسکو سے تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ یوں تو مدت سے تجارت اور روپیہ کے لین دین کی وجہ سے میکسکو برابر ریاستہائے متحدہ کے جال میں پھنس رہا تھا۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں جب مٹی کے تیل کے ذخیرے وہاں برآمد ہوئے تو ریاستہائے متحدہ کے لئے میکسکو کے مسئلہ نے بھی بہت اہمیت اختیار کرلی۔ پورفیریو دیاز نے بہترین مراعات انگریزوں کی پیرسن کمپنی کو دے ڈالے اور اس کی مخالفت "امریکن اسٹینڈرڈ آئل کمپنی" نے نہایت شد و مد سے کی۔ چنانچہ منجملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک وجہ تھی کہ ڈیاز کا اقتدار ۳۵ سال تک تقریباً مطلق العنان قایم رہنے کے بعد یکلخت ختم ہوگیا۔ اس وقت سے برابر میکسکو سے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔ اور بارہا یہ نوبت آئی ہے کہ بس اب جنگ ہوئی لیکن کچھ تو یورپ کی متحدہ مخالفت کا خیال کچھ جاپان کا اثر کہ امریکہ نے اس جھگڑے کو ٹالا ہے۔ اور سیاست عالمی کے اوّل دور میں امریکہ کو اس میدان میں معتدبہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

رفتہ رفتہ شمالی امریکہ کا اثر جنوبی امریکہ میں اور بحرالکاہل کے مسئلہ میں بھی بڑھا ہے۔ متعدد کانگرسیوں، تقریروں، لسانی تحقیقاتوں، عجائب خانوں غرض طرح طرح کے ذرائع سے براعظم امریکہ میں وحدت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش برابر جاری ہے۔ لیکن پھر بھی جنوبی امریکہ کو اپنے ساتھ ملانے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ لیکن یہ اس وجہ سے نہیں کہ یورپ کو اپنی نوآبادیوں کی وجہ سے ابھی تک وہاں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب کبھی جنوبی امریکہ کی حکومتوں نے یورپ کی قرضخواہ دول کے ساتھ بدمعاملگی کی اور اُن کے سرمایہ دار چلائے ہیں کہ جنگ کرکے اُن کے حقوق منوائے جائیں تو کبھی بھی دول

یورپ نے اس پر آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ کالوو اور ڈریگو کے مسلک کی رو سے جو رفتہ رفتہ مسلک منرو کا جزو بنگیا ہے، یہ قرار پاگیا ہے کہ بد معاملگی کے سلسلہ میں کسی غیر امریکن قوت کی جنگی کارروائی حق بجانب نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ ہاں تو شمال اور جنوب میں مغائرت کی وجہ یورپ نہیں ہے بلکہ جنوب کی بڑی بڑی ریاستیں چلی، ارجنٹائن اور برازیل اپنے معاشی اغراض کے اعتبار سے یورپ کی طرف جھکتی ہیں اور مذہبی اور نسلی اعتبار سے شمال سے بالکل جدا ہیں اور نہیں چاہتیں کہ کسی ایسے امریکی اتحاد میں شامل ہوں جسکی قیادت شمال کے ہاتھ میں ہو۔

یاں، امریکن منصوبوں اور مسلک منرو کے اطلاق سے بالکل جدا براعظم امریکہ کا ایک حصہ ہے جو جنگ آزادی میں انگلستان کے پاس رہ گیا تھا اور وہ کینیڈا ہے۔ اس نے نہیت تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اور بساطِ سیاست پر یہ امریکن سامراج کے مقابلہ میں برطانوی سامراج کا مہرہ ہے۔ چنانچہ جب سے اورگان کے مسئلہ کے بعد انگلستان اور شمالی امریکہ میں سرحدی تنازعہ کا فیصلہ ہوا ہے تو ریاستہائے متحدہ نے سرحدی معاملہ کو کبھی نہیں چھیڑا اور اسے انگریزی قوت کے قومی باقیات سے تعبیر کرکے خاموشی سے اس کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن یہ سوال ضرور پیش کیا جاتا رہا کہ آیا انگلستان اور اس کی اس نوآبادی کے نسلی اور سیاسی تعلقات زیادہ قوی ثابت ہوں گے یا وہ جغرافی اور معاشی رشتے جو کینیڈا کو ریاستہائے متحدہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ کینیڈا کے شمال و مغربی حصہ میں خاصی تعداد امریکن کسانوں کی آباد ہے اور ریاستہائے متحدہ کی شہری آبادی جوں جوں بڑھیگی اور غلہ کی مانگ خود ملک میں پوری نہ ہو سکیگی تو ظاہر ہے کہ کینیڈا سے غلہ کی مانگ بڑھیگی اور معاشی تعلقات زیادہ گہرے ہوتے جائیں گے۔

امریکن سیاست خارجہ کی ایک خصوصیت بحر الکاہل کے مسئلہ میں اُس کی روزافزوں دلچسپی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں جزائر ہوائی کا الحاق ہوا۔ اُسی سنہ میں جزائر فلپائن حاصل کئے

گئے اور سنہ ۱۹۰۰ء میں مسئلہ سموا حل ہوا۔ اور ان واقعات نے ریاستہائے متحدہ کو بحرالکاہل کے مسئلہ میں ایک نہایت قوی طاقت بنا دیا۔ اور یہ انگلستان کے (اسٹریلیا) بحر جنوبی میں ہالینڈ کی نوآبادی قوت کے اور جاپان کے مقابل کی ایک طاقت بنگئیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ چین میں جب سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور مشرقی ایشیا میں اثر اور تصرف کے مسائل پیدا ہوئے تو امریکہ نے نہایت گہری دلچسپی کا ثبوت دیا۔ یہ چین کی خودمختاری اور سب کے لئے "کھلے دروازہ" کے مطالبہ کا حامی بنا۔ چین میں جو ریلیں بننا شروع ہوئیں اُس میں خوب حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں امریکن وزیر روٹ اور جاپانی سفیر تاکاہیرا میں جو معاہدہ ہوا اُس کی رو سے دونوں طاقتوں نے چین میں حالات کو بدستور قائم رکھنے اور چین کی خودمختاری کے ضامن بننے نیز سب کے لئے چین کا دروازہ کھلا رکھنے کا تہیہ کیا۔ جنگ عظیم تک اسی معاہدہ نے جاپان اور امریکہ کے تعلقات کو استوار رکھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب چینی شاہی حکومت تباہ ہوگئی اور جمہوریت کے قیام سے جو بے ترتیبی مشرق بعید میں پیدا ہوئی اُس سے امریکہ کی دلچسپی اور بھی بڑھی۔ چار حکومتوں نے ملکر چین کو جو قرض دینا چاہا تھا اُس میں یہ انگلستان، فرانس، اور جرمنی کا شریک بنا۔ اور بعد کو جاپان اور روس بھی اس میں شریک ہوگئے۔ ولسن جب برسرِ حکومت آیا تو اُس نے امریکہ کو اس قرض میں شرکت سے علیحدہ کرلیا۔ اور اس کے بجائے امریکن سرمایہ داروں کی اشک شوئی اس سے کی کہ دوسرے طریقوں سے اُن کے لئے آزاد مقابلہ اور بے روک ٹوک کاروبار کے مواقع پیدا کئے۔

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان سے تعلقات کشیدہ ہوگئے کیونکہ یہ بھی چین کو اپنے حلقۂ اثر میں لینا اور شمال میں اپنا اقتدار جمانا چاہتا تھا۔ یہ مخالفت بڑھتی ہی گئی اور اسمیں نسلی مخالفت اور رنگ کے تعصبات نے اور اضافہ کیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں پردیسیوں کو کیلیفورنیا میں اراضی حاصل کرنے کی ممانعت ہوگئی اور جاپان نے بھی جنوبی اور وسطی امریکہ میں ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔

سیاستِ عالم کے دوسرے میدانوں میں امریکہ کا حصہ زیادہ قابلِ ذکر نہیں رہا۔ دولِ یورپ کی سیاست پر اس کا اثر ضرور بڑھتا گیا لیکن اُن کے اہم معاملات میں مثلاً افریقہ کی تقسیم، ترکی کی قسمت، بغداد ریلوے کی تعمیر وغیرہ میں اسے کچھ دخل نہیں رہا۔ مجموعی حیثیت سے یہ کہنا چاہیئے کہ معاشی قوت کی ترقی اور سرمایہ داری کے اقتدار کے ساتھ امریکہ نے بھی اپنی معاشی اغراض کے مطابق ایک سامراجی سیاست کی ابتدا کر دی تھی لیکن اس کا میدانِ عمل ہر جگہ دولِ یورپ سے ٹکر نہ کھاتا تھا۔ سامراجی سیاست کے جو نتائج فوج اور بیڑے پر پڑتے ہیں وہ یہاں بھی پڑے۔ صدر جمہوریت روزویلٹ نے امریکن جنگی بیڑے کو بڑھانے کی پوری کوشش شروع کر دی اور اس میں بہت کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن تجارتی جہازرانی میں یہ دولِ یورپ سے پیچھے رہے۔

جنگ سے ۲۰ سال قبل کی اس سیاستِ خارجہ نے اندرونِ ملک میں بھی طرح طرح کے نتائج پیدا کیئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ محسوس کی گئی کہ سامراج اور جمہوریت کا پورا پورا ساتھ مشکل ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ سامراجی جھگڑوں میں آئین ساز جماعت کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور حکومت کے نفاذی پہلو یعنی صدر کا اثر روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اور صدر کے روز افزوں اثر کو اس وجہ سے اور بھی محسوس کیا گیا کہ اس کا انتخاب سرمایہ داری اغراض سے بہت کچھ متاثر ہوتا ہے۔ امریکن سیاست میں سامراج کی حامی ریپلکن (Republican) جماعت ہے اور اس کی مخالف ڈیموکریٹک (Democratic) جماعت۔ سرمایہ داری کے اثرات کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۴ء تک تین صدر اول الذکر اور ایک مؤخر الذکر جماعت سے منتخب ہوئے۔ اور اس ایک نے بھی اگرچہ اخلاق اور جمہوریت کے متعلق باتیں بہت کیں لیکن میکسکو اور جنوبی امریکہ میں بحر الکاہل اور مشرقِ بعید میں اس کی اور مخالفین کی سیاست میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ اور سامراجی سیاست کے خلاف اس کی جماعت کی جدوجہد روز بروز کمزور پڑتی گئی۔

اس سیاست کی بنا پر ۱۹۱۴ء میں ریاستہائے متحدہ کا رویہ کیا ہونا چاہیئے تھا؟ قدیم الایام سے فرانس کے ساتھ تو ان ریاستوں کو خاص ہمدردی تھی، اور انگلستان کی طرف سے بعض حلقے بے تعلق تھے بعض مخالف۔ اس نئی سیاست نے جاپان سے البتہ تعلقات کشیدہ کرا دئے تھے ورنہ ریاستہائے متحدہ ہر طرح آزاد تھیں کہ جدھر چاہیں جھکیں۔ یورپ کے ممالک عام طور پر امریکہ کی معاشی ترقی اور سیاسی اثر کو فکرمند نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انگلستان کے مشہور صحیفہ نگار ولیم ٹ۔ اسٹیڈ نے اپنی کتاب "دنیا کا امریکانا" میں جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ اگرچہ مبالغہ آمیز تھے لیکن یورپ کی ذہنیت کی صحیح ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۹۸ء کے بعد سے جرمنی اور انگلستان میں تعلقات برابر کھنچتے جاتے تھے۔ انگلستان نے محسوس کر لیا تھا کہ جرمنی سے جنگ آرہی ہے چنانچہ اُس نے ہر معاملہ میں امریکہ کی طرفداری اور اپنے حقوقِ قانونی تک میں اُس کے سامنے دَب جانا شروع کر دیا تھا۔ پھر لسانی، نسلی، تمدنی رشتے ایسے تھے کہ امریکن صحافت کے ذریعہ اُن سے بہت کچھ سیاسی کام لیا جا سکتا تھا اور لیا بھی گیا۔ اِدھر امریکہ کی معاشی سیاست تامینی اور جرمنی کی سیاسی ابلہی نے اُسی زمانہ میں دونوں ممالک کے تعلقات کو کچھ بہت اچھا نہ رہنے دیا تھا۔ اس معاشی مقابلہ نے امریکہ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ جرمنی کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جرمنی نے اس صورتِ حال کو سمجھا اور ۱۹۱۰ء سے کوشش شروع کی کہ امریکہ سے تعلقات دوستانہ ہو جائیں۔ سیاست عالم میں دونوں ملکوں کے ایک سے اغراض پر زور دیا گیا۔ لیکن دونوں ملکوں میں سیاسی ذہنیت اس قدر مختلف تھی، امریکہ کے معاشی حلقوں میں جرمنی سے رقابت کا جذبہ اتنی جگہ پکڑ چکا تھا، اور انگریزی پروپگنڈا کی بے پناہ سرگرمیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جرمنی سیاسی میدان میں امریکہ کو جو کچھ دے سکتا تھا وہ اس قدر حقیر تھا کہ جب جنگ شروع ہوئی ہے تو درحقیقت امریکہ کی سیاسی طرفداری کا مسئلہ طے شدہ سا تھا۔

جنگ عظیم میں شرکت اور اُس کے نتائج نے امریکہ کو سیاستِ عالم میں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ امریکہ کے علاوہ صرف جاپان ہی ہے جو اس جنگ سے معاشی اور مالی لحاظ سے کمزور نہیں ہوا ہے۔ ورنہ فاتح اقوام کی آبادی بھی گھٹی ہے، حکومتوں کا قرض بڑھا ہے، فتح کی وجہ سے ایسی ذمہ داریاں سر پڑی ہیں جن کے لئے اُن کی قوتیں ساتھ ساتھ نہیں بڑھیں۔ انکے مقابلہ میں امریکہ کی قربانیاں بہت کم ہیں اور اُس نے فتح کا سودا بہت سستے داموں کر لیا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں مطلقاً اور اعتباراً دونوں حیثیت سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ ساری دنیا کی ساہوکار بنگئی ہیں۔ دورانِ جنگ میں انہوں نے ۵ ملیارڈ ڈالر کا پرانا قرضہ اُتارا اور اپنے حلیفوں کو ۱۰ ملیارڈ ڈالر اور قرض دئے۔

آج امریکہ کے پاس سیاست کے میدان میں اپنے تمام پُرانے وسائل موجود ہیں اور انمیں پہلے سے زیادہ تنظیم ہے۔ کئی ملین قواعد داں سپاہی آج اُس کے پاس ہیں۔ بہت بڑا جنگی بیڑا ہے۔ سامان جنگ اور جہاز سازی کی صنعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اور اب حملہ آور مدافعت کا سب سامان خود تیار کر سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں اُس نے ۳۰ لاکھ ٹن وزن کے جہاز بنائے، سنہ ۱۹ء میں ۴۰ لاکھ ٹن کے اور انہیں سنوں میں انگلستان نے بالترتیب تقریباً ۱۳ اور ۱۶ لاکھ ٹن کے جہاز تیار کئے۔

غرض امریکہ کی قوت آج ایسی ہے کہ وہ ہر میدان میں اس قوت کے بھروسہ پر اپنے اغراض کے موافق سیاست برت سکتا ہے۔ اسوقت امریکن سیاستِ خارجہ کی توجہ کن مسائل کی طرف ہے وہ مختصراً درج ذیل ہیں:۔

۱۔ کینڈا سے تعلق:۔ اس بارہ میں بھی جنگ کے اثرات امریکہ کے موافق ہی پڑے ہیں۔

۲۔ جزائر مغربی ہند کا مسئلہ:۔ یہاں امریکہ نے اپنی قوت کو ڈینمارک کا حصہ حاصل کر کے قوی کر لیا ہے اور مزید تقویت کا امکان اس طرح بھی بتایا جاتا ہے کہ امریکہ نے اپنے حلیفوں کو جنگ میں جو قرض دیا ہے اُسے کُل یا جزوی طور پر معاف کرے اور اُس

کے عوض میں یہ جزائر حاصل کرلے۔

۳۔ میکسکو کا مسئلہ:۔ یہ ہنوز بہت پیچیدہ صورت میں ہے اور یہاں تیل کی یافت کے باعث ہر وقت کسی شدید تنازعہ کا احتمال ہے۔

۴۔ جنوبی امریکہ سے تعلق:۔ یہاں بھی جنگ نے ریاستہائے متحدہ کو تقویت پہونچائی ہے۔ اس لئے کہ دوران جنگ میں جنوبی امریکہ کی ریاستوں کے تعلقات یورپ سے منقطع سے تھے۔ امریکہ نے اس زمانہ میں انہیں خوب قرض دیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ سے ان ریاستوں میں ۱۴۶ ملین ڈالر کا سامان جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ۴۱۱ ملین ڈالر کا سامان گیا۔

۵۔ مشرق بعید کا مسئلہ:۔ جاپان سے کشیدگی کم کئے کم نہیں ہوتی۔ کیلیفورنیا میں جو جاپانی جا کر بسے ہیں انہیں بار بار قومی خطرہ بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف ایک لاکھ جاپانی وہاں آباد ہیں اور انکے پاس ۸۰ ملین ایکڑ زمین ہے۔ جس ملک کے پاس ۲½ لاکھ تیار فوج ہو اور جس کے ڈھائی کروڑ آدمی ضرورت کے وقت میدان جنگ میں آسکتے ہوں اُسے اس تعداد سے نہ ڈرنا چاہئے لیکن دوسرے مقامات پر معاشی و سیاسی اغراض کا تصادم ہے اس لئے رائے عامہ کو ابھارنے کے لئے ان جاپانیوں سے نفرت پیدا کرائی جاتی ہے۔ امریکہ پر اگر جاپان کی ضرب کاری پڑسکتی ہے تو وہ جزائر فلیپائن میں۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے ہمیشہ فلیپائن کو حکومت خود اختیاری دینے کی تجاویز زیر غور رہتی ہیں۔

لیکن اصل چیز جس کا اثر امریکہ اور جاپان کے تعلقات پر ہے وہ چین کا مسئلہ ہے۔

۶۔ یورپ سے تعلق:۔ اس بارہ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے امریکہ منرو مسلک کا پیرو تھا لیکن جنگ عظیم میں وہ یورپ کے سب سے بڑے جھگڑے میں شریک ہوا۔ اب پھر اُس کی کوشش ہے کہ الگ تھلگ رہکر صرف ساہوکار کی حیثیت ہو جائے۔ لیکن

اسکی سیاسی آلودگیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ یہ چنداں آسان نہیں ۔

ان مسائل میں سے ہر ایک مستقل مطالعہ اور غور کا طالب ہے ۔ امید ہے کہ وقتاً فوقتاً جامعہ کے پڑھنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی اُن پر روشنی ڈالتا رہے گا ۔

جنگ کا حق اور موجودہ ضمیر انسانیت

انسان کی زندگی میں یہ ایک عجیب متضاد منظر نظر آتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس نے امن کی تمنائیں اور امیدیں قائم کیں اور ہر زمانہ میں وہ آپس میں دست و گریباں ہوا۔ ہر قوم کی تاریخ جنگوں کی ایک مسلسل کڑی ہے جس میں صرف بعض اوقات امن کے قلیل وقفے نظر آتے ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی قوم نہیں ہے جسکی اپنی فتوحات اور اپنی شکستیں نہ ہوں۔

کیا پھر جنگ امن کی ناگزیر شرط ہے؟ وہ امن جو اس قدر قلیل، ادھورا اور نامکمل ہو اور جو ہمیشہ آئندہ مکمل امن کی امید اور تلاش میں نئی جنگ کا سبب ہوتا ہے۔ یا پھر انسانیت ایک چکر میں مبتلا ہے کہ امن کے لئے جس کی وہ اس قدر خواہشمند ہے ہمیشہ جد و جہد کرتی ہے لیکن ہمیشہ جنگ میں مبتلا ہو جاتی ہے جس سے اُسے اس قدر نفرت ہے۔

موجودہ زمانہ کے عملی آدمی، قانونِ فطرت کے مفسر اور حکما جواب دیتے ہیں کہ جنگ ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی چونکہ انسان کی فطرت یہی ہے۔ مورخ تمام دنیا کی جنگوں کو پیش کر کے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں اور دنیا کے قنوطیین اسے قسمت کا ایک تاریک باب قرار دیتے ہیں۔

موجودہ انسانیت کا ضمیر اس خوفناک جواب سے مطمئن نہیں ہوتا چونکہ اُس کا رجحان ہے کہ وہ انسانی ارادے کو غیر محدود تسلیم کرے جو تمام قیود کو توڑ سکتا ہے۔ انسانیت کا ضمیر جنگ پر دو متضاد نقطہائے نظر سے غور کرتا ہے۔ یا تو وہ ایک اچھی چیز ہے جیسے طاقت انتخاب اصلح۔ اجتماعی قوت کی کامیابی وغیرہ۔ اس لئے ہمیں اسے جاری رکھنا چاہیئے یا وہ ایک بدی ہے جسکی بیخکنی کر دینی

چاہئے چونکہ جنگ انتشار ہے جو زندگی اور ملک کو تباہ کرتا ہے، ترقی کو روکتا ہے۔ دونوں نظریے جنگ کو انسانی ارادہ کے تحت تسلیم کرتے ہیں اور اسے انسانی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ان متضاد مذاہب کے تمام مقدمات کو تسلیم کئے بغیر ہم اپنے مطالعہ کی خاطر اس نظریے کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ جنگ ان انسانی اعمال سے تعلق رکھتی ہے جو انسانی ارادے کے ماتحت ہیں اور جو انسانی ارادہ سے پیدا اور فنا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ارادہ کیا ہے؟

حقیقتاً یہ ایک فرد کا ارادہ نہیں ہوسکتا۔ جنگ ایک اجتماعی مظہر ہے جو منظم انسانوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن فرد کا ارادہ یقیناً جماعت کے ارادہ کی تکمیل میں مدد ہوتا ہے۔

سیاسئین کے نزدیک اس اجتماعی ارادہ کا ظہور حکومت کے ارادوں میں ہوتا ہے چاہے وہ (۱) انفرادی ہوں جیسے بادشاہ، ڈکٹیٹر، امیر عساکر، یا مذہبی پیشوا یا (۲) نیابتی جیسے پارلیمنٹ، کونسل، اسمبلی۔ بعض اوقات اس کا اظہار عوام کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ اجتماعئین اسے کافی نہیں سمجھتے۔ وہ بہت ٹھیک ارادہ عامہ کا ظہور ان تمام اجتماعی اداروں اور روایات مثلاً خاندان، مذہب اور قانون میں بھی محسوس کرتے ہیں جن میں نسلوں کے جذبات اور ضروریات کے نقشے کھنچے ہوئے ہیں اور اُن کی تشریح کی گئی ہے۔

غرضکہ ہمارے نظریہ کے مطابق جب اجتماعی ادارے اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ وہ جنگ کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیں اُس وقت جنگ کا خاتمہ ہوجائیگا۔ آخر میں امن کا اجتماعی ارادہ جنگ کے اجتماعی ارادہ پر غالب آجائے گا۔

مستقل مسئلہ جسے ہمیں حل کرنا ہے یہ ہے کہ کیا کبھی انسانی جماعت اس قدر منظم ہوسکتی ہے کہ جنگ اس کے قانونی اداروں میں سے خارج کردیا جائے۔ کیا انسانی جماعت اس حق کو جو اس وقت تک اس کا امتیازی حق رہا ہے چھوڑنے کے لئے آمادہ ہے؟

سب سے پہلے ہمیں جنگ کے حق کے معنی کو بالکل واضح کرلینا چاہیئے اس کی تعریف اس طرح کیجاسکتی ہے کہ یہ "حکومتوں کا اپنے تنازعوں کے تصفیہ کرانے کے لئے مسلح اور

منظم قوتوں کے استعمال کا حق ہے جبکہ دوسرے مناسب اور مؤثر ذرائع باقی نہ رہیں۔" قانون بین الاقوامی اس حق کو تسلیم کرتا ہے حتیٰ کہ جمعیۃ الاقوام بھی اگرچہ محدود صورت میں اسے تسلیم کرتی ہے۔

اس بات کو ضرور مدنظر رکھنا چاہئے کہ جنگ کی تعریف کرنے میں اور قانون بین الاقوامی کے متعلق گفتگو کرنے میں ہم موجودہ حکومتوں کے اور خصوصاً مہذب حکومتوں کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔ دوسری قوموں کو جن کا ابھی تک باقاعدہ نظام حکومت نہیں ہے یا جو ابھی تک سفید نسل کے تابع ہیں یا جنہوں نے ہنوز ہمارا تمدن اختیار نہیں کیا ہے اسی راستہ کو طے کرنا ہوگا جسے ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لئے اس قدر محنت سے طے کیا ہے۔ اس بات کو فرض کرکے ہمیں مسئلہ کی بنیادی باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

(۲) فلسفی اور قانون داں جنگ کے حق کو تین بنیادی نظریوں سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی وہ جنگ جو انصاف کے لئے کیجائے۔ دوسری وہ جو حکومت کی ضروریات کے لئے ہو۔ تیسری وہ جو بقائے اصلح کے نظریہ پر مبنی ہو یعنی جو شہنشاہیت کے لئے کیجائے۔

پہلے نظریہ کا تعلق اخلاقی محرکات سے ہے۔ دوسرے کا سیاسی سے اور تیسرے کا اجتماعی سے۔ پہلا نظریہ جو جنگ مبنی بر انصاف کا ہے بالکل بیکار ہوگیا ہے چونکہ کسی جنگ کو ثابت کرنا کہ وہ انصاف پر مبنی ہے یا نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ عملاً حکومتوں اور لوگوں نے صرف انہیں جنگوں کو انصاف پر مبنی سمجھا ہے جو انکی اور صرف انکی تھیں۔

دوسرا نظریہ بھی جو ریاست کے لئے جنگ سے تعلق رکھتا ہے بیکار ہوگیا ہے چونکہ سیاست میں اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ متمدن ریاستوں کے درمیان تنازعوں کا فیصلہ پُرامن ذرائع کے مقابلہ میں جنگ سے زیادہ بہتر طور پر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے خلاف جنگ عظیم الشان نقصانات پہنچانے کے باوجود نئے تنازعات کی تخم ریزی کردیتی ہے۔

اب صرف تیسرا نظریہ باقی رہجاتا ہے جو معمولی جذبات کے خلاف ہے مگر جس کی تائید اجتماعیین

اور سیاسین بڑی شد و مد سے کرتے ہیں جن کے لئے جنگ بقا اصلح کے لئے ضروری ہے، قومی کے لئے اقتدار اور حکمرانی کا ایک وسیلہ ہے۔

حالات کی یہ متضاد اور پیچیدہ صورت ہمیں جنگ کے متعلق مندرجہ ذیل اجتماعی اور تاریخی قانون بنانے پر مجبور کر دیتی ہے:-

"جنگ کا اسی قدر ظہور ہوتا ہے جس قدر کہ وہ ارادی اجتماعی عمارت کا جزو ہے اور جس وقت تک وہ اجتماعی عمارت کا جزو ہے۔ ہم اسے قانونی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں بشرطیکہ وہ تمام شرائط جو اس وقت کے عام احساس، گزشتہ معاہدات اور قانونِ بین الاقوام سے متعلق ہوں پوری کیجائیں۔

اجتماعیات کی اصطلاح میں "اجتماعی عمارت" اُس چیز کے ظاہری پہلو کا نام ہے جس کو ہم جماعت کا مجموعی ارادہ کہتے ہیں۔

غرضکہ جنگ جو ابتدائی سوسائٹی میں تحفظ اور تقدم کا ایک جبلّی فعل تھا متمدن اقوام میں اپنے قوانین اور ضوابط کے ساتھ ایک قانونی ادارہ بن گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی ارتقا کے ساتھ جنگ کے علاوہ کوئی دوسرا مؤثر قانونی ادارہ پیدا نہیں ہو سکا۔

لیکن کیا اس انتشار کی حالت کو دور نہیں کیا جا سکتا؟ کیا سوسائٹی کا ارتقا اس حد تک نہیں پہنچ سکتا جسمیں جنگ کا وجود نہ ہو؟

تاریخ ہمیں اس کی متعدد مثالیں مہیا کرتی ہے۔ وہ رواج اور ادارے جو ایک وقت ناقابلِ فنا سمجھے جاتے تھے اور جنکی بنیاد انسان کی جبلت اور اجتماعی ضروریات پر تھی بالکل فنا ہو گئے ہیں۔ انفرادی انصاف، خاندانی اختیارات، افراد کا باہم لڑکر تنازعات کا فیصلہ کر لینا اور کثرتِ ازدواج وغیرہ قانونی ادارے تھے جو اب متمدن سوسائٹی میں اجتماعی قانون کے خلاف قرار دئے گئے ہیں۔ لیکن اجتماعی ترقی کی بہترین مثال غلامی کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ یہ مختلف صورتوں میں ہزاروں برس قائم رہی اور یہ ہر قوم کے اجتماعی اور معاشی نظام کے ساتھ اس قد

مربوط ہوگئی تھی کہ حکما اور قانون دان بھی اس کو ممنوع قرار نہ دے سکے بلکہ اسے ضروری قرار دیا۔ وہ سوسائٹی کا تخیل بغیر غلامی کے کر ہی نہیں سکتے تھے۔

مسیح نے بنی نوع انسان کو مذہبی اور اخلاقی مساوات کی تعلیم دی مگر وہ غلامی کا انسداد نہ کر سکے۔ لیکن انسداد غلامی اُنکی تعلیم کا اُسی طرح جزو ہے جس طرح ظلم اور قوت کے استعمال کی مخالفت اور جسطرح ہمارا یقین ہے کہ مسیحیت میں انسداد جنگ کی بھی روح موجود ہے۔ اگر سوسائٹی نے اجتماعی حیثیت سے ترقی کی ہے تو اُس کے لئے ہم بہت کچھ مسیحیت کے ممنونِ احسان ہیں لیکن اجتماعی اداروں میں ترقی جب ہی ممکن ہے جب اُس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں بھی تغیر ہوا ہو۔

غرضکہ اس وقت بھی جبکہ مسیحیت مکمل طور پر کامیاب ہوگئی وہ غلامی کا مطلقاً خاتمہ نہ کر سکی۔ اُس نے وہی کیا جو ڈاکٹر کرتا ہے جبکہ وہ خارجی طور پر بیماری کو نہیں روک سکتا تو جسم کو قوی اور توانا کرتا ہے تاکہ اس طرح مرض کے جراثیم مرجائیں۔ فرسودہ اداروں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انسانیت ہمیشہ سے عظیم الشان جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ ہر وقت مادہ کو روح کی اعلیٰ تمناؤں کے ماتحت کرنے میں مصروف ہے۔

ہمیں مغالطہ میں نہیں رہنا چاہیئے۔ غلامی کا اس وقت بھی وجود ہے۔ وہ مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ متمدن اقوام میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں اور وحشیوں میں وہ اسوقت تک موجود ہے۔ لیکن کہیں بھی اس کی حیثیت قانونی تسلیم نہیں کی گئی ہے اور نہ اسے موجودہ معاشی نظام کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

غرضکہ جب انسداد جنگ کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مفہوم متمدن دنیا کا ایک ایسا عہد ہوتا ہے جس میں جنگ کے حق کو اسی طرح غیر قانونی تسلیم کیا گیا ہو جسطرح آج غلامی کے حق کو غیر قانونی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی اقوام کے درمیان مسلح لڑائیاں ہونگی مگر یہ جنگ نہ ہوگی یعنی جنگ اس مفہوم میں کہ وہ ایک حق ہے جس کو ضمیر انسانیت نے فطری قرار دیا ہے۔ اُسوقت جنگ ایک وحشیانہ فعل متصور ہوگا۔ بین الاقوامی عہد کی روح کی خلاف ورزی ہوگی لوگوں کے

اخلاقی احساس کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ غرضکہ وہ ایک ایسا فعل ہوگا جس کو متمدن کے عام قوانین نے ممنوع قرار دیا ہو۔ جرمنی اور فرانس اگر اسوقت باہم دست وگریباں ہوں گے تو وہ ایسے ہی نظر آئیں گے جیسے اس وقت انگلستان نظر آئے اگر وہ غلاموں کی خرید و فروخت کے متعلق قوانین بنا کر غلامی کو قانونی تسلیم کرلے۔

(۳) پھر یہ کب اور کس طرح ہو سکتا ہے کہ جنگ کا حق اُسی طرح قائم نہ رہے جس طرح آج غلامی کا حق نہیں ہے۔ اجتماعیات ہمیں اس کا جواب دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "جب اجتماعی زندگی کو جنگ کے حق تسلیم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے"۔ یہ ایک مبہم سا جواب نظر آتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔

ہمیں موجودہ سوسائٹی پر غور کرنا چاہیئے یعنی تاریخی ترقی کی اُس سطح کا مطالعہ کرنا چاہیئے جسکی مظہر اس وقت کی متمدن اقوام ہیں۔

جمعیۃ الاقوام کا قانون ہے کہ کسی ریاست کو جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے معاملات کو جمعیۃ کی عدالت، کونسل یا اُس کی اسمبلی کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ عدالت میں معاملہ پیش کرنا ریاست کی مرضی پر منحصر ہے مگر اس کا فیصلہ تسلیم کرنے کے لئے ریاست مجبور ہے۔ کونسل کا فیصلہ اُسی وقت قابل تسلیم ہے جب وہ متفقہ ہو۔ اسمبلی کے فیصلہ کے لئے صرف ایک مقرر کردہ اکثریت کافی ہے۔ اِن شرائط کی اگر کوئی ریاست خلاف ورزی کرے تو دیگر ریاستوں کو اس کے خلاف جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اقوام میں باہم معاہدے بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جمعیۃ کی شرائط کے خلاف نہ ہوں۔ ان تمام معاہدوں کو نیک نیتی سے پورا کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی ریاست اس کی خلاف ورزی کرے تو وہ سوسائٹی سے خارج ہو جاتی ہے اور اس وقت اسے جنگ کا حق باقی نہیں رہتا۔

لیکن اگر ریاست نے معاہدہ کی تمام شرائط پوری کرلیں تو اُسے جنگ کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے چاہے دیگر اقوام سے اُس کے کیسے ہی معاہدے کیوں نہ ہوں۔ اس قدر آزادی ریاست کو اس وقت تک حاصل ہے اور یہ آزادی تمام بحری اور بری طاقتوں اور آلاتِ حرب وغیرہ

برقرار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح انسانیت ہمیشہ مسلح امن اور خطرہ حرب کے چکر میں گرفتار ہے۔
یہ حالت موجودہ اجتماعی زندگی میں تین اسباب سے پیدا ہوئی ہے۔ پہلا ہر حکومت کا دوسری حکومتوں سے تعلقات میں مکمل استقلال کا نظریہ ہے جو بالکل فطری اور غیر محدود سمجھا جاتا ہے۔ ریاستیں اس طرح بالکل جدا جدا ہو گئی ہیں اور وہ جماعت کی آخری اور مستقل مظہر سمجھی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ریاست کی حیثیت انفرادی اور خود غرضانہ ہو گئی ہے جو بالکل فطری اور ناقابل تغیر سمجھی جاتی ہے۔

مستبد بادشاہوں نے سب سے پہلے اس حق کا استعمال کیا۔ اس کے بعد اقوام نے اس کا یقین کر لیا کہ وہ مکمل طور پر آزاد اور خود اپنی حاکم ہیں۔

دوسرا سبب حکومتوں کی معاشی پالیسی ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ آزاد تجارت صرف چند دنوں تک چند اقوام میں مخصوص رہی اس کے بعد تامینی تجارت کا تقریباً ہر وقت دور دورہ رہا۔

تیسرا سبب تاریخی روایات ہیں جو جغرافی حالت، اختلاف نسل و تہذیب، سیاسی رقابت، قوت سے حاصل کردہ اختیارات اور توسیع ملک سے وابستہ ہیں۔ یہ تمام محرکات یورپ کی قدیم اقوام کے لئے جنگ کے حقیقی محرکات ہیں۔

جہاں یہ اسباب موجود ہیں جو ایسی جماعت کی تشکیل میں مانع ہیں جس میں جنگ کا وجود نہ ہو وہاں دوسرے اسباب بھی ہیں جو کسی دوسری سمت کا اشارہ کر رہے ہیں۔

اینگلوسیکسن اقوام نے جو عظیم الشان ریاستیں قائم کی ہیں اُن کے دو مقاصد ہیں (۱) ریاست کے اندر امن قائم رکھنا (۲) دوسری اقوام کو اپنے اثر کے ذریعہ جنگ سے روکنا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے متعدد ریاستوں کی ایک ریاست قائم کر کے اندرونی جنگ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا اثر پان امریکن کانگریس کے ذریعہ باقی امریکہ پر بھی ڈالدیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مختلف ریاستوں میں جنگ کے روکنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ جب

میکسیکو اور وسط امریکہ کی اقوام میں امن کی روح زیادہ سرایت کر جائے گی اُسوقت امریکن اقوام کے تعلقات اور زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔

دوسری مثال سلطنت برطانیہ کی ہے۔ ایسی سلطنت کی مثال ہمیں قدیم اور جدید تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یورپ کی دیگر سلطنتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کس طرح یہ تمام اقوام سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی زنجیروں سے بغیر کسی جبر کے باہم مربوط ہیں۔ اکثر لوگ سلطنت برطانیہ کے تنزل کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن برٹش دولت عامہ کا اخلاقی تعاون اور آزادی کا تجربہ قوموں کی زندگی میں ایک نئی شاہراہ کھولتا ہے۔ اس تجربہ کی کامیابی تاریخی نقطۂ نظر سے اسی قدر اہم ہوگی جس قدر نظام منصب داری کا انسداد یا حقوق انسانی کا اعلان۔

اس وقت تک بھی برطانیہ اور امریکہ قوت اور خصوصاً بحری قوت پر انحصار کرتے ہیں جو اُنکے نزدیک مدافعت کے لئے ناگزیر ہے۔ انہوں نے جنگ کے حق کو اپنے حدود میں غیر قانونی قرار دیا ہے مگر دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں وہ اس حق کو جائز تسلیم کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے وہ دوسری ریاستوں کے مخالف ہیں مگر موجودہ بین الاقوامی نظام کے ماتحت اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

بہرحال جمعیتہ الاقوام موجودہ نظام کی اصلاح کے لئے دو طرح کوشش کر رہی ہے۔ وہ ریاستوں پر کچھ قانونی بندشیں عائد کر کے اور کچھ اسلحہ میں تخفیف کر کے اُن کی جنگی قوت کم کر رہی ہے۔ دوسری طرف وہ ایسا اخلاقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے جسمیں جنگ اجتماعی قوانین کے خلاف سمجھی جاوے۔ غرضکہ جمعیتہ الاقوام کا وجود جنگی روح کو کم کرنے میں بہت ممد ہے۔

پھر معاشی ضروریات مفادِ عامہ کا ایک ایسا جال بچھا رہی ہیں جو تنہا کسی ریاست کے محدود دائرہ سے بہت وسیع ہے اور جو نسل، زبان، فاصلہ اور دیگر تمام عناصر پر غالب آ رہا ہے۔ سائنس کی روزانہ جدید انکشافات انسانی مفاد اور کارگزاریوں کو وسیع کر رہی ہیں۔

ہر چند کسی ریاست کے حدود سے زیادہ وسیع معاشی نظام مرتب کر رہی ہے۔ ہم اس وقت تاریخ کے ایسے زمانہ میں ہیں جبکہ سیاسی حدود وسیع تر ہو رہی ہیں۔ جنگوں کے بعد معاشی تنزل اقوام کے درمیان سمجھوتہ میں معاون ہوگا اور یہ تعاون معاشی حدود سے نکل کر سیاسی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

مغرب کی ہزار سالہ تاریخ کے چند ابواب کو اس وقت ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ ہم موجودہ حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

ازمنہ متوسطہ کی مختصر زرعی اور خانگی صنعتیں ایک محدود سیاسی دائرہ یعنی اضلاع میں ترقی کر سکتی تھیں۔ اس وقت بادشاہ اور شہنشاہ ریاستوں کے صرف نشانات تھے حقیقتیں نہ تھیں۔ انھیں صرف اس قدر درکار تھا کہ جاگیردار انہیں محصول ادا کیا کریں اور اپنا آقا تسلیم کریں۔

تجارت کی افزائش۔ معاشی نظام کی ترقی اور صنعت کی ابتدا کے ساتھ شخصی نظام حکومت کی بنیاد پڑی جس نے برو اور کومیون وغیرہ کا خاتمہ کر دیا۔

طویل سفروں اور نئی دنیا کے انکشافات نے نو آبادیات کے نظام حکومت کی بنیاد ڈالی جس سے بڑے شاہی خاندانوں کی عظیم الشان ریاستیں قائم ہو گئیں۔ امریکہ، فرانس اور انگلستان کے انقلابات کے بعد قومی حکومتوں کی تعمیر نیابتی اور آزاد سیاسی نظاموں کے اجراء اور مزدوروں کی تنظیم کا لازمی نتیجہ انیسویں صدی کا عظیم الشان صنعتی دور تھا۔ ریاستوں کی حدود کا خیال رکھے بغیر مفاد کا اشتراک ہمیں جنگ عظیم میں نمایاں نظر آگیا جبکہ قومیں دو عظیم الشان فریق میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ اس مہیب وقت میں ریاستوں کی حدود بیکار اور غیر فطری دکھائی دیتی تھیں۔ تنہا ایک ریاست انسانی عمارت کی انتہائی بلند منزل۔ انسانی نظام کا آخری مظہر نہیں نظر آتی تھی۔ جنگ کے بعد قومیت کا ردعمل حدود کی تعین، اقوام کے درمیان نئی اخلاقی اور مادی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش گزشتہ زمانہ کو برقرار رکھنے کی جواب ہمیشہ کے لئے جا چکا

ہے ایک آخری مایوس کوشش ہے۔ کیا احتجاج کی ایک صدا اس ندی کو روک سکتی ہے جو سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے یا اُس ہوا کو ٹھہرا سکتی ہے جو میدان کے اوپر چل رہی ہے؟

غرضکہ امریکہ اور برٹش امپائر کے اندرونی آزاد ریاستوں کے نظام، جمعیۃ الاقوام کی پُرامن کوششوں اور بین الاقوامی نظام معاشی نے ریاست کی سیاسی اور حربی قوت کو کم کر دیا ہے اور اُس کے کلی استقلال میں بہت تخفیف ہو گئی ہے۔ یہ جدید حالات سیاسی اتحاد کے حلقہ کو وسیع کر رہے ہیں اور اس طرح مفاد عامہ کا دائرہ بڑھ رہا ہے۔ یہ تمام امور اقوام کے درمیان جنگ کے موقعوں کو کم کر رہے ہیں۔ اس طرح حکومتوں کے درمیان جنگ کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

(۴) جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقوام کی اجتماعی زندگی میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو جنگ کے موقعوں کو کم اور اُس کی اہمیت کو گھٹا رہی ہیں تو اس سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ لازمی طور پر جنگ کا حق مفقود ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف مستقبل کی جنگیں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ شدت کے ساتھ لڑی جائینگی۔ جس قدر متضاد معاشی مفاد وسیع ہوگا اُسی قدر انسانی کارگزاریوں کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور جنگ کے آلات بھی زیادہ مہلک اور تباہ کن ہونگے۔ جنگیں اُسی قدر عظیم الشان ہوں گی جس قدر عظیم الشان اُن میں شرکت کرنے والی ہونگے۔ وہ کس قدر مہیب جنگ ہوگی جس میں دنیا کی ریاستیں دو فریق میں تقسیم ہو کر آپس میں دست و گریباں ہونگی۔ جس طرح کہ شخصی حکومتوں کے قیام نے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو خود میں جذب کر کے جنگ کے لئے ایک وسیع میدان کر دیا ہے اُسی طرح اقوام بڑے حلقوں میں جذب ہو کر جنگ کو وسیع تر اور زیادہ مہیب کر دینگی۔

لیکن موجودہ ضمیر انسانیت باوجود ان تمام چیزوں کے موجودہ بے چینی کا سبب صرف توسیع حدود کے جذبہ کو قرار نہیں دیتا۔ حقیقتاً اس کی تہ میں جنگ کے حق کی اخلاقی، قانونی اور اجتماعی پہلو کی تبدیلی کا احساس بھی موجود ہے۔ ایک نئی اور مہیب جنگ کا خطرہ بھی اس

احساس کا موجب ہے۔ جمعیۃ الاقوام جو کچھ دنوں قبل ایک بیکار چیز سمجھی جاتی تھی اب آہستہ آہستہ اپنا وجود منوا رہی ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جمعیۃ الاقوام کی عجیب پیچیدہ قانونی حیثیت ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سیاسی حیثیت سے بھی بہت کمزور ہے۔

جمعیۃ کی قانونی پیچیدگی خود اُس کی ذات میں مضمر ہے۔ وہ ریاستوں کا ایک خود ساختہ نظام ہے جس کے اراکین کچھ اجتماعی حقوق و فرائض تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنے استقلالِ کلی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ جمعیۃ کی سیاسی کمزوری یہ ہے کہ اُس کے پاس اپنا فیصلہ منوانے کے لئے کوئی قوت نہیں ہے۔

اس کمزوری کو رفع کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ جمعیۃ کے فیصلے متفقہ ہوں مگر اس کے ساتھ ہی گزشتہ زمانہ کی طرح خفیہ معاہدے اور ریشہ دوانیاں شروع ہو گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ جمعیۃ کی یہ کمزوری اور پیچیدگی اسوقت اس کی قوت کا باعث ہو اسی سبب سے قومی تعصب اور نفس پرستی کو موقع ملگیا ہے کہ وہ جمعیۃ کے عہد طفلی ہی میں اس کا گلا گھونٹ دے۔

جمعیۃ کا کام جو بہت طویل اور صبر طلب اور مشکلات سے گھرا ہوا ہے یہ ہے کہ وہ اپنی اس ابتدائی پیچیدگی اور کمزوری سے آزاد ہو اور ریاستوں کے درمیان کے تنازعات کو بالکل قانونی شکل دیدے جسمیں جنگ کے حق کو مطلق تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

جمعیۃ معاہدہ توڑنے والی حکومت کے خلاف بھی کچھ کارروائی کرتی ہے۔ یہ حقیقتاً کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ایک حکومت قانونِ بین الاقوام کی خلاف ورزی کرنے کے سبب رائے عامہ کے سامنے ذلیل ہوئی۔ بہت بڑی جنگ جرمنی نے اُسی وقت ہاردی جبکہ اُس کے وزرا میں سے کسی نے کہا کہ معاہدے صرف کاغذ کے پُرزے ہیں اور ضرورت کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ لیکن اُس وقت بالکل جداگانہ حالت ہو گی جب کوئی ایسی مرکزی قوت ہو گی جو قانون کی خلاف ورزی کرنیوالی ریاستوں کو سزا دے سکے گی اور ان کو متمدن اقوام کے احاطہ سے باہر کر دیگی۔ اگر اُسوقت کوئی ریاست جنگ کریگی تو وہ

اس کا حق تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ اُس کی طاقت کا ناجائز استعمال ہوگا۔ دیگر اقوام کو ایک کھلا ہوا پیغام مقابلہ ہوگا۔

اس منزل پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام تنازعات کے فیصلے جو آپس میں نہ ہوسکیں لیگ کی مجلس منتظمہ کے سپرد کر دئے جائیں اور وہ حتمی اور آخری سمجھے جائیں چاہے وہ مکمل اتحاد رائے سے ہوئے ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اس طرح نہیں ہوسکتا کہ موجودہ لیگ کے نظام دستور میں تبدیلی کر دی جائے بلکہ یہ صرف سیاست بین الاقوام میں ایک جدید اخلاقی ضمیر کی تعمیر سے ہوسکتا ہے۔ یقیناً یہ بہت بڑی پیش قدمی ہوگی۔ اس وقت تمام ریاستیں جنگ کرنے کے حق سے دست بردار ہوجائیں گی۔ وہ اپنے مقاصد ہتھیاروں کے ذریعہ نہ حاصل کریں گی تاکہ وہ اس مرکزی جماعت سے فیصلہ طلب کرسکیں جس کے وہ اراکین ہیں۔ ہمیں یہ اخلاقی آزادی کے لئے مادی آزادی کی قربانی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کیا یہ قول متحدہ طور پر تمام اقوام پر صادق آتا ہے۔ یہ مشکل سے کہا جاسکتا ہے۔ حقیقتاً اگر معاشی مفاد اور وسیع اجتماعی محرکات ملجائیں تو متمدن اقوام کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس اتحاد کو اپنے دائرہ میں امن کا ضامن قرار دیلیں۔

اسی طرح جب نیابتی حکومت، سیاسی آزادی اور عام حق رائے دہندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا تو جو اسوقت برسر اقتدار تھے یعنی مستبد سلاطین اور مخصوص طبقوں کو یقین تھا کہ ریاست منتشر ہورہی ہے۔ حقیقت نے جواب دیدیا کہ ریاست منتشر نہیں ہورہی تھی بلکہ اُن کے ناجائز حقوق غائب ہورہے تھے۔ جو کچھ ہورہا تھا وہ صرف اس قدر تھا کہ سیاسی زندگی کا مرکز تبدیل ہورہا تھا۔ اسی طرح آج بھی لوگ ایک آزاد ریاست کا خیال جو دوسری ریاست سے جنگ نہ کرسکے اس کے سوا نہیں کرسکتے کہ ایسی ریاست تباہ ہوجائے۔ اس کا وجود خطرہ میں ہو اور اُس کے حدود ہمیشہ باہر سے حملہ کے لئے کھلے ہوئے ہوں۔ حالانکہ جو کچھ ہوگا وہ صرف اسقدر ہوگا کہ اجتماعی نظام کی ایک جدید ترتیب ہوگی تاکہ واحد ریاستوں کی بجائے متحدہ ریاستوں کا ایک نظامِ حق استقلال حاصل کرلے۔

لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ کس قوت کے ذریعہ اپنے احکام تسلیم کروائیگی۔ کیا جمعیۃ کے دفعہ ۱۶ امیں مندرجہ اختیارات کافی ہیں یعنی یہ کہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے والی ریاست کا معاشی اور اخلاقی مقاطعہ کر دیا جائے۔

علوم طبیعی کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ کسی فعل کے وجود سے اس کا آلہ کار بھی وجود میں آجاتا ہے اور کسی قوت کے استعمال سے اس کے ذرائع استعمال بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

سیاسی نقطۂ نظر سے متعدد ریاستوں کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ قوی اقوام کو اُن کا خودغرضانہ جذبہ اس کی طرف نہ مائل کرے کہ وہ ضعیف اقوام اور اقلیتوں کے معاشی ذرائع اور خام پیداوار پر حاوی ہو جائیں۔

حقیقتاً اولاً یہ خطرہ ایک نفسیاتی خطرہ ہے یعنی یہ کہ مستقبل میں جبکہ جنگ کے حق کا انسداد ہو جائیگا یہ خطرہ زیادہ مہیب نظر آتا ہے بہ نسبت موجودہ زمانہ کے جبکہ یہ حق موجود ہے۔

ہمیں اس کا کافی احساس کر لینا چاہئے کہ قوی اقوام میں برتری کا جذبہ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گا۔ یہ اقوام کی زندگی میں وہ کام کیا کرے گا جو اتبک کرتا رہا ہے۔ جسطرح اسوقت قوی جماعتیں اور وہ جماعتیں جنہیں اُن کی قوت کا شکار ہونا پڑتا ہے موجود ہیں۔ اسی طرح قوی اقوام اور کمزور اقوام بھی موجود رہیں گی۔ ممکن ہے کہ ان کے سیاسی اور معاشی حالات میں تبدیلی ہو جائے مگر ان کی یہ خصوصیتیں ضرور موجود رہینگی۔ ہمیں جس چیز کو اپنا مطمح نظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جنگ کے ذریعوں میں فرق پڑجائے۔ مسلمہ حقوق تسلیم کر لئے جائیں۔ بین الاقوامی روابط اچھے ہوں اور بغیر جنگ کے تنازعوں کے فیصلوں کے امکانات زیادہ بڑھجائیں۔

ازمنۂ متوسطہ میں امرا، اپنے چھوٹے چھوٹے جتھوں کے ساتھ نیزوں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے تفوق کے لئے ایک دوسرے کے خاندان پر حملہ کیا کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو قلعوں کے خوفناک قید خانوں میں بند کر دیا کرتے تھے۔ آجکل امرأ کے باہم مقابلے دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں ہوتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں یہ امرا یعنی پارلیمنٹ کے لئے

مختلف حلقہائے انتخاب سے یہ امیدوار اپنی جنگیں تلواروں سے نہیں لڑتے ہیں بلکہ رائے کی برچھیوں کے ذریعہ نبرد آزمائی کرتے ہیں۔

یہ ایک اطمینان بخش بات ہے۔ ممکن ہے وہ وقت بھی آجائے جبکہ فرانس اور جرمنی سیڈان اور مارن میں صف آرا ہونے کی بجائے بین الاقوامی عدالت یا جمعیۃ الاقوام کی اسمبلی میں نظر آئیں۔

جنوا میں ایک حریف کامیاب ہوگا اور دوسرا ناکامیاب۔ لیکن جنگ میں بھی اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ ایک جیتتا ہے دوسرا ہارتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ جنگ میں ریاست اپنی مسلح قوت پر اعتماد کرتی ہے مگر یہاں اس کو دوسری ریاستوں کی رایوں پر انحصار کرنا پڑیگا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے اگر فرانس ۱۹۱۴ء میں جرمنی کا صرف اپنی قوت سے تنہا مقابلہ کرتا تو قیصر ولیم کب سے پیرس پر قابض ہوچکا ہوتا۔ جرمنی خود بھی بغیر اسٹریا اور دیگر ساتھیوں کے کبھی جنگ کرنیکی جرأت نہ کرسکتا۔

آج اور کل کے حالات میں صرف اس قدر فرق ہے کہ اسوقت ریاستوں کے درمیان گفتگو دو کروڑ انسانوں کا خون بہائے بغیر ہوگی۔

آج ہر زمانہ سے زیادہ بین الاقوامی اتحاد نے قانونی شکل اختیار کرلی ہے جو اقوام کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے۔ سیاست اور معیشت میں اپنی ضروریات خود پورا کرنے کا اصول اب بیکار ہوگیا ہے اسلئے اب یہ یقینی ہے کہ قومی ریاست اپنی ہستی کو ضائع کئے بغیر حقیقی اور زندہ بین الاقوامی نظام میں داخل ہوجائے گی۔

اب صرف ایک آخری مسئلہ رہگیا ہے۔ ان ریاستوں کا جو جمعیۃ کے اراکین ہیں ایسی ریاستوں کے ساتھ کیا تعلق ہوگا جیسی کہ چین یا روس یا نو آبادیات یا غیر متمدن کی اقوام ریاستیں ہیں۔ جہانتک انکا تعلق ہے جنگ کا خاتمہ نہ ہوگا۔

اس کا حل بہت آسان ہے۔ تمدن ہمیشہ زیادہ متمدن اقوام کی طرف سے کم متمدن

اقوام کی طرف گیا ہے۔ جو ریاستیں جمعیتہ کی ارکین ہیں انہیں جنگ کا خاتمہ کر دیجئے باقی دنیا میں خود بخود جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

لیکن نو آبادیات کے لوگوں اور رنگین نسلوں کے مسائل پر جسطرح ہم آجکل غور کرتے ہیں انہیں ضرور ترمیم کرنی پڑیگی۔ انسانیت کے سامنے جس کی ارتقائی قوت برابر بڑھ رہی ہے اور ترقی کے لئے اخلاقی کوشش ہمیشہ جاری ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہے۔

اجتماعی نظام کی ترقی کے متعلق ہم غلط امید نہیں باندہ رہے ہیں۔ موجودہ ضمیر انسانیت کا جنگ کے متعلق نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ اب یہ قسمت کا ایک تاریک باب نہیں سمجھا جاتا بلکہ انسانی اعمال کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے اس لئے قابلِ تغیر بھی ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ جسطرح تعدد ازدواج، خاندانی اختیارات۔ ڈوئل اور غلامی کو اب متمدن اقوام اپنا حق نہیں سمجھتی ہیں اسی طرح جنگ کو بھی ایک دن حق نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

نثر میں شاعری

بھیک

ایک بڑے شہر کے قریب شاہراہ پر ایک بیمار بوڑھا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ دُبلے پتلے پیر ٹھوکریں کھا کھا کر، لڑکھڑا لڑکھڑا کر بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے یہ اپنی خوشی سے نہ چل رہا ہو بلکہ کسی کے حکم کا بندہ ہو۔ لباس تار تار تھا، کچھ چیتھڑے بدن پر لٹک رہے تھے، سر کھلا ہوا اور سینہ پر جھکا ہوا۔ بدن کی طاقت جواب دے رہی تھی۔

راہ میں ایک پتھر تھا، اُس پر بیٹھ گیا۔ آگے کو جھکا، کہنی کا سہارا لیا، اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اُس کی سوکھی سوکھی ٹیڑھی ٹیڑھی انگلیوں کے بیچ میں سے آنسو بہنا شروع ہوئے اور خشک زمین پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ یہ اپنے گئے دن یاد کر رہا تھا۔

اِسے یاد آ رہا تھا کہ کبھی میں بھی تندرست تھا، مالدار تھا۔ پھر کیسے تندرستی ہاتھ سے گئی۔ دوسروں پر، اچھے بُرے دوستوں پر، کیسے اپنی دولت لٹائی! اور اب کھانے کو پاس روٹی کا ایک ٹکڑا نہیں۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا: دشمنوں سے پہلے دوستوں نے۔ کیا اب یہ نوبت بھی آئے گی، یہ ذلت بھی سہنی پڑے گی، کہ ہاتھ پھیلاؤں، بھیک مانگوں؟ یہ سوچتا تھا اور اُس کے دل میں کبھی تلخی پیدا ہوتی تھی کبھی شرم۔ لیکن آنسو تھے کہ بہہ بہہ کر زمین پر ٹپکے جا رہے تھے۔

یکایک ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نام لیکر اُسے پکارا۔ اُس نے اپنا ماندہ سر اُٹھایا اور سامنے دیکھا تو ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔

اجنبی کا چہرہ نہایت متین اور باوقار تھا لیکن اس میں سختی اور درشتی ذرا نہ تھی۔ آنکھیں بہت چمکتی تو نہ تھیں لیکن صاف تھیں، نظر کبھی جاتی تھی مگر اس میں عیاری نہ تھی۔

"تو نے اپنی دولت اَوروں کو دے ڈالی" اُس نے نہایت نرم آواز سے کہا "کیوں اب اپنی خیرات پر پچھتاتا ہے کہ نہیں؟" "نہیں میں نہیں پچھتاتا" بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "چاہے اسوقت بھوک سے میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔ میں نہیں پچھتاتا۔ بالکل نہیں پچھتاتا۔"

اجنبی بولا " اچھا اگر دنیا میں حاجتمند ہی نہوتے جو تیرے سامنے دست سوال دراز کرتے، کسی کو اگر تیری خیرات کی ضرورت ہی نہ ہوتی، تو پھر تو کیسے یہ خیرات کرتا اور نیکی کماتا؟"

بڈھے نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا۔

" تو پھر غریب بھکاری، تو بھی اس وقت اتنا غرور نہ کر۔ اُٹھ اور ہاتھ پھیلا۔ دوسرے نیک آدمیوں کو بھی موقع دے کہ وہ عمل سے اپنی نیکی کا ثبوت دیں۔"

بڈھا اُٹھا، اِدھر اُدھر دیکھا....... اجنبی غائب ہوچکا تھا لیکن دور فاصلہ پر ایک راہگیر دکھائی دیا۔

بڈھا اُس کی طرف بڑھا اور اپنا ہاتھ اُس کی طرف پھیلایا۔ راہگیر نے نہایت خشونت سے آنکھیں پھیر لیں اور اُسے کچھ نہ دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور راہگیر گذرا اور اُس نے غریب بڈھے کو کچھ بھیک دی۔

بھیک کے پیسہ سے بڈھے نے روٹی خریدی اور بھیک کا یہ ٹکڑا کیسا مزہ کا تھا! اُس کے دل پر شرم کی تکلیف بھی نہ تھی بلکہ اُس کے برعکس اُس پر ایک عجیب طرح کی خاموش اور پُرسکون مسرت طاری ہو چکی تھی۔

۲۔ دو دولتمند

میرے سامنے جب کوئی راس چائلڈ کی تعریف کرتا ہے کہ اپنی بے حساب آمدنی میں سے

یہ شخص ہزاروں لاکھوں روپیہ بچوں کی تعلیم پر، بیماروں کے علاج پر، اور بوڑھے اپاہجوں کے پیٹ پالنے پر صرف کر دیتا ہے تو گمبھیر بڑا اثر ہوتا ہے اور منہ سے بے ساختہ داد نکلتی ہے۔

لیکن باوجود اس تمام تحسین اور اس تمام اثر کے میرے ذہن سے ایک کسان خاندان کی یاد نہیں ٹلتی جس نے ایک یتیم بچی کو اپنے فلاکت زدہ گھر میں جگہ دی تھی۔

بڑھیا کا خیال تھا: "کاتیا کو گھر میں لینے کو تو لے لو۔ لیکن بس آخری دمڑی تک اس پر اُٹھ جائیگی۔ پھر دال میں نمک کا بھی اللہ مالک ہے۔"

"اچھا تو بے نمک کے ہی دال کھالیں گے" اُس کے شوہر نے جواب دیا۔

راس چائلڈ اور اُس کسان میں کتنا بعد ہے؟

مزدور

مزدور: کیوں، ہم میں کہاں گھسا آتا ہے؟ چاہتا کیا ہے؟ تو ہم میں سے نہیں ہے۔ چل چل لمبا ہو۔

لیڈر: بھائیو! میں تو تمہیں میں سے ہوں۔

مزدور: اچھی کہی۔ ہم میں سے! تجھے سوجھی کیا ہے؟ ذرا دیکھ میرے ہاتھ دیکھ۔ کچھ دکھتا ہے کیسے میلے ہیں؟ گوبر کی سی، تارکول کی سی بُو آتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ دیکھ۔ کیسے سفید ہیں۔ انہیں کا ہیکی بو ہے؟

لیڈر (ہاتھ بڑھاکر): لو، سونگھ لو۔

مزدور: یہ کیا۔ یہ تو لوہے کی سی بو ہے۔

لیڈر: ہاں، ہاں، لوہے کی سی۔ میرے یہ ہاتھ پورے چھ سال تک ہتکڑیوں میں رہے ہیں۔

مزدور: آخر کیوں؟

لیڈر: اس لئے کہ میں نے تمہاری بھلائی کے لئے کوشش کی تھی، اس لئے کہ میں تمہیں آزاد کرانا چاہتا تھا، تمہیں، مظلوم بے زبان انسانوں کو؛ اس لئے کہ میں تم پر ظلم کرنیوالوں

کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بغاوت کی تھی .... اس لئے انہوں نے مجھے قید میں ڈال دیا۔

مزدور: قید میں! اچھا تو تجھ سے کہا کس نے تھا کہ بغاوت کر؟

(دو سال بعد)

انہیں مزدوروں میں سے ایک مزدور (دوسرے سے): "پیٹر، سن تو۔ یاد ہے نہ کہ تیورس کی سال وہ ایک سفید ہاتھوں والا تجھ سے بکواس کر رہا تھا؟

دوسرا مزدور: ہاں، تو؟

پہلا مزدور: اُسے آج پھانسی پر لٹکائیں گے۔ ایسا حکم آیا ہے۔

دوسرا مزدور: کیوں، کیا پھر بغاوت کی تھی؟

پہلا مزدور: ہاں، پھر بغاوت کی تھی۔

دوسرا مزدور: بھائی دمتری، ایک بات کہوں، ذرا اس کی فکر رکھنا کہ جس رسی میں اُسے لٹکائیں وہ ہاتھ لگ جائے۔ ایسی چیزوں سے گھر میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

پہلا مزدور: بات ٹھیک ہے۔ ضرور اس کا انتظام کریں گے۔

(فاعتبروا یا اولی الابصار)

بڑھیا

مَیں ایک کھلے میدان میں اکیلا جا رہا تھا۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ احتیاط سے قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔

مَیں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی جھکی ہوئی بڑھیا دکھائی دی۔ میلے کچیلے چیتھڑوں میں بالکل لپٹی ہوئی تھی۔ انہیں سے بس بڑھیا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ زرد، جھریاں پڑی ہوئی، لمبی نوکیلی ناک، منہ میں ایک دانت نہیں۔ مَیں اُس کی طرف بڑھا، وہ ٹھہر گئی۔

"کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ بھکارن ہے؟ بھیک چاہتی ہے؟" بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں اُس کی طرف ذرا جھکا تو دیکھا کہ اُس کی دونوں آنکھوں پر ایک گدلا گدلا سفید سا استر یا جھِلا سا چڑھا تھا جیسے بعض چڑیوں کے ہوتا ہے تاکہ آنکھ کو تیز روشنی سے بچائے۔

لیکن بڑھیا کی آنکھوں کا یہ جھِلا بالکل غیر متحرک تھا اور اُس کی پتلیاں باہر نہ آسکتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اندھی ہے۔

میں نے پھر وہی سوال دہرایا: "بھیک چاہتی ہے؟ کیوں میرے پیچھے پیچھے کیوں آتی ہے؟" لیکن بڑھیا اب بھی چپ رہی اور ذرا جھکی۔ میں نے اُس کی طرف سے منہ موڑ لیا اور اپنی راہ لی۔

پیچھے پھر وہی آہستہ آہستہ، نپے ہوئے، ایک سے گھسٹ گھسٹ قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔

پھر وہی عورت، میں نے سوچا، یہ آخر میرے پیچھے کیوں پڑی ہے؟ لیکن پھر خیال آیا اندھی ہے، شاید راستہ بھول گئی ہو اور اب میرے قدموں کی آواز پر چل رہی ہے تاکہ میرے ساتھ ساتھ بستی میں پہونچ جائے۔ ہاں، ٹھیک ہے، بس یہی بات ہو گی۔

مگر رفتہ رفتہ میرے خیالات میں عجیب بھینی سی پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ بڑھیا میرے پیچھے پیچھے ہی نہیں آتی بلکہ مجھے راہ بھی بتلاتی ہے۔ کبھی ایک طرف ٹھیل دیتی ہے، کبھی دوسری طرف اور میں بلاارادہ مجبوراً اسی کی مانتا ہوں۔

پھر بھی میں آگے چلتا رہا ...... دفعتہً ٹھیک میرے راستہ پر ایک سیاہ سی چیز دکھائی دی، کچھ پھیلتی ہوئی ...... ایک خندق سی۔ میرے ذہن میں معاً آیا "قبر" بٹھیل بٹھیل کر یہ مجھے یہاں لائی ہے۔ میں جلدی سے مڑا۔ میرے سامنے پھر وہ بڑھیا آئی۔ لیکن اب تو یہ دیکھتی ہے بڑی بڑی، شریر، منحوس آنکھوں سے یہ مجھے دیکھتی ہے ...... جیسے کسی شکاری چڑیا کی آنکھیں ...... میں اُس کے چہرہ کو، اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا ہوں .....

پھر وہی گدلا استر، وہی بے روح خاموش چہرہ .... خیال آیا۔ افوہ، یہ بڑھیا میری قسمت ہے۔ وہ قسمت جس سے کوئی بھاگ کر نہیں جاسکتا، جس سے کوئی پناہ نہیں۔ کیا واقعی کوئی پناہ نہیں؟ یہ کیسی دیوانگی ہے؟ کیا اندھیر ہے؟ چلو کوشش تو کریں۔ اور میں نے ذرا مڑکر دوسری سمت میں چلنا چاہا۔

جلدی جلدی قدم بڑھائے۔ لیکن وہ قدم بھی جیسے جب ویسے اب میرے پیچھے بہت ہی قریب قریب آرہے تھے۔ اور میرے سامنے پھر وہی تاریک گڑھا تھا۔

پھر ایک مرتبہ میں نے دوسری جانب رُخ کیا۔ پھر میرے پیچھے وہی پیروں کی آہٹ اور سامنے وہی ڈرانی تاریکی۔ اُس خرگوش کی طرح جس کا پیچھا کتے کر رہے ہوں میں نے جدھر رُخ کیا ہر طرف یہی، ہر طرف یہی!

میں نے سوچا ٹھہر۔ اب اِسے دھوکہ دیتا ہوں۔ اس جگہ آپ ملو نگا ہی نہیں۔ اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

بڑھیا میرے پیچھے کھڑی ہے، صرف دو قدم ہٹ کر۔ مجھے سنائی تو نہیں دیتا مگر محسوس کرتا ہوں کہ وہ موجود ہے۔ دفعتہً کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تاریک زمین کا ٹکڑا جو دور تھا اب تیرنے سا لگا اور آہستہ آہستہ چلکر ٹھیک میری طرف آرہا ہے۔

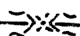
یا اللہ۔ پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو بڑھیا نے اپنی نظر مجھ پر جمالی ہے اور اُس کے پوپلے منہ پر شکنیں پڑی ہیں ——— لیس المفر!

بڈھا

مصیبت اور گرانی کے دن آن پہونچے .... خود اپنا دُکھ درد، اپنے دوستوں کی بیماریاں، بڑھاپے کی سردی اور تاریکی .... وہ سب کچھ جس سے تو محبت کرتا تھا، جس پر تو دل سے فریفتہ تھا، سب مرجھایا جاتا ہے، مٹا جاتا ہے۔ تیرا راستہ پہاڑ کا اُتار ہے۔

اب کیا کرتا؟ شکوہ و شکایت ؟ رنج و غم؟ نہیں اس سے نہ خود تیرا بھلا ہوگا نہ کسی اور کا...... سوکھتے ہوئے، مرجھاتے ہوئے پیڑ پر پتے کم تو ہوتے ہی جائیں گے لیکن پتے ہیں تو ابھی ہے۔ تو پھر کیا ہے۔ اپنے کو خود اپنے میں محصور کر لے۔ اپنی یاد کو اپنا ساتھی بنا' تیری روح کی گہرائیوں میں تیرا ماضی، تیری وہ زندگی جو بس تیری ہی ہے، اپنی تمام خوشبو اور تازگی کے ساتھ اور اس شان کو پہلو میں لئے ہوئے جس سے بہار ٹپکی پڑتی ہو تیرے سامنے جلوہ گر ہو جائے گی۔

لیکن، خبردار، غریب بوڑھے، خبردار، نظر اُٹھا کر آگے نہ دیکھنا۔



ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

عورت

قبل اس کے کہ میں جماعت سازی کی نئی شکل سے بحث کروں چاہتا ہوں کہ اس باب میں اس مسئلہ کا ذکر کروں جسے اور جس کے حل کو اس ارتقا سے بہت قریب کا تعلق ہے جسکا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے یعنی عورتوں کا مسئلہ۔ اس امر میں جدید تمدنی تحریک نے آراء و خیالات میں نہایت وسیع اور گہرا تغیر پیدا کر دیا ہے۔

نظری اعتبار سے اسلام میں عورت کی حیثیت اچھی خاصی ہے۔ بہت سے مسلمان اور بہت سے اہل مغرب یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلام ایشیائی عورت کی بند سے آزادی کا مرادف ہے۔ لیکن اسلامی اقوام میں واقعی جو عورت کی حیثیت تھی اُس پر صحیح اسلامی تعلیم کا اتنا اثر نہ تھا جتنا کہ خود اُن قوموں کے مختلف مدارج ترقی کا اور اُن جماعتی حالات وخیالات کا جو ان مدارج سے مطابقت رکھتے ہوں۔ خود آغاز اسلام میں عورت کے مسئلہ کا جو حل کیا گیا اُس پر بھی خالص جماعتی عناصر کا اثر تھا مثلاً تعدد ازدواج کی قرآنی اجازت اُس زمانہ کے عرب حالات کی خاطر ہی کی گئی تھی۔ لیکن جہاں یہ اجازت آئی ہے وہاں (عدل) پر اصرار ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اچھا راستہ کونسا ہے اور حقیقتاً اس راہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جس کی طرف آئندہ ترقی کا ہونا لازمی تھا۔ قرآنی تعلیم کی ساری روح اور پیغمبر اسلام کا عورتوں کے ساتھ سلوک اس تاریخی رویہ کے ساتھ مطابقت نہیں کھاتا جو اسلامی اقوام میں فی الواقع ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن

ہماری تاریخ میں اس صورت حال میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ یہ خدمت دور حاضر ہی کے سپرد تھی کہ وہ اصلی اسلامی تعلیم کو سمجھے یا اسے ایک نئے معنی دے۔

ترکی قوم کے احساس اخلاق نے نہ پہلے کبھی تعدد ازدواج کو پسند کیا اور نہ اب پسند کرتا ہے اور ترکی عورت نے ہمیشہ اس کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی صدیوں سے برابر تعدد ازدواج (جو عموماً دو بیویوں تک محدود ہوتا ہے) اگر ۔۔ کہیں ہے تو چھپے چھپائے۔ اس کے خلاف اگر کہیں کوئی صورت نظر آتی ہے اور یہ عموماً دیہاتوں میں ہوتا ہے تو اس کی وجوہ معاشی ہیں یعنی مزدوروں کی قلت اور افلاس۔

جدید تمدنی تحریک کے ابتدائی مراحل میں کوئی مسئلہ نسواں نہ تھا۔ خود کمال نے جس کا احساس اور تخیل قدیم اسلامی فضا میں کام کرتا تھا اس معاشرتی مسئلہ پر توجہ نہیں کی۔ اور جہانتک میں جانتا ہوں سب سے پہلا شخص رومانی مصنف حامد تھا جس نے اس بارہ میں پیشقدمی کی اور اپنی قوم کے احساس میں اس معاملہ پر جو چیزیں اپنا کام کرتی تھیں انہیں شاعرانہ انداز سے ظاہر کیا اور انہیں ایک اچھی شکل دیکر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس کا ڈراما "طارق" جس کا مواد عربوں کی فتح ہسپانیہ سے لیا گیا ہے اس اعتبار سے تاریخ تمدنی کی ایک نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی کس طرح شریک جہاد ہوتی اور زخم کھا کر "غازیہ" کا لقب پاتی ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ طارق کے لشکر میں ایک چوتھائی عورتیں ہیں۔ ایک غازیہ کہتی ہے "ہم حاکم بھی بن سکتی ہیں اور تابع بھی۔ ہسپانیہ کی دل لبھانے والی حسینوں کی طرح ہم ناچوں اور تفریح گاہوں میں نہیں نکلتیں، بلکہ ہم تعلیم گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں اپنے جوہر دکھلاتی ہیں۔" زہرا جو اس ڈراما کی خاص نسوانی شخصیت ہے اپنے باپ امیر موسیٰ کی طرف سے ایک سرکاری فرمان لکھتی ہے تو اُس کے بھائی عزیز اور مروان فخر سے کہتے ہیں کہ تم غازیہ بھی ہو اور شاعرہ بھی۔ وہ تعجب سے جواب دیتی ہے۔ میں امیر موسیٰ کی بیٹی ہوں اور عرب قوم سے ہوں۔ کیا یہ کوئی بڑی بات ہے کہ میں غازیہ بھی ہوں ادیبہ بھی؟

کیا عرب لڑکیوں میں تم ایک بھی ایسی نکال سکتے ہو جو لکھ پڑھ نہ سکے؟ جس سے ملو وہی باتوں کا ذکر ہوگا فنونِ لطیفہ کا یا جنگ کا۔" "کیا میں مسلم لڑکی نہیں؟ مسلم شہری نہیں؟ میں کیوں اوروں سے پیچھے رہوں؟ کیا یہ اسلام کا حکم نہیں کہ ہر ایک کو لکھنا پڑھنا جاننا چاہیئے۔ چاہے مرد ہو چاہے عورت؟" ایک اور جگہ حامد زہرا کی زبان سے کہلاتا ہے "تم عورت کو بیکار چیز سمجھتے ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ایک یتیم ہے جس کے حقوق چھین لئے گئے ہیں۔" طارق' جو اس ڈراما کا ہیرو ہے ان الفاظ میں مرد اور عورت کی مساوات کا اعلان کرتا ہے "میں تو اس رائے سے اتفاق نہیں کرسکتا کہ ان ذہنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے جو نوعِ انسانی کو ودیعت کیگئی ہیں عورت کو بھی اتنا ہی حصہ نہیں دیا گیا ہے جتنا مرد کو اور اس لئے میں اس خیال کو محض حماقت جانتا ہوں کہ ذہنی لحاظ سے عورت مرد سے پست ہے۔" ایک دوسری غازیہ عذرا ایک جگہ کہتی ہے کہ ریاستوں اور مذہبوں میں مردوں اور عورتوں میں مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اسی ڈراما میں حامد کا یہ قول آتا ہے کہ "قوم کی عورتیں اس کی ترقی کا معیار ہیں"۔ اور یہ قول آج ترکی میں سب سے مشہور ضرب المثل ہوگیا ہے۔ ڈراما کے آخر میں طارق اور زہرا کی شادی اس جدید تخیل کی مادی تصویر پیش کرتی ہے۔

حامد کو تتبع نہایت زوردار ملے۔ فکرت نے اپنی نظم "ہمشیرم اتشین" ("رباب شکستہ") میں ترکی عورت کے رنج و غم کی داستان سنائی اور ۔ ۔ ۔ برغم کتبی اتنیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں اُس نے تعلیم نسواں کی حمایت کی۔

امین نے بھی عورت کی مصیبت کو مختلف نظموں کا موضوع بنایا ہے خصوصاً اناطولی عورت کو جسے یہ پوری اناطولیہ کا مجسمہ جانتا ہے۔ اپنی نظم "اناطولیہ" میں اُس نے نہایت سخت لیکن سچے اور دل سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سلوک پر ملامت کی ہے جو عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "ہم نے اس کے سب حقوق بھلادئے۔ ہم نے عورت کو جانور کے برابر سمجھا۔ ہم نے تیری بھی ویسی ہی ذلت کی جیسی پہلے تیری ماؤں کی کرچکے تھے تجھے

ہم نے بیکس اور بے بس بنادیا ۔۔۔۔۔۔۔“

اپنی نظم ”کوسِ امام“ میں عاکف نے نہایت سختی سے اس خیال کی مخالفت کی ہو کہ شریعت
رت کے ساتھ تغافل اور بدسلوکی کی اجازت دیتی ہے اور اس خیال کو اسلام پر بہتان سے
ہر کیا ہے ۔ اُس نے مسئلہ نسواں پر مصری عالم فرید وجدی کی ایک تصنیف کا بھی عربی سے
ہ کیا جس میں اس مسئلہ کے متعلق مصری اور ترکی مصلحین کی آرار درج ہیں۔

خصوصاً عاکف کے طرز عمل سے اور نیز لوگوں کے خیالات کی وجہ سے موجودہ اسلامی عمل
مخالفت بڑھی اور اس نے مسئلہ کو مذہبی مسئلہ بنا دیا ۔ چنانچہ رسالہ ”اسلام مجموعہ سی“ میں محمد شمس الدین
، ایک سلسلۂ مضامین لکھا جس میں اسلام میں عورت کی حیثیت سے بحث کیگئی ہے اور موجودہ صورت
ں کو بالکل غیر اسلامی ثابت کیا گیا ہے ۔ افسوس کہ یہ سلسلۂ مضامین آخر تک نہ لکھا جا سکا ۔ اس
، بعد اور کئی شخصوں نے اسی موضوع پر مضامین لکھے ۔

لیکن اس سب بحث میں وہ اصلی سوال رہ گیا جو سب کے ذہن میں تھا یعنی تعدد ازدواج
ے متعلق کیا کیا جائے ۔ یہ تعدد ازدواج ہر چند کہ ترکوں میں مٹتا جاتا تھا تاہم موجود ضرور تھا اور
ربی خیالات اور تنقید کے اثر سے اسی کو تمام قومی عیوب کی جڑ سمجھا جاتا تھا ۔ اس سوال کو نہایت
ری کے ساتھ قوم پسند جماعت نے پیش کیا اور اس کا جواب بھی دیدیا جسکی سب کو توقع تھی ۔
ی اُس نے ”وحدت زوجہ“ کا فیصلہ کیا ۔ مذکورہ بالا رسالہ ”اسلام مجموعہ سی“ ہی میں سمرنا
کے سابق نمائندہ محمد سعید نے ایک مضمون اس عنوان سے لکھا کہ ”اسلام میں تعدد زوجات
نوع قرار دیا جا سکتا ہے“۔ اس پر بڑا شور غل ہوا اور قدامت پسندوں کی طرف سے اس کی
ت مخالفت ہوئی ۔ سعید نے اور مضامین میں اپنے نقطۂ خیال کی تائید کی ۔ اُس نے دلیل
ی بنیاد عدل پر نہیں رکھی اگرچہ یہ خود اس کا بھی قایل ہے بلکہ اس سے زیادہ اصولی بات پر ۔
س نے زور دیا ہے کہ قرآن کی متعلقہ آیت میں کوئی حکم نہیں ہے ۔ اس سے وجوب ثابت
یں ہوتا بلکہ صرف جواز ۔ اور حکومت کو اولوالامر کی حیثیت سے ”جائز“ کے منع کرنے کا

حق ہے۔ چنانچہ اُس نے ایک قانون کا مطالبہ کیا جسکی رو سے تعددِ ازدواج ممنوع قرار پائے۔ اور "وحدتِ زوجہ" کا حکم نافذ ہو۔ قانون منظور بھی ہوا لیکن یہ اتنا دوررس نہ تھا جتنا کہ سعید کا مطالبہ چاہتا تھا۔ بلکہ اس عارضی قانون کی دفعہ ۳۸ کی رو سے یہ ٹھیک ہے کہ آدمی اس شرط سے شادی کرے کہ پہلی بیوی پر دوسری کا اضافہ نہ کریگا لیکن اگر وہ ایسا کرے تو پہلی یا دوسری ایک بیوی عقد سے باہر ہو جائے اور اس طرح اصلی شرط قائم رہے۔ قوم پسندوں کی حکومت نے جنگ عظیم کے دوران میں اس قانون کو عارضی طور پر نافذ کر دیا تھا لیکن جب یہ حکومت ختم ہوئی تو قدامت پسندوں کے اصرار پر نئی حکومت نے اسے منسوخ کر دیا۔ اس سے ترقی کی راہ میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹ پیدا ہو گی لیکن اصل معاملہ کی صورت پر بہت کم اثر پڑے گا۔ ۲ر جنوری ۱۹۲۱ء ہی کے اقدام میں فواد شکری نے اس تنسیخ کو ایک مجرمانہ ردعمل سے تعبیر کیا تھا۔

اس کے علاوہ مغرب پرستوں کی ایک جماعت ہے جو ترکی عورت کو سرے سے یورپی عورت بنا دینے کے درپے ہے۔ اس سلسلہ میں جلال نوری کی کتاب (قدنلری مز) یعنی ہماری عورتیں) قابل ذکر ہے۔ جو اگرچہ اس انتہا پسند رجحان کی حامل ہے تاہم نہایت احتیاط سے لکھی گئی ہے۔ اس تحریک کے لئے انگریزی حقوق طلب عورتوں کی جماعت نمونہ ہے۔ ہم بعد میں اس کا اور ذکر کرینگے۔

اقتباسات

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قائم رہنے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ یہاں مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں اور بالخصوص یہ کہ یہاں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں جس سے آپس میں اتحاد و یگانگت ہونا ناممکن ہے۔ اسی دعوے کی تردید کرتے ہوئے مسٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ "ماڈرن ریویو" کے ایک تازہ نمبر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں مختلف زبانوں کا وجود ہندوستان کی آزادی کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا اور نہ اس بنا پر یہاں ایک غیر ملکی حکومت کا ہونا حق بجانب ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر روس کو لیجئے، روس کے آخری دور میں اس سے کہیں زیادہ زبانیں، قومیں اور نسلیں تھیں جتنی آج ہندوستان میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کے لئے کوئی نہیں کہتا کہ روس حکومت خود اختیاری کے نااہل ہے اور اس پر ایک غیر ملکی حکومت کا قبضہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ صرف روس بلکہ آج ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اندر ہندوستان سے کہیں زیادہ قومیں اور زبانیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں جنوبی اور وسطی امریکہ کی قومیں رہتی ہیں، یورپ کی قومیں جاکر آباد ہوئی ہیں ان کے علاوہ ایشیا، افریقہ اور تمام بڑے بڑے جزیروں کے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ ان تمام قوموں کی زبانوں کا شمار کیجئے اور پھر انہیں ریڈ انڈین قبائل کی زبانوں کو شامل کر دیجئے پھر فیصلہ کیجئے کہ ہندوستان میں زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں یا ریاستہائے متحدہ امریکہ میں۔ اس بنا پر کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جاپان، روس، فرانس یا انگلستان میں سے کسی کو اس پر حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے؟

تازہ اعداد و شمار کے مطابق کنیڈا میں ۱۷۰ زبانیں بولی جاتی ہیں، ۷۰ قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں اور ۹۷ مذاہب پائے جاتے ہیں اور یہ اعداد اس کی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف اقوام و مذاہب اور زبانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، باوجود اس

کے کنیڈا آپ اپنے اوپر حکومت کر رہا ہے اور تقریباً نصف صدی سے یہ حکومت کر رہا ہے۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ دعویٰ ہے اور اس کے دلائل کس درجہ کمزور اور لغو ہیں۔

عربی علوم و ادب کے بعض علما کا خیال ہے کہ ایران کا تمام علم و ادب عربی زبان سے ماخوذ ہے اور ایران کے پاس اپنا مستقل سرمایہ کچھ نہیں ہے لیکن آر۔ اے نکلسن صاحب نے جنہیں عربی زبان اور ایرانی ادبیات دونوں سے بیک وقت تعلق ہے اسکے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور جنوری ۱۹۲۷ء کے "اسلامک کلچر" میں وہ لکھتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی کے آخر تک ایران اگرچہ برائے نام عباسی خلافت کی اطاعت کا دم بھرتا تھا لیکن اس کے بعد سے وہ نہ صرف مذہبی اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہو گیا بلکہ اس زمانہ میں ایک ایسے وسیع اور مستقل لٹریچر کی تخلیق ہوئی جس میں ایرانی قوم کو اپنی ذہانت و ذکاوت کے ظاہر کرنے کا پورا موقع ملا۔ اس لٹریچر کا سب سے بڑا حصہ شعرا کی ذات سے وجود میں آیا گو یہ صحیح ہے کہ ظاہری اور معنوی دونو حیثیتوں سے ایران کی ابتدائی شاعری کی بنیاد بالکل عربی شاعری کے انداز پر ہے پھر بھی اس میں جدت اور مزید اضافہ کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ عربی علم عروض میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ ہوئی، نئی نئی بحریں ایجاد ہوئیں، قصیدہ کیساتھ رباعی، غزل اور مثنوی کی طرز ایجاد ہوئی۔ قصیدہ اور غزل میں اشعار کی تعداد محدود ہوتی ہے اور انمیں قافیہ اور مضمون کی بھی قید ہوتی ہے لیکن مثنوی ان تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ فردوسی، نظامی اور جامی اپنی اپنی جگہ پر اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ مدح گوئی میں انوری اپنا ثانی نہیں رکھتا۔" نظامی کی وفات سے قبل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ فارسی شاعری تاریخی اور مدحیانہ انداز چھوڑ کر انسانی جذبات و خیالات کے وسیع میدان میں قدم رکھیگی چنانچہ اس کے بعد خسرو، جامی، فریدالدین عطار جیسے بڑے بڑے شعرا گزرے جنہوں نے مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو شاعری میں داخل کیا اور یہ واقعہ ہے کہ فارسی زبان کا ہر بڑا شاعر ایک حد تک معلم اخلاق ہوتا ہے۔ بارہویں صدی کے آخر میں شاعری میں تصوف کا رنگ پیدا ہونا شروع ہوا جسکا سب سے بڑا مظہر فریدالدین عطار ہیں۔

"برفاب پری"

از جناب محمد اکبر صاحب منیر

(برفهای "کهلن مرگ" آب شده از کوه سرازیر و جوی کوچکی را تشکیل میدهد که از سبزه زار گلمرگ میگذرد، این جوی قشنگی را "برفاب پری" اسم گزاشته اشعار ذیل در گلمرگ کشمیر گفته شد)

مهر چو شمشیر خود بر سر کهسار زد — از شکم برفها سر زده چون تو پری
زادهٔ کوهی ولے نیک شناسم که تو — آمدهٔ از فلک پاک ترک گوهری
جلوهٔ تو دلربا نغمهٔ تو دلکشا — می بخرامی بناز جان ز کف ما بری
پاک بود گوهرت صاف بود پیکرت — آئنه خواند ترا گنبد نیلوفری
لغزش مستانهٔ مار صفت می خزی — جنبش دیوانهٔ تیغ صفت می بُری
طرفه سرودے زنی طرفه خرامے کنی — من بشگفت آمدم این چه بود ساحری
سحر برفتار تو سحر بگفتار تو — از که بیاموختی صنعت جادوگری
غرش تو رعد سا تابش تو برق وار — بارگیٔ رستمی خنجرک حیدری
گرچه شوی ریز ریز باز زنی تیغ تیز — نیک بدانی که چیست کشمکش داوری
گاه مسلمان شوی سجده کنی از نیاز — گاه تراشی بتے ساز دہی کافری
گه صفت آبشار می جهی دیوانه وار — گاه چو جوئے چمن ساز کنی دلبری
شعله فروزی بآب نقش بریزی بسنگ — گاه گلِ آتشی گاه بتِ آذری
چون ز محبت بشب ماچ کند پیکرت — همچو گمان می برم وخت مه انوری
موج تو دارد بروز نور سرود حیات — لیک بهنگام شب نغمهٔ خواب آوری
تند برانی ہمی شوق وصال کسے — در ره هر منزلے میکندت رهبری
شعلهٔ اندر نوا شعلهٔ در زیر پا — برق صفت اے پری از بر ما بگذری

جلوهٔ تو دیده ام شعلهٔ گل چیده ام
بهر تو افشانده ام گوهر نظم دری

تنقید و تبصرہ

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن) کی مرسلہ کتابیں

۱۔ خیابانِ اُردو | نظم و نثر کا انتخاب مرتبہ احمد عارف صاحب (حیدرآبادی)۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶
حجم نثر ۲۰۴ صفحہ۔ نظم ۱۰۷ صفحہ قیمت عا۔

حلقۂ انتخاب بہت وسیع ہے۔ پرانے اور نئے نثاروں اور شاعروں میں سے غالباً کوئی مشہور شخص نہیں چھوٹا۔ مضامین کی ترتیب نہایت خوش سلیقگی سے کیگئی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ قابل اطمینان ہے۔ مضامین اور ظاہری حیثیت دونوں کے اعتبار سے یہ کتاب اردو کی درسی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

۲۔ اسوۂ حسنہ | جامعہ عثمانیہ کی مجلس میلاد النبی کا انعامی مضمون از احمد عبداللہ المسدوسی صاحب
تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ حجم ۷۲ صفحہ قیمت ۸؍۔

احمد عبداللہ صاحب کا یہ مضمون واقعی انعام کا مستحق ہے۔ چند صفحوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حالات اسقدر جامعیت کے ساتھ محققانہ انداز میں لکھنا سہل بات نہیں۔ بچوں بلکہ بہت سے بوڑھوں کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔

۳۔ اردو کے اسالیب بیان | مصنفہ غلام محی الدین صاحب قادری۔ ایم۔ اے۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۲۰۴ صفحہ قیمت عہ۔

اس کتاب میں نثر اردو کی نشو و نما دکھائی گئی ہے اور اردو کے پُرانے اور نئے انشاپردازوں کے اسلوب بیان کی خصوصیات بیان کیگئی ہیں۔

کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے اور اس کے مطالعہ سے اوسط درجہ کے تعلیمیافتہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ خواہ اُس کے مذاق کی تربیت میں کوئی خاص مدد نہ ملے۔

شذرات

پچھلے پچاس برس سے اسلامی ہند کی تعلیمی کوششوں کا مرکز علیگڈھ رہا ہے۔ سید احمد خاں کی زبردست شخصیت اور اُن کے ساتھیوں کی کوششوں نے اسے عرصہ تک ہندی مسلمانوں کی تمام نئی تحریکوں کا گہوارہ بنائے رکھا۔ اور یہ بات ابھی چند سال سے پیدا ہوئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں میں ایسی تحریکیں رونما ہوسکیں۔ اور خود ان تحریکوں پر کچھ براہ راست اور بہت کچھ بالواسطہ علیگڈھ کی تحریک کا اثر رہا۔

... ...

اس مرکزی حیثیت کی وجہ سے جب کبھی علیگڈھ کے اندرونی معاملات میں کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے تو ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان بے چین ہوجاتے ہیں۔ تقریباً دس سال ہوئے جب انگریز اساتذہ نے علیگڈھ سے علیحدگی اختیار کی تو تمام ملک میں مسلمانوں نے کارکنان علی گڈھ کالج سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اُن کے فیصلہ کا دل سے ساتھ دیا لیکن مسلمانوں کی عام سیاست اور علی گڈھ میں بُعد رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا جس نے ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں نہایت تکلیف دہ شکل اختیار کرلی۔ ہم اس جگہ اس افسوسناک اختلاف کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتے اور نہ اس غلط بیانی کی تردید پر وقت صرف کرنا چاہتے ہیں کہ تارکین موالات نے علیگڈھ کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ علیگڈھ کو اگر تارکین موالات نے نقصان پہنچایا تو خود وہ لوگ جو اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے علیگڈھ کو اس "حملہ" سے بچایا اپنی ناقابل فہم ملت دشمنی اور فرنگی دوستی کے سبب سے کہیں زیادہ نقصان کا باعث ہوئے۔ "حملہ" کی شدت کو اور شدید کرکے انہیں محافظین نے بتلایا تاکہ اس خدمت تحفظ کی قیمت سرکار سے

اچھی وصول کر سکیں۔ علی گڑھ یوں تو شروع ہی سے بوجوہ حکومت وقت کا حلیف تھا لیکن اس آخری دور میں یہ تعلق نہایت ناگوار اس وجہ سے ہوگیا کہ نفس تعلق اور مجرد تقرب مقصود قرار دیدیئے گئے اور حکومت سے دوستی اسلامی ہندی سیاست میں محض ایک عارضی ذریعہ سمجھی جانے کے بجائے ایک قدر مطلق تسلیم کر لیگئی۔ اس تقرب نے قوم سے بُعد بڑھایا اور اس بُعد نے قوم کی طرف سے بے اعتنائی پیدا کی۔ انتظامی جماعتوں کے وہ عناصر جو صحیح نکتہ چینی کر کے ارباب حل وعقد کی میانہ روی کے ضامن تھے، بالکل کنارہ کش ہوگئے۔ اب نہ قوم کی طرف سے علی گڑھ میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا نہ ان کی غلطیوں پر نکتہ چینی۔ کارکنانِ علیگڈھ اطمینان سے حکومت کی دوستی اور سرپرستی کے نشہ میں سرشار جو چاہتے کرتے تھے۔

... ...

یکایک اس پرامن خاندانی زندگی میں منافشات کی صورت پیدا ہوئی۔ اب مخالفت یونیورسٹی کے تباہ کرنے والوں سے نہ تھی، نہ تارکین موالات کا حملہ تھا بلکہ عشاق کی باہمی رقابتیں تھیں اور مخالف فریقوں میں فیصلہ کے لئے دونوں کی نظر قوم کی طرف نہیں، بلکہ "سرکار" کی طرف تھی۔

یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے یونیورسٹی کورٹ کو آگاہ کئے بغیر، خود چانسلر سے استصواب کرنے سے پہلے سرکار دولت مدار کی توجہ یونیورسٹی کی بے ضابطگیوں اور بےقاعدگیوں کی طرف منعطف کرائی اور مداخلت کی درخواست کی۔ خدا بھلا کرے یونیورسٹی کی چانسلر بیگم صاحبہ بھوپال کا کہ انہوں نے قوم کو اس بے غیرتی سے محفوظ رکھا کہ لارڈ ریڈنگ (وائسرائے) کوئی تحقیقاتی کمیشن مقرر کر کے دونوں سرکار دوست فریقوں کا جھگڑا چکائے اور مسلم قوم کو ہمیشہ کے لئے محجوب کر دے۔

بیگم صاحبہ نے خود ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمایا۔ کمیشن نے تحقیقات کی اور اپنی رپورٹ پیش کی جو عرصہ تک صیغۂ راز میں رہنے کے بعد چند ہفتے ہوئے ممبران کورٹ کو بھیجی گئی اور

۱۵ اپریل کو اس پر غور کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ منعقد ہوا۔

... ...

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں جس صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے وہ مسلمانوں کے لئے جس قدر خطرناک ہے اُسی قدر افسوسناک بھی ہے۔ مسلمانوں کی اس قومی امانت کے ساتھ کارکنوں نے جو کچھ کیا اور باغی' مخالفوں' سے پاک کرکے یہ 'وفادار' ساتھی' جو کھیل کھیلے اُس کا مختصر سا تذکرہ لوگ کمیشن کی رپورٹ میں پڑھ سکتے ہیں۔

کورٹ کے گزشتہ اجلاس میں اس صورت حال کو بدلنے کی تدابیر پر غور کیا گیا۔ کمیشن کی سفارشات کو تقریباً حرف بحرف مان لیا گیا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین ایک ربع صدی سے زیادہ تعلق کے ساتھ اپنی خدمات سے دستکش ہو گئے۔ اور اگرچہ کمیشن کی رپورٹ اور اندرونی حالات کے علم کے بعد ہمارے نزدیک اُنکی علیحدگی یقیناً ضروری تھی لیکن وہ بلا لڑے جھگڑے اور اپنی مضبوط پارٹی کی قوت کو کام میں لائے بغیر جس طرح خاموشی سے الگ ہو گئے وہ بہت قابل تعریف ہے اور انہوں نے اس طرز عمل سے اپنے اثر میں اضافہ کیا ہے۔

کمیشن نے اصلاح کی جو اور سفارشیں کی ہیں انہیں کورٹ نے تقریباً حرف بحرف تسلیم کر لیا۔ البتہ ترمیم کی کوشش جہاں اور جس طرح کی وہ بہت سبق آموز ہے۔ کمیشن کی سفارش ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کی علیحدگی کے بعد صرف تین سال کے لئے ایک ایسا شخص بطور مخصوص افسر کے مقرر کیا جائے جو مقامی سازشوں اور جماعت بندیوں سے علیحدہ ہو، جسے تین سال بعد خود یونیورسٹی میں رہنے کی توقع نہ ہو تاکہ وہ خود کہیں اپنی جماعت نہ بنائے، اور جو ایسی حیثیت کا آدمی ہو کہ سب اُس پر اعتماد کر سکیں۔ کمیشن نے عمداً یہ سفارش نہیں کی کہ یہ افسر یورپین یا انگریز ہو۔ لیکن کورٹ کے ایک نہایت با اثر گروہ نے یورپین اور انگریز افسر کے بلانے پر اصرار کیا اور صاف صاف تسلیم کیا کہ مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس بار عظیم کو اپنے سر لے سکے۔ ان ہمدردوں نے یہ نہ سوچا کہ کسی تعلیمی تحریک کی ناکامی کا اس سے زیادہ اور کیا

ثبوت ہوسکتا ہے کہ پچاس سال کی پیہم کوشش کے بعد وہ خود اپنے قیام وبقا کے لئے کافی افراد نہ پیدا کرسکی ہو۔ بہرحال ان حضرات کا یہی عقیدہ تھا۔ خوش قسمتی سے ایک دوسرا گروہ بھی موجود تھا جس نے اس کی مخالفت کی اور بتلایا کہ انگریز یا یوروپین کا بلانا اور اس لئے بلانا کہ وہ اس تعلیمگاہ میں نئی روح پھونکے تا کہ اُس راہ پر چلائے جو بانی کے پیش نظر تھی، یہی نہیں کہ قومی بے غیرتی و بے شرمی کی نشانی ہے بلکہ بے معنی بھی ہے۔ علی گڈھ یونیورسٹی اگر خاص مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے، اور تمدنِ اسلامی کا قیام اور اس کی تجدید اس کا مقصد ہے، تو اسکی اصلاح اسطرح نہیں ہوسکتی جیسے کسی بیٹھتے ہوئے کارخانہ میں کوئی سخت مزاج اور دیانتدار انگریز مہتمم رکھ دینے سے ہوجاتی ہے لیکن اگر علیگڈھ کسی ایسی کوشش سے = ہے جسکو مسلمانوں کی حیاتِ قومی سے تعلق ہونا چاہئے، جو مخصوص اسلامی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہی اگر جاری رکھی جائے تو اسکا جاری رکھنا جائز ہے ؛ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی مخصوص معاشرتی معاشی اور سیاسی ضروریات اور مشکلات کا پرتو اس کوشش میں نظر آنا ضروری ہے، مختصر یہ کہ اگر علی گڈھ مسلمانوں کی قومی درسگاہ ہے تو اس کے اہم مقاصد کے حصول کے لئے کسی غیر مسلم پر بھروسا کرنا جو یوکرآم کے درخت پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

... ...

خدا کا شکر ہے کہ کورٹ کے ممبروں کی ایک کافی تعداد نے مغرب پرستی کے اس مظہر کی مخالفت کی اور بالآخر یوروپین یا انگریز کی شرط ہٹا دی گئی۔ لیکن پھر بھی جس ترمیم میں مسلمان کو ترجیح دینے کا ذکر تھا وہ دورایوں سے مسترد ہوگئی۔

رپورٹ کی جملہ سفارشات پر عمل کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا انتخاب بھی ہوا ہے۔ جس میں ۱۱ ممبر ہیں، ان میں ایک لارڈ رکٹر کا نمائندہ ہوگا اور ایک وزٹنگ بورڈ کا۔ اور ایک یہ مجوزہ افسر خاص۔ احتمال کیا تقریباً یقین ہے کہ یہ تینوں انگریز ہوں گے۔

کاش اس قومی امانت کے امین سمجھتے کہ اصلاح و تجدید کے اس کام میں اس قدر

تو ہی عنصہ دوسری قوم کا رکھنا کیا معنی رکھتا ہے

دلا نارائی پروانہ تا کے ــــــ نگیری شیوۂ مردانہ تا کے

یکی خود را بسوز خویشتن سوز ــــــ طواف آتش بیگانہ تا کے

ــــــ

اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں گروکل کانگڑی کا سالانہ جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کے سلسلہ میں پچھلے سال سے قومی تعلیمگاہوں کے طلبہ کا ایک مشترک مباحثہ بھی ہوا کرتا ہے۔ امسال مباحثہ کا مضمون یہ تھا کہ "شہنشاہیت تہذیب انسانی کے لیے فی الجملہ ممد و معاون ثابت ہوئی ہے"۔

جامعہ ملیہ کے طلبہ کو بھی دعوت آئی تھی اور جامعہ کی انجمن اتحاد نے مقابلہ میں شرکت کے لیے اپنے دو اراکین کو بھیجا تھا۔ ہمیں بہت خوشی ہے کہ جامعہ ہی کے ایک طالب علم کو بہترین تقریر کرنے پر اول انعامی تمغہ ملا اور دونوں مقرروں کے مشترکہ نمبر دوسرے کالجوں کے شرکا کے نمبروں سے زائد رہے اور جامعہ کو اس وجہ سے وہ ٹرافی ملی جو سوامی شردھانند کے نام سے موسوم ہے۔

اس سالانہ جلسہ کے سلسلہ میں ایک ادبی کانفرنس ("سرسوتی سمیلن") بھی منعقد ہوئی ہے جس کے صدر اس سال ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ منتخب کئے گئے تھے۔

جلسہ میں آریہ سماج کے ممتاز اراکین کے علاوہ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو اور پرنسپل کرپلانی بھی شریک تھے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان تینوں حضرات کی شرکت نے جلسہ میں رواداری اور وسعت قلب و نظر کی نہایت خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی۔

جلسہ میں قدرت کی طرف سے بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ جلسہ کے دوسرے ہی روز نہایت شدید آگ لگ گئی جس سے مہمانوں کے عارضی مکانات کا بہت بڑا حصہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ تیسرے روز سخت آندھی چلتی رہی لیکن باوجود ان نامساعد حالات کے حاضرین کی تعدا

میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور چندہ کے وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ چندہ بھی گروکل کی نئی عمارت کے لئے ہو گیا۔

مختلف کانفرنسوں اور مباحثوں میں گروکل کے فارغ التحصیل طلبہ نے حصہ لیکر اپنے مادر علمی کے نام کو روشن کیا۔ اور جلسہ میں جامعہ کے جو حضرات شامل تھے انکا خیال ہے کہ گروکل کی تحریک آریہ سماج کا سب سے بہتر اور مستحکم جزو ہے جس کی تفصیلات سے واقفیت ہر ہندوستانی کے لئے ضروری ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ کسی آئندہ اشاعت میں گروکل کے متعلق مزید تفصیلات ہدیۂ ناظرین کر سکیں۔

روسی انقلاب غالباً دور حاضر کے تاریخی واقعات میں سب سے اہم واقعہ ہے۔ دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح اس عظیم الشان انقلاب میں بھی تخیل کی بلند پروازی اور حقیقت کی اٹل دشواریاں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئیں اور نتیجہ اگرچہ شروع کے انقلابی اعلانات سے مختلف نکلا لیکن ایک توازن رفتہ رفتہ قائم ہو گیا اور ترقی انسانی کے لئے اور یہی ہر انقلابی تحریک کا قیمتی فائدہ ہوتا ہے۔

روسی انقلاب دنیا سے شخصی ملکیت کو مٹانے کے لئے کیا گیا اور اس نے دنیا کی سب سے بڑی کسان آبادی کے لئے زمین کو کسان کی شخصی ملک بنا دیا۔ وہ صنعتی مزدور کی حکومت قائم کرنے کے لئے اٹھا اور کسان کا اقتدار بڑھا گیا۔ انقلاب پسندی کی روح پھونکنے نکلا اور قدامت پسندی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور رہا۔ ٹراٹسکی نے اسے ظفر یاب بنایا اور خود اسٹالین کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔

اس انقلاب کی ابتدائی بے عنوانیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ یہ محض جسمانی کام کرنے والوں کو دولت آفریں طبقہ مانتا تھا اور ذہنی کام کرنے والوں کے حقوق کو کسی طرح تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کچھ تو غلط معاشی نظریوں کی وجہ سے دولت آفرینی محض مادی اقتدار کے پیدا کرنے

تک محدود کردی گئی تھی۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ شروع انقلابی زمانہ میں ذہنی کام کرنے والوں نے برابر انقلابی تحریک کو نقصان پہونچایا۔ پہلے تو کھلی مخالفت کی اور جب یہ بروے کار نہ آئی تو خفیہ دغا بازی سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسمانی کام کرنے والوں نے جی کھول کر بدلا لیا۔ اور ہزاروں ذہنی کام کرنے والے اس بدنصیب ملک میں بھوکوں مرگئے۔ اور لاکھوں اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر پردیس میں جا بسے۔

اب یکہ صورت حالات میں تبدیلی شروع ہوگئی ہے اور روسی حکومت نے کئی قوانین نافذ کئے ہیں جنسے ذہنی کام کرنے والوں کو کم سے کم وہ درجہ تو حاصل ہوجائے گا جو جسمانی کام کرنیوالوں کو حاصل ہے۔

مصوروں اور سنگ تراشوں کو اپنے کام کے لئے خاص قسم کے مکانات کی ضرورت پڑتی ہے۔ انکے کرایہ میں رعایتیں کیجائینگی۔

ذہنی کام کرنے والوں کے بچوں کو دوسرے مزدوروں کے بچوں کیطرح سرکاری مدارس میں فیس وغیرہ میں جملہ مراعات حاصل ہوں گی۔

مکان کے کرایہ کے بارہ میں بھی ذہنی کام کرنیوالوں کے ساتھہ وہی رعایتیں کیجائینگی جو مزدوروں کے ساتھہ کیجاتی ہیں۔

اس درجہ سے شاید ہمارے اہل علم مطمئن نہ ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ روس میں مزدوروں کی حکومت ہے۔ اہل علم کو وہی مراعات حاصل ہوجانا جو مزدوروں کو ہیں ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان میں ہر شخص کو وہ حقوق ملجائیں جو ہر انگریز رکھتا ہے! اور یہ بہت ہیں!!


سائبیریا
منگولیا
جاپان
چین
جزائر
فلپائن
جزائر شرق الہند
بورنیو
نیوگنی
جاوا
آسٹریلیا
تسمانیا
نیوزیلینڈ
نقشہ متعلقہ مضمون
"امریکہ کی سیاست خارجہ"
جامعہ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

یک محدود کردی گئی تھی۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ شروع انقلابی زمانہ میں ذہنی کام کرنے والوں نے برابر انقلابی تحریک کو نقصان پہونچایا۔ پہلے تو کھلی مخالفت کی اور جب یہ بروے کار نہ آئی تو خفیہ دغا بازی سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسمانی کام کرنے والوں نے جی کھول کر بدلا لیا۔ اور ہزاروں ذہنی کام کرنے والے اس بدنصیب ملک میں بھوکوں مرگئے۔ اور لاکھوں اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر پردیس میں جا بسے۔

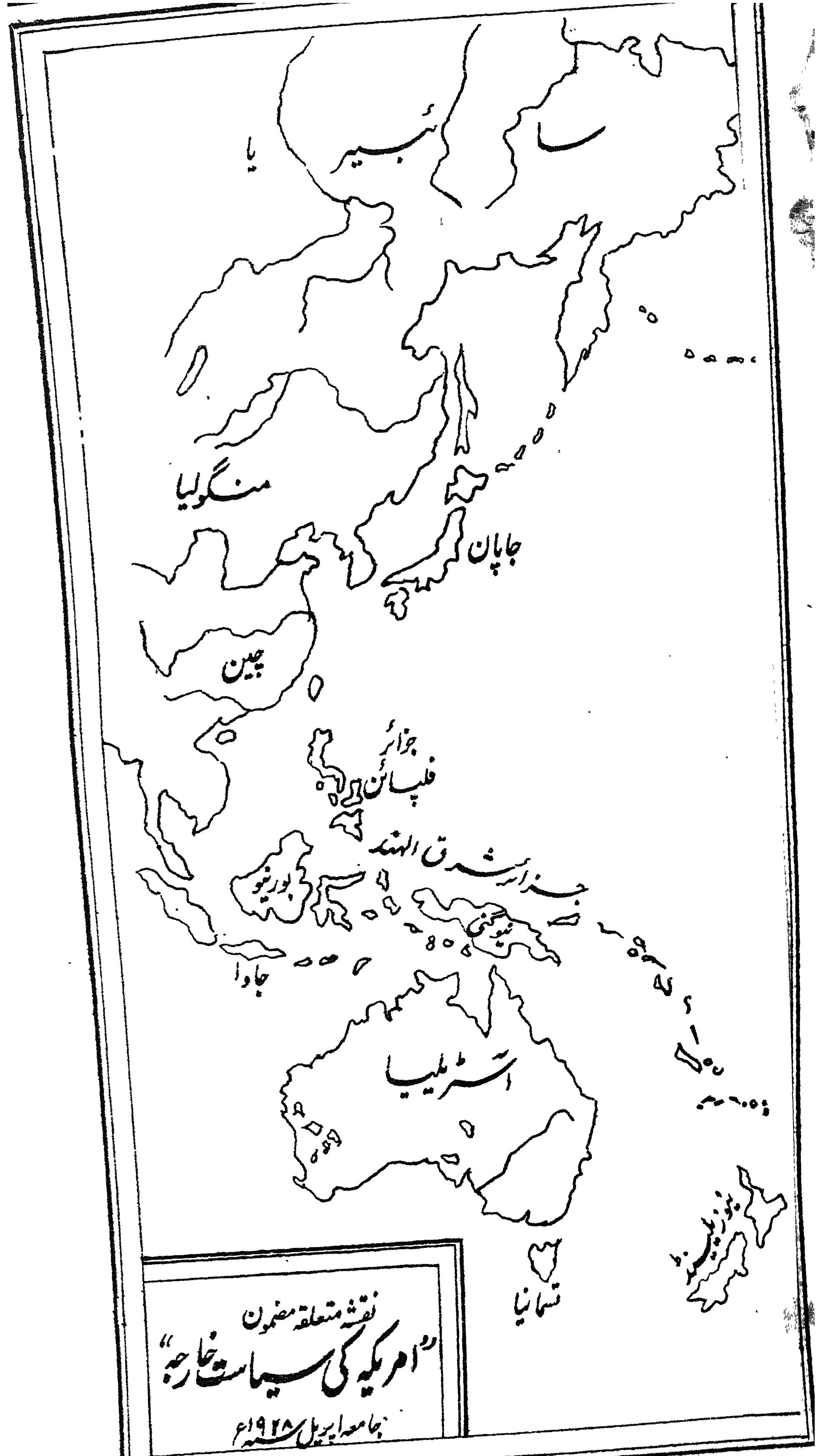
اب کچھ صورت حالات میں تبدیلی شروع ہوگئی ہے اور روسی حکومت نے کئی قوانین نافذ کئے ہیں جینسے ذہنی کام کرنے والوں کو کم سے کم وہ درجہ تو حاصل ہو جائے گا جو جسمانی کام کرنیوالوں کو حاصل ہے۔

مصوروں اور سنگ تراشوں کو اپنے کام کے لئے خاص قسم کے مکانات کی ضرورت پڑتی ہے۔ انکے کرایہ میں رعایتیں کیجائینگی۔

ذہنی کام کرنے والوں کے بچوں کو دوسرے مزدوروں کے بچوں کیطرح سرکاری مدارس میں فیس وغیرہ میں جملہ مراعات حاصل ہوں گی۔

مکان کے کرایہ کے بارہ میں بھی ذہنی کام کرنیوالوں کے ساتھ وہی رعایتیں کیجائینگی جو مزدوروں کے ساتھ کیجاتی ہیں۔

اس درجہ سے شاید ہمارے اہل علم مطمئن نہ ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ روس میں مزدوروں کی حکومت ہے۔ اہل علم کو وہی مراعات حاصل ہو جانا جو مزدوروں کو ہیں ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان میں ہر شخص کو وہ حقوق ملجائیں جو ہر انگریز رکھتا ہے! اور یہ بہت ہیں!!


سائبیریا
منگولیا
جاپان
چین
جزائر فلپائن
جزائر شرق الہند
بورنیو
نیو گنی
جاوا
آسٹریلیا
تسمانیا
نیوزیلینڈ
نقشہ متعلقہ مضمون
"امریکہ کی سیاست خارجہ"
جامعہ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

تک محدود کردی گئی تھی۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ شروع انقلابی زمانہ میں ذہنی کام کرنے والوں نے برابر انقلابی تحریک کو نقصان پہونچایا۔ پہلے تو کھلی مخالفت کی اور جب یہ بروئے کار نہ آئی تو خفیہ دغابازی سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسمانی کام کرنے والوں نے جی کھول کر بدلا لیا۔ اور ہزاروں ذہنی کام کرنے والے اس بدنصیب ملک میں بھوکوں مر گئے۔ اور لاکھوں اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر پردیس میں جا بسے۔

اب کچھ صورت حالات میں تبدیلی شروع ہوگئی ہے اور روسی حکومت نے کئی قوانین نافذ کئے ہیں جنسے ذہنی کام کرنے والوں کو کم سے کم وہ درجہ تو حاصل ہو جائے گا جو جسمانی کام کرنیوالوں کو حاصل ہے۔

مصوروں اور سنگ تراشوں کو اپنے کام کے لئے خاص قسم کے مکانات کی ضرورت پڑتی ہے۔ انکے کرایہ میں رعایتیں کیجائینگی۔

ذہنی کام کرنے والوں کے بچوں کو دوسرے مزدوروں کے بچوں کیطرح سرکاری مدارس میں فیس وغیرہ میں جملہ مراعات حاصل ہوں گی۔

مکان کے کرایہ کے بارہ میں بھی ذہنی کام کرنیوالوں کے ساتھ وہی رعایتیں کیجائینگی جو مزدوروں کے ساتھ کیجاتی ہیں۔

اس درجہ سے شاید ہمارے اہل علم مطمئن نہ ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ روس میں مزدوروں کی حکومت ہے۔ اہل علم کو وہی مراعات حاصل ہو جانا جو مزدوروں کو ہیں ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان میں ہر شخص کو وہ حقوق ملجائیں جو ہر انگریز رکھتا ہے! اور یہ بہت ہیں!!

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ ڈی

جلد ۱	بابتہ ماہ مئی ۱۹۲۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۴۶ھ	نمبر ۵

فہرست مضامین

پانچ ہزار سال قبل ہندوستان کی تہذیب

سندھ اور پنجاب کے حیرت انگیز انکشافات

(گزشتہ سے پیوستہ)

گزشتہ نمبر میں سندھ اور پنجاب کے ان ہر دو مقامات پر جو اشیا برآمد ہوئی ہیں ان سے ایک حد تک تفصیل سے بحث کی گئی تھی اس نمبر میں زیادہ تر اس تہذیب کے حدود اور اثرات سے گفتگو کی جائے گی۔

اس تہذیب کا رقبہ کہ جس کے آثار موہنجوداڑو اور ہڑپا سے برآمد ہوئے صرف انہی مقامات کے اردگرد تک محدود نہیں ہے بلکہ اگر گردونواح کے اور آثار سے جو وقتاً فوقتاً نکلے ہیں، ان آثار کا مقابلہ اور موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تہذیب و تمدن کا رقبہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی طرف بلوچستان کے علاوہ نل اور جھلوان میں جو کھدائی کا کام ہوا ہے اور جو آثار برآمد ہوئے ہیں، ان کی بنا پر ہارگریوز کا خیال ہے کہ اس تہذیب کا دائرہ بلاشبہ بلوچستان کو بھی اپنے اندر شامل رکھتا تھا۔ مشرق کی جانب جیسا کہ سرجان مارشل کہتے ہیں، یہ دائرہ راجپوتانہ تک آتا ہے۔ اور نہ صرف یہیں تک بلکہ کوئی وجہ نہیں کہ دریائے گنگا کے وادی میں جس تہذیب کے آثار نمودار ہوئے ہیں وہ بھی اسی تہذیب سے ماخوذ نہ سمجھی جائے۔ جنوب میں کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال میں پنجاب کا علاقہ اس کے اندر داخل ہی تھا جو خود موجودہ آثار ہڑپا واقع ضلع منٹگمری سے ظاہر ہے۔ اس طرح ملحقہ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ اس تہذیب کا دائرہ اثر جو آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل دریائے سندھ کے اس وادی میں برسرعروج تھی، مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں

ان مہروں اور تختیوں کے باہمی مشابہت اور مماثلت ہی جو ہر دو تہذیبوں کے علاقوں میں نکلی ہیں۔ لیکن ایک طرف جہاں ہر دو علاقوں میں یہ مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہی، وہاں دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ عدم مشابہت اور اختلاف کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ اگر چند مہروں اور تختیوں میں کسی قدر یکسانیت اور مماثلت کا پتہ چلتا ہے تو اسکے ساتھ ۱۰۰ کے قریب ایسی مہریں بھی نکلی ہیں جن سے عراق کی مہروں سے نسبت اور تعلق کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

چوتھا امکان اور غالبًا سب سے غالب امکان یہ ہی کہ یہ خالص ہندی تہذیب کے آثار ہیں اور اس میں کوئی ضد یا اختلاف نہیں۔ تا جس طرح دریائے نیل فرات و دجلہ اور دوسرے بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے عظیم الشان تہذیبیں پیدا ہوئیں، اسی طرح بہت ممکن ہی کہ دریائے سندھ کے ساحل پر بھی خالص ہندی نژاد تہذیب وجود میں آکر پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہو۔ بعض مہروں کی عراق کی دریافت شدہ مہروں سے مشابہت رکھنے پر اگر اس کے عراقی تہذیب سے ماخوذ ہونیکا گمان ہو سکتا ہی تو سیکڑوں مہروں کی عدم مشابہت اور اختلاف صوری پر اس کے غیر ملکی ہونے کا کیوں نہ یقین کیا جائے۔ یا بقول کننگھم بعض مہروں پر ایسے بیلوں کی تصویریں نظر آنے سے جن کے کوبھ نہیں ہیں اگر یہ آثار اس کے غیر ہندی ہونے پر دلالت کر سکتے ہیں تو اب جدید انکشافات سے یہ امکان بھی باقی نہیں رہا ہے، اس لئے کہ اب جو مہریں نکلی ہیں ان میں سے ایک پر نہایت صاف تصویر ایسے بیل کی ہے جس کے کوبھ بھی ہی غرض جس طرح اور بہت سی امکانات پیش کئے جاتے ہیں، ہمارے خیال میں اس امکان کے تسلیم کرنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہی کہ یہ ایک خالص ہندی مستقل بالذات تہذیب کے آثار ہیں۔ اس قدیم زمانہ میں ایک ایسے خطہ پر جہاں انسانی آبادی کا وجود نہ صرف ممکن بلکہ اس کے قوا جسمانی و دماغی کے نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے، انسانی تہذیب و تمدن کا شیوع ہوا اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب وہ تہذیب اپنی عمر طبعی پوری کر چکی تو فنا ہو گئی ۔ اسی طرح

مختلف جگہوں اور زمانوں میں منصہ شہود پر آئی ہیں، کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ قدیم سے قدیم آثار ہندوستان کی تہذیب کے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ آریوں کے زمانہ کے ہیں جن کی آمد کا زیادہ سے زیادہ زمانہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح ہو سکتا ہے۔ لیکن آرین تہذیب کے جو آثار و قرائن اس سے پیشتر ملے ہیں ان کو ان چیزوں سے جو موہنجوداڑو اور ہڑپا میں برآمد ہوئی ہیں، دور کی نسبت بھی نہیں ہے اس سے بلا خوف تردید یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تہذیب کا زمانہ آریوں سے اتنا قبل رہا ہوگا اور ہر دو زمانوں میں اتنی طویل مدت حائل رہی ہوگی کہ ہر دو زمانوں کے آثار اپنے اندر اس درجہ عدم مشابہت اور عدم مماثلت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح سے آگے ہم اس زمانہ کا جو تعین کریں کم ہے۔

ایک دوسرا امکان یہ ہے کہ یہ آریوں کے آنے سے قبل دراوڑی تہذیب ہو سکتی ہے لیکن اس نظریہ کے تسلیم کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ دراوڑی زبان کا ماخذ ۵۰۰ ق۔م سے آگے نہیں جاتا اور اس بنا پر اسکا تعلق ۳ ہزار سال قبل مسیح سے قرار دینا کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس سے مضبوط نظریہ یہ ہے کہ اسکا تعلق بہت ممکن ہے کہ سمیریا یعنی عراق کی تہذیب سے ہو۔ انگلستان کے ایک بڑے ماہر سیاسیات اے۔ ایچ سیاسے A.H.Sayace کا خیال ہے کہ سوسا اور شمالی مغربی ہندوستان میں حضرت مسیح سے کوئی ڈھائی ہزار برس نہایت گہرے تعلقات تھے۔ بعض دیگر محققین نے بھی اس کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تعلقات بری اور بحری دونوں راستوں سے تھے۔ خشکی کا راستہ جنوبی ایران اور بلوچستان ہوتا ہوا آتا تھا۔ برٹش میوزیم کے دو بڑے ماہرین گیڈ (Gadd) اور سڈنی اسمتھ Sydney Smith نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ تہذیب یا تو بالکل سومیر اور بابل کی تہذیب سے ماخوذ ہے یا کم سے کم ان تہذیبوں سے اسکا گہرا تعلق ضرور رہا ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس امر کا

ان مہروں اور تختیوں کے باہمی مشابہت اور مماثلت ہے جو ہر دو تہذیبوں کے علاقوں میں نکلی ہیں۔ لیکن ایک طرف جہاں ہر دو علاقوں میں یہ مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے، وہاں دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ عدم مشابہت اور اختلاف کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ اگر چند مہروں اور تختیوں میں کسی قدر یکسانیت اور مماثلت کا پتہ چلتا ہے تو اسکے ساتھ ۱۰ کے قریب ایسی مہریں بھی نکلی ہیں جن سے عراق کی مہروں سے نسبت اور تعلق کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

چوتھا امکان اور غالبًا سب سے غالب امکان یہ ہے کہ یہ خالص ہندی تہذیب کے آثار ہیں اور اس میں کوئی ضد یا اختلاف نہیں ہے۔ جس طرح دریائے نیل، فرات و دجلہ اور دوسرے بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے عظیم الشان تہذیبیں پیدا ہوئیں، اسی طرح بہت ممکن ہے کہ دریائے سندھ کے ساحل پر بھی خالص ہندی نژاد تہذیب وجود میں آ کر پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہو۔ بعض مہروں کی عراق کی دریافت شدہ مہروں سے مشابہت رکھنے پر اگر اس کے عراقی تہذیب سے ماخوذ ہونے کا گمان ہو سکتا ہے تو سیکڑوں مہروں کی عدم مشابہت اور اختلاف صوری پر اس کے غیر ملکی ہونے کا کیوں نہ یقین کیا جائے۔ یا بقول کننگھم بعض مہروں پر ایسے بیلوں کی تصویریں نظر آنے سے جن کے کوبھ نہیں ہیں اگر یہ آثار اس کے غیر ہندی ہونے پر دلالت کر سکتے ہیں تو اب جدید انکشافات سے یہ امکان بھی باقی نہیں رہا ہے، اس لئے کہ اب جو مہریں نکلی ہیں ان میں سے ایک پر نہایت صاف تصویر ایسے بیل کی ہے جس کے کوبھ بھی ہے غرض جس طرح اور بہت سی امکانات پیش کئے جاتے ہیں، ہمارے خیال میں اس امکان کے تسلیم کرنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہے کہ یہ ایک خالص ہندی مستقل بالذات تہذیب کے آثار ہیں۔ اس قدیم زمانہ میں ایک ایسے خطہ پر جہاں انسانی آبادی کا وجود نہ صرف ممکن بلکہ اس کے قوائے جسمانی و دماغی کے نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے، انسانی تہذیب و تمدن کا شیوع ہوا اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب وہ تہذیب اپنی عمر طبعی پوری کر چکی تو فنا ہو گئی۔ اسی طرح

دوسری تہذیبوں کا بھی اپنے اپنے علاقوں میں یہی حال ہوا یہ امر کہ ایک نے دوسری کی جگہ لی یا ایک فنا ہوئی تو دوسری وجود میں آئی کوئی لازمی اور ضروری چیز نہیں ہے۔ بہ یک وقت متعدد تہذیبوں کا اپنے اپنے حدود میں وجود پذیر ہونا کوئی خلاف قیاس امر نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے سرتاسر ماخوذ ہو۔ باہم دو تہذیبوں میں قدرے مشابہت و مماثلت ہونا بذات خود ایک قدرتی امر ہے، اس لئے کہ طبایع انسانی میں اجزا مشترک ہیں اور پھر اگر کچھ بہت زیادہ یکسانیت و مشابہت پائی بھی جائے تو اسکا سبب باہمی تعلق و ارتباط ہے جو بیک وقت موجود رہنے والی دو تہذیبوں میں ممکن ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ایک خالص ہندی نژاد تہذیب کے آثار ہو سکتے ہیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

ان آثار سے جو موہنجو دڑو اور ہڑپا میں نکلے ہیں خواہ اس امر کا یقین ابھی نہ ہو سکے کہ یہ تہذیب دراصل کہاں سے ماخوذ ہے یا اس پر کن کن تہذیبوں کا کہاں تک اثر ہے۔ لیکن اتنا تو کم سے کم بلا کسی رد و قدح کے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اب سے کوئی پانچ ہزار سال قبل ایک نہایت عظیم الشان اور بلند پایہ تمدن موجود تھا۔ اب تک عام خیال یہ رائج تھا کہ ہندوستان میں علم و فن، تہذیب و تمدن، زندگی و معاشرت کی اصل بانی مبانی آرین اور صرف آرین ہوئے ہیں اس یقین کا تو پورے طور پر خاتمہ ہو گیا ہے اور اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہندوستان میں آرینوں کے آنے سے قبل بھی ایک اعلیٰ اور کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ تر تہذیب موجود تھی۔ اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا سرچشمہ جو تمام تر آرین اور انکی زندگی و معاشرت کو قرار دیا جاتا ہے، اسکا اصل خزانہ دراصل حضرت مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال قبل شمال و مغرب سے آئی ہوئی قوم کے پاس نہیں بلکہ اس سے تین ہزار سال قبل دریائے سندھ کا علاقہ تھا۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ آرین ایک نہایت مہذب و متمدن قوم تھی اور جب اس نے ہندوستان کے اندر قدم رکھا

تو اسے ایک نہایت غیر متمدن اور اپنے سے پست تر قوم سے سابقہ پڑا جسے اس نے اپنا غلام بنالیا اور اس رعایت سے اسے 'دسو' کہنے لگے جس کے لغوی معنی غلام کے ہیں۔ لیکن ان آثار سے شمالی ہند کے اس علاقہ میں رہنے والوں کے تمدن و معاشرت پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے ہرگز یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی معمولی قوم رہی ہوگی جو آسانی سے مطیع ہو کر ان بدیسیوں کی غلام بنگئی ہوگی۔ نیز ان کے قیام و طرز زندگی کے متعلق یہ بھی خیال چلا آتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے گانؤں کے رہنے والے تھے جنہیں 'پُرہ' کہتے ہیں۔ مگر سندھ اور پنجاب کے ان حصوں میں یکے بعد دیگرے جو تین عظیم الشان شہر کے آثار مع ان کے تمام لوازمات کے پائے گئے ہیں ان سے ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ آریوں سے قبل ہندوستان کے لوگ شہروں کی متمدن زندگی سے ناواقف محض تھے اور تہذیب و تمدن کا یہ سبق انہیں آریوں نے آکر سکھایا۔

ایک اور مسئلہ پر ان تازہ اکتشافات کا براہ راست جو اثر پڑتا ہے وہ رگ وید اور اتھر وید کے باہمی تعلق کا مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رگ وید، اتھر وید سے بعد کے اشلوکوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس لئے کہ ان میں رفتہ رفتہ ایسے جانوروں اور چیزوں کے نام ملتے ہیں جو رگ وید میں نہیں پائے جاتے۔ اس پر قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ جوں جوں آرین مشرق کی جانب بڑھتے گئے وہ اسی رفتار سے نئی نئی چیزوں سے واقف اور باخبر ہوتے گئے۔ چنانچہ اتھر وید جو بعد کے اشلوکوں کے مجموعہ کا نام ہے، بہت سے نئے نئے جانوروں اور چیزوں کے نام سے بھری ہوئی ہے، مثلاً شیر، ہاتھی اور مچھلی وغیرہ جو رگ وید میں نہیں آتے یا اگر آتے ہیں تو اس کے آخری حصہ کے اشلوکوں میں آتے ہیں۔ برعکس اس کے اتھر وید میں انکا ذکر بہ کثرت اور بالعموم آتا ہے۔ لیکن ان ہر دو مقامات پر ایسے ایسے جانوروں کی ہڈیاں اور نشانیاں پائی گئی ہیں جو وید کے اخیر

سے آخیر حصوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے رگ وید کی قدامت اور دوسرے ویدوں کیساتھ اس کے تقدم کا جو تخیل تھا وہ سرے سے جاتا رہتا ہے۔ یہاں کتنی مہریں ایسی نکلی ہیں جن میں ہاتھی، شیر، بیل اور مچھلی وغیرہ کی تصویریں نہایت صاف اور واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

غرض ابتک جتنی چیزیں برآمد ہو چکی ہیں۔ انکے صحیح اور پوری روشنی کا بہت کچھ انحصار ابھی آئندہ مزید اکتشافات پر ہے جن قرائن و اثرات کا ذکر اب تک ہوا ہے، وہ صرف اشارات اور توجیہات ہیں تفصیلات و تصریحات کے لئے ابھی بہت کچھ ہمیں مکتشفین کی آئندہ کوششوں اور نتائج کا انتظار کرنا پڑیگا۔



اُردو اکیڈمی

جب انسان نے ارتقائی منازل طے کرنیکے بعد انسانیت میں قدم رکھا تو اُس نے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت محسوس کی بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ احساس ہی حیوانیت محض سے اُس کے افتراق اور امتیاز کا باعث ہوا بعض انواع د حوش وطیور کے جماعت نما طرز ماند وبود پر اجتماعی زندگی کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اُنکا طبعی فعل اور جبلی عمل ہے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کے لئے اعضائے قبیلہ اور افراد قوم اور ارکان جماعت کا ایک دوسروں کے ارادوں اور خواہشوں سے واقف ہونا لازمی ہے۔ اس واقفیت کے حصول کا صرف ایک ہی کامل ذریعہ ہے اور وہ زبان ہے۔ اجتماعی زندگی کی غرض غایت ہے دوسری مخلوقات کے ساتھ جہدالحیات میں انسان کی فتح وکامیابی، قوانین قدرت وقوانین فطرت پر اسکا عبور اور انسانی مفاد بہتری اور ترقی کے لئے اُنکا استعمال۔ اجتماعی زندگی کا مدار ہے ہمدردی ومشاورت اور معاونت پر، اور مشاورت اور معاونت منحصر ہے ایک کو دوسرے کے خیالات ومحسوسات کے معلوم ہونے پر اور دوسروں کے خیالات ومحسوسات کے کماحقہ معلوم ہونیکا صرف ایک ہی وسیلہ ہے اور وہ زبان ہے۔ غرض بیادنے غور سے معلوم ہوگا کہ تنازع للبقا میں انسان کی اصلی کفیل اور اُس کی نوعی زندگی اور مدنیت کی اول ضامن زبان ہے۔

قوم وملت کی ترکیب عموماً پانچ عناصر سے ہوسکتی ہے۔ اتحاد زبان۔ اتحاد اغراض سیاسی ومعاشی، اتحاد مذہب اور اتحاد نسل اور اتحاد روایات تاریخی۔ مگر قومیت کے ان اساسی اجزا میں سچ پوچھئے تو اصلی کارکن اور عامل صرف زبان ہی ہے۔

کیونکہ افراد قوم میں سیاسی معاشی مذہبی اور اتحاد نسل کے خیالات اور تاریخی روایات

کے اشاعت وتبلیغ کا ذریعہ اور ان خیالات اور روایات کے متعلق یکسوئی و یک رنگی پیدا کرنیکا وسیلہ عام زبان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مذہب اور سیاسی ومعاشی اغراض کا اتحاد اُن کے اصول و فوائد کے علم کے بغیر ممکن نہیں اس علم اور اُس کے ساتھ دوسرے تمام انسانی علوم کی حامل و خزینہ دار زبان ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے جس پر قوم کا اطلاق ہوسکے قیام کا بغیر ایک عام زبان کے خیال ہی نہیں ہوسکتا۔ اتحاد نسل درحقیقت قومیت پیدا کرنیکے لئے ضروری نہیں۔

آج دنیا میں کوئی متمدن قوم ایسی نہیں ہے جو اتحاد نسل رکھتی ہو۔ یا اُس کی مدعی ہوسکے ہاں عام تاریخی روایات نے اتحاد نسل کا خیال کسی کسی قوم میں پیدا کر دیا ہے۔

اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی ومعاشی کی مجموعی قوت اتحاد مذہب کے عنصر کو بھی غیر ضروری قرار دے سکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نئی امریکن قومیت بغیر اتحاد مذہب کے پیدا ہوئی ہے اور عہد جاہلیت میں عرب باوجود اختلاف مذہب کے ایک قوم کہلاتے تھے۔ تاریخ ایسی قوم کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جس کی اجزائے ترکیبی میں ایک سے زیادہ زبانیں شامل ہوں۔ ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی نے افتراق نسل اور اختلاف مذہب کے باوجود ایک قومیت کو پیدا کیا۔ جیسے قدیم زمانہ میں رومی قومیت کی توسیع اٹلی کی دوسرے اقوام پر اور موجودہ عہد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مخلوط النسل اور مختلف المذہب قومیت۔

یہ صحیح ہے کہ اتحاد مذہب سے ایک نئی قومیت کے پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور قومیت کا قوام بہت جلد اور آسانی سے تیار ہوسکتا ہے۔ مگر اُسکا وجود اس قوام کی تیاری کے لئے لابدی نہیں ہے۔ جیسے انگریز قوم میں اتحاد مذہب کے اثر سے اُس کے مختلف الاصل مختلف الالسنہ اجزا ایک عام قومیت میں بہت جلد جذب ہوگئے مگر انگریز قومیت کی بنا اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی ومعاشی پر رکھی گئی ہے۔ جہاں زبان کا کامل اتحاد نہیں ہوسکا وہاں

مذہبی سیاسی و معاشی اغراض کے یگانگت کے باوجود کامل قومیت پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی سچی مثال سابق شہنشاہی روسی قومیت ہے روسی شہنشاہیت کے فنا ہونے کے بعد ملک روس میں مختلف قومی سلطنتیں قائم ہو گئیں جیسے بالشویک روس اوکرین لیتھونیا وغیرہ۔ اس کی وجہ منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی ہے کہ ان علاقوں اور قوموں کی زبانیں فنا نہ ہونے پائی تھیں۔ پولی قومیت تو سراسر زبان ہی کی وجہ سے آج دنیا میں قائم ہے۔ ورنہ جرمنوں اور روسیوں نے ہر ممکن طریقہ سے اسکے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کی بنیاد اتحاد خاندان پر ہے جو وسیع ہو کر اتحاد نسل بن جاتا ہے۔ مگر غور کرنے سے ثابت ہو گا کہ اس کی تہہ میں در اصل اتحاد زبان ہے ایک ہی خاندان یا ایک محدود رقبہ کے اندر رہنے والے اور ضروریات زندگی کے لئے روزانہ باہم ملنے والے متعدد خاندانوں میں جو دراصل ایک ہی خاندان کی شاخیں ہوں گی تبادلہ خیالات مشاورت اور معاونت کے لئے جب زبان پیدا ہوئی ہو گی تب اس کے واضعین کو یہ احساس بھی رہا ہو گا کہ وہ ایک نسل سے ہیں اور ایسا خیال واقعات پر مبنی تھا بھی۔ اس لئے اتحاد نسل یا کم سے کم اشتراک نسل کا اعتقاد ضروری ہے۔ مگر یہ عقیدہ نفس انسانی کا خود ساختہ فریب ہے۔ کیونکہ دنیا کے مختلف متمدن قوموں کی تدریجی ترکیب و تقویم کی تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم بھی اتحاد نسل کو قائم نہ رکھ سکی۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ہمیشہ زبردست جماعتوں نے کمزور جماعتوں کو اپنا محکوم و غلام بنالیا ہے۔ اور بالآخر اپنے میں جذب کر لیا ہے۔ پھر نسل کی اصالت کہاں باقی رہی۔ دنیا کی متمدن قومیں تمامتر مختلف النسل اجزا سے مرکب اور ممتزج ہوئی ہیں جیسے انگریز۔ امریکن مصری۔ اطالوی عثمانی۔ ترک وغیرہ کیونکہ زبان حاکم و غالب قوم ہی کی قائم رہتی ہے۔ اس لئے وہ مرکب جماعت اسی غالب جماعت کے نام سے پکاری جاتی ہے غرض ماننا پڑے گا کہ قومیت کا اصلی مرکز اور اسکی حقیقی بنیاد زبان ہی ہے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم مذہبی قومی خیالات پر غالب نہ ہو سکی۔ بلکہ قومی یگانگت کے خیال

نے مذہبی اتفاق کو بے اثر کر دیا جیسے عیسائی عربوں نے بعض وقت دولت رومیہ مشرقیہ کے خلاف جو اُن کی ہم مذہب تھی مسلم عربوں کی طرفداری کی ہے بصری عیسائیوں نے رومی عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی ہے یہاں سبب امداد ہم قومی نہیں بلکہ سیاسی فوائد کا یقین تھا۔ ترکوں اور عربوں کی ناموافقت اسلام کے عہد زریں میں فتنہ شعوبی وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ بانیٔ اسلامؐ کے وہ مشہور الفاظ جو آنحضرتؐ نے یہود و مشرکین مدینہ و جوالی مدینہ کے ساتھ عہدنامہ میں استعمال کئے تھے کہ آؤ ہم اور تم مل کر ایک قوم بن جائیں اس نظریہ کا کہ قومیت کے لئے ہم مذہبی ضروری نہیں ایک زبر دست ثبوت ہے مختصر یہ کہ قومیت کے لئے نہ اتحاد نسل کی ضرورت ہے اور نہ اتحاد مذہب کی۔ اتحاد زبان سے قومیت پیدا ہوتی ہے اور سیاسی و معاشی اغراض و مقاصد کے اتحاد سے اُس کی تکمیل ہوتی ہے بشرطیکہ یہ اتحاد ایک کافی عرصہ تک قائم رہے اور کوئی دوسرے اور تفرقہ انگیز اثرات نہ پیدا ہوں۔

۲۔ نوع انسانی کے گروہوں جماعتوں جرگوں اور قوموں میں تقسیم و تفریق کے اسباب ماقبل التاریخ عہد میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر اب تو اُن کی شناخت و تمیز کے فقط دو ہی معیار ہیں۔ اختلاف زبان اور اختلاف ساخت جسمانی، نوع انسان کی اسی تقسیم اور انشعاب نے انسانیت کو ہمیشہ نقصان پہونچایا ہے اور پہنچا رہی ہے اپنے دور وحشت میں جبکہ انسان قانون اصلح کے ماتحت کائنات کی حکومت کے لئے دوسری مخلوقات سے برسرپیکار اور مصروف دمار تھا اُس وقت اُس نے نوعی نفاق کی ضرورت سمجھی اور اُسکی برکت سے کماحقہ فائدہ اٹھایا۔ قدیم و جدید تمام تمدن اسی اتفاق کے عملی نتائج و آثار ہیں مگر افسوس ہے کہ دوسری مخلوقات کو مغلوب و محکوم کرنے کے بعد انسان نے اپنی ہی بنی نوع پر حکومت کی کوشش شروع کی۔ اور دنیا کی تمام تاریخ اسی ناپاک کوشش اور اس کے ناپاک ترحصول کی داستان ہے۔ اس خانہ جنگی نے جس کا سلسلہ موجودہ دور تہذیب و شائستگی میں بھی بند نہیں ہوا ہے۔ انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں کیونکہ وہ طاقت جو جارحانہ و مدافعانہ اپنی نوعی حفاظت و ترقی کے

لئے استعمال ہو سکتی تھی مجادلہ و مقاتلہ میں صرف ہونے لگی۔

۴۔ انسان کی ابتدائی اجتماعی زندگی کا سنگ بنیاد زبان ہی تھی اب نوع انسان کی تقسیم و انشعاب کی ذمہ دار اختلاف ساخت جسمانی کے بعد جس میں رنگ بھی شامل ہے اختلاف زبان ہی ہے۔ اختلاف ساخت جسمانی کا ازالہ قریب قریب ناممکن ہے جب تک موسموں کی موجودہ حالت کرہ زمین کی مختلف سطحی ہیئت اور ان قدرتی اسباب کے ماتحت انسانی غذا میں اختلاف قائم رہیگا تب تک انسان کے جسم کی ساخت کے اختلاف کا مٹنا مشکل ہے۔ بُعد مسافت کی مشکلات جو عہد قدیم اور قرون وسطےٰ میں بلکہ قریب کے زمانہ تک مختلف انسانی جماعتوں کے اختلاط و ارتباط میں مانع تھیں۔ اُن کو اب انسان نے برق کی امداد سے مٹا دیا اور بخار کی تائید سے دھواں بنا کر اڑا دیا ہے۔ اور آج ایک دو دس بیس افراد نہیں بلکہ ایک سالم جماعت دوسری سالم جماعت سے تعلقات و موانست پیدا کر سکتی ہے۔ اور ہم بہت جلد دیکھیں گے کہ مختلف قوموں میں باہم ربط ضبط بلکہ ایک کافی عرصہ کے بعد ازدواجی تعلقات بھی قائم ہو جاویں گے جو بتدریج اتحاد زبان اور زاں بعد اتحاد قومیت کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ نوع انسان کی موجودہ لسانی اور صوری تفریق و تقسیم کے اثرات کو زائل یا کم کر کے آپس کی قومی اختلافات کو مٹانا اور اس کی توحد و یکرنگی پیدا کرنیکی کوشش کرنا انسانیت کی بہترین خدمت اور انسان کا اعلیٰ ترین عمل ہوگا وحدت و یکرنگی سے مقصود ہے باہمی خانہ جنگی کا استیصال اور تمام قوائے انسانی کا ارتقائے انسانیت کے لئے استعمال۔ برق و بخار اور نور و حرارت نے اپنے گوناگوں اور کثیر المظاہر خواص و صفات کی مقبوضانہ حیثیت اور مفتوحانہ حالت میں انسان کے لئے وقت اور فاصلہ کے تمام حجابات کو تقریباً رفع کر دیا ہے اور عام اختلاط و ارتباط کے لئے بیحد آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک مشترکہ زبان کا اختیار کرنا فی الحال دائرۂ امکان سے باہر نظر آتا ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں جو بیشمار غیر مکمل زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انکی تعداد کم کر کے چند مکمل زبانیں رائج کیجائیں اور اس طرح بجائے لاتعداد کمزور قوموں کے صرف چند طاقتور اور خود مختار

قومیں بنائی جائیں۔ آئندہ جنگوں کے موقوف کرنے کا اس سے معقول تر دوسرا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا جنگ لازمی نتیجہ ہے طاقتور قوموں کو اپنے فائدہ کے لئے محکوم و مطیع بنانیکی ظالمانہ خواہش کا اس خواہش کا انسداد جذبات عدل و انصاف و ہمدردی سے نہیں ہو سکتا۔ اس ناجائز خواہش کو صرف خوف ہی قابو میں رکھ سکتا ہے شکست کھانیکا خوف اور یہ خوف حریف مقابل کے جارحانہ و مدافعانہ قوت اور حربی طاقت سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ کمزور قوموں کو دوسری طاقتور قوموں میں بتدریج امن پسندانہ ذرائع سے جذب کرنا جنگ کے امکانات کو زائل کرنا ہے۔ ان امن پسندانہ ذرائع میں سب سے زبردست ذریعہ تعمیم زبان ہے۔ کسی ملک اور اُس کے باشندوں میں وہی زبان عام طور پر رائج ہو سکتی ہے جو اُس کے ایک حصہ کی مادری زبان ہے اور اس ملک کے مختلف حصوں میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سوا وہی زبان مختلف قوموں کی عام زبان ہو سکتی ہے جو ان کی قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کے ادا کرنیکی قابلیت رکھتی ہے۔

۵۔ ازمنہ ماضیہ میں زبان کا اتحاد مختلف امتوں اور قوموں کے جذبہ انسانیت اور صلح پسندانہ رجحانات پر مبنی نہ تھا۔ اور نہ انکے میل ملاپ اور باہمی رضا و رغبت کی پیداوار تھا بلکہ اس کے وجود کی بنا زیادہ تر فاتحانہ اور غالب قوت پر رہی ہے۔ مگر کرہ زمین پر ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں ایک عام زبان بغیر کسی سلطنت یا جماعت کی خاص کوشش کے پیدا ہو چکی ہے اور اس طرح گویا خود قدرت نے ایک نادر موقعہ اتحاد زبان کے ذریعہ ایک کامل قومیت کے بنانیکا دیا ہے۔ میری مراد ہندوستان اور اردو زبان سے ہے۔

ہندوستان صدیوں سے مختلف النسل مختلف المذہب اور مختلف الالسنہ انسانی جماعتوں کا مسکن ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کے باشندوں میں انگریزی راج کی بدولت اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہو گیا ہے۔ اور ایک عام زبان اردو بھی پیدا ہو چکی ہے۔ ایک عام قومیت کی تکمیل کے لئے اتحاد زبان کی کمی رہ گئی ہے۔ جس کا پورا کرنا ہی خواہان ملک و محبان وطن

کا فرض ہے۔

۶۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو ہندوستان کے کل باشندوں اور پورے ملک کی عام اور قومی زبان ہونیکی صحیح صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ مختلف الالسنہ جماعتوں کی عام زبان ہونے کی اہلیت صرف اسی زبان میں ہوتی ہے جو ان مختلف جماعتوں کی قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کو آسانی سے ادا کر سکتی ہے۔یہ قابلیت اردو زبان میں بمقابلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بدرجہ احسن موجود ہے۔اردو ثمرہ ہے ہندوستان کے مختلف النسل مختلف المذہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے ارتباط و امتزاج لسانی کا جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔زبان عموماً اس کے بولنے والوں کی ذہنی اخلاقی و روحانی درجات کی مظہر اور ان کی تہذیب و شائستگی کی کاشف ہوتی ہے۔اس اصول کے ماتحت اردو زبان بھی اپنی ماخوذ زبانوں کے بولنے والوں کے ارتقائے دماغی و روحانی اور اُنکے مختلف مدارج تمدن کی حامل ہے۔اُسکا ثبوت ہے اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا وجود اور استعمال اور الفاظ کیا ہیں خیالات و محسوسات مشخصہ اور اُردو میں جدید مذہبی فرقوں کے عقائد و دستور العمل زندگی کی تدوین۔یہ جدید مذہبی فرقے یا بالفاظ دیگر علحدہ مذاہب دراصل قدیم مذاہب سے مقتبس ماخوذ ہیں جو نتیجہ ہے ان مذاہب کے پیروٗں کے اختلاط و ارتباط کے غائر مطالعہ کا۔

اُردو میں عربوں ایرانیوں ترکوں حبشیوں اور مختلف اقوام ہنود کے قومی و مذہبی مخیلات یا اُنکے آثار و علائم بصورت اصلی یا بتبدیل ہیئت ہیں۔اسلام کے مذہبی علوم اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور عیسائیت موجود ہے اور یہودیت کے متعلق بوجہ دعاۃ و مبلغین عیسائیت کے علمی اور عملی سرگرمیوں کے اُردو میں کافی معلومات مل سکتے ہیں۔آریہ سماج، دیو سماج اور دوسرے جدید ہندو فرقوں کے مجاہدانہ و مبلغانہ مساعی اور علمی کوششوں کی بدولت اور صوفیائے کرام کے طفیل فلسفۂ ویدانت اور ہندوستان کے دیگر مذاہب فلسفہ اور ہندو بدھ مذاہب کے متعلق اردو میں کافی مواد پیدا ہو گیا ہے۔کسی دوسری ہندوستانی زبان میں اسلام اور عیسائیت

کے متعلق اسقدر معلومات فراہم نہیں ہوئے ہیں۔ علوم جدیدہ وفنون حدیثہ کی ترجمانی میں بنگالی
کے بعد اردو کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہیں۔ امید ہے کہ خسرو دکن کی دوراندیشانہ
فیاضی اور نتیجہ خیز علوم دوستی کے صدقہ میں جس نے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی حسین وجمیل
صورت اختیار کی ہے۔ اردو بہت جلد بنگالی کو پیچھے چھوڑدے گی۔ ہندوستان کے ایک بڑے
حصہ میں مروجہ مالی وملکی اصطلاحات مخصوص الفاظ کی لغات تمام تر فارسی وعربی سے ماخوذ ہیں

ہندوستان کی قدیم ومقدس زبان سنسکرت کے سوا اردو ہندوستان کے باہر کی دو
زندہ اور قدیم زبانوں یعنی عربی وفارسی کے جو دنیا کی قدیم ترین متمدن قوموں اور انکی سرزمینوں
کی وارث ہیں علمی ترقیوں اور مشغلوں سے مستفید ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ دوسری
ہندوستانی زبانوں کے لئے یہ راہ استفادہ مسدود ہے۔

اوپر بتلایا جاچکا ہے کہ اُردو کی پیدایش ہندوستان میں مختلف قوموں کے صدیوں
کے میل جول اور قرنوں کے ربط ضبط سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی خاص قوم
سے منسوب نہیں کیجاسکتی۔ اپنی پیدایش کے اول تین چار صدیوں تک وہ گھریلو اور بازاری
بول چال کا درجہ رکھتی تھی۔ سرکار انگریزی کی دستگیری اور بالائی ہند و دکن کے تعلیم یافتہ باشندوں
کی تفریحانہ علمی مشغلوں نقالانہ مذاق شاعری نے اسے زبانوں کی صف میں جگہ دلوائی۔ مندرجہ
ذیل واقعات سے ظاہر ہوگا کہ اردو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی یا خصوصی زبان نہیں
ہے۔

(۱) اردو آزاد اسلامی ہند کی دفتری زبان نہ تھی۔

(۲) انگریزی سلطنت کے استحکام اور سرکار انگریزی کے اُردو کو اپنے ممالک محروسہ کے ایک
بڑے حصہ کی دفتری زبان قرار دینے کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسلمان
ریاستوں کی زبان فارسی رہی ہے۔

(۳) انگریزی حکومت اور حکام کی توجہ سے اردو میں علمی شان پیدا ہوجانے کے باوجود ہندوستانی

مسلمانوں نے گویا بطور صدائے احتجاج فارسی میں تصنیفات کی ہیں حالانکہ ان تصنیفات کے اول مخاطب اُنکے اردو بولنے والے ہم وطن ہیں۔ایک دو نسل آگے کے مسلمان اہل قلم اُردو میں لکھنا کسرشان سمجھتے تھے۔اُسکا اس عہد کی تصنیفات میں اکثر اظہار ہوا ہے۔خانگی خط و کتابت بھی فارسی میں کیجاتی تھی۔

(۴) مسلمانوں کی دینی تعلیم ابھی تک فارسی اور عربی میں ہوتی ہے۔عربی تو ناگزیر ہے کیونکہ وہ اسلام کی مذہبی زبان ہے۔مگر فارسی تو غیر زبان ہے۔اردو کو مسلمانوں کی مخصوص زبان سمجھنا تاریخ کو جھٹلانا ہے اور اس کے نشو و نما میں غیر مسلم یا ہندو اصحاب علم اور ارباب قلم نے جو زبردست حصہ لیا ہے۔اس کو بالکل نظر انداز کرنا ہے۔اُردو کی پیدائش مختلف ہندستانی اقوام کے میل جول سے ہوئی اور اُسکی ترقی و اشاعت میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہر مذہب کے پیرؤں نے حصہ لیا ہے اُردو کا وجود علم الاقوام و علم الالسنہ کے اس نادر مسئلہ کا ثبوت ہے کہ مختلف النسل مختلف المذاہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے دوستانہ میل جول اور برادرانہ ربط ضبط سے اور بغیر فاتحانہ تقدم و ترجیح اور حاکمانہ مساعی کے ایک نئی عام زبان پیدا ہو کر اتحاد لسانی کی محرک ہو سکتی ہے۔صحیح معنوں میں کل ہندوستان کی عام زبان ہونے کا حق صرف اردو ہی کو پہونچتا ہے۔باقی تمام مروجہ زبانیں مختلف صوبوں کی زبانیں ہیں۔اردو کی مخلوط اللسانی بنیاد اور اُس کی روز افزوں عمومیت سے انکار کرنا نہ صرف واقعات کی تکذیب کرنا ہی بلکہ نو پیدا ہندوستانی قومیت کی تکمیل و توسیع کے راستہ میں روڑے اٹکانا ہی۔

اب رہا رسم الخط کا اختلاف آخر ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کے سامی الاصل ہونے کا ایک نظریہ ہے جو اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ابھی تک معرکۃ الآرا ہے۔اشوک اعظم کے بعض کتبے سامی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں، جو کافی ثبوت ہیں اس واقعہ کا کہ ہندؤں کے عہد زریں میں بھی ہندوستان کے بعض قوموں میں سامی رسم الخط مروج تھا اُردو کا سامی الاصل رسم الخط برّ اعظم ایشیا افریقہ اور یوروپ کے وسیع علاقوں میں

مستعمل ہے۔ بلکہ امریکہ میں بھی جہاں عربی گو حبشیوں اور سامی عیسائیوں کی خاصی تعداد آباد ہے دنیا کی اسلامی اقوام میں عربی یا اردو رسم الخط رواج پا رہا ہے۔ عربی اور اردو حروف کی کتابت میں بالکل بے حقیقت فرق ہے۔ عربی حروف کا واقف اردو حروف اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ آج دنیا کی کوئی قوم اور کرۂ زمین کا کوئی ملک دوسری اقوام اور دوسرے ملکوں سے قطعی علیحدگی اور بیگانگت کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ لامحالہ دوسری قوموں اور ملکوں سے تجارتی معاشی و سیاسی تعلقات قائم کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کوئی قوم اور کوئی ملک اپنی خود پسندی اور سیر حاصلی سے گوشہ تنہائی کو پسند بھی کرے تو بین الاقوامی تعلقات کی آفت سے بچ نہیں سکتا۔ ورنہ تنانی بہ ستم می رسد کا مصداق ہوگا۔ بین الاقوامی تعلقات صحیح قومی زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ عہد حاضرہ کے سیاسی واقعات و ملی سانحات کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی اردو رسم الخط والی اقوام کے لئے ایک جدید شاندار مستقبل طلوع ہونے والا ہے بلکہ طلوع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان اقوام سے اتحاد مذہبی حاصل ہے اس اتحاد کے اثر و نفوذ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے بھی مناسب ہے کہ ان اقوام سے برادرانہ تعلقات پیدا اور مستحکم کئے جائیں رسم الخط کا اتحاد ان تعلقات کو پائدار اور مضبوط کرے گا۔ لہٰذا ہندوستان کا ناگری رسم الخط کو اختیار کر کے جہاں اس رسم الخط کو بھی عمومیت حاصل نہیں ہے۔ ہمسایہ ممالک اور اقوام سے علمی علیحدگی اور قطعی بے تعلقی کی حالت پیدا کرنے کے بجائے زیادہ مناسب ہے کہ ہمسایہ اقوام کے رسم الخط کی برادری میں شامل ہو جائے۔ بنگالی۔ تلنگی۔ تامل وغیرہ زبانوں کے بولنے والوں کو ناگری حروف کا سیکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اردو حروف کا سیکھنا۔

(۵) اردو کی عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بغیر مسلمانوں یا کسی منظم جماعت کی مساعی کے ہندوستان کے غیر اردو بولنے والوں میں بتدریج

پھیل رہی ہے۔ مختلف حصص ہند کے سیاحوں سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ غرض بمقابلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اردو کل ہندوستان کی عام اور قومی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور زیادہ آسانی سے اس کی اشاعت ہوسکتی ہے چونکہ انگریزی راج کی بدولت ہندوستان کی کل اقوام میں اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہوگیا ہے۔ اردو کی اشاعت و ترقی سے کامل اتحاد لسانی حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش ہونی چاہیئے تاکہ جدید ہندوستانی قومیت کی تکمیل ہوجائے۔ اردو کو کل ہندوستان کی عام قومی زبان بنانے اور اُس کی ترقی و اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل نظام عمل مفید اور کارآمد ہوگا۔

(۱) ہندوستان کی کل زبانوں میں اُردو آموز رسالے تیار کرنا تاکہ ہر شخص اپنی ہی زبان میں اُردو سیکھ سکے۔

(۲) اُردو کے حروف تہجی اور کتابت میں ضروری اصلاح کرنا جیسے ھ کے ساتھ دوسرے حروف کی ضم شدہ آواز کی کتابت معروف و مجہول حروف علت کی کتابت کی تفریق وغیرہ۔

(۳) اُردو میں ٹائپ رائٹر اور شارٹ ہینڈ جاری کرنا۔

(۴) اُردو میں ٹائپ کا رواج دینا۔

(۵) اُردو میں قومی ڈراما تیار کرنا۔ ہندوستان کی ہر قوم کی شاندار ماضی کے سبق آموز واقعات اور قابل تتبع سانحات کے ناول اور ناٹک اُردو میں لکھنا اور ان ناٹکوں کا کھیل کرانا۔

(۶) ہندوستان کے عظمائے رجال کے سوانح عمری تلاش کرکے عام فہم اُردو میں شائع کرنا خاصکر ایسے بزرگوں کی سیرتوں کی ضرورت ہے جنہوں نے اپنے اقوال و اعمال سے ہندو مسلمانوں یا ذاتوں اور فرقوں کے اختلافات کم کرنے کی مبارک کوشش کی ہے۔ اور نفس انسانی کی شرافت اور تقدس کی تعلیم دی ہے۔ جیسے اکبر۔ دارا۔ ملک عنبر۔ سعداللہ خاں

دادو بابا۔ نانک۔ کبیر داس وغیرہ۔

(۷) ان مشاہیر کے حریت آموز ایثار آگیں حب وطن خیز اعمال و اقوال کو سلیس اُردو دلکش دھنوں میں نظم کرنا تاکہ ہر کس و ناکس انکو ہر جگہ گا بجا سکے اس طرح ہماری سوسائٹی کا ہر طبقہ اُن کے کارناموں سے واقف ہو جائے۔

(۸) قومی گیتیں اور لوریاں بنانا۔

(۹) کامل لغات اور انسائیکلوپیڈیا تیار کرنا ضرب المثل اور محاورات جمع کرنا۔

(۱۰) اُردو زبان میں شروع سے لیکر اب تک جو نثر و نظم کی کتابیں لکھی گئی ہیں انکو جمع کرنا خاص اُردو کتابوں کا ایک بڑا مرکزی کتب خانہ قائم کرنا جس کی شاخیں بتدریج تمام شہروں اور قصبوں میں پھیلائی جاسکیں۔ پرانی کتابوں میں سے مفید کتابیں چھاپکر شائع کرنا۔

(۱۱) مختلف صوبجات ہندوستان کے اردو ٹکسٹ بکس کی اصلاح کرنا از روئے مضامین تمام علوم فنون کی ابتدائی کتابیں لکھنا اور شائع کرنا۔

(۱۲) تمام اردو مصنفین اور مولفین کو ایک رشتہ معاونت و رفاقت میں منسلک کرنا اس کی بڑی ضرورت ہے اہل قلم گویا قومی دماغ کے اجزا ہوتے ہیں۔ ان اجزا کا انتشار ظاہر ہے کہ دماغ کو اپنے وظیفہ طبعی کے ادا کرنے سے روک دیگا جب دماغ ہی برابر کام نہ کرے گا تو انسان کیسے رہ سکتا ہے۔

(۱۳) اس نظام عمل کے سرانجام دینے کے لئے میں ایک تشکیل بنام اردو اکیڈیمی کی تجویز پیش کرتا ہوں اس تشکیل کی اوّل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے اُردو داں اصحاب علم و ارباب قلم کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اُنہیں تبادلہ خیالات اور باہمی استفادہ کا موقعہ دیا جائے اور اردو مصنفین کی ہمت افزائی علمی مشورہ مالی امداد اور خطابات کے ذریعہ کیجائے۔ اکیڈیمی کا مستقر ہمارے مردان سخن و پہلوانان قلم کے لئے ملجا و ماوے کا کام دیگا۔ اور جہاں طرح کا سامان مہیا رہیگا۔ اکیڈیمی کا مستقر و صدر مقام کل ملک کے لئے ادبی مرکز

بن جائے گا جہاں سے ہماری نوپیدا قومیت کے نشو و تکمیل کا کام ہمارے رؤسائے تحریر و تقریر کے ہاتھوں انجام کو پہونچے گا۔

دنیا میں کوئی بھی متمدن قوم نہ ایسی گزری ہے اور نہ ایسی موجود ہے۔ جو ایک یا ایک سے زیادہ علمی و ادبی مرکز نہ رکھتی ہو۔ قومیت کی ترقی اور اُسکے مخصوص تمدن اور تہذیب کی تشریح توضیح و محافظت کے لئے ایسے مرکز یا مراکز کی سخت ضرورت ہے۔ صرف یونیورسٹیاں ہی ایسے مراکز کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں کیونکہ اُنکا اول مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ اور غیر ماہرین فن اور عام صاحبان دماغ کو اُن کے یہاں بار نہیں مل سکتا۔ یونیورسٹی اگر مرکز ہے بھی تو بہت چھوٹے پیمانے پر اور ہندوستان کے غیر قومی یونیورسٹیاں تو مرکزیت کا دعوےٰ بھی نہیں کرسکتیں کسی قوم کے نشو و نما کے لئے علمی و ادبی مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ زوال بغداد سے مسلمانوں کا علمی تنزل شروع ہوا جو آخر کار سیاسی تنزل کا بھی باعث ہوا۔

ایکیڈیمی کے شرکا کے یہ اقسام ہوں گے:-

(۱) رسالہ ایکیڈیمی کے خریدار (رسالہ کی قیمت میں چندہ بھی شامل رہیگا) (۲) ارکان

(۳) رفقا (انکو رسالہ مفت ملیگا)

(۴) سرپرست جو پچاس روپے سے لیکر ایک سو روپیہ تک سالانہ چندہ دیں۔

کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ رکنیت کے شرائط حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) کلیہ جامعہ عثمانیہ کا ہر طیلسانی

(۲) ہر ایسا گراجویٹ جس کی دوسری زبان اردو فارسی یا عربی رہی ہو۔

(۳) ہر سند یافتہ اور صاحب دستار مولوی اُردو داں پنڈت۔

(۴) ہندوستانی یونیورسٹیوں کے علوم مشرقیہ فارسی و عربی کا ہر سند یافتہ۔

(۵) ہر اُردو اخبار نویس اسمیں موقت الشیوع رسالوں کے رؤسائے تحریر بھی شامل ہیں

(۶) ہر صاحب دیوان شاعر۔

(۷) ہر ایسا مصنف مؤلف یا مترجم جس نے کوئی اہم یا مفید کتاب تصنیف تالیف یا ترجمہ کی ہو
(۸) ہر وہ شخص جس کو دو ارکان کی تحریک و تائید پر جلسۂ عام میں منتخب کیا جاوے۔
چندہ دینے پر رکنیت کے حقوق و فوائد حسب ذیل ہوں گے۔
(۱) اکیڈمی کا رسالہ مفت ملیگا۔
(۲) اکیڈمی کی تمام شائع کردہ کتابیں اصلی قیمت پر ملیں گی۔
(۳) اکیڈمی کے جلسوں میں شرکت کا حق حاصل ہوگا
(۴) حق رائے و صورت حاصل ہوگا۔
(۵) اکیڈمی کے کتب خانہ سے کتابیں اپنے خرچ پر مستعار لیجا سکینگی (مقررہ پابندیوں کیساتھ)
(۶) ارکان و رفقا اپنی مصنفات کی طباعت و اشاعت میں ہر طرح امداد کے مستحق ہوں گے
رفقا کا انتخاب اراکین میں سے ہوگا۔ خاص قابلیت اور غیر معمولی لیاقت کے اشخاص منتخب ہونگے
انکی تعداد ہندوستانیوں کے لئے ۱۰۰ ہوگی اور باہر والوں کے لئے ۲۵ رفاقت کا معیار اتنا بلند رہیگا کہ اکیڈمی کا رفیق ہونا ہی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہوگی رفقا کو بھی وہی حقوق اور فرائض حاصل ہونگے جو اراکین کو ہونگے صرف اتنا فرق رہیگا کہ رفقا سے کوئی چندہ نہیں لیا جائیگا
اکیڈمی حیدرآباد دکن۔ لاہور۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ یا پٹنہ کسی ایک جگہ قائم کیجا سکتی ہے۔

[یہ مضمون ہمیں صوبۂ متوسط سے ایک صاحب نے بھیجا ہے۔ مضمون پر نام نہیں تھا اور اس کے ساتھ کا خط جس پر نام تھا بدقسمتی سے ضائع ہوگیا۔ مضمون کو جلد شائع کرنا مقصود تھا۔ تاکہ یہ بحث چھڑ جائے اور جامعہ کی اردو اکادمی کے ارکان اسے پڑھنے کے بعد اظہار رائے فرمائیں۔ اور اکادمی کے مستقل نظام کی تشکیل میں مدد دیں۔ اسلئے ہم یہ مضمون بے نام کے چھاپتے ہیں اور مضمون نگار صاحب سے معافی چاہتے ہیں۔ اگر وہ اسے پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے نام سے اطلاع دینگے تو ہم اسی شذرات میں شائع کر دیں گے۔ (جامعہ)]

چاند اور اُسکے متعلق جدید ترین تحقیقات

(ماخوذ از رسالہ المقتطف)

ہماری اس وقت یہ غرض نہیں ہے کہ چاند کے بابتہ کوئی مفصل مضمون لکھیں جبکہ گزشتہ سالوں میں کافی اس موضوع پر لکھ چکے ہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اُن مباحث کا خلاصہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا ہے جو ابھی حاصل ہوئے ہیں۔

چاند ہماری زمین سے تقریبًا دو لاکھ میل دور ہے۔ یہ دوری بمقابلہ دیگر اجرام سماوی کے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن خود زمین پر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کو دوری کی نسبت ہے۔ اُس کے مقابلہ میں تو یہ دوری بہت ہی زیادہ ہے۔ کیونکہ زمین کا محیط پچیس ہزار میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ چاند کی دوری کا آٹھواں حصہ ہے۔ باوجود اس بعد مسافت کے علماء فلک بمقابلہ زمین کے بعض بعض حصص کے، چاند سے زیادہ واقف ہیں۔ افریقہ و ایشیا کی درمیانی حالت کا اُنکو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن چاند کی بابتہ وہ قیاس کرتے ہیں کہ اس کے پہاڑوں کی بلندی کس قدر ہے۔ اس کے سمندروں اور نشیب زمین کی کیا کیفیت ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ تغیرات کس قسم کے اور کیوں وہاں ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایشیا اور افریقہ کے اکثر درمیانی ملک کے پہاڑوں کی بلندی اور انکے ملک کی جغرافیائی کیفیت وغیرہ سے وہ بالکل ناواقف و جاہل محض ہیں۔

جب سے دوربین ایجاد ہوئی ہے علمائے فلک برابر چاند کا معائنہ کرتے اس کی تصاویر حاصل کرتے اس کو ذریعہ خطوط عرضی تقسیم کرتے اور اسکی پہاڑوں کی بلندیاں اور اس کے سمندروں کی گہرائی و وسعت کا اندازہ کرتے رہے ہیں۔

لیکن سمندر حقیقت میں سمندر نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اس کرہ زمین پر دیکھتے ہیں۔ بلکہ

خالی وسیع زمین کا نام وہاں سمندر رکھا گیا ہے۔ اور پانی کا ایک قطرہ بھی اس سمندر میں نہیں ہے ہاں پہاڑ ہیں اور وہ زمین کے پہاڑوں سے زیادہ بلند ہیں اور بڑے بڑے غار ہیں اور ان غاروں میں بعض بعض نہایت چمکدار نورانی دھات ہے جیسے الماس وبلور، اور اسی طرح کی بعض بعض اور متور دھاتیں ہیں جن کے بڑے بڑے پتھر قیاس کئے جاتے ہیں انکی روشنی سے جو خطوط اور صورتیں بنتی ہیں وہ ان خطوط اور صورتوں سے بالکل متشابہ ہیں جو ہماری زمین کی ان متور دھاتوں سے نکلتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے یہ نام ان دھاتوں کا رکھا ہے۔

ہمارا چاند بمقابلہ دیگر سیاروں کے چاندوں کے بہت بڑا ہے اس کے مقابلہ کا کوئی چاند ہی نظام شمسی میں نہیں ہے۔ اسکا قطر ۲۱۶۳ میل ہے۔ جب ہم مشتری اور اس کے چاندوں کی طرف دوربین سے دیکھتے ہیں تو ہم کو ایک بہت ہی چھوٹا نقطہ چاندوں کا بمقابلہ اس سیارہ کے جس کے گرد وہ گردش کرتے ہیں نظر آتا ہے۔ لیکن جب قبہ فلک میں ہم زمین اور اسکے چاند کو دیکھتے ہیں تو کمی بیشی کا ایسا بین فرق نہیں محسوس ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر سیارات کے اقمار بمقابلہ ہمارے چاند کے زمین کی نسبت سے بہت چھوٹے ہیں۔ ہمارا چاند خود اس زمین کا ہی ایک جزو ہے۔ کروڑوں سال ہوئے جب وہ اس سے جدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت زمین کی گردش بمقابلہ اس زمانہ کے بہت ہی تیز تھی۔ پس ایک جانب بڑی ہو گئی اور اس میں سے ایک وزن مرکز سے دور چلا گیا۔ اور آسمانی خلاء میں مثل اور سیاروں کے گردش کرنے لگا۔ اسکا اندازہ (۵۰۰۰) پانچہزار ملین میل مکعب کیا جاتا ہے (۱۰۰۰۰۰۰ × ۵۰۰۰) = ۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰ میل مکعب یا (۱۰۰۰۰۰ × ۱۰۰۰۰۰۰ × ۷۸ × ۱۰۰۰۰۰۰۰) ٹن فی

۷۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

ٹن یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ زمین کا ۱/۴۹ حصہ حجم میں اور وزن میں سوا (۱¼) حصہ سو حصوں میں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ زمین کے ثقل کے مقابلہ میں چاند کا ثقل کم ہے کیونکہ

چاند پر جو ثقل ہے وہ ایسا ہی جیسا کہ چھلکہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ چھلکہ سے ہی جدا ہوا ہے۔ اور زمین کے قلب پر جو ثقل ہے وہ چھلکہ کے مقابلہ میں زائد ہے۔

اس تمام بحث اور کیفیت سے جو ظاہر کی گئی یہ ثابت ہوا کہ خود چاند زمین کا ہی ایک ٹکڑہ ہے جو زمین سے جدا ہو کر اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ عقلاء کا یہ بھی گمان ہے کہ وہ جگہ جہاں سے چاند جدا ہوا ہے بحر اوقیانوس و بحر پاسفک ہے۔ جس میں اتنا بڑا مثل چاند کے ایک ٹکڑا جدا ہو گیا اور اس وقت تک یہ کمی پوری نہیں ہوئی۔ قدیم زمانہ سے لوگ چاند کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بعض بعض نے تو چاند کی پرستش تک بھی کی ہے۔ اور بہت غور سے اس کی شکلوں اور اس کی اختلافی کیفیت کو برہنہ مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن باوجودیکہ وہ ماہوار ایک گردش کرتا ہے۔ لیکن کوئی فرق اس کی شکل کا نہیں دیکھا گیا۔ اس پر علمائے فلک نے مدتوں کے تجربہ کے بعد یہ رائے قائم کی کہ جس طرح وہ اپنے محور پر گھومتا ہے۔ اسی طرح وہ زمین کے گرد بھی اسی وقت میں گردش کرتا ہے۔ یعنی اسکا دور ۲۷½ دن میں ہوتا ہے۔ جسقدر حصہ اس کا آج ہمارے سامنے ہے۔ اور آج ہم قاہرہ میں ہیں۔ دوسرے روز اسی سبب سے بڑھتا جائیگا۔ اور یہی کیفیت اہل شام و اہل امریکہ و اہل یورپ کو نظر آئیگی۔ اور جو حصہ جس تاریخ میں قاہرہ والوں کو نظر آئے گا۔ وہی حصہ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کو بھی نظر آئے گا۔ پس لوگوں نے قیاس کیا کہ وہی حصہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ جو زمین کے سامنے ہوتا ہے چاند کی حرکت اپنے محور پر اور زمین کے گرد بمقابلہ دیگر اجرام سماوی کے تیز نہیں ہے۔ کیونکہ ۳۳۰۰ قدم فی سکنڈ ہے لیکن بندوق کی گولی اور توپ کے گولہ کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہے۔

چاند میں بمقابلہ زمین کے قوت جاذبہ بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زمین سے چھوٹا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے۔ اگر انسان چاند پر چڑھے تو وہ آسانی سے ایک ذقن سو قدم کی چھلانگ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں اس میں بمقابلہ زمین کے چھ گنا زیادہ قوت ہوئی اور اسکا سبب چاند کی کمی جاذبیت ہے۔

بعض بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ چاند کی سطح بالکل خالی ہے۔ نہ اس میں کوئی جاندار ہے نہ نباتات ہیں پانی ہے نہ ہوا ہے۔ اور یہ زمین بھی مثل چاند کے ہی ایک روز ہو جائے گی۔ جبکہ حیوان و نباتات اس پر سب ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن پروفیسر پکرنگ نے اپنی رصدگاہ سے بعد مشاہدہ قمر یہ اعلان کیا ہے کہ مذکورہ بالا خیال چاند کے بابتہ غلط ہے جس طرح سطح زمین پر ہوا محیط ہے۔ اسی طرح چاند پر پانی ہے۔ لیکن اسکی شکل سیال نہیں ہے۔ بلکہ بشکل برف جما ہوا یا بشکل گیس ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں سردی نہایت شدید ہوتی ہے۔ پس پانی جما ہوا رہتا ہے۔ بہت تھوڑی مقدار پانی کی ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ گیس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ زمین پر پانی تین شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض بعض مقامات قطبیہ میں زمین پر بھی یہی کیفیت دیکھی جاتی ہے۔

قوت جاذبہ کی کمی کے سبب سے چاند میں آکسیجن و ہائڈروجن گیس نہیں ہے۔ لیکن کاربونیک گیس بہت کثرت سے ہے اگرچہ گیسوں کی جو حالت بیان کی گئی وہ چاند میں ہے۔ لیکن پھر بھی اسباب معیشت کی چاند میں کمی نہیں ہے یعنی نباتات کی کثرت ہے۔ پروفیسر پکرنگ فرماتے ہیں کہ ان کے پاس نہایت قوی دلائل موجود ہیں کہ چاند میں نباتات کا وجود ہے مگر یہ نباتات صرف دن میں ہی اُگتے، نشوونما پاتے، پکتے اور خشک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ رات چاند کی نہایت درجہ سرد ہوتی ہے۔ کیونکہ درجۂ حرارت صفر سے ۱۰۰ درجے نیچے گر جاتا ہے اور اس سردی میں کوئی نباتات زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ چاند کا دن مثل زمین کے دن کے صرف چند گھنٹہ کا نہیں ہوتا بلکہ ہمارے چودہ روز کے برابر ہوتا ہے۔ اور یہ مدت بعض بعض نباتات کی نشوونما کے لئے کافی ہے۔

ہم نے ظاہر کیا ہے کہ سطح چاند پر بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور اُن میں بڑے بڑے غار اور آتش فشاں ہیں۔ اور سطح چاند پر جو کوئی تغیر ہوتا ہے اسکی وجہ یہی آتش فشاں ہیں۔ سطح پر یہ مثل جھریوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ کسی بوڑھے شخص کے چہرے پر جھریاں

پڑی ہوں۔

یہ آتش فشاں کبھی کبھی اب بھی چاند میں عمل کرتے ہیں بلکہ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ بعض بعض کا عمل اسس وقت تک جاری ہے۔ زمین کے آتش فشاں، بخارات پھینکتے ہیں یہ کچھ دور نہیں ہے کہ چاند کے آتش فشاں سے بھی بخارات نہ نکلتے ہوں اور چونکہ سطح چاند بمقابلہ زمین کے بہت ٹھنڈی ہے جیسا کہ ہم نے اول ذکر کردیا ہے۔ پس یہ بخارات بجائے پانی ہونے کے گیس ہو کر برف ہو جاتے ہیں۔ ان سفید خطوط کے بابتہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان آتش فشاں کے دہانوں پر جو برف ہے اسکا زنگ اور اس کے خطوط ہیں اور انکی شکل بالکل ان شکلوں سے ملتی ہوئی ہے جو ہم لیبوریٹری یعنی معمل میں برف پر روشنی کا انعکاس کرکے دیکھتے ہیں۔ اور یہ خطوط آفتاب کے نکلتے اور ڈوبتے وقت جب چاند پر عکس ڈالتے ہیں ظاہر ہوتے ہیں۔

اور شاید طویل خطوط جو ہمیں نظر آتے ہیں وہ ان نہروں کے ہیں جن پر اول اول پانی کوہ آتش فشاں سے نکل کر بہہ چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چاند زمین ہی کی اولاد ہے اور وہ حیات سے جیسا کہ بعض بعض کا خیال ہے خالی نہیں ہے۔

اسلام اور عقلیت

برٹش مسلم سوسائٹی لندن کے سامنے سی۔ اے سورا صاحب ال ال ایم نے اس موضوع پر ایک تقریر کی تھی جو اسلامک ریویو بابتہ فروری ۱۹۳۶ء میں چھپی ہے۔ ذیل میں اس تقریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

دین کیا ہے؟ دین وہ فطری طاقت ہے جو انسان میں موجود ہے اور اسے نیک بد کی تمیز میں مدد دیتی ہے اگر کوئی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ انسان میں یہ طاقت موجود ہے تو وہ گویا مذہبی عقیدہ کی جڑ کھوکھلی کر رہا ہے۔ درحقیقت مذہب کی بنیاد ہی اس مفروضہ پر ہے کہ انسان میں خیر و شر کی تمیز کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلعم سے سوال کیا کہ دین کیا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ "دین وہ مادہ ہے جس کے ذریعہ تم اپنے نیک کاموں پر خوش ہوتے ہو اور اپنی برائیوں سے نفرت کرتے ہو" لیکن اگر انسان میں یہ قوت فطرۃً موجود ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف مذاہب کی کیا وجہ ہے اور لوگوں کے عقائد اس قدر مختلف کیوں ہیں۔ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:-

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔

یہاں ہمیں اسلام کے خصائص میں سے ایک ایسی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے عقلی مذہب کے درجے تک پہنچا دیتی ہے بخلاف دوسرے مذاہب کے جو صرف اپنی تعلیمات کو صحیح بتلاتے

ہیں اور باقی مذاہب کی تعلیمات کو یکسر باطل ٹہراتے ہیں اور بخلاف ان مذاہب کے جو انسانی اختلافات کی تاریکی کے پردے کو چاک نہ کر سکے اسلام ایک مدلل اور معقول توجیہ پیش کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اختلاف عقائد کی وجہ آب وہوا، طبائع، ماحول اور سیاسی اجتماعی اور معاشی حالات کے اختلاف ہیں لیکن دامن فطرت میں تو صرف ایک سچے مذہب کے لئے جگہ ہے۔ اور وہ اسلام ہے۔ اسکا یہ دعویٰ ہے کہ تمام انبیا رصادقین کے مذاہب اپنی اصلی حالت میں ایک ہی تھے اور وہ ایک ہی پیام تھا جو آدم سے لیکر محمد (صلعم) تک دنیا کو پہنچایا جاتا رہا۔ ذرا توقف کیجئے اور سوچئے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس دین کی وسعت اسی قدر ہے جتنی انسانیت کی اور اسکی ابتدا بھی اسی وقت سے ہوئی ہے جب سے انسان معرض وجود میں آیا۔ اصول سب ایک تھے صرف بعض فروع میں نبی نوع انسان کی ضروریات کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

لفظ اسلام میں بھی ایک گنجینہ معانی پنہاں ہے۔ یہ نام خود رسول کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام" اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ۔ اب حقیقتاً اسلام کے معنی کیا ہیں اسکے دو پہلو ہیں۔ ایک خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، اس کی مرضی میں اپنے ارادے کو گم کر دینا جو تمام نیکیوں اور پاکیوں کا منبع ہے۔ اسکا دوسرا پہلو انسان سے اچھا سلوک کرنا ہے۔ تمام دنیا کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ہے۔ اس لئے کہ اپنے بھائی کے ساتھ احسان کرنا خدا نے لازم کر دیا ہے۔ کیسی اچھی طرح قرآن نے اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْہَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام "امن کا دین" ہے اب میں قرآن سے دوسری آیتوں کا حوالہ دیکر آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام کیوں ہماری عزت و احترام کا مستحق ہے: الم ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُم

ینفقون والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ہم یوقنون اولئک علی ہدی من ربہم واولئک ہم المفلحون

مندرجہ بالا آیتوں میں سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ محض عقیدہ اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے جبتک کہ اس کے ساتھ عمل بھی نہ ہو اس لئے کہ عملی پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے یعنی تقویٰ۔ اقامت صلوٰۃ اور اپنی دولت میں سے دوسروں کو دینا یہ قرآن کی افتتاحی عبارت ہے اور اس میں ہمیں صاف صاف یہ بتلایا گیا ہے کہ پچھلے مذاہب سچے تھے اور ہمارے لئے عمل صالح اور خیرات ضروری چیزیں ہیں نہ کہیں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور نہ عبارت میں کوئی الجھن ہے۔ روشن اور کھلا ہوا پیام ہمیں سنایا جاتا ہے اور عقل بے چون وچرا اسے صحیح تسلیم کر لیتی ہے اس کے علاوہ یہ باتیں جو اوپر بتائی گئی ہیں کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں ایمان بالغیب، وحی پر اعتقاد۔ قیامت کا یقین اور عبادت وخیرات کی عملی تعلیم انہیں اصول پر ہر دین کی بنیاد ہے لیکن باوجود اس یکسانیت کے جو مسائل میں اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان پائی جاتی ہے اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اسکا وہ تخیل ہے جو اس نے خدا کی ذات کے متعلق پیش کیا ہے قران میں خدا کے بہت سے نام ہیں جن میں سے عام 'اللہ' ہے لیکن سب سے زیادہ پر معنی لفظ 'رب' ہے اس لفظ کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس کا صحیح طور پر ادا کرنا مشکل ہے۔ بہر حال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد پیدا کرنے والا، پالنے والا حفاظت کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو فطرت میں پائی جاتی ہیں اور فطرت ان قوانین کا نام ہے جس سے دنیا قائم ہے۔ پھر اسلام ہم سے ایک خدا پر ایمان رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے وہ خدا جو تمام جماعتی اور قومی دیوتاؤں سے بلند وبالا ہے۔ اسلام کا خدا کسی خاص قوم کا خدا نہیں ہے کہ وہ اُسی قوم کی ضروریات کا نگراں رہے بلکہ وہ تو قرآن کی سب سے پہلی آیت میں 'رب العالمین' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا یہ تخیل انسانی برادری کے دائرے کو وسیع تر بنا دیتا ہے دنیا کی تمام قوموں کو اپنے احاطے میں داخل کر لیتا ہے اور

انسانی ہمدردی کو غیر محدود کر دیتا ہے۔ توحید اسلام کا بنیادی اصول ہے اور اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ مثال کی طور پر ملاحظہ ہو کہ ذیل کی آیات میں کس خوبصورتی کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے " اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِی تَجْرِی فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۵

قرآن نے توحید کے ثبوت میں کتاب فطرت کو بار بار پیش کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان گوناگوں قوانین فطرت میں جن پر عالم کا مدار ہے ایک ہی اصول جاری وساری نظر آتا ہے۔ فطرت کی یکسانیت خالق کی وحدت کا حتمی ثبوت ہے۔ اسلام میں خدا کے وجود کو معمہ نہیں بنایا گیا ہے۔ توحید میں تثلیث اور تثلیث میں توحید کی بھول بھلیاں جسے نہ عقل تسلیم کرے اور نہ عقیدہ قابل اطمینان طریقہ سے اسکی توجیہ کر سکے یہاں نہیں ہے۔ یہاں تو انسانی زندگی اور فطرت کی کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعے سے یہ سمجھا دیا گیا ہے خدا کون اور کیا ہے۔ تصویر صاف، صحیح اور معقول ہے۔ اس میں تناسب اور یکرنگی ہے۔ کلی اور جزوی حیثیت سے ادہر سے یا اُدہر سے جس طرح بھی اسکا مطالعہ کیا جائے عقل اس میں کوئی نقص نہیں نکال سکتی یہ بولتی ہوئی تصویر ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یقین واثق پیدا کر دیتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن انسان کے متعلق کیا کہتا ہے :-

(۱) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ

(۲) لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔

ان دونوں آیتوں سے واضح ہو گیا کہ انسان بے گناہ پیدا ہوتا ہے گناہ گار نہیں جیسا کہ عیسائیت ہمیں یقین کرانا چاہتی ہے اور سب سے زیادہ قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ انسان میں ترقی اور تکمیل کی عظیم الشان فطری صلاحیت کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ ہر بچہ جو

اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے بے گناہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا کہ اس کے ماں باپ مسلم ہیں یا غیر مسلم اس کے علاوہ اسلام میں بچے کو انسانی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی اصطباغ کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے کہ ہر بچے پر اس کے خالق کی عظمت اور تقدس کی مہر ہوتی ہے اس مضغۂ گوشت پر قرآن نے بہت زور دیا ہے اور اسے خدا کی ایک نشانی قرار دیا ہے۔

وفی الارض آیاتٌ للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون۔

اب یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں اس عقیدے کی گنجایش نہیں ہے کہ انسان گناہ کا پتلا ہے اور اسکی نجات کے لئے خدا کے بیٹے کی قربانی کی ضرورت تھی۔ وہ انسان جو بے گناہ پیدا ہوا ہے اور جسے بے شمار جسمانی، دماغی، اخلاقی اور روحانی طاقتیں عطا کی گئی ہیں۔ اسکا مستقبل خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اُسے نہ تو کسی وسیلہ کی حاجت ہے اور نہ اسکی ضرورت ہے کہ کوئی دوسرا اس کے لئے جان دے۔ قرآن کہتا ہے۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات لہم مغفرۃٌ و اجرٌ عظیم۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام حیات آخری کے متعلق کیا کہتا ہے۔

(۱) فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین جزاءً بما کانو یعملون ہ

(۲) یوم تری المومنین والمومنات یسعیٰ نورہم بین ایدیہم وبایمانہم بشریکم الیوم جنّاتٌ تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ذلک ہو الفوز العظیم ہ

(۳) یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ایک ایسی قوم کے سمجھانے کے لئے جو باریک خیالات اور اعلیٰ تخئیلات کے ادراک کی پوری صلاحیت نہیں رکھتی تھی جنت کی لذتوں اور دوزخ کی تکالیف کی تصویر کھینچنا نہایت ضروری تھا۔ اپنے زمانہ کے لوگوں کو رسول اللہ صرف انکے احساسات کے ذریعے سے متوجہ

کر سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جنت اور دوزخ کی بہت شوخ تصویریں نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ نہایت خوبی سے اسکا مفہوم بھی خود رسول ہی نے اس حدیث میں بیان کر دیا ہے جو ابو ہریرہ سے منقول ہے۔

قال اللہ عز وجل عددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علےٰ قلب بشر۔

کیا اب بھی کسی کو قرآنی آیات میں روحانیت کی کمی کی شکایت ہو سکتی ہے اسلام بار بار انسان کی روح کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے اخلاق عالیہ کی طرف اسے توجہ دلاتا ہے پھر ایسی حالت میں مادیت کا الزام صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اس امر کی کوشش کی ہے کہ ان اصول پر جو کم و بیش ہر مذہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں بحث کروں اور ان میں ہر ایک کی جو تصویر اسلام نے پیش کی ہے وہ آپ کو دکھاؤں اور عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھوں۔ اسلام میں مجھے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جسے بحیثیت عقلیت پسند کے میں رد کر سکوں کوئی جزو بھی اسکا ایسا نہیں جس کی قابل اطمینان توجیہ موجود نہ ہو۔ خدا، فطرت، انسان اور قیامت ان سے میں نے مختصراً بحث کی ہے اور سرچشمہ اسلام یعنی قرآن کا حوالہ دیکر اپنے دعوے کو ثابت کر دیا ہے۔

محمد رسول اللہ نے جو تاریخ کے تاریک ترین دور میں پیدا ہوئے تھے اور جن کی قوم اپنی جہالت اور وحشت کے لئے تمام دنیا میں بدنام تھی، صحیح دین فطرت یعنی اسلام کو پھیلانے کی کوشش میں ہمارے سامنے انسانیت کا بہترین تخیل پیش کیا ہے اور اس عجوبہ گاہ عالم میں انسان کا جو درجہ ہے اور اسکی پیدائش کی جو غایت ہے اُسے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے انہوں نے ہمیں ایسے مقاصد کی تعلیم دی ہے جو تمام تر علمی حقائق پر مبنی ہیں اور ایسے قوانین عطا فرمائے ہیں جو کرۂ ارض کے ہر حصے میں یکساں طور پر نافذ ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ مطالعہ فطرت کے لئے انسان کے ہاتھ میں ایک نئی مشعل دیدی ہے۔ انسانی ترقی اور تمدن کی وہ کامل دنیا جو آج کل بھی ہمیں ایک دھندلے ستارے کی طرح نظر آتی ہے اس دنیا کی صحیح تصویر صحرائے عرب کے ایک بسنے والے نے چودہ سو برس پہلے ہمارے سامنے پیش کر دی تھی۔ سب سے بڑا عقلیت پسند اور انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد وہ عرب کا رسول تھا جو ہماری عزت اور احترام کا مستحق ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

جوہر فرد

اس کی ساخت اور خواص

قبل اسکے کہ میں جوہر فرد اور اس کی ساخت کے متعلق موجودہ علمی تخیل کا کچھ بیان کروں یہ لازمی ہے کہ میں ان اصحاب کے لئے جو کیمسٹری سے بالکل ناواقف ہیں جوہر فرد اور سالمہ مادہ کی وہ تعریف اور اس کے متعلق وہ کام جو زمانہ قدیم کے سائنس دانوں نے کیا ہے بیان کروں۔ اسی سلسلہ میں یہ بتانا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ سائنس اور خصوصاً کیمسٹری کا اصلی مقصد کیا ہے۔

سائنس انسان کی تمام علمی معلومات کے مجموعہ کا نام ہے جس کے دائرہ میں کل کائنات آجاتی ہے۔ سائنس علم کا وہ ذخیرہ ہے جو تجربات اور مظاہر سے حاصل ہو کر مسلسل حقائق کی صورت اختیار کرے اور پھر کسی خاص تنظیم کے جامہ سے ملبوس ہو سکے۔ سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ قدرت میں یکسانی اور وحدت پائی جاتی ہے۔ سائنس کی یہ کوشش ہے کہ کائنات کے ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے اجزا کا مکمل علم حاصل کرے۔ اس معنی میں کہ یہ اجزا خود تنہا یا ایک دوسرے سے مل کر کیا کیا تبدیلیاں اور اثرات پیدا کرتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ سائنس کا مقصد معلومات عامہ ہے۔ اس مقصد کا حصول سائنس کی روز بروز ترقی کے ساتھ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ٹینی سن کا خیال جو وہ ان اشعار کی صورت میں ادا کرتا ہے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے ؎

So runs my dream; but what am I ?

An infant crying in the night .

An infant crying for the light,

And with no language but a cry.

ہماری انسانی عقل نے سائنس کو ایک درخت سے تشبیہ دے رکھی ہے جس کے ایک ہی تنے سے مختلف شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور ہر شاخ کا نام بغرض عام فہمی الگ الگ رکھا گیا ہے مثلاً علم نجوم، طبعیات، علم الکیمیا، معدنیات، علم طبقات الارض، علم الحیات ۔

علم الکیمیا وہ علم ہے جو ہمیں کائنات کے تمام موجودہ مادوں کی حقیقت اور ان کی اصلی اور انتہائی ترکیب کا پتہ دے اور یہ بتائے کہ مختلف مادے ایک دوسرے سے مل کر کیا مظاہر پیدا کرتے ہیں ۔ . . . . . . علم سائنس کی ترقی نے علم الکیمیا کو بذات خود اس قدر وسیع علم بنا دیا کہ اس شاخ کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرنا لازم ہو گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کیمیا کی تقسیم مختلف شاخوں میں کر دی گئی ہے ۔ مثلاً نامی، غیر نامی، برقی - طبعی کیسٹری سائنس داں اپنے علم کا استعمال اکثر تجارت اور دیگر مفید کاموں میں کرتے ہیں اس وجہ سے ایک نئی کیمسٹری کا نام Industrial یا صنعتی Technical کیمسٹری اور اضافہ ہو گیا ہے۔

زمانہ قدیم سے لوگ تمام مادوں کو جو قدرت میں پائے جاتے ہیں چند اصلی یا بنیادی مادوں سے بنا ہوا خیال کرتے چلے آتے ہیں ۔ کسی زمانہ میں ہوا ۔ پانی وغیرہ عناصر خیال کئے جاتے تھے ۔

۱۷۷۷ء میں فرانسیسی عالم کیمیا لوازیر (Lavoisier) نے بالتحقیق تجربات سے یہ ثابت کر دیا کہ ہوا دو گیسوں کا مخلوط ہے جن گیسوں کا نام مختلف صورتیں اختیار کرنیکے بعد آج کل نائٹروجن اور آکسیجن قرار پایا ہے ۔

اسی طرح سے پانی عرصہ دراز تک عنصر خیال کیا جاتا تھا ۱۷۸۱ء میں کیونڈش نے پانی کو دو عناصر یعنی ہیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ثابت کر دیا ۔

لفظ عنصر یا Element کے موجودہ تخیل کے لئے ہم رابرٹ بائل Boyle اور اسکے

بعد لوازیر Lavoisier کے مشکور ہیں۔ آج کل کے کیمیا داں عنصر اس مادہ کو کہتے ہیں جو ابتک کسی دوسرے قسم کے مادہ میں تقسیم نہو سکا ہو ۱۹۰۸ء تک Didymium عنصر خیال کیا جاتا تھا لیکن اس سنہ میں ایک جرمن کیمسٹ Welschach نے متعدد تجربات کی بنا پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ "عنصر" دراصل دو عناصر کا مخلوط ہے چنانچہ اس سنہ سے ایک عنصر Didymium ختم ہوگیا اور اسکی جگہ دو عناصر Praseodynium اور Neodymium پیدا ہو گئے عنصر کی اس تعریف کی بنا پر آج کل کیمیا داں کو جو عنصری مادے یا عناصر معلوم ہیں ان کی تعداد ۱۹۲۷ء تک ۹۲ تھی۔ زمانہ قدیم کے فلسفی مادے کی ساخت اور بناوٹ کے متعلق عجیب عجیب خیالات گڑھا کرتے تھے۔ ان تصورات میں جو یونان۔ ہندوستان اور اٹلی کے فلسفیوں کے ہم کو دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں بہ حیرت ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان سب فلسفیوں کی رائے قریب قریب ذیل کے چار اصول پر مشتمل کیجا سکتی ہے جو آج کل بھی بہت تبدیلیوں کے بعد اپنے ہزار ہا سال قبل کے رنگ پر قائم ہیں جن چار اصولوں کی تعلیم ان لوگوں نے دی وہ یہ ہیں:-

۱۔ مادہ منقسم ہو سکتا ہے۔

۲۔ تمام چیزیں چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنی ہوئی ہیں۔

۳۔ یہ ذرے لگاتار حرکت میں ہیں۔

۴۔ یہ حرکت کسی بیرونی طاقت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان ذروں کی بذات خود یہ خاصیت ہے کہ وہ حرکت کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ذرے دکھائی نہیں دئے جا سکتے اور یہ کہ یہ ذرے ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔ ہر چیز کی خاصیت انہیں ذروں کی خاصیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یونان کے فلسفیوں کے پاس اس نظریہ کے صحیح ہونیکے لئے کوئی تجربی اور حکمی ثبوت نہ تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ زمانہ حال میں باوجود لاتعداد تبدیلیوں کے یہ نظریہ کم و

پیش قائم ہے۔

رابرٹ بوائل، رابرٹ ہوک، جان میگو، وغیرہ وغیرہ نے اس نظریہ کو پھیلانے میں بہت زور دیا۔ روسی کیمسٹ M. W. Lomonosoff نے ۱۷۴۱ء میں اس نظریہ کو اچھا اور زیادہ مضبوط بنا دیا۔ اس کے بعد جان ڈالٹن نے ۱۸۰۱ء میں اسی نظریہ کو جو عرصہ دراز سے مردہ ہوچکا تھا۔ پھر جگا دیا اور ۱۸۰۳ء میں وہ مشہور اصول اسی نظریہ کے قائم کئے جو آج کل اسی صورت میں ہر کیمیائی عمل کو سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔

ڈالٹن کے نقطۂ نظر کے مطابق جوہر فرد مادہ کے اس چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو کہتے ہیں جو کسی کیمیائی طریقہ عمل سے پھر تقسیم نہ ہوسکے۔ گویا ڈالٹن کا جوہر فرد وہی ہے جو عربوں کا جزو لایتجزیٰ ہے۔

ڈالٹن کے نظریہ کے مطابق ہر مرکب اسی جوہر فرد کے ملنے سے بنتا ہے۔ چونکہ جوہر فرد مادہ کی تقسیم کی آخری حد ہے اس لئے کسی مرکب میں کسی عنصر کے ایک جوہر فرد سے کم کا موجود ہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔

ہر مرکب کی خاصیت ایسی جوہر فرد کی کمی اور بیشی پر اور اسکی قسم پر منحصر ہے۔ مثلاً دہی دو قسم کے جوہر فرد مختلف تعداد میں ایک دوسرے سے ملکر مختلف مرکبات پیدا کرتے ہیں۔ پانی میں ایک جوہر فرد آکسیجن دو جوہر فرد ہائیڈروجن کے ساتھ ملا ہوا ہے مگر بجائے ایک آکسیجن کے اگر دو آکسیجن جوہر فرد ہائیڈروجن جوہر فرد سے ملیں تو دوسرا مرکب جس کو Hydrogen Peroxide کہتے ہیں بنتا ہے۔ ایک مرکب کو یعنی پانی کو ہم پیتے ہیں لیکن دوسرے مرکب کو باوجود اس کے کہ وہ انہیں دو اجزا سے بنا ہوا ہے ہم دوائی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق یہ لازمی ہے کہ ہر ایک قسم کا مرکب ہمیشہ ایک ہی نسبت میں مختلف جوہر فردوں سے مل کر بنتا ہے۔ مثلاً کھانے کا نمک خواہ امریکہ میں تیار کیا جائے یا ہندوستان میں سانبھر جھیل سے نکالا جائے یا جرمنی میں کسی نئی ترکیب سے تیار کیا جائے ہمیشہ ایک ایٹم کلورین

اور ایک ایٹم سوڈیم سے بنا ہوا پایا جائیگا۔ ان ایٹموں کے اس چھوٹے سے چھوٹے مجموعہ کو جو اپنی ہستی قائم رکھ سکے مالیکیول کہتے ہیں۔

کیمیا داں جب تمام مادوں کو چند عناصر سے بنا ہوا خیال کرنے میں متفق ہو گئے تو پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ سب عناصر ایک ہی عنصر کی مختلف شکلیں تو نہیں ہیں۔ رابرٹ بوائل کا خیال تھا کہ سب عناصر ایک ہی مادہ سے بنے ہوئے ہیں بر زیلیس کا خیال اس کے برعکس تھا کہ نہیں ہر عنصر بذات خود علٰحدہ مادہ ہے اور دو عناصر میں باہم کوئی تعلق نہیں۔

جب لوگوں کو جوہر فرد کا تخیل صحیح طور پر ذہن نشین ہو گیا تو کوشش شروع ہوئی کہ انکا وزن معلوم کرنیکی ترکیب نکالی جائے۔ ہر چیز کو تولنے کے لئے لازمی ہے کہ کچھ اوزان مقرر کئے جائیں۔ چونکہ جوہر فرد سے چھوٹی اور چیز نہیں تھی اس لئے کسی کو تولنے کے لئے جو باٹ مقرر ہو سکتا تھا وہ صرف کسی دوسرے عنصر کا جوہر فرد ہی ہو سکتا تھا جب یہ معلوم ہوا کہ ہائیڈروجن سے ہلکا اور کوئی عنصر نہیں ہے تو تمام عناصر کے ایٹمی وزن ہائیڈروجن کے جوہر فرد سے مقابلہ کرنیکے بعد رکھے گئے یہ کس طرح کیا گیا اور اب کس طرح کیا جاتا ہے۔ یہاں بیان کرنا ممکن ہے اور نہ غرض مضمون ہے۔ چنانچہ مختلف کیمیا دانوں نے ایٹمی اوزان کی فہرست قائم کی ۱۸۱۵ء میں لندن کے مشہور ڈاکٹر پراؤٹ ان ایٹمی وزنوں پر غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ وزن ہمیشہ پورے عدد اور کسور سے پاک ہوتے ہیں یعنی ہر جوہر فرد ہائیڈروجن کے جوہر فرد کا ایک خاص حاصل ضرب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے رائے قائم کی کہ ممکن ہے کہ تمام جوہر فرد یعنی تمام عناصر ہائیڈروجن سے ہی بنے ہوئے ہوں لیکن اس رائے کو کسی نے اہمیت نہ دی اس وجہ سے کہ مختلف عناصر کے ایٹموں کے وزن ہمیشہ پورے عدد نہیں ہوتے۔

۱۸۴۳ء میں گمیلن نے عناصر کی انکے ایٹمی اوزان کے مطابق ایک فہرست تیار کی ۱۸۶۴ء میں ایر اور ۱۸۶۳-۶ء میں نیولینڈ نے اسی سلسلہ میں یعنی

عناصر کے وزن اور صفات کے بتلاتے ہیں بہت کام کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب عناصر اٹمی وزنوں کے مطابق سلسلہ وار لکھے جائیں تو ہر سات عناصر کے بعد ایک عنصر آتا ہے۔ جو اوپر کے عنصر سے کیمیائی خواص میں مشابہ ہوتا ہے۔ اسی کو ۱۸۶۹ء میں مشہور روسی کیمیا داں (منجلف) نے Periodic Law کے نام سے مستند طور پر چھاپا۔

چونکہ مینجلیف کے زمانہ میں Helium. وغیرہ گیس دریافت نہیں ہوئے تھے اس لئے ان نئے گیسوں کو ایک نئے خانہ میں جس کا نمبرہ رکھا گیا جگہ دی گئی۔ اس نقشہ کو غور سے دیکھئے سے فوراً معلوم ہوتا ہے کہ عناصر سلسلہ وار قطاروں میں لکھے جائیں تو ہر آٹھواں عنصر پہلے عنصر سے کیمیائی اوصاف میں مشابہ ہے۔

لیتھم (Li) ۲-بریلیم (Be) ۳-بورن (B) ۴-کاربن (C) ۵-نائٹروجن (N) ۶-آکسیجن (O) ۷-فلورین (F)
۸-سوڈیم (Na) ۹-میگنیسیم (Mg) ۱۰-المونیم (Al) ۱۱-سلیکن (Si) ۱۲-فاسفورس (P) ۱۳-گندھک (S) ۱۴-کلورین (Cl)
۱۵-پوٹیسیم-۱۶-کیلسیم (Ca) ۱۷-سیلنیم (Se) وغیرہ

کیمیائی مشابہت کو سمجھانے کے لئے اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح مثلاً لیتھم کسی دوسرے عنصر کے ساتھ مرکب بناتا ہے۔ لیتھم کے دو جوہر فرد آکسیجن کے ایک جوہر فرد سے مل سکتے ہیں اسی طرح سوڈیم کے بھی دو ہی جوہر فرد اور اس کے پیچھے آنیوالے عنصر پوٹاسیم کے بھی دو ہی جوہر فرد آکسیجن کے ایک جوہر فرد سے مرکب بناتے ہیں۔ ان مرکبات کے خواص یکساں ہیں۔

مینجلیف نے ان تمام باتوں کو حیرت انگیز اعتقاد کے ساتھ شائع کیا اور یہ ہی نہیں کہ اپنے زمانہ کے موجودہ عناصر کے خواص بتائے ہوں بلکہ چند نئے عناصر کی پیشین گوئی بھی کر دی اور انکے اوصاف ایک جگہ قلم بند کر دئے۔ جن کا ذکر اس مقام پر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مینجلیف نے ۱۸۷۱ء میں لکھا کہ ایک نیا عنصر ملے گا جس کا نام میں فی الحال Aluminium. رکھتا ہوں اس کے اوصاف یہ ہونگے اس کے اٹیم کا وزن ۶۸ ہوگا۔ تھوڑی سی گرمی سے پگھل جائے گا۔ پانی سے ۶ گنا بھاری ہوگا ہوا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس کے دو جوہر فرد آکسیجن

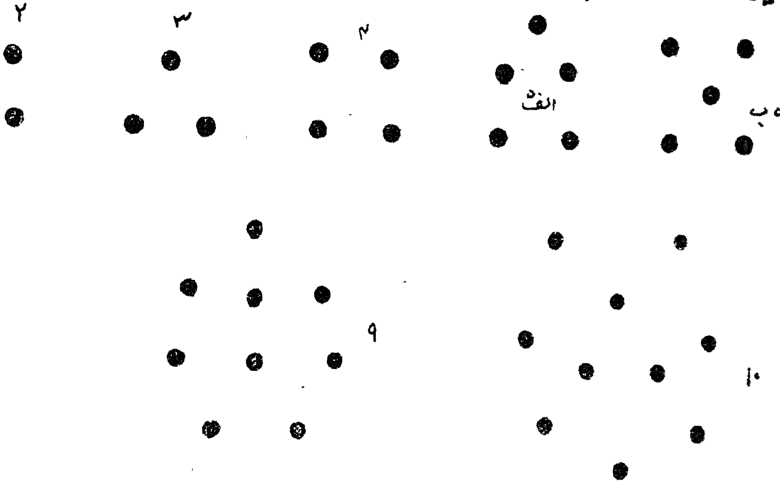
کے ۳ جوہر فرد سے مل کر مرکب بنائیں گے۔ اسکا انکشاف بذریعہ طیف نما کے ہوگا۔ ۱۸۷۵ء میں فرانسیسی کیمیا داں نے طیف نما (Spectroscope) کے ذریعہ ایک عنصر کا انکشاف کیا اور معلوم کیا کہ اسکا ایٹمی وزن ۹ر ۶۹ اور پگھلنے کا درجہ حرارت ۳۰ پانی سے یہ عنصر ۶ گنا بھاری پایا گیا ہوا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس کے ۲ جوہر فرد آکسیجن کے ۳ جوہر فرد سے مل کر مرکب بناتے ہیں۔

اس عنصر کا نام آج کل گیلیم ہے اور نقشہ مندرجہ صفحہ ۴۰ میں اسے درج کیا جائے تو تیسرے خانہ میں اسکی جگہ المونیم کے نیچے ہوگی اور چونکہ (مینڈلف) کے زمانہ میں ایٹمی وزن ۶۵ اور ۷۲ کے درمیان کوئی عنصر نہیں تھا اور چونکہ وہ عنصر جس کے ایٹم کا وزن ۷۲ تھا ۶۵ کے بعد بوجہ اختلاف خواص المونیم اور اس کے نیچے آنیوالے عناصر کے اس خانہ میں نہیں لکھا جا سکتا تھا اس لئے اس نے یہ یقین کامل یہ کہدیا کہ اس خالی جگہ پر دوسرا جوہر فرد آنا چاہئے جس کے خواص جو اوپر بیان کئے گئے اس نے اندازاً اوپر کے عناصر کے خواص سے اخذ کر لئے۔ اسی طرح سے مینڈلف نے اور کئی عناصر کی پیشین گوئی کر دی جو بعد میں صحیح نکلی۔ مگر اس سب کے باوجود اس طریقہ ترتیب سے پورے طور پر عناصر کی تنظیم نہو سکی۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ایٹمی وزن کی بنا پر ٹھیک ٹھیک اس نقشہ کے اندر جگہ نہ پا سکے جیسا کہ ان میں خطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ آیوڈین کہ جس کا ایٹمی وزن ۱۲۶ ہے ٹیلوریم سے جس کا وزن ۱۲۷ ہے قبل آنا چاہئے مگر بوجہ مشابہت اوصاف قبل لکھے نہیں جا سکتے۔

اس موقعہ پر میری غرض اس نقشہ کے صحیح ہونیکی دلیلیں یا اسکے نقائص بیان کرنا نہیں ہے۔ باوجود تمام خامیوں کے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس کی وجہ سے مختلف عناصر میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مشابہت پائی جاتی ہے جس سے کیمیا دانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جوہر فرد بھی کسی اور چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا ہے اس لئے کہ کسی اور طریق پر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جوہر فرد کا وزن کسی خاص حد تک بڑھ

جانے کے بعد عناصر کے خواص پھر کیوں دوبارہ مشابہ ہو جاتے ہیں اس سب کے سمجھانے کے واسطے صرف ایک یہی ترکیب خیال میں آسکتی ہے کہ عناصر کی خاصیتیں جوہر فرد کے اندر ان چھوٹے ذروں کی ترتیب پر مبنی ہیں اور یہ کہ یہ ترتیب ان ذروں کی ایک خاص تعداد کے بعد پھر وہی ہو جاتی ہے جو پہلے تھی

جیساکہ فان مایر کے مشہور تجربہ سے جو اس نے مقناطیسوں کی ایک دوسرے پر کشش معلوم کرنیکے واسطے کئے تھے معلوم ہوگا یہ تجربہ اس طریقہ پر کیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے مقناطیس مثلاً مقناطیسی سوئیاں کارک میں اٹکاکر پانی پر تیرا دی گئیں اس طرح سے کہ ان چھوٹے مقناطیسوں کے ایک سی سرے۔ (مثلاً اثباتی) اوپر تیرتے رہیں قوانین مقناطیسی کی رو سے یہ مقناطیس ایک دوسرے کے پاس کبھی نہ آسکیں گے۔ اگر ایسی صورت میں ایک بڑا مقناطیس غیر منفی سرے کا اوپر کچھ فاصلہ پر رکھا جائے تو یہ چھوٹے مقناطیس حسب ذیل شکلوں میں اپنے کو ترتیب دیتے ہیں۔



جیساکہ ان شکلوں سے ظاہر ہے ۱ مقناطیس والی شکل اور ۹ مقناطیس والی شکل میں ضرور کچھ مشابہت ہے۔ اسی طرح ۳ اور ۱۰ مقناطیس والی شکل میں اندر کے تین مقناطیس ایک

ہی طرح ترتیب دئے ہوئے ہیں۔ اگر ہم بجائے ان چھوٹے مقناطیسوں کے جوہر فرد کے اندر چھوٹے چھوٹے ذروں کو خیال کرلیں اور یہ کہ کیمیائی مشابہت ان ذروں کی ترتیب کی مشابہت سے پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تصور کرلیں کہ یہ ذرے یکساں قوت رکھنے کی وجہ سے حرکت میں رہتے ہیں اور کسی دوسری مرکزی قوت کی کشش سے اپنے کو خاص خاص شکلوں میں ترتیب دے لیتے ہیں تو اس کے بعد ہم اب سمجھ سکتے ہیں کہ اٹمی وزن بڑھنے کے بعد کچھ دور چل کر پھر عناصر میں کیمیائی مشابہت کیوں پائی جانے لگتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کی ترقی نے قدیم زمانہ کے کیمیادانوں کے جوہر فرد اور مولیکول کی خیالی تصویر کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔ جوہر فرد اور مولیکول دراصل مادہ سے بنے ہوئے ریزوں کا نام ہے۔ یہاں تک کہ اب جوہر فرد اور مولیکول کی جسامت اور حقیقی وزن دریافت کرنیکی کوشش کیجانے لگی کیمیا کے ایک پروفیسر نے سونے کی مولیکول کی جسامت معلوم کی ہے ان تجربات کے صحیح ہونیکی دلیل یہی ہے کہ ۱۲ مختلف ایک دوسرے سے بالکل جدا طریقوں پر مولیکول کی جسامت معلوم کئے جانے پر وہی نتیجہ نکلا یہاں پر صرف ہیڈروجن کی جسامت کا بتا دینا کافی ہوگا۔ ہائیڈروجن کے مولیکول کا صحیح وزن ۳٫۲۴×۱۰^-۲۴ گرام ہے ایک

c. c ہیڈروجن گیس میں (درجہ حرارت اور ہوائی دباؤ ۷۶۰) ۲۵×۱۰^۱۸

یعنی ۲۵ ٹرلین مولیکول ہوتے ہیں۔ کلیہ اوگیڈرو کے مطابق ہر گیس کے ایک c. c میں مولیکول کی تعداد برابر ہوتی ہے (لوشمید نے سب سے پہلے مولیکول کی جسامت معلوم کرنے کے قاعدے نکالے اس وجہ سے ایک c. c میں مولیکول کی تعداد کو اکثر لوشمید کا عدد کہتے ہیں۔

جوہر فرد کو ان چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا خیال کرنیکی وجہ صرف ایک یہ ترتیب Periodic table ہی نہیں ہے۔ بلکہ کچھ اور اس سے کہیں اہم تر اور قابل یقین وجوہ ہیں جو شک وشبہ کو بالکل مٹا دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر تفصیل سے ان وجوہ کا بیان کرنا

بیکار ہوگا۔ مگر کچھ انکے متعلق کہنا لازمی ہے تاکہ اصل مضمون سمجھ میں آسکے۔

زمانہ دراز سے یہ بات معلوم تھی کہ ہر عنصر ایک خاص قسم کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً سوڈیم کی روشنی زرد سٹرانشیم کی سرخ۔ بیریم کی سبز۔ تانبے کی نیلی وغیرہ وغیرہ ہوتی ہیں۔ یہ کہ اس روشنی کا تعلق جوہر فرد (ایٹم) سے ہے اور مولیکول سے نہیں ہے اس طرح ثابت کیا گیا کہ سوڈیم کسی شکل سوڈیم کلورائڈ (نمک) سوڈیم نائٹریٹ (شورہ) یا کسی اور مرکب شکل میں کیوں نہو ہمیشہ زرد روشنی دیگا۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر عنصر کی روشنی کی وجہ سے جوہر فرد ہے نہ کہ مولیکول۔ روشنی کی کلیوں کے مطابق یہ مانا جاتا ہے کہ روشنی نہایت ہی چھوٹے (ایتھر) ذرات کے بے انتہا تیزی سے حرکت کرنے سے وقوع میں آتی ہے لہذا یہ ماننا لازمی ہوجاتا ہے کہ جوہر فرد بھی اور چھوٹے ذرات سے بنا ہوا ہے اسی بات کا مزید ثبوت زیمان کے تجربہ سے ملتا ہے جو اس نے روشنی اور مقناطیس کے تعلقات معلوم کرنے میں کئے۔

۱۸۹۷ء میں اس نے یہ دیکھا کہ عناصر سے جو روشنی نکلتی ہے اور اسکا جو طیف بنتا ہے وہ مقناطیسی طاقت کے اثر سے بدل جاتا ہے کچھ بعد معلوم ہوا کہ برقی قوت سے بھی عناصر کا طیف بدل جاتا ہے۔ ان تجربات سے اس امر کا کافی ثبوت مل گیا کہ جوہر فرد بھی چند چھوٹے ذروں کے مجموعہ سے بنا ہوا ہے اور یہ کہ ان ذروں پر برقی قوت اثر کرتی ہے۔

فن طیف پیمائی نے اس قدر عروج حاصل کیا ہے کہ قریب نصف سے زائد عناصر ایسے ہیں جن کا انکشاف اس ترتیب سے ہوا ہے۔ ہر عنصر کا طیف جداگانہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی شے کے سپکٹرم میں کوئی نئی لکیر یا رنگ معلوم ہو تو خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہاں کوئی نہ کوئی نیا عنصر مخفی ہے اس سراغ کے ملجانے کے بعد اس شے کی تحلیل ہر ممکن طریق پر شروع کر دیجاتی ہے اور آخرکار ایک نیا عنصر ملجاتا ہے۔

اگر ہر طیف کا پیدا ہونا ایٹم اور اُس کے اندر کے چھوٹے برقی وزن پر مبنی ہے تو یہ لازمی ہونا چاہیئے کہ ایسے عناصر جن کے ایٹمی وزن کم ہیں بہت ہی سادے سپکٹرم بنائیں

گے برخلاف ان عناصر کے جن کا ایٹمی وزن بہت ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے سہل و سادہ طیف۔ شروع شروع کے چند عناصر کے پائے جاتے ہیں اور جوں جوں وزن بڑھتا جاتا ہے سپکٹرم نہایت پیچیدہ اور گھنے ہوتے جاتے ہیں اس زمانہ میں جبکہ جوہر فرد (ایٹم) کی ساخت کے متعلق یہ کشمکش ہو رہی تھی رونٹگن نے وہ مشہور شعاعیں دریافت کیں جو آج تک اس کے نام سے بطور رونٹگن شعاعوں کے مشہور ہیں۔

ان رونٹگن Roentgen کی دریافت کردہ شعاعوں X—Rays کی اہمیت کیمیا دانوں کی نظر میں اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ اسکی مدد سے ان کو ایٹم کے ٹکڑے کر ڈالنے میں بہت مدد ملی۔

روشنی کی لہروں کی بہت بڑی خاصیت یہ ہے کہ جب روشنی ایک گٹر میں سے گزاری جائے تو دوسری طرف سیاہ و سفید دھاریاں سی بنتی ہیں۔ آپ لوگ سوال کریں گے کہ گٹر کیا ہے؟ کسی ہموار شیشہ پر ایک انچ فاصلہ کے اندر اندر ایک لاکھ لکیریں کھینچی جائیں تو اس کو جرمن زبان میں گیٹر انگریزی میں گریٹنگ کہتے ہیں۔ اس شیشہ میں یہ خاصیت ہو جاتی ہے کہ روشنی اس میں سے گزرنے کے بعد اپنی اصلی حالت کو بدل کر دھاریاں بناتی ہیں۔

روشنی کی لہریں جس قدر چھوٹی ہوں گی اسی قدر ان لکیروں کے درمیان کا فصل کم ہونا چاہئے ورنہ یہ سیاہ و سفید دھاریاں نہیں بنتیں X-Ray کی لہریں حد درجہ چھوٹی ہیں اس وجہ سے ان کی قوت نفوذ بہت زائد ہے۔ نہایت حیرت انگیز تجربہ پر و فیسر لاوے (برلن) نے یہ کیا ایک Crystal میں سے X Ray گزاریں تو دیکھا کہ بجائے اس کے کہ یہ شعاعیں بدستور رہیں۔ سیاہ و سفید نشان بناتی ہیں۔

اس تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ Crystal جو دیکھنے میں بظاہر صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ درحقیقت چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنا ہوا ہے جو اس قدر قریب ہیں کہ معمولی روشنی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن X—Rays کے واسطے گیٹر کی طرح

کام کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ اب میں ایٹم (جوہر فرد) کی ساخت بیان کروں یہ بتا دینا اور ضروری سمجھتا ہوں الکٹرون کسے کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں اپنے پچھلے مضمون میں بتا چکا ہوں خلا میں برق گزارنے سے چھوٹے چھوٹے ذرات منفی سری سے دوسری جانب نہایت تیز رفتار سے چلتے ہیں۔ یہ بجلی کے ذرے منفی بجلی سے بھرے ہوتے ہیں۔ انکو الکٹرون کہتے ہیں۔

جس طرح جوہر فرد کا تخیل مادہ کی ساخت کے لئے لازمی تھا اسی طرح الکٹرون کا تخیل برق کی ساخت کے لئے لازمی ہے۔ جس طرح سے چاندی یا سونیکا ایک ایٹم کہنے سے ہم کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح برق کے الکٹرون سے بھی بجلی کا وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو انتہائی تقسیم کے بعد مل سکے سمجھنا چاہئے۔ الکٹرون ہمیشہ منفی ہوتے ہیں اس الکٹرون کے تخیل کا موجد ہلم ہولٹسز ہے۔ بلوکر نے ۱۸۵۹ء میں ان ذرات کا انکشاف کیا ہٹورف نے دس سال بعد اچھی طرح ان کی تحقیقات کی اور انگریزی ماہر طبعیات کروکس نے اس پر کچھ اور تحقیق کر کے جلد سب اپنے نام سے چھپوا دیا۔

ایک الکٹرون کا وزن ہیڈروجن کے جوہر فرد (ایٹم) کے وزن سے $\frac{1}{1800}$ ہی یعنی قریب قریب بے وزن شے ہے الکٹرون کا ریڈیس 10^{-13} c.m. کا بتایا جاتا ہے ایٹم کا ریڈیس 10^{-8} یعنی اس سے ۵ گنا بڑا ہے ایک ایٹم اور الکٹرون کی جسامت میں وہی مناسبت ہے جیسے کہ کرہ زمین اور کسی مسجد کے گنبد میں برقی بار جو ایک الکٹرون پر ہوتا ہے اس کو برقی اکائی مانا گیا ہے

الکٹرون کے پیدا کرنیکی ترکیب صرف یہی نہیں ہے کہ خلا میں برق گزاری جائے۔ چونکہ ہمارے تخیل کے مطابق ایٹم ان الکٹرون سے بنا ہوا ہے۔ ہمیں اور بہت سی ترکیبوں سے الکٹرون پیدا کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ ہر قسم کے عناصر کے سخت گرم کئے جانے پر گرمی کے اثر سے۔ یا تزہر Phosphorescence سے الکٹرون پیدا ہوتے ہیں۔ ان الکٹرون کے نکل

جانے کے بعد وہ عنصر مثبت برق سے بھرا ہوا باقی رہجاتا ہے۔ ہر عنصر سے شعاعیں پیدا کیجاسکتی ہیں۔ ان کی شعاعوں کی لہروں کی لمبائی عناصر کے وزن کے بڑھنے سے کم ہوتی جاتی ہے یعنی جس قدر ایٹم کا وزن زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس ایٹم سے نکلنے والی شعاعوں کی قوت نفوذ بڑھتی جاتی ہے یعنی انکی حرکت کی تعداد ارتعاش بڑھتی جاتی ہے اس طریقہ پر شعاعوں کے تعداد ارتعاش کی بنا پر اگر ہم عناصر کی ترتیب کریں تو ایک نیا پہلی سے بالکل ملتا ہوا عناصر کا نقشہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حاصل ہوتا ہے جس میں وہ تمام عیب جو مینجلف کے نقشہ میں تھے غائب ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلہ وار عناصر کو ترتیب دینے سے جس مقام پر عنصر آئے اس کے نمبر کو اس عنصر کا عدد ترتیبی کہتے ہیں یہ وہ عدد ہے جو ہم کو بتلاتا ہے کہ اس عنصر کے جوہر فرد میں کس قدر مثبت ذرے ہیں۔

ایٹم کا تمام وزن انہیں مثبت برق سے لدے ہوے ذروں کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے کہ الکٹرون کو بالکل بے وزن خیال کیا جاتا ہے۔

اس طرح اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایٹم (جوہر فرد) کس ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ ان سب نتیجوں پر پہونچنے کے واسطے سب سے زائد مدد ریڈیم کی کیمسٹری اور اسکی شعاعوں نے کی ہے اور یہی قوتیں کیمیا داں کے قبضہ میں ہیں جو اس عقدہ کے حل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ میں اپنے مضمون کو ایٹم (جوہر فرد) کا مختصر سا خاکہ بتا کر ختم کروں گا۔ اس خاکہ کی موجودہ صورت بتانے میں جن ماہرین علم طبعیات وکیمیا نے کام کیا انکے نام حسب ذیل ہیں۔

ہلم ہولز، مارسلے، رتھرفورڈ، ساڈی، بور، فایان، لاوے، پلانک، ہان۔

ایٹم چند الکٹرون (یعنی منفی برق کے انتہائی چھوٹے ذرے) اور چند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثبت برق سے لدے ہوئے ذروں[1] سے بنا ہوا ہے۔ یہ مثبت ذرے ایک مرکز پر جمع ہیں

---

[1] ان مثبت ذروں کو اکثر لوگ پروٹون کہتے ہیں۔ الکٹرون صرف منفی بجلی کے ذروں کو کہتے ہیں

ایٹم کا وزن انہیں کی کمی و بیشی پر مبنی ہے۔ مثبت ذرے پر مثبت بجلی کے ۲ چارج ہیں ہر اس
مثبت ذرہ کا وزن ہیڈروجن کے ایٹم کے وزن سے دگنا ہے یعنی
ایک ایٹم میں جس قدر یہ مثبت ذرے زائد ہونگے اسی قدر اسکا وزن زائد ہوگا اور
اسی قدر اسکی مثبت برق زائد ہوگی۔

الکٹرون ایٹم میں دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ تو بالکل اس مثبت مرکز گیلیم کے قریب
اس کو گھیرے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اس سے فاصلہ پر نہایت تیز رفتار سے چکر لگاتے رہتے ہیں
اب ایٹم میں تعدیل قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ الکٹرون کی تعداد مثبت ذروں
کی برق کے برابر ہونی چاہئے۔ لیکن یہ سب الکٹرون ایک دائرہ میں چکر نہیں کر سکتے۔ ایک
دائرہ میں صرف ۸ الکٹرون چکر لگا سکتے ہیں یا اس سے کم مگر جہاں ۸ سے زائد الکٹرون
ہونیکی ضرورت ہوتی ہے تو یہ الکٹرون نیا دائرہ قائم کر لیتے ہیں۔ ہر ایٹم کی کیمیائی صفات
ان الکٹرون کی اس تعداد پر مبنی ہوتی ہے۔ جو سب سے بیرونی دائرہ میں موجود ہوں۔
سب سے سادہ ترکیب کا جو ایٹم ہو سکتا ہے وہ وہی ہوگا جس کا وزن سب
سے کم ہو۔ یعنی ہائیڈروجن کا ایٹم کے وزن کے متواتر بڑھتے جانے سے ایٹم کی ترکیب پیچیدہ
ہوتی جاتی ہے۔

ماہرین علم طبعیات ایٹم کی ساخت پر غور کر کے اور تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پہ پہونچے ہیں
کہ ایٹم میں الکٹرون اور مثبت ذرات کی تعداد بڑھتے جانے سے ایٹم کی ساخت کمزور ہو جاتی ہے
اور یہی وجہ ہے کہ آخر کے عناصر یعنی ریڈیم ، تھوریم ، یورانیم وغیرہ
اپنے میں سے خود بخود الکٹرون خارج کرتے رہتے ہیں۔ یہ بتلا دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ
یہ مثبت ذرے کیمیائی اوصاف میں ہیلیم گیس سے بالکل یکذات ہیں رتھرفورڈ
نے ۱۹۰۸ء میں اسی کو بالتحقیق ثابت کر دیا کہ ریڈیم میں سے یہ ذرے ہر وقت نکلتے رہتے
ہیں۔ انکا نام ذرہ کی شکل میں جبکہ وہ ریڈیم سے نکالیں یا کسی اور طریق پر پیدا کئے جائیں۔

کے ذرات رکھا گیا۔ گویا اب یہ طے ہوچکا ہے کہ ہیلیم اٹیم (جوہرفرد) کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ ایک ایسا نہ ذرہ ایک مرکز پر قائم ہیں۔ جس پر ۲ مثبت برقی لداؤ ہیں اور اس کے گرد منفی برقی الکٹرون نہایت تیزی سے گھوم رہے ہیں چونکہ ہر مثبت برقی ذرے کا وزن ہائیڈروجن کے اٹیم سے دُگنا ہوتا ہے اور چونکہ الکٹرون بغیر وزن تصور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ہر ہیلیم اٹیم کا وزن ۴ ہونا چاہئے چنانچہ تجربہ سے جو ہیلیم کا اٹمی وزن معلوم کیا گیا وہ چار ہی نکلا

یہ صاف ظاہر ہے کہ جب ریڈیم میں سے ایک اٹیم ہیلیم نکل گیا۔ تو پھر وہ ریڈیم نہیں رہا۔ اور اسکا اٹمی وزن بھی کم ہوجانا چاہئے۔ عرصہ دراز تک چونکہ آلات اس قدر نازک نہ تھے کہ اس ہیلیم کے اخراج کی رفتار کو معلوم کرسکیں۔ اس لئے یہ کل مشاہدہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا خصوصاً یہ کہ اس قدر قوت ایک اٹیم میں سے خارج ہو اور اٹیم (جوہرفرد) اسی طرح قائم رہے۔ موجودہ آلات نے یہ ممکن کردیا کہ ریڈیم کی رفتار تجزیہ . . . . . . کو معلوم کرسکیں اب معلوم ہوا ہے کہ یک گرام ریڈیم ۲۵۰۰ برس میں کل ختم ہوجائے گا اور ایک نئے عنصر میں تبدیل ہوجائیگا۔

ایک گرام کوئلہ کو جلانے سے جو انرجی حاصل ہوسکے۔ اس سے ۲۵۰۰۰۰ گنی زیادہ انرجی اس عرصہ میں خارج کریگا۔

رتھرفورڈ کے سب سے حال کی تحقیق کے مطابق جو اس نے الکٹرون کو نائٹروجن میں گذار کر دیکھے تو معلوم کیا کہ نائٹروجن میں کچھ اٹیم ہائیڈروجن کے پائے جاتے ہیں۔ مگر تمام دوسرے کیمیادان اور ماہرین طبعیات اسکو نہیں مانتے قبل اس کے کہ اپنے مضمون کو ختم کردوں یہ اور بتا دینا چاہتا ہوں اور غالباً آپ میں چند کو خیال بھی آیا کہ مولیکول میں یہ نئے اٹیم کسطرح موجود ہیں اور جبکہ ہر اٹیم کے چاروں طرف منفی الکٹرون ہیں تو دو اٹیم آپس میں کس طرح مل سکتے ہیں۔ اسکا جواب آجکل مختلف طرح سے دیا جاتا ہے۔

اور لوگ برابر کوشاں ہیں کہ کوئی متفق طریقہ اس کے سمجھانے کا نکالیں۔ لیکن جہاں تجربات

کو دخل نہیں اور صرف تصورات اور کلیوں کی بنا پر نقشہ اور ماڈل بنائے جاتے ہیں۔ وہاں ہ
اپنی اپنی رائے پر قائم رہتا ہے دو ایٹم (جوہر فرد) ہائیڈروجن کا ملنا شکل ذیل سے ظا



تدافع　　　　تجاذب

مفتی محمد عبدہ

تمہید | جریدہ المنار مصری نے ایک مضمون متعلق سوانح عمری حضرت مولانا شیخ محمد عبدہ قاضی القضاۃ مفتی اعظم مصری کا شائع کرتے ہوئے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک مفصل سوانح زندگی حضرت موصوف شائع کریگا۔

المنار لکھتا ہے کہ حضرت موصوف کے انتقال کے چالیس روز بعد انکے مریدین معتقدین شاگردان جامع ازہر مصر میں جمع ہوئے۔ اور حالات زندگی حضرت موصوف ذریعہ قصائد ومضامین بیان کئے گئے اور اسکی اتباع میں مجلس شوری یعنی مصری پارلیمنٹ وطلتہائے محکمہ جات مصر ونیز دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی جو حالات زندگی بیان ہوئے ان سے ہم نے حسب ذیل مختصر اقتباس تیار کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

خاندانی حالت | حضرت موصوف ۱۲۶۶ھ میں متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد محلہ نصر نامی قصبہ میں جو ضلع بحیرہ مصر میں سکونت پذیر تھے اور انکا سلسلہ نسب بنی عدی عرب اور آپ حضرت عمر فاروق رضؓ کی اولاد سے تھے۔ اور آپ کا خاندان بلاد مغرب سے ہجرت کر کے مصر میں آیا تھا آپ کا ابتدا نشو ونما مثل عام لڑکوں کے ہوا جو دیہات میں عام طور سے ہوا کرتے ہیں اور آپ اپنی عمر کے دس سال تک کسی مکتب میں باقاعدہ بغرض تعلیم داخل نہیں ہوئے۔ اور خود حضرت موصوف نے اپنی ابتدائی تعلیم کے جو حالات لکھے ہیں وہ حسب ذیل ہیں

ابتدائی تعلیم قرآن شریف | میں نے ابتدا میں لکھنا پڑھنا اپنے والد کے ہی مکان میں سیکھا اس کے بعد میں ایک حافظ قرآن کے گھر بغرض تعلیم قرآن شریف بٹھایا گیا اور ایک مرتبہ تو میں نے ناظرہ

قرآن شریف پڑھا پھر میں نے اُس کو دو سال میں حفظ کیا۔

جب میں ایک سال اپنا ختم کر چکا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے اور لڑکے بھی اسی حافظ کے پاس آ آ کر میرے مکتب میں شریک ہونے لگے اور انکا یہ خیال ہو گیا تھا کہ یہ حافظ قرآن نہایت عمدہ طور سے تعلیم دیتا ہے۔

علم تجوید ۱۲۷۹ھ میں بعد حفظ قرآن شریف میرے والد صاحب مجھے شہر طنطا میں جہاں میرے ایک بھائی شیخ مجاہد رہتے تھے ان کے پاس لے گئے تاکہ میں مدرسہ مسجد احمدی میں جو قراۃ کے لئے مشہور تھا فن تجوید یعنی علم قراۃ سیکھوں۔

ابتدا علم صرف نحو ۱۲۸۱ھ میں میں مدرسہ میں بغرض حصول علم داخل ہوا اور میں نے شرح الکفراوی (جو کتاب اجرومیہ کی شرح ہے) اسی مسجد احمدی میں شروع کی اور ڈیڑھ سال کی مدت صرف کرنے کے بعد میں کچھ نہیں سمجھا اس کی وجہ یہ تھی کہ طریقہ تعلیم بہت ناقص تھا اور استاد صاحبان اصطلاحات نحویہ و قضیہ کو سمجھانے کی بجائے صرف رٹوایا کرتے تھے اور کچھ نہیں سمجھاتے نہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس ڈیڑھ سال کی مدت ضائع ہو جانے سے میں حصول علم سے مایوس ہو گیا۔ اور مدرسہ سے بھاگ کر تین ماہ تک اپنی ننہال میں پوشیدہ رہا۔ لیکن میرے بھائی کو پتہ لگ گیا انہوں نے مجھے پکڑا اور مجھ سے مسجد احمدی طنطا میں چلنے کے لئے کہا میرے انکار کرنے پر جھگڑا ہوا میں نے کہہ دیا کہ مجھے کامل ناامیدی ہو چکی ہے کہ میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتا مجھے زراعتی مشاغل ہی پسند ہیں جس طرح میرے اور عزیز زراعت میں مشغول ہیں میں بھی زراعت ہی کروں گا۔ یہانتک کہ میں نے اپنے بھائی کو منوا دیا اور گویا ہمیشہ کے لئے تعلیم سے بے نیاز ہو کر اور یہ خیال کر کے کہ اب کبھی تعلیم کا خیال بھی نہیں کروں گا۔ اپنے کپڑے اور سامان لیکر اپنے بھائی کے ہمراہ اپنے قصبہ محلہ نصر میں واپس آیا۔ ۱۲۸۲ھ میں میں نے شادی بھی کر لی۔

احساس نقائص طرز تعلیم پس یہ اول نقش میرے دل پر طریقہ تعلیم کی خرابی کا ہوا اور یہی نقشہ طریقہ

تعلیم کا زہر میں تھا اور اسی کی یہ وجہ تھی کہ ۹۰ فیصدی طالب علم حقیقی تعلیم سے محروم رہتے تھے۔ استاد بغیر اسکا لحاظ کئے ہوئے کہ طلبہ نے سمجھ لیا یا نہیں سمجھا اس کی تعلیم جاری رکھتے تھے۔ اور جو نقص رہجاتا تھا اسکی دفعہ کی اور ان کو سمجھانیکی کوئی کوشش نہیں کیجاتی تھی اور یہ سمجھا جایا کرتا تھا کہ یہ طلبہ سمجھ گئے حالانکہ وہ بالکل کورے ہی ہوتے تھے جب وہ جوان ہو جاتے اور یہ خیال ہوتا کہ یہ کافی طور سے علم حاصل کر چکے ہیں وہ بالکل کورے مثل لڑکوں کے جاہل محض ہی ہوتے تھے اور اپنی اس ناقص تعلیم سے جہالت لوگوں میں پھیلاتے تھے خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے تھے حقیقی علم کی روشنی اور عام لوگوں کے درمیان جاہل ہو کر لوگوں کو نفع علم سے محروم کرتے تھے۔

میری شادی کے چالیس روز بعد والد صاحب صبح کے وقت تشریف لائے اور مجھ سختی کے ساتھ پابند کیا کہ میں پھر طنطا بغرض حصول تعلیم جاؤں۔ اگرچہ میں نے بہت انکار کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور مجبوراً اُنکے حکم کی تعمیل میں جانا پڑا۔ میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اسٹیشن (انیابی البارود) کو روانہ ہوا تاکہ وہاں سے میں بذریعہ ریل گاڑی طنطا جا سکوں میرا ساتھی میرے عزیزوں میں سے تھا لیکن نہایت تندخو اور قوی آدمی تھا۔

ہم جب روانہ ہوئے تو گرمی بہت سخت اور لو چل رہی تھی دوپہر کے وقت تو یہ حالت ہو گئی کہ گویا آگ برس رہی ہے اور چلنا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب اس گرمی میں قیام کرنا چاہئے۔ اس وقت چلنا ممکن نہیں ہے لیکن میرے ساتھی نے نہیں مانا اور چلتے رہنے پر ہی اصرار کیا میں نے اپنے گھوڑے کو تیز بھگایا اور کہدیا میں تو قصبہ کنبہ اُدرین جہاں میرے والد صاحب کی ننہیال کے لوگ رہتے تھے جاتا ہوں اور اپنے ساتھی کو پیچھے چھوڑ دیا جب میں اس قریہ میں پہونچا تو وہاں کے نوجوان لوگ مجھے دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے اس لئے کہ میں گھوڑے کی سواری و فنون

سپاہ گری میں کافی مہارت رکھتا تھا اور انہوں نے خیال کیا کہ اب اس کے ساتھ ایک عرصہ تک خوب کھیل کھیلیں گے۔ عصر کے قریب جب میرا ساتھی آیا تو میں نے اُس سے کہدیا کہ میرے گھوڑے کو واپس لیجاؤ میں تو آج یہاں قیام کر کے کل صبح طنطا روانہ ہوجاؤں گا اور یہی میرے والد صاحب سے کہد نیا۔ لیکن میں تقریبًا پندرہ روز تک وہاں رہا یہاں میری زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا یعنی علم سے جو مجھے رغبت نہ تھی اب رغبت پیدا ہوگئی۔

علم سے رغبت اور اسکی وجہ | میرے والد کے ایک ماموں شیخ درویش نامی جنہوں نے صحرائے لی بیا کے بہت سے سفر کئے تھے اور طرابلس الغرب تک گئے تھے اور سید محمد مدنی رحمہ کے درس میں شریک ہوئے جو مشہور شیخ ظافر رحمہ کے والد بزرگ وار تھے اور یہ شیخ ظافر عرصہ تک قسطنطنیہ میں رہے اور طریقہ شاذلیہ کو رائج کیا موطا امام مالک وکلام مجید وبعض کتب حدیث حفظ تھیں اور قرآن وحدیث خوب سمجھتے تھے اور وہیں قسطنطنیہ میں انتقال فرمایا۔

شیخ درویش سے ملاقات | صبح کے وقت شیخ صاحب موصوف میرے پاس تشریف لائے اور اُنکے پاس ایک کتاب تھی جس میں چند رسائل جو حضرت سید محمد مدنی رحمہ نے اپنے بعض مریدوں کو مغربی باریک خط میں لکھے تھے مجھ سے شیخ صاحب نے فرمایا کہ یہ کتاب میں انکو سناؤں کیونکہ وہ بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور شیخ صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت تھی میں نے نہایت سخت لہجہ میں انکار کیا اور پڑھنے پر لعنت بھیجتے ہوئے کتاب کو جو انہوں نے میرے سامنے پڑھنے کے لئے رکھدی تھی دور پھینکدی۔ لیکن شیخ صاحب موصوف نے تبسم فرمایا اور اس انداز سے مجھ سے دوبارہ درخواست کی اور اپنے تحمل اور بردباری کو ظاہر کیا کہ میں مجبور ہو گیا اور میں نے کتاب لیکر چند سطریں پڑھیں اس پر انہوں نے اس طرح اُس کی تفسیر بیان کی اور اس طرح اُس کو سمجھایا کہ کچھ کچھ مجھے بھی اس کے سنانے اور سمجھنے میں لطف آیا لیکن تھوڑی دیر بعد میرے ہم عمر جوان آگئے اور انہوں نے مجھ سے گھوڑے کی

سواری نیزہ بازی اور اس نہر میں جو اس قصبہ کے پاس ہی تھی تیرنے کی خواہش کی میں کتاب پھینک کر انکے ہمراہ چلدیا اسی روز عصر کے بعد پھر شیخ صاحب موصوف آئے اور عاجزی سے پھر مجھ سے پڑھنے کے لئے کہا جس کی میں نے تعمیل کی اور وہ تفسیر بیان کرتے رہے لیکن میں نے کھیل کی وجہ سے پھر اس کو چھوڑ دیا غرض دو روز تک یہی کیفیت رہی تیسرے روز میں نے تین گھنٹہ کامل پڑھا میں پڑھتا جاتا تھا اور شیخ صاحب تفسیر کرتے جاتے تھے مجھے اب ان تین گھنٹہ میں پڑھنے سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ شیخ صاحب نے فرمایا کہ انکے کھیت میں ان کو کچھ کام ہے وہ جاتے ہیں میں نے کتاب ان سے لے لی اور ان کی غیر حاضری میں دیکھتا رہا اور جو عبارت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اس پر نشان کر دیتا تھا تاکہ شیخ صاحب سے انکی واپسی پر حل کروں عصر کے وقت جب شیخ صاحب تشریف لائے تو جو جو مقامات میں نے نہیں سمجھے تھے ان سے سمجھے انہوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت وضاحت سے ان کو سمجھایا اور میرے مطالعہ علمی اور علمی مسائل کے سمجھنے کی کوشش پر اظہار خوشنودی فرمایا۔

ان رسائل میں علم تصوف علم آداب النفس و مکارم اخلاق و پاکیزگی روح اور ان کے حصول کے ذرائع وغیرہ پر بحث تھی۔ پانچویں روز تو جس چیز سے میں نفرت کرتا تھا وہ مجھے محبوب ترین معلوم ہونے لگی اور جملہ لہو و لعب و تفریحات سے کلی نفرت ہوگئی یعنی مطالعہ مجھ کو اب محبوب تھا اور کھیل کود سے نفرت تھی اور جوان لڑکے مجھے کھیل کود کی ترغیب دینے اور تفریح کے لئے بلایا کرتے تھے ان سے میں اس طرح بھاگنے لگا جس طرح ایک تندرست آدمی ایک متعدی مریض سے بھاگتا ہے۔

ساتویں روز میں نے شیخ موصوف سے دریافت کیا کہ آپ کا کیا مذہب ہے فرمایا کہ "اسلام" میں نے عرض کیا کہ کیا یہ سب لوگ مسلمان نہیں ہیں فرمایا کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہوتے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں نہ جھگڑتے اور بے سبب و بے سبب خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسمیں نہ کھاتے۔ یہ الفاظ گویا ایک شعلہ بجلی کی طرح میرے دل پر گرے اور میرے خیالات قدیمہ کو

مثل خس وخاشاک جلا ڈالا وہ خیالات یہ تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور جنت ونجات کے خدا کے یہاں سے صرف ہمیں ٹھیکہ دار۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ آپ خلوت میں یا بعد نماز کیا پڑھا کرتے ہیں اور آپ پر کیا نازل ہوا ہے انہوں نے فرمایا کہ سوائے قرآن کریم کوئی چیز ہم پر نازل نہیں ہوئی ہم ہر نماز کے بعد صرف چار رکوع قرآن مجید کے خوب سمجھکر اور غور کرکے پڑھا کرتے ہیں میں نے کہا کہ میں قرآن کریم کیسے سمجھ سکتا ہوں میں نے تو کچھ بھی نہیں پڑھا فرمایا کہ میرے ہمراہ قرآن پڑھو۔ خواہ ایک ہی جملہ ہو تم کو کافی ہوگا اور اللہ تعالیٰ اُس کی برکت سے تم کو علم بھی عطا فرمائیگا اور پھر تم قرآن شریف سمجھ بھی سکوگے اور جب تنہائی میں ہو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا کرو اور طریقہ حضرت نے مجھ سے ارشاد فرمایا

آٹھویں روز میں نے حسب الہدایت شیخ موصوف اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ چند روز میں میں نے اپنے میں ایک تغیر عظیم محسوس کیا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا میری روح عالم بالا کی طرف اُڑتی ہے اور یہ عالم باوجود اسکی وسعت و بڑائی میری نظروں میں تنگ و چھوٹا معلوم ہونے لگا تھا مجھے عرفان کا ادراک ہونے لگا اور میری روح عالم قدس کیطرف اڑنے لگی سوائے اس ایک غم کے جملہ غم والم میرے قلب سے محو ہوگئے وہ غم صرف یہ تھا کہ کاش میں بھی کامل المعرفت ہوتا اور میرا نفس نفس مطمئنہ ہوتا اور یہ سوائے شیخ موصوف کی توجہ و صحبت کے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ جنہوں نے چند ہی دن کی توجہ سے مجھے قعر جہالت سے نکالا معراج ترقی پر ڈالدیا۔ اور معرفت کے لئے راستہ صاف کردیا۔ انہوں نے گویا میرے لئے جہالت کی تقلید کے بند توڑ کر کامل توحید کی شاہراہ اعظم کی طرف ہدایت کردی۔ یہ سب کچھ شیخ موصوف کی برکت اور فیض کا ہی اثر ہے جو میرے لئے خضر راہ کنیسہ ادرین ضلع بحیرہ میں میرے اعزا میں ثابت ہوئے۔ اگر خاکدان دنیا میں سعادت کوئی چیز ہے تو حضرت شیخ موصوف کی صحبت ہی اس سعادت کی کنجی ہے جو مجھے ملی اور میری روح پر وہ تمام فطرت انسانی کے راز افشا ہوگئے جو اب تک مجھ سے پوشیدہ تھے۔

پندرہویں روز ایک شخص محلہ نصر میرے قصبہ کا رہنے والا مجھ سے ملا اور اس نے مجھے اطلاع کی کہ میری والدہ میری ملاقات کے خیال سے طنطا گئی ہیں۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ یہ شخص میرے والد سے کہدیگا کہ بجائے طنطا کے ابھی تک کنبہ اورین میں ہی مقیم ہوں اپنے والد صاحب کے غصہ سے ڈر کر دوسرے روز صبح طنطا روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ والد صاحب کے سامنے اگر کنبہ اورین میں قیام کی ہزار دلیلیں پیش کیجائیں تو ایک بھی کام نہیں آئے گی۔

طنطا کو دوبارہ روانگی | میں طنطا گیا اس وقت تعلیمی سال سے اختتام کا زمانہ قریب تھا یعنی جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ میں پہونچا اس وقت ایک عجیب اتفاق یہ ہوا تھا کہ ایک استاد صاحب کی صاحبزادی کا اسی زمانہ میں انتقال ہو چکا تھا اور انہوں نے بسبب غم والم و دیگر مصروفیتوں کے کتاب شرح زرقانی جو ان سے متعلق تھی پوری نہیں کرائی تھی میں اس میں شریک ہوا اور شرح خالد جو اجرومیہ پر ہے اس میں بھی شریک ہوا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب میں ہر دو کو خوب سمجھتا تھا بلکہ بعض بعض طلبہ مجھ سے سمجھا کرتے تھے۔

ایک مجذوب کی ملاقات | ماہ رجب کی کسی تاریخ میں جبکہ میں شرح زرقانی اپنے ہمراہی طلبہ کو سمجھا رہا تھا میں نے اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کو لوگ عموماً مجذوب کہتے اور سمجھتے ہیں میں نے جب سر اٹھایا تو مجھ سے کہا کہ اس کے کیا معنی ہوئے " ما احلیٰ حلوی مصر البصار"، مصر کا حلوے بھی کیسا خوش ذائقہ ہے میں نے کہا کہ وہ کہاں ہے کیا تمہارے پاس ہے، مجذوب نے کہا سبحان اللہ۔ جوئندہ یابندہ۔ یہ کہکر چلا گیا میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے الہام کیا ہے کہ میں بجائے طنطا کے مصر جا کر تعلیم حاصل کروں۔

جامع ازہر میں داخلہ بطور طالب علم | اس سنہ کے نصف شوال میں میں جامع ازہر میں داخل ہو گیا۔ اور طلب علم میں اس طرح کوشش شروع کی۔ لوگوں سے اور دوسرے طلبہ سے دور رہتا۔ بلاضرورت کسی سے بات نہ کرتا اور اگر اتفاقاً کہیں بلاضرورت مجھے بولنا پڑتا تو توبہ کرتا۔ اور تعلیمی سال کے اختتام پر میں ہمیشہ دو ماہ کی تعطیل میں اپنے گھر محلہ نصر جایا کرتا تھا یعنی نصف

شعبان سے نصف شوال تک میں اپنے گھر رہا کرتا اور اس قریہ میں جہاں میری ملاقات میرے والد کے ماموں شیخ درویش سے ہوئی تھی آتے جاتے قیام کرتا اور رجب تک میں اس قصبہ میں رہتا شیخ صاحب موصوف مجھے قرآن شریف پڑھایا اور سمجھایا کرتے اور ہر سال مجھ سے دریافت فرمایا کرتے کیا پڑھا میں نے جو کچھ پڑھا ہوتا ظاہر کردیتا بس فرمایا کرتے منطق، فلسفہ، حساب، نہیں پڑھا۔ اور بعض بعض علم کے بابت بھی دریافت فرماتے اور جب میں یہ کہتا کہ یہ علوم تو ازہر میں نہیں پڑھائے جاتے تو فرماتے کہ طالب علم تو کسی جگہ بھی تحصیل علم سے عاجز نہیں ہوا کرتے۔ جب میں قاہرہ واپس لوٹا کرتا تو ان علوم کے حصول کی بھی کوشش کرتا کہیں مجھے کوئی مل جایا کرتا کبھی میں کامیاب نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ ۱۲۸۶ھ میں مرحوم سید جمال الدین افغانی رح مصر میں تشریف لائے۔

سید جمال الدین افغانی سے ملاقات میں سید صاحب مرحوم کے ہمراہ ابتدائے ماہ محرم ۱۲۸۷ھ سے ہوا اور میں نے علم ریاضی و فلسفہ و علم الکلام کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں اکثر علماء ازہر و اکثر طلبہ سید صاحب کے مذہب کے خلاف رائے رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ علوم اسلامیہ عقائد کے مضبوط بنیادوں کو دل سے ہلا دیتے ہیں۔ اور نفس کو گمراہی کی طرف رہبری کرتے ہیں جس سے دین و دنیا دونوں خراب ہوجایا کرتے ہیں۔ اور میں جب اپنے گھر جایا کرتا تو راستہ میں حضرت شیخ درویش سے ملاقات کرتا اور یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش کیا کرتا۔ وہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے کوئی علم کوئی حکمت اس کے علم و حکمت سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص علم کا دشمن ہے وہ جاہل ہے اور جو حکمت کا دشمن ہے وہ احمق ہے۔ خدائے تعالیٰ کی قربت علم و حکمت سے زیادہ کسی اور چیز سے میسر نہیں آتی مگر خدا کے نزدیک بے شک ایک علم سب سے زیادہ قابل ملامت اور اس کے غصہ کا موجب ہے۔ اور اس علم سے جہالت خدائے تعالیٰ کو پسند ہے وہ علم حقیقت میں علم نہیں بلکہ لوگوں نے اس کا نام علم رکھا ہے۔ وہ سحر اور شعبدہ بازی ہے جو صرف انسان کو نقصان پہنچا

کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہاںتک ابتدا [illegible] احال خود حضرت مفتی اعظم نے اپنے مرض موت کی سختی سے قبل لکھا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ آ [illegible] ین سال تک ازہر میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور شروع شروع میں شیخ محمد تسلوتے سے استفادہ علوم عقلیہ و منطق کا کیا لیکن کسی طرح نفس کو حصول علم سے سیری نہیں ہوتی تھی اور اکثر شکوک باقی رہنے لگے تھے۔ شیخ حسن الطویل ازہر میں ایک بہت بڑے ماہر علم منطق تھے پھر ان سے تلمذ حاصل کیا اور ازہر کے کتب خانہ کی بہترین کتابیں دیکھیں لیکن شوق علم کی سیری کسی طرح نہیں ہوتی تھی اور روز بروز جذبہ حصول زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اور شکوک جو حل نہیں ہوتے تھے بڑھتے رہتے تھے یہاںتک کہ ایک روز شیخ حسن طویل نے مجھ سے فرمایا کہ رواق شوام کے ایک مجاور کی زبانی معلوم ہوا کہ سرائے خلیل میں ایک نہایت زبردست افغانی عالم سید جمال الدین نامی تشریف لاکر مقیم ہیں۔ ان سے ملنا چاہئے چنانچہ ہم دونوں آنکی ملاقات کی غرض سے گئے اور شام کے کھانے کی دعوت دی لیکن انہوں نے عذر کیا ہم نے چند آیات قرآنی کی تفسیر معلوم کرنا چاہی اور اسکی بابت صوفیہ و اہل کلام کا مذہب معلوم کرنا چاہا۔ سید صاحب نے اس وضاحت سے جوابات دیئے کہ مفتی اعظم کو بہت ہی پسند آئے اور اُن کی محبت دل میں جاگزیں ہو گئی۔

جامع ازہر سے حصول سند حسن پاشا عاصم نے جو حالات زندگی حضرت مفتی اعظم مرحوم کے بیان فرمائے اس سے معلوم ہوا کہ سنہ ۱۲۹۴ھ میں صاحب مرحوم نے اپنے آپ کو بغرض امتحان و حصول سند علماء ازہر کے سامنے پیش کیا باوجودیکہ آپ کے ساتھ غیر معمولی بعض بعض اساتذہ نے بوجہ استفادہ از سید جمال الدین افغانی سختی کی لیکن آپ کو سند علم دینا پڑی اب تک حصول علم و تربیت نفس کا زمانہ تھا۔ اب سے مرحوم کا زمانہ عمل و اصلاح کا شروع ہوا۔ آپ علم توحید و منطق کا درس دینے لگے اور اکثر لوگ آپ کے درس میں شریک ہوئے اور استفادہ حاصل فرمایا۔ آپ طرز جدید کے مطابق تعلیم دیتے تھے کبھی کبھی رات کے وقت کسی علمی مباحثہ

ومناظرہ میں تمام تمام رات گزر جاتی اور صبح ہو جایا کرتی تھی یہ وقت حقیقت میں علم کے کمال روشنی کا ازہر میں تھا اور جدید انکشافات علمی اور نئے اسلوب کے ساتھ بیان وتفسیر ہونے لگے تھے۔

جامع ازہر میں مدرسی بعدہٗ آپ باقاعدہ مدرس جامع ازہر کے ہوگئے لیکن وہ سید جمال الدین کے دست بازو بنے رہے اور ان سے برابر استفادہ حاصل کرتے رہے۔ سید جمال الدین کی غرض یہ تھی کہ عالم اسلامی کی کسی طرح اصلاح ہو جائے اور وہ حکومت سے امداد لینا چاہتے تھے حضرت محمد عبدہ آپ کے اس کام میں معین اول کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کو امید تھی کہ خدیو توفیق پاشا کے برسر حکومت آنے پر یہ غرض آپ کو حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ توفیق پاشا انکی غرض میں شامل اور انکے معاون تھے ان ہی ایام میں اسمٰعیل پاشا خدیویت سے معزول ہوئے اور توفیق پاشا حسب امید خدیو ہوئے لیکن بجائے امداد کرنیکے انہوں نے سید جمال الدین کو جلاوطن کر دیا۔ اور مفتی اعظم مرحوم اپنے جائے پیدائش قصبہ محلہ نصر میں چلے گئے یہ واقعہ رمضان ۱۲۹۶ھ کا ہے۔

بطرز جدید درس دینا شروع کیا مرحوم مفتی اعظم اس سے اول علم تاریخ وعلم لغت عربیہ کے جامع ازہر میں مدرس تھے انہوں نے طریقہ جدیدہ کے مطابق تعلیم دینا شروع کی۔ اور اس طریقہ کے مطابق اس سے اول کسی نے تعلیم نہیں دی تھی۔ اور مقدمہ ابن خلدون پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اس استاد اعظم مجتہد زمانہ علم الاجتماع وعلم تمدن کے ہی مسلک پر درس دینا شروع کیا اگرچہ امتداد زمانہ سے اسکا طریقہ متروک ہوگیا تھا لیکن اس جدید طرز سے مفتی صاحب کو پھر علم کا احیاء مقصود تھا

سرکاری گزٹ کی اڈیٹری ۱۲۹۷ھ میں صاحب الدولہ ریاض پاشا نے سرکاری گزٹ کا انکو محرر مقرر کیا اور اس کے بعد اڈیٹر کر دیا۔ اور آپ سے خواہش کی کہ ایک قانون مطبوعات کے لئے بنایا جائے چنانچہ آپ نے اس کی تعمیل کی اس کے احکامات یہ تھے کہ حکومت پر ضروری ہے کہ وہ اپنے جملہ احکامات واعلانات شائع کردے اور اڈیٹر گورنمنٹ گزٹ کو حق

ہے۔ کہ اگر کوئی قابل تنقید بات ہو تو اس کی وہ تنقید کرے اور جو اخبارات ملک مصر میں شائع ہوتے ہیں انکا محاسبہ بھی کرے اگر وہ چاہے تو کسی اخبار کو ہمیشہ کے لئے بند بھی کر سکتا ہے۔ اس گورنمنٹ گزٹ یا جریدہ کے اقسام میں ادب تدابیر ملکی یعنی سیاحت امور نافعہ فی الاخلاق وعادات بھی داخل تھے جس کو خود ایڈیٹر لکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ اس قانون کے ذریعہ مرحوم کی حیثیت ایک عام نگرانی کی سی ہوگئی۔ اور سچ یہ ہے کہ آپ نے خوب ہی اسکا حق ادا کیا آپ کی با ضابطہ صحیح تنقید کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بڑے ذمہ دار عہدہ دار مواخذہ حکومت سے خوف کھانے لگے۔ یہ صورت اسی وقت میں ہو سکتی ہے جبکہ تنقید حکومت کے زاویہ نگاہ سے نہ کیجائے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی تھا کہ اگر کسی اخبار نے کسی شخص کو بدنام کرنے کے لئے کچھ لکھا تو سرکاری گزٹ نے حکومت سے اسکی تحقیقات کا مطالبہ کیا اگر بعد تحقیقات وہ تحریر غلط ثابت ہوئی تو اس اخبار کو بھی کافی سزا دی جاتی تھی یہانتک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند بھی کر دیا جاتا تھا۔ خاص طور سے ادب اور حسن عبارت کا بھی لحاظ تھا۔ غلط عبارت لکھنے والے اخبارات بھی سزا سے نہیں بچا کرتے تھے جس کی وجہ سے صحیح علم ادب سے ملک وقوم مستفید ہو رہی تھی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مصر کے اخبارات مہذب ترین اخبارات میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ اس میں سید جمال الدین افغانی اور اُنکے اور بھی بہت سے معاونین کی اعانت کو بھی دخل ہے۔ اسکا یہ بھی اثر ہوا کہ حکومت نے مجبور ہو کر مجلس نظارۃ المعارف قایم کی جس کی نگرانی میں تعلیم ملک کی دیدی (گویا وزارت تعلیمات کی کمیٹی) مرحوم کی اس تنقید کیوجہ سے لوگوں میں انکے خلاف حسد کا مادہ پیدا ہوا۔ اور حکومت نے بھی ان اصلاحات کو ملتوی کر دیا جو ریاض پاشا کی بدولت ملک میں نافذ ہو گئی تھیں۔

(باقی)

تین سوال

مصنفہ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

سنہ ۱۹۰۳ء

ایک بادشاہ کو ایک دفعہ خیال آیا، کہ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ اُس کام کے لئے جو اسے درپیش ہے، بہترین وقت کونسا ہے، بہترین مشورہ دینے والے اُس کے لئے کون لوگ ہو سکتے ہیں اور اُسے پرہیز کن لوگوں سے واجب ہے۔ مزید براں، اگر اُسے یہ بھی علم ہو کہ اہم ترین کام اُس کے لئے کیا کیا ہیں، تو وہ کسی کام میں بھی جس کا وہ بیڑا اُٹھائے، ناکام نہ ہوا کرے۔

اور جب اُسے یہ خیال آیا، تو اُس نے اپنی سلطنت میں اعلان کر دیا کہ جو شخص اس کو سکھلائے کہ ہر ایک کام کے لئے موزوں ترین وقت کونسا ہو سکتا ہے، سب سے زیادہ مفید لوگ کونسے ہیں، اور اہم ترین معاملات کے معلوم کرنیکا کیا طریقہ ہے اسے وہ ایک بہت بیش بہا انعام دیگا۔

عالم اور فاضل شخص ہر طرف سے بادشاہ کے پاس آئے لیکن سب نے بادشاہ کے سوالوں کے مختلف جواب دئے۔

پہلے سوال کے جواب میں بعض نے کہا کہ ہر ایک کام کے لئے موزون وقت جاننے کے لئے، انسان کو چاہئے کہ مستقبل کے ایام، اور ماہ وسال کا ایک دستورالعمل پہلے سے تیار کر رکھے اور ہمیشہ پابندی کے ساتھ اُس کے مطابق کام کرے، انہوں نے کہا کہ ہر ایک کام اپنے موزوں ترین وقت پر اسی طریقہ سے سرانجام پا سکتا ہے، بعض کا خیال تھا

کہ ہر ایک معاملہ کے لئے پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھنا کہ اس کے لئے موزوں ترین وقت کونسا ہوگا ناممکن ہے، البتہ انسان کو چاہئے کہ اپنے آپ کو سستی اور کھیل کود میں نہ پڑنے دے، جو کچھ ہو رہا ہو اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہا کرے، اور پھر وہ کام جو سب سے ضروری ہو، کرے اور بعض کا خیال یہ تھا کہ بادشاہ چاہے کتنا ہی بیدار مغز ہو ایک آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ ہر امر کے لئے موزون ترین وقت کا تنِ تنہا فیصلہ کر سکے اس لئے یہ ضروری ہے کہ عقلمندوں کی ایک مجلس مقرر کیجائے، جو ہر امر کے لئے موزوں وقت کا فیصلہ کرے،

لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کے فیصلہ کے لئے ایک مجلس کے انعقاد کا انتظار نہیں کیا جا سکتا، اور اُن کے متعلق فوری طور پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کہ اُنکا بیڑا اٹھایا جائے یا نہ اٹھایا جائے۔ لیکن اس فیصلہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان کو پہلے ہی سے معلوم ہو کہ کیا کیا واقعات پیش آنے والے ہیں۔ یہ علم محض جادوگروں کو ہوتا ہے، اس لئے ہر ایک کام کے لئے موزوں وقت کا انتخاب کرنے کے لئے جادوگروں کی رائے لینا ضروری ہے۔ دوسرے سوال کا جواب بھی بالکل اسی طرح مختلف تھا۔ بعض نے کہا کہ جن لوگوں کی بادشاہ کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ مشیر ہیں، بعض نے کہا کہ زاہد۔ بعضوں نے طبیبوں کے حق میں رائے دی۔ بعض نے جنگ آزمودہ سپاہیوں کے حق میں۔

تیسرے سوال یعنی اسکا کہ اہم ترین مشغلہ کونسا ہو سکتا ہے۔ بعض نے تو جواب دیا "سائنس"، بعض نے کہا کہ "جنگ میں مہارت" اور بعض نے کہا "خدا کی پرستش"۔

چونکہ جواب بہت مختلف تھے، بادشاہ کو کسی سے اطمینان نہ ہوا۔ اور اُس نے انعام کسی کو نہیں دیا۔ البتہ صحیح جواب پانیکی خواہش باقی رہی اُس نے ایک جوگی کی جو اپنی عقلمندی کی وجہ سے بہت مشہور تھا رائے لینے کا فیصلہ کیا۔

جوگی ایک جنگل میں رہتا تھا جہاں سے وہ کبھی نہیں ہٹتا تھا۔ اور نہ وہ غریب لوگوں کے سوا کسی سے ملتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی سادہ کپڑے پہن لئے، اور جوگی کی جھونپڑی تک پہونچنے سے پہلے اپنے گھوڑے سے اُتر آیا اور اپنے باڈی گارڈ کو پیچھے چھوڑ کر تنہا آگے گیا۔ جب بادشاہ جوگی کے ہاں پہونچا تو جوگی اپنی جھونپڑی کے آگے زمین کھود رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو سلام کیا اور کہا "آؤ بابا بیٹھو" یہ کہہ کر خود زمین کھودنے لگا۔ وہ بہت ضعیف اور کمزور تھا۔ وہ کدال کو زمین میں گاڑ کے مٹی کو ہلاتا جاتا تھا۔ اور تھکن کے مارے ہانپ رہا تھا۔

بادشاہ اُس کے قریب جا کر کہنے لگا، اے عقلمند جوگی، میں تم سے تین سوال پوچھنے آیا ہوں۔ میں یہ کیونکر سیکھ سکتا ہوں کہ ہر ایک کام کو موزوں ترین وقت پر کروں، وہ لوگ کونسے ہیں جن کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جن کی طرف مجھے زیادہ توجہ ہونا چاہیے، اور کونسے معاملات اہم ترین ہیں جنہیں سب سے پہلے انجام دینا چاہیے

جوگی نے بادشاہ کی بات سنی لیکن جواب کچھ نہ دیا، اس نے اپنے ہاتھ پر تھوکا اور پھر زمین کھودنے لگا۔

"تم تھک گئے ہوگے"، بادشاہ نے کہا "کدال مجھکو دیدو اور اپنی جگہ کچھ دیر تک مجھے کام کرنے دو۔"

جوگی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کدال بادشاہ کو دے کر خود زمین پر بیٹھ گیا۔

جب بادشاہ دو کیاریاں کھود چکا تو وہ ذرا ٹھہر گیا اور اُس نے اپنے سوال دُہرائے جوگی نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اُٹھا اور کدال کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔

"اب تم ذرا آرام کرو۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے کام کرنے دو۔"

لیکن بادشاہ نے کدال اُسے نہ دی خود ہی کھودتا گیا، ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا پھر دوسرا گھنٹہ بھی، سورج درختوں کے پیچھے غروب ہونے لگا تو آخر بادشاہ نے کدال زمین

میں گاڑدی اور کہا۔

"اے حکیم میں تیرے پاس اپنے سوالوں کا جواب لینے کے لئے آیا تھا اگر تو مجھ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا تو صاف کہہ دے تاکہ میں گھر چلا جاؤں"

جوگی نے کہا "وہ کوئی دوڑتا چلا آ رہا ہے دیکھیں تو وہ کون ہے"

بادشاہ نے مڑ کر دیکھا تو ایک ڈاڑھی والا شخص بھاگتا ہوا جنگل کی طرف سے آ رہا تھا وہ دونوں ہاتھ سے پیٹ پکڑے تھا، اور اُنکے نیچے سے خون بہ رہا تھا۔ جب وہ بادشاہ کے قریب پہونچا تو بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور کمزوری کی شدت سے سسکنے لگا۔ جوگی اور بادشاہ نے مل کر اُس کے کپڑوں کے بٹن وغیرہ کھولے۔ اس کے پیٹ میں ایک بہت بڑا کاری زخم تھا۔ بادشاہ نے اس کو حتی الامکان بہترین طریقہ سے دھویا۔ اور اپنے رومال اور جوگی کے ایک تولیہ کو ملا کر اس میں پٹی باندھی۔ لیکن خون برابر جاری رہا، اس لئے بادشاہ گرم گرم خون سے آلودہ پٹیاں بار بار کھولتا رہا اور زخم کو دھو دھو کر نئے سرے سے پٹیاں باندھتا رہا۔ آخر جب خون تھم گیا۔ تو آدمی کو ہوش آیا اور اس نے پانی مانگا۔ بادشاہ نے اُسے تازہ پانی لاکر دیا۔ اتنی دیر میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور ٹھنڈک ہو چکی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے جوگی کی مدد سے آدمی کو جھونپڑی کے اندر لے لیا اور اس کو ایک بستر پر لٹایا۔ بستر پر لیٹ کر اس شخص نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گیا۔ لیکن بادشاہ پیدل چلنے کی وجہ سے اور اُس کام کی وجہ سے جس میں وہ دن بھر مشغول رہا تھا اسقدر تھک چکا تھا کہ وہ دہلیز ہی پر گر کر لیٹ گیا اور وہیں اس کو نیند آ گئی۔ سویرے جب وہ جاگا تو کچھ دیر تک تو اُسے معلوم ہی نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں اور یہ شخص جو بستر پر لیٹا ہے اور ٹکٹکی باندھے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھ کو دیکھ رہا ہے کون ہے۔

"میرا قصور معاف کرو" ڈاڑھی والے نے کمزور سی آواز میں کہا، جب اُس نے دیکھا کہ بادشاہ جاگ اٹھا ہے اور اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

بادشاہ نے کہا " میں تمہیں جانتا نہیں اور نہ تم نے کوئی قصور کیا ہے جو کہ معافی کی ضرورت ہو "

اس نے کہا " تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں جانتا ہوں ، میں تمہارا وہ دشمن ہوں جس نے قسم کھائی تھی کہ تم سے اس بات کا بدلہ لوں گا۔ میرے بھائی کو پھانسی کی سزا دی اور اس کی جائداد ضبط کر لی ۔ مجھے معلوم تھا کہ تم جوگی سے ملنے اکیلے آئے ہو اور میں نے قصد کر لیا تھا کہ جب تم واپس ہو گے تو تمہیں راہ میں مار ڈالوں گا۔ لیکن سارا دن گزر گیا اور تم نہ آئے ۔ اس لئے میں اپنی کمینگاہ سے نکل آیا تاکہ تمہیں تلاش کروں۔ اس تلاش میں میں تمہارے باڈی گارڈ تک پہونچ گیا ، اور انہوں نے مجھے پہچان لیا اور مجھے زخمی کر دیا۔ میں اُن سے تو بچکر بھاگ آیا ، لیکن اگر تم میری مرہم پٹی نہ کرتے تو اتنا خون بہتا کہ میں مر جاتا ۔ میں تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا اور تم نے میری جان بچالی۔ اب اگر میں زندہ رہا اور تمہاری خواہش ہوئی تو میں تمہارا فرمانبردار غلام بن کر رہوں گا اور اپنے بیٹوں کو بھی تلقین کروں گا کہ ایسا ہی کریں۔ میرا قصور معاف کرو "

بادشاہ کو بہت خوشی تھی کہ دشمن کے ساتھ اتنی آسانی سے صلح ہو گئی بلکہ وہ دوست بن گیا۔ اُس نے اُسکا قصور معاف کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے نوکروں اور اپنے خاص طبیب کو اس کے علاج کے لئے بھیجے گا۔ اور اس کی جائداد بھی اس کو واپس دیدیگا۔

زخمی سے اجازت لیکر بادشاہ باہر آیا اور جوگی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ واپسی سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ جوگی سے اپنے سوالوں کے جواب کی پھر درخواست کرے جوگی دوزانو بیٹھا تھا اور جو کیاریاں کل کھودی گئی تھیں ان میں بیج بو رہا تھا۔

بادشاہ اس کے قریب گیا۔ اور کہنے لگا۔

" آخری بار ، اے حکیم میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے سوالوں کا کچھ جواب دو "

جوگی بادشاہ کی طرف دیکھکر جواُس کے سامنے کھڑا تھا کہنے لگا "تمہارے سوالوں کا جواب تو تم کو مل چکا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا یہ کیسے تمہارا کیا مطلب ہے" ؟ جوگی نے جواب دیا "کیا تم دیکھتے نہیں، اگر تمہیں کل میری کمزوری پر رحم نہ آتا اور تم یہ کیاریاں نہ کھودتے بلکہ واپس چلے جاتے تو یہ شخص تم پر حملہ کرتا اور تم پچھتاتے کہ تم میرے ہی پاس کیوں نہ ٹھیرے پس اہم ترین وقت وہی تھا جب تم کیاریاں کھود رہے تھے، اور اہم ترین آدمی اُس وقت میں تھا اور میرے ساتھ بھلائی کرنا تمہارا اہم ترین کام۔ اُس کے بعد جب وہ شخص بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا تو اہم ترین وقت وہ تھا جب تم اس کی خدمت میں مشغول تھے کیونکہ اگر تم اس کے زخم نہ باندھتے تو وہ تمہارے ساتھ صلح کئے بغیر مرجاتا۔ وہی اس وقت اہم ترین آدمی تھا اور اُس کی خدمت سب سے ضروری کام تھا۔ یہ یاد رکھو کہ سب سے اہم وقت ایک ہی ہوتا ہے، اور وہ موجودہ وقت ہے یعنی وہ گھڑی جواب گزر رہی۔ کیونکہ صرف اسی وقت ہم کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جو کچھ کرنا چاہیں کریں۔ سب سے اہم شخص وہ ہوتا ہے جو تمہارے پاس ہو، کیونکہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ اس کو اب تمہارے بعد کسی کے ساتھ بات بھی کرنی نصیب ہوگی کہ نہیں، اور سب سے ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ بھلائی کیجائے، کیونکہ انسان اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔

یاس اور اُمّید

مضمون کا عنوان دیکھ کر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یاس عظیم آبادی اور امید امیٹھوی کا مقابلہ کرنا منظور ہے۔ یہ بحث بھی بجائے خود دلچسپ یا بہ قول محققین دل چسپاں ہے لیکن ہم اس پر بحث کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں کیونکہ ایک تو امید خدا جانے کسی شاعر کا تخلص ہو یا نہ ہو اور اگر ہو بھی تو خدا جانے ان حضرات کا وطن امیٹھی ہو یا چڑیا کوٹ یا کوئی اور اسی طرح کا دیر ہضم نام والا قصبہ۔ دوسرے یاس کا کسی سے مقابلہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کہ مبادا وہ کوئی "منقولات" لکھ کر ہمارے نام سے معنون کر دیں۔ ہمارا مقصد اس وقت یاس سے وہ قلبی کیفیت ہے جس کی نسبت سے بغیر کسی مناسبت کے حضرت عظیم آبادی نے اپنا تخلص یاس رکھا ہے اور امید سے وہ جذبہ جو حضرت امید امیٹھوی کے لئے بہ شرطیکہ وہ وجود رکھتے ہوں وجہ تخلص ہے یعنی ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی زندگی میں جسے اصطلاح میں غلامی یا ہندو مسلم فسادبھی کہتے ہیں یاس اور امید کی کیفیتوں کا کیا درجہ ہے۔ ہمارے یہاں خدا جانے غدر کے بعد سے یہ حالت ہے یا ہمیشہ سے کہ جن حضرات کے چہرے پر محرم اور رمضان کا مشترکہ قبضہ ہو یا جس کی زبان پر "مبادا ازیں بتر گردد" یا "چشم من بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است" رہا کرتا ہو۔ انہیں ضرور روحانیت یا حکمت لاحق ہو گئی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ صورت غدر کے بعد سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں جو نیک یا عقلمند لوگ ہوں گے وہ بیچارے "غم روزگار" یا "شہر کے اندیشے" سے دوسروں سے زیادہ ملول اور متفکر رہتے ہوں گے کیا عجب ہے کہ انہیں دیکھتے دیکھتے لوگ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ ہر شخص جس کے منہ پر نور کی جگہ دوسری چیز برستی ہو اور جو ہمیشہ فال بد زبان سے نکالتا ہو بڑا پرہیزگار اور دانشمند ہے۔

ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ یاس مشرب لوگ ہرگز عقلمند اور راسخ العقیدہ نہیں ہو سکتے بلکہ اکثر بدھو اور ڈھلمل یقین ہوتے ہیں۔ (ڈھلمل یقین پر علاوہ دلچسپیاں والے محققین کے دوسروں کو بھی اعتراض ہے مگر ہمارے پاس ملا دوپیازہ کی اینٹ البحر کی سند موجود ہے) کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو سمجھتے کہ مصیبت دیسی ریاستوں کے انگریز ملازموں کی طرح پالنے سے اور بڑھتی ہے اور مایوسی ہندوستان کی موجودہ تعلیم کی طرح رفتہ رفتہ قوت عمل، قوت ارادہ اور قوت فکر کو بیکار کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر ان میں روحانیت ہوتی اور ان کا عقیدہ پکا ہوتا تو سمجھتے کہ اگر انسان اپنی سی کوشش کرے تو خدا ضرور اُسے اس کا پھل دیتا ہے۔

یاس مشربوں اور محرمی شکل والوں میں جو مشابہت دینداروں اور عقلمندوں سے ہے وہ بالکل سرسری ہے بقول شاعر

نہ ہر کہ ہیٹ بسر کرد افسری داند　　نہ ہر کہ پیش کمیشن رود سری داند

اور غور سے دیکھئے تو کچھ ایسی مشابہت بھی نہیں ہے بظاہر دیندار اور حکیم کی طرح یاس مشرب کے چہرے پر بھی سکون، اطمینان اور غور کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن اُس سکون و اطمینان میں جو گھوڑے کو دوڑ میں جیتنے کے بعد ہوتا ہے اور اُس میں جو گدھے کو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دوڑنے ہی کو خیال است و محال است و جنوں سمجھتا ہے بہت فرق ہے سچے سکون و اطمینان سے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس معیار پر ہمارے گدھے صاحب کا سکون جس میں ہزاروں دولتیاں نہاں ہیں کسی طرح پورا نہیں اترتا۔ اسی طرح چہرے پر غور کی علامت بھی اس کی دلیل نہیں کہ ذہن واقعی غور کر رہا ہے جو آدمی بالکل خالی الذہن ہو وہ بھی اگر کُہنی کرسی کے بازو پر ٹیک کر اور چاہ زنخدان یا سراب ریش کا بوجھ ایک ہتھیلی پر سنبھال کر بیٹھ جائے وہ بھی غور کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جانوروں میں اگر آپ کو اس دھوکے کی زندہ مثال دیکھنا ہو تو بھینس کو دیکھئے۔ تجربہ کے طور پر آپ کبھی اس کے سامنے

یاس اور اُمّید

مضمون کا عنوان دیکھ کر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یاس عظیم آبادی اور امید امیٹھوی کا مقابلہ کرنا منظور ہے۔ یہ بحث بھی بجائے خود دلچسپ یا بہ قول محققین دل چسپاں ہے لیکن ہم اس پر بحث کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں کیونکہ ایک تو امید خدا جانے کسی شاعر کا تخلص ہو یا نہ ہو اور اگر ہو بھی تو خدا جانے ان حضرات کا وطن امیٹھی ہو یا چڑیا کوٹ یا کوئی اور اسی طرح کا دیر ہضم نام والا قصبہ۔ دوسرے یاس کا کسی سے مقابلہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کہ مبادا وہ کوئی "ہفوات" لکھ کر ہمارے نام سے معنون کر دیں۔ ہمارا مقصد اس وقت یاس سے وہ قلبی کیفیت ہے جس کی نسبت سے بغیر کسی مناسبت کے حضرت عظیم آبادی نے اپنا تخلص یاس رکھا ہے اور امید سے وہ جذبہ جو حضرت امید امیٹھوی کے لئے بہ شرطیکہ وہ وجود رکھتے ہوں وجہ تخلص ہے یعنی ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی زندگی میں جسے اصطلاح میں غلامی یا ہندومسلم فسادبھی کہتے ہیں یاس اور امید کی کیفیتوں کا کیا درجہ ہے۔ ہمارے یہاں خدا جانے غدر کے بعد سے یہ حالت ہے یا ہمیشہ سے کہ جن حضرات کے چہرے پر محرم اور رمضان کا مشترکہ قبضہ ہو یا جس کی زبان پر " مبادا ازیں بتر گردد" یا "چشم من بسیار ازیں خواب پریشاں دیدہ است" رہا کرتا ہو۔ انہیں ضرور روحانیت یا حکمت لاحق ہوگئی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ صورت غدر کے بعد سے پیدا ہوگئی ہے۔ اس زمانے میں جو نیک یا عقلمند لوگ ہوں گے وہ بیچارے "غم روزگار" یا "شہر کے اندیشے" سے دوسروں سے زیادہ ملول اور متفکر رہتے ہوں گے کیا عجب ہے کہ انہیں دیکھتے دیکھتے لوگ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ ہر شخص جس کے منہ پر نور کی جگہ وہ دوسری چیز برستی ہو اور جو ہمیشہ فال بد زبان سے نکالتا ہو بڑا پرہیزگار اور دانشمند ہے۔

ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ یاس مشرب لوگ ہرگز عقلمند اور راسخ العقیدہ نہیں ہو سکتے بلکہ اکثر بدھو اور ڈھلمل یقین ہوتے ہیں۔ (ڈھلمل یقین پر علاوہ دلچسپیاں والے محققین کے دوسروں کو بھی اعتراض ہے مگر ہمارے پاس ملا دوپیازہ کی اینٹ البحر کی سند موجود ہے) کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو سمجھتے کہ مصیبت دیسی ریاستوں کے انگریز ملازموں کی طرح پالنے سے اور بڑھتی ہے اور مایوسی ہندوستان کی موجودہ تعلیم کی طرح رفتہ رفتہ قوت عمل، قوت ارادہ اور قوت فکر کو بیکار کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر ان میں روحانیت ہوتی اور ان کا عقیدہ پکا ہوتا تو سمجھتے کہ اگر انسان اپنی سی کوشش کرے تو خدا ضرور اُسے اس کا پھل دیتا ہے۔

یاس مشربوں اور محرمی شکل والوں میں جو مشابہت دینداروں اور عقلمندوں سے ہے وہ بالکل سرسری ہے بہ قول شاعر

نہ ہر کہ ہیٹ بہ سر کرد افسری داند

نہ ہر کہ پیش کمیشن رود سری داند

اور غور سے دیکھئے تو کچھ ایسی مشابہت بھی نہیں ہے بظاہر دیندار اور حکیم کی طرح یاس مشرب کے چہرے پر بھی سکون، اطمینان اور غور کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن اُس سکون و اطمینان میں جو گھوڑے کو دوڑ میں جیتنے کے بعد ہوتا ہے اور اُس میں جو گدھے کو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دوڑنے ہی کو خیال است و محال است و جنوں سمجھتا ہے بہت فرق ہے سچے سکون و اطمینان سے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس معیار پر ہمارے گدھے صاحب کا سکون جس میں ہزاروں دولتیاں نہاں ہیں کسی طرح پورا نہیں اترتا۔ اسی طرح چہرے پر غور کی علامت بھی اس کی دلیل نہیں کہ ذہن واقعی غور کر رہا ہے جو آدمی بالکل خالی الذہن ہو وہ بھی اگر کہنی کرسی کے بازو پر ٹیک کر اور چاہ زنخدان یا سراب ریش کا بوجھ ایک ہتھیلی پر سنبھال کر بیٹھ جائے وہ بھی غور کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جانوروں میں اگر آپ کو اس دھوکے کی زندہ مثال دیکھنا ہو تو بھینس کو دیکھئے۔ تجربہ کے طور پر آپ کبھی اس کے سامنے

بین بجائیے یا مقالہ افتتاحیہ پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اکثر جلسوں کے صدر یا نائب صدر کی طرح کمال غور سے ایک ایک حرف سنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی گردن کی خفیف جنبش سے اظہار استحسان بھی کرتی ہے لیکن کیا وہ واقعی غور کرتی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہر شخص کو خفش مرحوم اور انکی بکری کا قصہ پڑھنا چاہئے اور اگر پھر بھی تسکین نہ ہو تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے۔

مختصر یہ کہ پاس مشربی کو دینداری یا دانشمندی کے ہم معنی سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہے جس دل میں حکمت و معرفت ہوگی اہیں یاس کی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں یہ بات کسی کی سمجھ ہی میں نہیں لوگ بس اسی کے قائل ہوتے ہیں جو یہ کہے کہ اس سال پانی نہیں برسے گا یا طاعون یا ہیضہ یا سائمن کمیشن سے چھٹکارا پانا مشکل ہے یا جامعہ ملیہ بند ہوجائیگی یا ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہوگا۔ ہم ان لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئے مگر انکے سنبھلنے کی کوئی امید نہیں بلکہ

من ز وضع زمانہ در فکرم   کہ مبادا ازیں بتر گردد

از تعطیل زدہ "رپورٹر"

"وہ"

جناب سعید رضا صاحب بی اے سابق متعلم جامعہ

کس کے سجدے میں یہ فلک یہ زمیں ۔۔۔ ہیں ملائے پڑے جبیں سے جبیں ؟
کون ہے صدر بزم کون و مکاں ۔۔۔ فرشِ محفل ہے کس کا عرشِ بریں ؟
کس کی خاتم کا حلقہ ہے گردوں ۔۔۔ کس کی ہے کائنات نقش نگیں ؟
کون ہے ساقیٔ بساطِ وجود ۔۔۔ کس کا ساغر لئے ہے ماہِ مبیں ؟
کس کی گلگشت ہے یہ کاہکشاں ۔۔۔ یہ کواکب ہیں کس کے راہ نشیں ؟
کون ہے مظہرِ جلال و جمال ۔۔۔ کس کے یہ نقش ہیں حسیں سے حسیں ؟
کس کی خاطر نکھار رہا ہے قمر ۔۔۔ چاندنی سے یہ مسند زریں ؟
کس کی قدرت کے یہ مظاہر ہیں ۔۔۔ ان مظاہر میں خود وہ ہے کہ نہیں ؟
پردۂ کائنات میں پنہاں ۔۔۔ یا کہیں آس پاس گوشہ گزیں ؟
یا ورا الورائے بود و عدم ۔۔۔ یا ہر اک ذرہ میں نہاں یہ کمیں ؟
کس جہت ہے وہ قبلۂ کونین ۔۔۔ کس طرف ہے 'وہ' لامکاں کا مکیں ؟
سخت برہم ہے اس تفکر میں ۔۔۔ فہم سے عقل اور گماں سے یقیں
چشم کو یہ نظر ہے مایۂ نور ۔۔۔ دل کو یہ اضطراب ہے تسکیں
یہ تصور جلائے ذہن و دماغ ۔۔۔ حسن فطرت کا یہ خیال آئیں
یاد اس کی ہے میری مونس جاں ۔۔۔ نام اس کا ہے مجھکو حبل متیں
روح میری تڑپ رہی ہے رضاؔ ۔۔۔ تاکہ دیکھے اسے کہیں نہ کہیں

تنقید و تبصرہ

نثرہ - چھوٹی تقطیع حجم ۸۱ صفحہ قیمت ۸ ر

پیشکش شاہجہانی - $\frac{18 \times 23}{8}$ حجم ۲۴ صفحہ قیمت نہیں لکھی

نوربان - " " "

ارمغان " " "

نگارش عاری - $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۰۵ صفحہ

یہ پانچوں رسالے جناب محمد عزیز اللہ شاہ صاحب عرف منشی محمد ولایت خانصاحب رئیس صفی پور کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور ادبی پریس لکھنؤ میں چھپے ہیں۔ ہم کسی پچھلے پرچہ میں موصوف کے دیوانؔ اور پنج رقعہ پر ریویو کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ آپ اس وقت ہندوستان کے فارسی انشا پردازوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہماری رائے میں یہ سب رسالے خصوصاً نگارش عاری ان لوگوں کے لئے بیحد مفید ہیں جو مدرسوں میں فارسی کی تعلیم پاتے ہیں یا بطور خود فارسی پڑھتے ہیں۔

پنجاب میں اردو - از جناب حافظ محمود خانصاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ لاہور۔ تقطیع $\frac{18 \times 22}{8}$ حجم ۲۱۲ صفحہ قیمت درج نہیں۔ کتابت طباعت کاغذ قابل اطمینان ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے زبان اُردو کی تاریخ نہایت تحقیق سے لکھی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان فارسی اور برج بھاشا کے ملنے سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے علاقے میں پہونچنے سے بہت پہلے پنجاب کے حصہ میں

فارسی اور ملتانی پنجابی کی آمیزش سے اردو کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے علاوہ تاریخی اور خارجی شواہد کے علم اللسان کے اصول کے مطابق داخلی شہادت بھی پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اردو اور برج بھاشا میں اگر کچھ الفاظ کا اشتراک ہے تو یہ کافی دلیل نہیں کہ اردو کی ماں یہی زبان ہے۔ ملتانی پنجابی اور اردو زبان میں علاوہ بیشمار الفاظ مشترک ہونے کے جملوں کی ساخت اور صرفی اور نحوی ترکیبوں کے لحاظ سے بیحد مشابہت ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں پنجاب کے قدیم اُردو شعرا اور نثر نگاروں کے حالات اور اُنکے کلام کے نمونے ہیں جن میں سے بعض علاوہ تاریخی اہمیت کے ادبی قیمت بھی رکھتے ہیں۔

علاوہ اس موضوع کے جس سے بحث کرنا اس کتاب کا اصل مقصد تھا ضمنی طور پر علم اللسان کے اصول اور خصوصاً اُردو زبان سے متعلق بہت دلچسپ اور مفید بحثیں ہیں۔ پروفیسر شیرانی صاحب کی یہ تصنیف اُردو کے علمی خزانے میں بہت گراں قدر اضافہ ہے۔ موصوف نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس پر ہم عجلت میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتے مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ اہل نظر سے پوری توجہ اور غور کا طالب ہے۔

ہمارے نبی ۔ از پروفیسر نواب علی صاحب۔ شائع کردہ جامعہ ملیہ

چھوٹی تقطیع حجم ۱۰ صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ نفیس، سرورق نہایت خوشنما قیمت ۴ر

یہ چھوٹی سی کتاب ان کتابوں میں سے ہے جنہیں خدائے تعالیٰ حسن قبول عطا کرتا ہے کہ وہ ملکوں ملکوں پھیلتی ہیں اور صدیوں تک انہیں لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ کتابیں عموماً بچوں کے لئے ہوتی ہیں اور بچوں کے رنگ میں ڈوب کر لکھی جاتی ہیں مگر وہ بڑے بھی جو انتہائی پختگی پر پہونچ کر بچپن کی سادگی کے بھید کو سمجھتے ہیں ان سے تسکین قلب حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی میں

پلگرمس پراگریس اور اس قسم کی متعدد کتابیں ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب مزے لے لیکر پڑھتے ہیں اور اپنے ظرف کے مطابق اُن سے ایمان کی گرمی اور عقیدت کا ذوق حاصل کرتے ہیں۔ پروفیسر نواب علی کا یہ رسالہ بچوں کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے اور اب تیسری بار پانچہزار کی تعداد میں چھپا ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ نے سیرت پر دو اور کتابیں ہمارے رسول اور سرکار دربار کے نام سے تیار کرائی ہیں جو زیر طبع ہیں یہ تینوں کتابیں ہر مسلمان بچے کے نصاب تعلیم کا جزو ہونا چاہئیں۔

نظام گزٹ تقطیع طباعت وغیرہ میں الہلال سے مشابہ ہے حجم ۲۵ صفحہ ملنے کا پتہ چار مینار حیدرآباد (دکن)

حیدرآباد کے اس قابل قدر ہفتہ وار اخبار پر ہم پہلے کسی اشاعت میں ریویو شائع کر چکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے اس کا خاص نمبر ہے جو اعلیحضرت نظام دکن کی سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے یہ نمبر اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ نظام گزٹ اسی شان کا اخبار ہے جیسا حیدرآباد جیسے ادبی مرکز سے نکلنا چاہئے تھا۔ اس نمبر کی قیمت ۸ر ہے اور رسالے کا سالانہ چندہ ۵ ہے۔

خیالات ارونگ ۔ مترجمہ محمد یحیٰی صاحب تنہا۔ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت غازی آباد تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۹۶ صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما۔

یہ امریکہ کے مشہور انشا پرداز واشنگٹن ارونگ کے مضامین اور اس کے خود نوشتہ حالات زندگی کا ترجمہ ہے۔ ارونگ کا دلکش انداز بیان مشہور ہے اور اس کی کتاب خواہ وہ ترجمہ کی صورت میں پڑھی جائے یقیناً وسعت خیال کا ذریعہ ہے۔ ہماری

زبان کو اس کی بہت ضرورت ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے ادبی جواہر اُردو زبان میں منتقل کئے جائیں۔

مجلہ مکتبہ۔ تقطیع رسالہ جامعہ کے برابر۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ کا حجم ۶۶ صفحہ قیمت سالانہ صہ ر

یہ ماہوار رسالہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ زیر ریویو نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عام پسند رسالوں کی صف میں شامل ہونا نہیں چاہتا بلکہ اپنا معیار بلند رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خصوصیت رسالہ اردو کی طرح ادب ہی ہیں امید ہے کہ یہ رسالہ ادب اردو کی مفید خدمت انجام دیگا۔

ہمیں ذیل کے رسائل بھی بغرض تنقید موصول ہوئے ہیں۔

۱۔ **الاحسان عید نمبر**۔ جمعیۃ القریش دہلی کا ماہوار رسالہ کا خاص نمبر۔
تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۴}$ حجم ۸۴ صفحہ کاغذ نفیس کتابت وطباعت اوسط درجہ کی۔ چندہ سالانہ ۳ روپے فی پرچہ ۴ ر

۲۔ **ترجمہ قانون طب**۔ مصنفہ ڈاکٹر سیموال ہانمن موجد ہومیوپیتھی (علاج تمثیلی) قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ ڈاکٹر صادق علی صاحب پرنسپل و پریسیڈنٹ سنٹرل میڈیکل ہومیوپیتھک کالج۔ سنٹرل روڈ۔ لاہور۔

۳۔ **امراض مزمنہ**۔ ہانمن کی کرانک ڈزیزز کے نظری حصہ کا اردو ترجمہ۔ قیمت عہر

۴۔ **قانون طب**۔ پرسوال جواب (انگریزی) مصنفہ ہانمن صاحب۔ قیمت عہر

۵۔ نظام الدین صاحب کے رسائل ہومیوپیتھی کا پہلا نمبر " جدید طب انگریزی خود ہومیوپیتھی کی تعلیم دیتی ہے " قیمت ۸ ر

۶۔ **فلسفہ روحانی** ۔ مصنفہ ڈاکٹر صادق علی صاحب چھوٹی تقطیع حجم ۴۸ صفحہ قیمت درج نہیں

۷۔ **تقلید و تحقیق** ۔ مصنفہ ڈاکٹر صادق علی صاحب چھوٹی تقطیع حجم ۴۰ صفحہ قیمت درج نہیں

۸۔ **خلافت و اسلام** ۔ (انگریزی) مصنفہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی مترجم انگریزی کلام مجید۔ چھوٹی تقطیع حجم ۴۳ صفحہ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگ لاہور۔

۹۔ **اولی الالباب سے خطاب** ۔ از سید سعید الدین صاحب سب جج الہ آباد تقطیع $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$ حجم ۳۲ صفحہ ریفارم سوسائٹی دربار الہ آباد نے شائع کی۔

شذرات

مارچ کے پرچہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اپریل کا پرچہ ۲۰ر اپریل تک اور مئی کا ابتدائے
سئی میں نکل جائیگا۔ مگر افسوس ہے کہ اہل جامعہ کی غیر معمولی مصروفیتوں کے سبب سے اس کی
پابندی نہ ہوسکی۔ بہر حال اب یہ مئی کا پرچہ آخر مئی میں نکل رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ تعطیل
بں یعنی اگست تک اسی طرح ہر مہینہ کا پرچہ اُس مہینہ کے آخر میں نکلا کرے گا۔ اس کے بعد
پرچہ کو مہینہ کے شروع میں لانیکی کوشش کیجائیگی۔

جامعہ کی مجلس تاسیسی کا جلسہ ۲۹ر اپریل کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے
صدارت فرمائی۔ کافی غور اور بحث کے بعد مندرجۂ ذیل قرارداد منظور ہوئی:۔

"مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم کی یادگار کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ
استحکام دینے اور اُس کو مالی دشواریوں سے آزاد کرنیکے لئے اس کی ضرورت ہے کہ
ضابطہ طریقہ پر پوری جدوجہد کیجائے جن کے ہاتھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تمام نظم و نسق ہو
جماعت تاسیسی آج بتاریخ ۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء اصحاب ذیل کو بطور جماعت امناء کے
ب کرتی ہے۔

مختار احمد صاحب انصاری	مولانا ابو الکلام آزاد
ذاکر حسین صاحب	مولانا محمد علی
جمنالال صاحب بزاز	مولانا شوکت علی
محمد شفیع داؤدی صاحب	عبد المجید خواجہ صاحب
عبد اللہ ہارون صاحب	سیٹھ حاجی محمد احمد

شعیب قریشی صاحب
مولوی کفایت اللہ صاحب
جواہرلال نہرو صاحب
تصدق احمد خاں صاحب شروانی
مولوی محمد نسیم صاحب
ڈاکٹر محمد عالم صاحب
مولانا قطب الدین عبدالوالی
محمد مجیب صاحب
حسن محمد حیات صاحب
مولوی سید مرتضیٰ بہادر صاحب

مولوی مسعود علی صاحب
مولوی محمد عرفان
حاجی محمد موسیٰ خانصاحب
قاضی نجم الدین صاحب
مولوی عبدالقادر صاحب قصوری
مولوی عبدالحق صاحب
ڈاکٹر عابد حسین صاحب
ای۔ جے کلاٹ صاحب
چودہری خلیق الزمان صاحب
مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی

ان میں سے اصحاب ذیل جماعت امنار کے عہدہ دار منتخب کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری صاحب — صدر
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب — معتمد
جمنالال بزاز صاحب — خازن

اصحاب ذیل پہلی مجلس انتظامی کے رکن منتخب کئے جاتے ہیں

۱۔ صدر مجلس امنار
۲۔ معتمد مجلس امنار
۳۔ خازن مجلس امنار
۴۔ مولانا محمد علی
۵۔ مولانا ابوالکلام
۶۔ مولانا شوکت علی
۷۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب مسجل جامعہ
۸۔ خواجہ عبدالمجید صاحب
۹۔ مولوی شفیع داؤدی صاحب

مجلس تاسیسی قرار دیتی ہے کہ اس کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں مذکورہ مجلس

امنار کی طرف منتقل ہو جائیں اور اُس کے بعد مجلس تاسیسی خود قائم نہ رہے چنانچہ وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں مجلس امنا کیطرف منتقل ہوگئیں اور اس کے بعد مجلس تاسیسی ختم ہوگئی نیز قرار پایا کہ نئی مجلس انتظامی اپنے آئندہ اجلاس میں جامعہ کا نیا دستور اساسی تیار کرے اور مجلس امنار کے سامنے بہ غرض منظوری پیش کرے "۔

جامعہ کا دستور اساسی تیار ہوگیا ہے اور مجلس انتظامی کے جلسہ میں جو ۱۳ رمئی کو صبح کے وقت منعقد ہوگا اس پر بحث کیجائے گی۔ اُسی دن شام کو مجلس امنار کا جلسہ ہوگا جس میں یہ دستور بہ غرض منظوری پیش ہوگا۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس دستور میں اُردو اکادمی کے متعلق بھی چند دفعات ہیں جن کی رو سے اکادمی کے لئے ایک مجلس عاملہ کا تقرر ہوگا اور اُس کے تعلقات جامعہ سے معین کئے جائیں گے۔

اجل جامعہ فنڈ کے لئے چندہ فراہم کرنے کی غرض سے وفود کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ایک وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں اعظم گڑھ اور جونپور گیا تھا۔ جامعہ کے سچے قدردان مولوی مسعود علی صاحب ندوی کی کوشش اور مستعدی سے دونوں جگہ خاصی کامیابی ہوئی اور ایک ہفتہ میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ چندہ جمع ہوگیا۔ یہ وفد بنارس الہ آباد، گورکھپور، غازی پور اور دوسرے مشرقی اضلاع میں بھی جانیوالا تھا مگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ۲۹ راپریل کے جلسہ میں شرکت کے لئے واپس آنا پڑا اور اس کے بعد جامعہ کے امتحانات شروع ہوگئے۔ اب ۵ ارمئی کو ڈاکٹر صاحب پھر تشریف لیجائیں گے تاکہ بقیہ اضلاع کا دورہ بھی ختم کرلیں۔ دوسرے وفود بھیجنے کا مسئلہ زیر غور ہے جب کوئی قطعی فیصلہ ہوجائےگا تو اخبارات میں اعلان کر دیا جائے گا۔

اپریل کے آخری ہفتہ میں یہ افسوسناک خبر آئی کہ مہاتما گاندھی کے بھتیجے مگن لال گاندھی صاحب یکایک شدید بخار میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ مگن لال صاحب جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے اور ہمیشہ انکے مخلص اور وفادار رفیق کار رہے۔ کئی سال سے انکا قیام آشرم میں تھا اور اسکا سارا انتظام انہیں کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ اس کے چرخہ سنگھ کے منتظم اعلیٰ بھی یہی تھے۔ چرخہ سنگھ کو جو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اس میں مگن لال صاحب کی قابلیت اور محنت کو بہت کچھ دخل ہے جس خاموشی و بے نفسی اور محبت سے وہ قومی کاموں کو انجام دیتے تھے اُسکی مثال افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں کم ملتی ہے۔ آخری وقت میں بھی وہ بہار میں اپنی انجمن کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ ہمیں اُنکے پسماندوں سے انتہائی ہمدردی ہے اور امید ہے کہ انکے ہونہار فرزند اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ملک و قوم کی خدمت انجام دیں گے۔

اسی ہفتہ میں جامعہ کے لوگوں کو بھی اپنے ایک عزیز بھائی کی وفات کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ جامعہ کی فوج کا ایک چھوٹا ہونہار سپاہی سمیع الدین طالب علم ابتدائی سوم اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اسکے والدین اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۰	بابتہ ماہ محرم ۱۳۴۷ھ مطابق جون ۱۹۲۸ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

ابن مقفع

دوسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں اسلامی تہذیب و تمدن نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اسلامی تحیل نے جہان عرب سے شرک و بت پرستی اور جہالت و وحشت کی ناپاکیوں کو بالکل مٹا دیا تھا وہاں زبان و ادب پر بھی نہایت گہرا اثر ڈالا تھا۔ عربی زبان نیا چولا بدل رہی تھی علوم و فنون کی نئی نئی شاخیں پیدا ہو رہی تھیں۔ علاوہ مذہبی علوم کے اور تمام اصناف علم خصوصًا ادبیات میں بھی حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی غرضکہ فطرت عربی لٹریچر کو بالکل جدید بنیادوں پر تعمیر کر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جبکہ عربی کے دو زبردست انشا پرداز پیدا ہوئے انہوں نے اس تعمیر میں زبردست حصہ لیا اور اگر انکو فن انشا خصوصًا سادہ طرز تحریر کا بانی کہا جائے تو بے جا ہوگا بلاشبہ اُن کی حیثیت بالکل ایک مینار کی تھی جس سے آجتک روشنی حاصل کیجاتی ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ متعجب ہونگے کہ ان میں سے ایک خالص عربی النسل تھا اور دوسرا عجمی (فارسی) یعنی عبدالحمید بن یحیٰی کاتب اور ابن مقفع یہ دونوں امام فن نہ صرف معاصر تھے بلکہ آپسمیں نہایت دوستانہ اور پرخلوص تعلقات تھے۔ دونوں اپنے ذوق صحیح اور فطرت سلیم کی بدولت علم و ادب کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکے اور بہت جلد علمی دنیا پر چھا گئے۔ علاوہ بریں اپنی اعلیٰ ترین انشا پردازی کا ایسا بے نظیر کارنامہ چھوڑ گئے کہ ذوق سلیم آجتک سر دھنتا ہے۔ خصوصًا ابن مقفع کے طرز تحریر کی تقلید کو موجودہ زمانہ میں بھی (جبکہ عربی طرز انشا نے سخت انحطاط پذیر ہونیکے بعد اب پھر سادگی اختیار کی ہے اور بالکل جدید قالب میں ڈہل گئی ہے) مایۂ فخر سمجھا جاتا ہے۔ آج کی صحبت میں

یہ مضمون رسالہ الزہرا (مصر) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ (جرجی زیدان) جلد دوم مقدمہ رسائل البلغا (حالات ابن مقفع) اور مقدمہ الدرۃ الیتیمہ سے ماخوذ ہے

ابن مقفع کے حالات کا تذکرہ مقصود ہے۔

نام ونسب

عبداللہ نام ابن المقفع کنیت باپ مجوسی تھا۔ اور ایک روایت کی بنا پر حجاج بن یوسف الثقفی اور دوسری روایت کی بنا پر (اور یہی زیادہ صحیح سمجھی جاتی ہے) خالد القسری کے زمانہ میں خراج وصول کرنے پر مامور تھا۔ اسی سلسلہ میں اس پر خیانت کا الزام لگایا گیا اور حجاج یا یوسف بن ہبیرہ نے جو خالد کے بعد عراق کا والی تھا اس قدر سخت سزا دلوائی کہ ایک ہاتھ بیکار ہو گیا اسی لئے مقفع نام پڑ گیا اور اصلی نام ولقب داذویہ اور مبارک پر غالب آگیا۔ اس نام کے متعلق دوسرے خیالات بھی ظاہر کئے گئے ہیں مگر زیادہ صحیح اسی کو سمجھا جاتا ہے۔

خاندان کی اصل سکونت خوز ہے جو شہر کور (فارس) کا ایک مقام ہے۔ لیکن اپنے دوسرے ہموطنوں کی طرح یہ بھی تلاش روزگار میں عرب کی جانب رُخ کرنے پر مجبور ہوئے خلافت نے انہیں اپنے دامن دولت کے سایہ میں لے لیا اور آخر عرب کی سرزمین کو انہوں نے اپنا وطن بنالیا

تعلیم وتربیت

عبداللہ بن مقفع نے باوجود فارسی نژاد ہونیکے عرب اور عربی ماحول میں نشو ونما پائی۔ اُسکا باپ خود عامل خراج اور دفتر کا منشی تھا۔ حکومت بھی اس وقت خالص عربی تھی سرکاری زبان عربی ہی تھی اس لئے اُس نے اپنے لڑکے کو اسی فن (انشا) کے سکھانیکی جانب توجہ کی اور عربی وفارسی میں مہارت پیدا کرنے کے وسائل مہیا کرنے لگا۔ خلافت بنوامیہ میں ایک فارسی النسل کی انتہائی عزت یہی تھی کہ وہ عالم، منشی، یا مترجم ہو۔

روزبہؒ (ابن مقفع) بعض قدرتی اسباب نیز اپنے مافوق فطرت ذہن وذکاوت کی بدولت ابھی پورے طور پر جوانی کی عمر کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ ان تمام چیزوں میں پورے طور پر مہارت

حاصل کرلی۔ اُس کے اسقدر جلد اور اس درجہ کمال حاصل کرنے کے چند خاص وجوہ ہیں۔

۱۔ بصرہ میں نشو و نما پائی جو اُس وقت علوم و فنون کا سرچشمہ۔ فقہا، رواۃ، محدثین اور ماہرین لغت کا مرکز تھا۔ خصوصاً مربد کا محلہ فصحا، بلغا خطیبوں اور شاعروں کے اجتماع کا مقام تھا۔

۲۔ آل اہتم کی سرپرستی میں نشو و نما حاصل کی جو فصاحت و بلاغت اور خطابت کا سرچشمہ تھا۔ اور جہاں خالد بن صفوان اور شبیب بن شبیہ جیسے لوگوں نے نشو و نما پائی۔

۳۔ عبدالحمید بن یحیٰی سے انتہائی دوستانہ تعلقات۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی قابلیت سے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ دونوں میں بچپن سے دوستی تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ دونوں نے عراق ہی میں نشو و نما پائی کیونکہ عبدالحمید آل انبار سے تھا۔

۴۔ روایت کی جانب توجہ۔ بصرہ میں آنے والے بدوی عربوں سے استفادہ۔ جالوس ثور بن یزید سے خصوصیت کے ساتھ صحت زبان اور فصاحت و بلاغت میں تلمذ۔

جب قابلیت مستحکم ہوگئی اور علم و فضل کا چاروں طرف چرچا ہونے لگا۔ تو دولت امویہ کے زمانہ میں عمر بن ہبیرہ نے اُسے اپنا کاتب بنایا پھر عباسی عہد خلافت میں عیسیٰ بن علی کا کاتب مقرر ہوا۔ حافظ کے بیان کے مطابق اسمٰعیل بن علی نے اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے اسی کے سپرد کر دیا پھر سلیمان بن علی والی بصرہ بحرین و عمان کی خدمت میں رہا پھر انبار میں ابوجعفر المنصور کی خدمت میں شرف ملازمت حاصل کیا۔ اور اس کے لئے کلیلہ و منہ اور فارسی کی دوسری اخلاقی تمدنی نیز بعض یونانی کتابوں کا جو پہلے فارسی میں منتقل ہو چکی تھیں عربی میں ترجمہ کیا۔

اسلام

ابن مقفع اپنی عمر کے اکثر حصہ میں آبائی مذہب پر رہا اور تقریباً بوڑھاپے میں مسلمان ہوا اس کے مسلمان ہونے کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ خلافت عباسی

کے عہد میں وہ عیسیٰ بن علی کا کاتب مقرر ہوا تھا چنانچہ وہ اسلام بھی اسی کے ہاتھ پر لایا۔ ایک روز وہ عیسیٰ بن علی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا "اسلام کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لانا چاہتا ہوں" شام ہو چکی تھی۔ عیسیٰ بن علی نے کہا یہ وقت مناسب نہیں صبح کو آنا تمام معززین وعمائد موجود ہوں گے، بہتر یہی ہے کہ اُنکے سامنے دین حق قبول کرو۔ تھوڑی دیر میں خاصہ چنا گیا وہ بھی کھانے میں شریک ہوا۔ اور کھاتے وقت زکرمہ[۱] کرنے لگا عیسیٰ نے اعتراض کیا اس نے جواب دیا "مسلمان مجھے صبح کو ہونا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ میں کسی وقت بھی مذہب سے الگ رہوں" غرضکہ صبح کو مسلمان ہوگیا۔ نام اور کنیت بدل دی گئی۔

عقیدہ

مذہبی اتہامات کوئی نئی بات نہیں بدقسمتی سے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ چیز ترقی پذیر رہی ہے۔ اور ایسی ایسی تقدس مآب ہستیوں پر یہ الزام تراشا گیا ہے کہ سنکر حیرت ہوتی ہے۔ امام غزالی جیسے مقدس بزرگ اور ابن حبان جیسے امام المحدثین بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے فلسفہ سے ذوق رکھنے والوں پر تو خاص نظر عنایت رہی ہے۔ ابن رشد۔ فارابی ابن سینا ابن الصائغ وغیرہ خاص طور پر اس تیر کا نشانہ بنے ہیں۔ پھر ابن مقفع اس لپیٹ میں کیوں نہ آتا اُسپر بھی نہایت شد ومد سے یہ الزام لگایا گیا لیکن جن دلائل کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے وہ ہمیں زیادہ وزنی نہیں نظر آتیں۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ محض دنیوی طمع سے مسلمان ہوا تھا تاکہ بنی ہاشم سے دولت سمیٹے۔ منصور کے چچا عیسیٰ اور سلیمان کی ملازمت اور اُنکا کاتب مقرر ہونے کو وہ اسی

---

[۱] عجمی کفار (مجوسی) زبان اور ہونٹوں کسی قسم کی حرکت دیے بغیر حلق اور ناک کے درمیان آواز کو گھماتے ہیں اور اسی طرح اپنا مطلب ادا کرتے ہیں یہی زمزمہ کہلاتا ہے (قاموس)

لالچ پر محمول کرتے ہیں اُنکے نزدیک اسی چیز نے اُسے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا اس سلسلہ میں وہ متعدد ثبوت پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اکثر بت پرستی سے متعلق مشرکانہ کتابیں مانویہ مزدکیہ مرقونیہ وغیرہ جن پر کفر و زندقیت کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ ان سب کا اس نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا یونانی فلسفہ کی بعض کتابیں جو دولت ساسانی کے اخیر عہد میں ترجمہ ہو چکی تھیں اس نے اُنکا عربی میں ترجمہ کیا اس وقت تک اہل عرب نے اس قسم کی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل نہیں کیا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک کفر و زندقہ کی اصل بنیاد صرف ابن مقفع ہے۔

(۲) وہ ان پندرہ آدمیوں میں سے تھا جو اکثر ایک ساتھ رہتے تھے شراب و کباب کی مجلس گرم رہتی تھی اور اُنکی باہمی صحبت بے تکلفی کی انتہائی حد کو پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

والبۃ بن الحباب، مطیع بن ایاس۔ منقذ بن عبدالرحمٰن الہلالی۔ حفص بن ابی بردہ۔ ابن مقفع۔ یونس بن ابی فروہ۔ حماد عجرد۔ علی بن الخلیل۔ حماد بن ابی لیلی الراویہ۔ ابن الزبرقان۔ عمارۃ بن حمزہ۔ یزید بن الفیض جمیل بن محفوظ۔ بشار المرعث۔ ابان اللاحقی۔

(۳) اُس نے یحییٰ بن زیاد کا مرثیہ کہا جو زنادقہ کا سرخیل تھا[۱] لیکن اخفش کے بیان کے مطابق

---

[۱] چند ہمجیال اور ہم مذاق لوگوں کے باہمی تعلقات یا اُنکا ایک جگہ مل بیٹھنا اور تبادلہ خیالات کے غرض سے مجتمع ہونا کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں کو اپنی مجلس میں گھسنے نہیں دیا۔ جو اُنکے ہم مذاق نہیں تھے بس انہیں لوگوں نے جو اُنکے ہم مذاق نہ ہونیکی وجہ سے اس مجلس میں بار نہ پا سکے انہیں متہم کر دیا۔ ابن حیان التوحیدی کی جماعت بھی اسی طرح بدنام ہوئی۔ یہ لوگ بھی قومیت اور مذہبیت میں باہم مختلف تھے لیکن علم اور فلسفہ کے ذوق نے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا۔ انکے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ بد دین ہیں اور (دیکھو صفحہ)

صحیح یہ ہے کہ اُس نے ابوالعوجا کا مرثیہ لکھا ہے یہ بھی زندیق تھا حدیث وضع کرتا تھا اور جیسا کہ طبری کا بیان ہے جس وقت محمد بن سلیمان بن علی والی کوفہ اسے قتل کرنے کی غرض سے اُس کے پاس گیا تو اُس نے نہایت بیباکی سے کہا۔ اگر تم نے مجھے قتل کیا تو کوئی مضائقہ نہیں میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جنمیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا ہے۔ لیکن طبری نے ابن ابی العوجا کے قتل کا ۱۵۵ھ کے حادثات میں ذکر کیا ہے اور ابن مقفع ۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ یا اس سے بھی قبل مقتول ہوا ہے۔ اس لئے کہ سلیمان بن علی کا انتقال جو اس کے قصاص کا طالب تھا ۱۴۲ھ میں اور دی ساسی (   ) کے قول کے مطابق ۱۳۹ھ میں ہوا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی ہے کہ جس روز اس نے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اسی رات سلیمان بن علی کے یہاں کھانا کھاتے وقت زمزمہ کیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پر اسے اعتقاد نہیں تھا۔ ورنہ پھر زمزمہ کے کیا معنی۔

علاوہ بریں ابن شبّہ کا بیان ہے کہ اسلام کے بعد ایک مرتبہ وہ آتشکدہ کے پاس سے ہو کر گزرا اور اسے دیکھکر اُس نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے

یا بیت عاتکہ التی اتعزل — حذر العدیٰ وبک الفؤاد موکل

انی لامنحک الصدود وانني — قسماً الیک مع الصدود لامیل

ان شبہات کا جواب یہ ہے کہ جس طرح صحیح ہو سکتے ہیں اسی طرح غلط بھی ممکن ہے کہ زنادقہ کی کتابوں کا اسلام سے قبل اس نے ترجمہ کیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ وہ زنادقہ کے ہاتھوں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶) شرا لخوری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جاحظ نے البیان والتبیین میں بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن میں شدید مذہبی تباین کے باوجود بے انتہا میل جول اور مخلصانہ تعلقات تھے (رسائل البلغا حالات ابن مقفع)

شائع ہوگئیں اور بہت سے لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوئیں۔

اب رہا یہ امر کہ مختلف مذاہب کے لوگوں میں دوستی و اخلاص کے تعلقات ہوں اور ایک دوسرے کا مرثیہ کہے تو اس کے لئے بھی ہمارے پاس کافی ثبوت ہے۔ شریف رضی نے ابواسحاق صابی کا مرثیہ کہا اور ثابت بن ہارون عیسائی نے متنبی کا مرثیہ کہا۔

ابن خلکان نے جاحظ کا قول نقل کیا ہے ابن مقفع مطیع بن ایاس اور یحییٰ بن زیاد بے سبب مذہب میں بدنام تھے۔

اسکا اصلی راز یہ ہے کہ ابن مقفع نے معتزلہ پر بہت سے اعتراضات کئے تھے معتزلہ کی جانب سے اسکا انتقام اس طرح لیا گیا کہ اس پر اس قسم کے اتہام لگا دئے گئے خود جاحظ اپنی مذہبیت کے ثبوت اور بریت کی سخت کوشش کے باوجود کب اس الزام سے بچ سکا۔

ایسی کمزور دلیلوں کی بنا پر ابن مقفع کے متعلق ایسا خطرناک فیصلہ کر دینا کہاں تک قرین قیاس ہے اسکا اندازہ خود قارئین کرام کر سکتے ہیں بفرض اگر کوئی شخص زندیقیت کو اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے تو اسکا حال تو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ اور معترض سے کہا سکتا ہے کہ آپ نے اسکا دل چیر کر دیکھا تھا؟ ان باتوں کا تو اسی وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے جبکہ تحریروں یا کتابوں میں انکا اظہار ہوا اور ان پر احکام بھی مترتب ہوں۔ بہرحال اقوال یا اعمال ایسی صورت میں ہونے چاہئیں کہ ان پر دلائل بھی قائم کئے جا سکیں برخلاف اس کے مذہبیات سے متعلق جو کچھ ابن مقفع نے لکھا ہے وہ اُس کی مذہبی عقیدت اور مذہب کی جانب زبردست میلان کی دلیل ہے۔ یہ الزام صحیح ہوتا تو سب سے پہلے منصور جو اس پر سخت برافروختہ تھا اسی کی آڑ لے کر اُسے قتل کروا تا اس صورت میں اُسے پبلک کی خوشنودی بھی حاصل ہو جاتی۔

ابن مقفع پر معارضہ قرآن کا الزام لگایا گیا ہے مگر اس کی حیثیت بھی بالکل ویسی ہی ہے قاضی عیاض اور باقلانی نے جو کچھ اس سے متعلق لکھا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ بعض سادہ لوح مصنفین کے خیالات کا اقتباس ہے۔ علاوہ اس کے اسکا انہوں نے اعتراف

کیا ہے کہ خود ابن مقفع اس سے انکاری ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کے معاصرین اُس کے علم وفضل اور بڑھتی ہوئی شہرت کو برداشت نہ کر سکے - انکے دلوں میں ابن مقفع کا یہ عروج دیکھکر بغض وحسد کی آگ دہکنے لگی - سچ ہے کسی اچھے آدمی کی معاصرۃ بھی محرومی کا سبب بنجاتی ہے انہوں نے اُسے زندیقیت کے ساتھ جس طرح بدنام کیا وہ یا تو انکے قصور فہم کی وجہ سے تھا کہ وہ اس کے خیالات کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکے یا اس میں ان کی کوئی خاص غرض مدنظر تھی - اگرچہ یہ ضرور ہے کہ ابن مقفع جیسے بہت سی فارسی نژاد محض ظاہرا اسلام لاتے اُن کی غرض معاشی ہوتی یا سیاسی یا اسلام کو ذلیل اور اہل اسلام کو گمراہ کرنا تاریخی حوادث اور مذہبی کتابیں اُنکے اعمال کی گواہ ہیں

قتل

جس وقت عبداللہ بن علی نے منصور کی بیعت سے انکار کیا اور ابومسلم خراسانی کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی تو اُس نے ساتھیوں سمیت اپنے بھائی والی بصرہ کے یہاں پناہ لی اور مدتوں اس کے یہاں چھپا رہا تاآنکہ سلیمان کو منصور نے معزول کر دیا اور بجائے اس کے سفیان بن معاویہ مہلبی کو والی مقرر کیا اس وقت عبداللہ اپنی جان کے خوف سے پھر پوشیدہ ہو گیا -

خلیفہ منصور کو اسکا علم ہوا تو اُس نے سلیمان اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ عبداللہ کو لیکر حاضر ہوں اور اس کی امان کے لئے جو شرط کریں مجھے منظور ہے وہ ان شرائط کو لکھوانیکے لئے ابن مقفع کے پاس گئے - اس نے اس تحریر میں نہایت شدت سے کام لیا اور لکھتے لکھتے یہاں تک لکھ گیا کہ امیرالمومنین اپنے چچا سے غداری کرے تو اس کی بیویوں پر طلاق ہے اُس کے غلام آزاد ہیں اور مسلمان اس کی بیعت سے آزاد ہیں خلیفہ پر یہ بات خصوصًا بیعت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا بہت گراں گزرا - ابن مقفع کی اس حرکت نے اسے نعل در آتش کر دیا - اس واقعہ کے چار برس بعد اس نے سفیان کو لکھا کہ اُسے پوشیدہ طور پر قتل کر دے

پوشیدہ اس لئے کہ اسے اپنے چچا کی ناراضگی کا خوف تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلیمان کے عزل کے بعد سفیان کا تقرر ہوا تو وہ سفیان کا مضحکہ اُڑاتا تھا اور اُس کی ہر طرح توہین روا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ سلیمان نے کسی کام سے اُسے سفیان کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ابن مقفع نے توقف کیا کہ مبادا اُسے کوئی گزند پہنچ جائے مگر سلیمان نے یہ کہہ کر اُسے مطمئن کر دیا کہ میں تمہیں بھیج رہا ہوں اور خلیفہ سے میری قرابت کے سبب وہ ایسی جرات نہیں کر سکتا۔ ابن مقفع جانے پر راضی ہو گیا۔ مگر سفیان کے گھر میں داخل ہونیکے بعد پھر اُسے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ سلیمان و عیسٰی اس سے سخت برافروختہ ہوئے اور منصور کی خدمت میں جا کر مرافعہ کیا۔ وہ گواہ پیش کئے جنہوں نے ابن مقفع کو گھر میں جاتے دیکھا تھا۔ منصور نے گواہوں سے کہا۔ دیکھو اگر میں نے سفیان کو ابن مقفع کے قصاص میں قتل کر ڈالا اور وہ اس گھر سے (اپنے محل کی پشت کی جانب اشارہ کر کے) نکل آیا اور تم نے گفتگو کی تو بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ کیا سفیان کے قصاص میں تمہیں بھی قتل کر دیا جائے"۔ یہ سنکر تمام گواہ پلٹ گئے۔ عیسٰی و سلیمان بھی اس لئے کہ اُنکے پاس کوئی دلیل نہیں رہی نیز منصور کی ہیبت سے خاموش ہو رہے۔ وہ سمجھ گئے کہ منصور کی رضامندی سے ایسا ہوا ہے۔

قتل کی نوعیت کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اول یہ کہ اُس نے اُنکے تمام اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اور تنور میں آگ روشن کر کے ایک ایک عضو اس میں ڈالتا گیا۔ سب جل چکا تو اُس کی راکھ بصرہ کے میدانوں میں پھنکوا دی تاکہ گھر کی تلاشی لی جائے تو ایک ذرہ بھی نہ نکلے دوسرے یہ کہ اُسے کنویں میں ڈلوا دیا گیا اور اوپر سے پتھر چنوا دئے تیسرے یہ کہ اُسے حمام میں ٹھونس کر دروازہ بند کر دیا اور وہ اُسی میں گھٹ گھٹ کر مر گیا۔ بہر حال پہلی روایت زیادہ مشہور ہے۔ ابن مقفع کو قتل کرتے وقت سفیان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "تیرے قتل کرنے میں میرے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ تو زندیق ہے اور تو نے

لوگوں میں فساد پھیلا رکھا ہے"

یہ بات قرین قیاس ہے کہ "شرائط امان" کی کتابت اُس کے قتل کا حقیقی سبب نہیں کیونکہ منصور نے اس پر دستخط کر دئے اور بجائے واپس کرنے کے قبول کر لیا۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ شرائط قبول کرلے اور اس کے کاتب کو قتل کرا دے حالانکہ اُس کی حیثیت محض خادم اور ماموری کی تھی۔ اس لئے یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ہی نے اُسے قتل کرایا۔ وہ سفیان کی بے انتہا بے عزتی کرتا تھا۔ اور ذرا بھی موقعہ ملنے پر نہیں چوکتا تھا۔ چنانچہ سفیان کی ناک بہت بڑی تھی۔ ایک دفعہ اُس کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہا اسلام علیکما یعنی تمہیں اور تمہاری ناک کو سلام" یہی وجہ تھی کہ سفیان اس سے دل ہی دل میں جلنے لگا۔ اور قتل کے در پے ہو گیا۔ منصور چونکہ زنادقہ کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا اس لئے موقع بھی بہت اچھا ہاتھ آ گیا اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ۱۴۲ھ میں دھوکہ سے قتل کر ڈالا۔

منصور بھی مشکوک ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کے خون کے مطالبہ میں اُس نے سختی سے کام نہیں لیا۔ ابن مقفع نے ۳۶ سال کی عمر پائی قتل کی تاریخ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ایک روایت تو اوپر مذکور ہوئی دوسری روایت یہ ہے کہ ۱۴۵ھ میں یہ واقعہ پیش آیا لیکن سلیمان بن علی نے ۱۴۲ھ میں انتقال کیا اس لئے اوپر ہی کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اخلاق

وہ نہایت با اخلاق اور سنجیدہ مزاج تھا۔ صرف اُنہیں لوگوں سے ملتا تھا جو عادات و اخلاق میں اُس کے برابر ہوں، اپنے دوستوں کے ساتھ نہایت وفادار تھا۔ یحییٰ بن زیاد نے دوستانہ تعلقات سے قبل محبت و مودت قائم کرنے کے لئے خط و کتابت کی ابن مقفع نے جواب میں تاخیر کی تو شکایت لکھی اس نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے اُس نے کہا کہ

"محبت ایک غلامی ہے اور یہ میرے لئے نہایت تکلیف دہ تھا کہ تجھے پورے طور پر بھیا ...

بغیر خود کو تیری غلامی میں دیدوں"

اُس کی وفاداری کا حسب ذیل مشہور واقعہ اس قابل ہے کہ زریں حروف میں لکھا جائے جسوقت مروان بن محمد مقتول ہوا عبدالحمید بن یحییٰ ابن مقفع کے یہاں چھپ رہا۔ لیکن یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا اور ابن مقفع کے مکان پر دوڑ آگئی۔ اس وقت دونوں مکان میں موجود تھے۔ دونوں سے دریافت کیا گیا کہ تم میں سے عبدالحمید کون ہے' مگر ہر ایک نے اپنے دوست کی جان کے خوف سے کہا کہ میں ہی عبدالحمید ہوں' لیکن چند نشانیوں کی وجہ سے عبدالحمید پہچان لیا گیا۔ اور گرفتار ہوگیا۔

ابن مقفع کے متعلق اہل علم کی رائیں

ابن مقفع تیزی و ذہانت میں غیر معمولی طور پر مشہور تھا علوم لغت علوم حکمت نیز اہل فارس کی تاریخ مرتب و مدون کرنے میں اس نے انتہائی ذکاوت سے کام لیا۔ یہ مقولہ عام طور پر دُہرایا جاتا ہے کہ عرب میں صحابہ کے بعد خلیل ابن احمد اور عجم میں ابن مقفع سے زیادہ کوئی ذہین نہیں پیدا ہوا لیکن ابن مقفع کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ محتاط اور حزم پسند نہیں تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور بعض معزز لوگوں کی کوشش سے دونوں میں ملاقات بھی ہوئی۔ وہ تین دن تک برابر تبادلہ خیالات کرتے رہے خلیل بن احمد سے دریافت کیا گیا کہ ابن مقفع کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ابن مقفع کی طرح میں نے آجتک کوئی شخص نہیں دیکھا لیکن اسکا علم اس کی عقل پر غالب ہے۔ اسی طرح ابن مقفع سے دریافت کیا گیا کہ تم نے خلیل کو کیسا پایا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا کہ اس سے پہلے میں نے خلیل کی طرح کسی کو نہ دیکھا لیکن اس کی عقل اس کے علم پر غالب ہے۔ لوگوں نے دونوں کی گفتگو سنکر کہا کہ دونوں سچے ہیں کوئی شک نہیں کہ خلیل بن احمد کی عقل اس کے علم پر غالب تھی۔ یہی سبب تھا کہ مرتے دم تک وہ زاہد ترین لوگوں میں سے تھا۔ اسی طرح ابن مقفع کا علم اس کی عقل پر غالب تھا کہ اس نے عبداللہ کی

"امان کی تحریر" ایسی لکھی جو بالآخر اس کے قتل کا موجب ہوئی۔

ابن ندیم کے نزدیک عربی کے دس بہترین انشا پردازوں میں ایک ابن مقفع بھی ہے[۵۱]

البیان والتبیین کے مصنف کا خیال ہے کہ ابن مقفع کی طرح فن بلاغت کی کسی نے تعریف نہیں کی۔[۵۲]

عبدالعظیم بن ابی الاصبع کا قول ہے کہ متقدمین اپنی تحریروں میں کبھی سجع کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہاں اثنائے کلام میں کبھی موقع کے مناسب آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ بلکہ اس سے تحریر کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ حضرت علی کا طرز تحریر تھا اور ابن مقفع، سہل بن ہارون اور جاحظ جیسے انشا پردازوں نے اسی کی تقلید کی۔

معرّی کہتا ہے کہ متقدمین اہل علم کل اور بعض پر الف لام داخل کرتے تھے۔ اس پر اصمعی عرب کا مشہور راوی لکھتا ہے کہ میں نے ابن مقفع کی تقریباً تمام کتابیں دیکھ ڈالیں مجھے اُس کے کلام میں صرف ایک غلطی نظر آئی۔ اور وہ اس کے اس فقرہ میں العلم اکبر من ان یحاط بجذ البعض یعنی بعض پر الف لام داخل کیا ہے۔

---

۵۱ یعنی عبداللہ ابن مقفع۔ عمارۃ بن حمزہ۔ حجر بن محمد۔ محمد بن حجر۔ انس بن ابی شیخ۔ احمد بن یوسف الکاتب سالم سعدۃ الہریرہ۔

۵۲ ابن مقفع سے دریافت کیا گیا کہ بلاغت کیا چیز ہے اُس نے جواب دیا کہ" بلاغت کا لفظ بہت سے معانی کا جامع اور بہت سی صورتوں پر حاوی ہے۔ بلاغت خاموشی میں بھی ہوتی ہے بلاغت سننے میں بھی ہوتی ہے۔ اشارہ میں بھی ہوتی ہے گفتگو میں بھی ہوتی ہے۔ دلیل پیش کرنے میں بھی ہوتی ہے۔ جواب میں بھی ہوتی ہے کسی چیز کے ابتدا کرنے میں ہوتی ہے شعر میں ہوتی ہے خطابات اور وعظ و تقریر میں ہوتی ہے۔ مکتوبات میں ہوتی ہے

متذکرہ صدر صورتوں میں اختصار اور معنی کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی بلاغت ہے۔

بعض لوگوں نے ابن مقفع کی یہانتک تعریف کی ہے کہ اس کے الفاظ سراسر معانی ہیں اور معانی سراسر حکمتیں، اُسکا ناصحانہ طرز بیان ہمارے لئے بس ہے۔

ابو العیناء نے ابن مقفع کا کلام سنکر کہا کہ حقیقۃً اس کی تحریر گویا بکھرے ہوئے موتی اور سرسبز و شاداب باغات ہیں۔

جعفر بن یحییٰ کا قول ہے عبد الحمید اصل ہے اور سہل بن ہارون فرع اور ابن مقفع ثمر ہے اور احمد بن یوسف کلی۔

ابن مقفع شاعری بہت کم کرتا تھا لیکن جب کبھی کچھ کہتا تو بہت بہتر کہتا تھا، صاحب حماسہ نے اُس کے تین شعر نقل کئے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے یحییٰ بن زیاد کا مرثیہ لکھا ہے لیکن اخفش کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ اُس نے ابن ابی العوجاء کا مرثیہ لکھا ہے۔

تصنیفات و تراجم:۔

ابن مقفع ایک مولف و مصنف کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں، بلکہ جس چیز نے اُسے شہرت دوام کا خلعت بخشا ہے وہ اُس کے تراجم ہیں۔ قفطی کے نزدیک وہ پہلا شخص ہے جس نے منطق کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنیکی جانب توجہ کی چنانچہ منصور کے لئے اس نے منطق کی تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ قاطیغوریاس باری ارمینیاس (یا باریمنیاس) اور انالوطیقا۔

قفطی کا خیال ہے کہ فرفوریوس کی کتاب ایساغوجی کا بھی اُسی نے ترجمہ کیا ہے۔ اغلباً ان کتابوں کا اس نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ یا کسی نے انکو یونانی سے نقل کیا ہے اور اس نے انہیں عربی قالب میں ڈھال دیا۔

ابن ندیم اس کے تراجم و تصنیفات کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں کا ماہر تھا۔ فارسی سے اُس نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ خدا ینامہ۔ آئین نامہ۔ کلیلہ دمنہ مزدک نامہ۔ کتاب التاج وغیرہ یہ تمام کتابیں اسی قبیل سے ہیں۔ ابن فارس نے قدیم زمانہ میں منطق اور فلسفہ کی جن کتابوں کا یونانی زبان سے ترجمہ کیا۔ ابن مقفع نے انہیں عربی

میں منتقل کیا۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تصنیفات و تراجم کا ایک مختصر سا خاکہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

(۱) کلیلہ دمنہ۔ اس کتاب کا موضوع اصلاح اخلاق اور تہذیب نفس ہے۔ دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ ہوا ایک ہندی فلسفی بیدپا نے ہندوستان کے ایک راجہ کے لئے تصنیف کی تھی۔ یہ راجہ سکندر کے حملہ کے بعد تمام ہندوستان پر قابض ہو گیا تھا۔ نہایت ظالم اور مستبد تھا۔ رعایا اس کی سختیوں سے پریشان تھی۔ مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اس ذریعہ سے راجہ کی اصلاح کیجائے۔ اس نے اس کتاب میں تمام نصیحتیں جانوروں اور پرندوں کی زبانی کی ہیں۔ جیساکہ قدیم زمانہ کے برہمنوں کا عام دستور تھا۔ وہ اپنے حکمت و فلسفہ کو جانوروں کی زبانی بیان کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تناسخ کے قائل تھے اس لئے اب عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کے قصوں کی بنیاد ہندوستان میں پڑی۔ اکثر حکما نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن اس طرز کی ایجاد کا سہرا بیدپا کے سر ہے بعد کی تمام تصنیفات اسی کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہیں۔ اور گویا اسی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں۔

اس کتاب میں وہ تمام نصیحتیں جمع کر دی گئی ہیں جن سے انسان کو روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ نیز اخلاقی اصلاح کے لئے مفید ہیں۔ یہ نصیحتیں جیساکہ ذکر ہوا قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں ہیں جو شاخ در شاخ چلی گئی ہیں۔ یہ کتاب پہلے سنسکرت زبان میں بارہ بابوں میں تصنیف ہوئی۔ سنسکرت سے سریانی میں اسکا ترجمہ ہوا سریانی سے پہلوی یعنی قدیم فارسی میں منتقل ہوئی۔ ابن مقفع نے اسی پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اپنی طرف سے ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا ہے جس میں کتاب کے محاسن کو اُجاگر کیا ہے اور اُس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کی ہے

ابن مقفع کے معاصرین اس کی اس سبقت کو رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے

حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اسکا مکرر ترجمہ کیا بعض لوگوں نے اسے نظم بھی کر ڈالا تاکہ حفظ کرنے میں آسانی ہو۔ اس میں بھی ابن مقفع سے مقابلہ آرائی مقصود تھی۔ مگر یہ تمام تراجم قبول کی سند حاصل نہ کر سکے اور خود ہی فنا ہو گئے صرف ابن مقفع کا ترجمہ باقی رہ گیا۔ اس وقت اس کتاب میں ۲۱ باب ہیں جن میں کچھ ہندی الاصل ہیں کچھ فارسی اور کچھ عربی۔ اصل سنسکرت کے بارہ باب ہیں۔ فارسی کے تین۔ عربی ترجمہ سے پہلے تین باب غیر معروف تھے جن میں ابن مقفع کا نیز ابن علی شاہ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ ان میں بعض چیزیں عربی کے موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتیں۔

پھر ہندی اصل اور پہلوی ترجمہ دونوں ضائع ہو گئے۔ صرف یہی عربی ترجمہ رہ گیا دوسری قوموں نے اسی سے اپنی زبانوں میں منتقل کیا حتیٰ کہ سریانی میں بھی دوسری مرتبہ اسی سے ترجمہ کیا گیا۔ علاوہ ان زبانوں کے یونانی۔ اطالی۔ جدید فارسی۔ ترکی۔ عبرانی۔ لاطینی۔ اسپینی۔ لمقیہ انگریزی۔ روسی ان تمام زبانوں میں عربی سے ترجمہ ہوا۔ بعد کو ان زبانوں سے پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

عربی نسخہ کے اس وقت متعدد نسخے شائع ہو چکے ہیں بعض میں تصاویر بھی ہیں بکمل کتاب صرف مرحوم خلیل یازجی نے شائع کی ہے۔

کلیلہ دمنہ منظوم

۱ سب سے پہلے اس کتاب کو ابوسہل الفضل بن نوبخت نے نظم کیا۔ یہ منصور عباسی اور اس کے بعد اس کے بیٹے کا ملازم تھا۔ اس نے فارسی کی دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

۲۔ ابان الاحقی۔ اس کے صرف دو شعر باقی رہ گئے ہیں۔

۳۔ علی بن داؤد۔ زبیدہ (ہارون کی بیوی) کا کاتب

۴۔ بشر بن المعتمد نے بعض حصہ کو نظم کیا۔

یہ تمام منظومات ضائع ہو گئیں۔

۵- ابن ہباریہ (متوفی ۵۰۴ھ) کتاب کا نام "نتائج الفطنہ فی نظم کلیلہ ودمنہ" لندن، ہندوستان اور آستانہ کے کتبخانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں، ہندوستان کا نسخہ ۱۳۱۷ھ میں بمبئی میں (لیتھو میں) شائع ہو چکا ہے دوسرا اڈیشن کسی دوسرے مقام کے نسخہ سے بعبدا (لبنان) میں (۱۹۰۰ء میں) الخوری نعمۃ اللہ الاسمر کے اہتمام سے شائع ہوا۔ کتاب نامکمل تھی اس لئے اس نے بقیہ بابوں کا خود ترجمہ کیا ہے۔

۶- ابن مماتی (متوفی ۶۰۶ھ) مگر اس کی نظم ضائع ہو گئی۔

۷- عبدالمومن بن الحسن (ساتویں صدی ہجری) اس نے پوری کتاب یا اس کے بعض حصے یا اسی طرز کی دوسری کتاب کو نظم کیا اور اُسکا نام "درر الحکم فی امثال الہنود والعجم" رکھا اس کے قلمی نسخے فینا اور مونیخ میں موجود ہیں۔

۸- جلال الدین (نویں صدی ہجری) اسکا ایک نسخہ آبا رالیسوعین (بیروت) اور ایک برٹش میوزیم میں ہے۔

۹- کلیلہ ودمنہ کے مقابلہ میں سہل بن ہارون نے بھی اسی طرز کی ایک کتاب کو نظم کیا لیکن یہ بھی ضائع ہو گئی۔ کتاب کا نام اس نے "کتاب ثعلہ وعفرہ" رکھا تھا۔

(۲) کتاب الادب الصغیر۔ اسکا موضوع اخلاق وحکم اور فلسفہ اجتماع ہے۔ جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ (اسکندریہ) نے ۱۹۱۱ء میں احمد زکی پاشا کی ادارت میں بہترین شکل وصورت میں شائع کیا۔ موصوف نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں کتاب کے طرز واسلوب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

(۳) کتاب الدرۃ الیتیمہ اسکا دوسرا نام کتاب الادب الکبیر ہے۔ یہ بھی نصیحت وارشاد میں ہے تقریباً ۵۰ صفحوں کی ضخامت میں کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ ابن عربی نے "محطۃ الاسباب و ذخیرۃ الاکتساب" کے نام سے ایک تتمہ بھی لکھا ہے۔ اسکا ایک قلمی نسخہ پیرس کے کتبخانہ میں ہے۔

(۴) ایک اخلاقی رسالہ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ نور عثمانیہ (آستانہ) میں ہے۔

علاوہ اس کے اور بھی بہت سی کتابوں کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا کسی موقعہ پر ذکر بھی آچکا ہے۔ انہی میں کتاب التاج نوشیرواں کے حالات پر مشتمل ہے کتاب "سیر ملوک العجم"۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اسکا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔

نمونۂ کلام

کوئی شک نہیں کہ ابن مقفع کی شہرت کے دو بڑے اسباب ہیں یعنی تراجم۔ اور ماہرانہ انشا لیکن وہ نرا مترجم یا محض انشا پردازہی نہ تھا بلکہ اس میں ایک زبردست اخلاقی رہنما کی شخصیت بھی نمایاں تھی۔ وہ انسان کی اجتماعی وانفرادی زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا اور کامیاب غواص کی طرح ایسے بیش بہا موتی نکال لایا جن کی چمک دمک سے آج بھی نظر میں ہیں۔ انسان کی خوبیوں اور خامیوں اور دونوں پر اُس کی گہری نظر تھی۔ وہ اپنے عجیب غریب فلسفیانہ انداز بیان میں ایک طرف ہمیں برائیوں سے منع کرتا ہے تو دوسری طرف کی ترغیب دیتا ہے اس کے ان حکیمانہ اقوال کو پیش نظر رکھا جائے تو بلا شبہ ہماری زندگی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ اس موقعہ پر قارئین کی خدمت میں اس کی اسی قسم ایک تصنیف کا مختصر سا اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف اس کی ماہرانہ انشا پرداز اور دوسری طرف اُس کے مصلحانہ اقوال کی صداقت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ وھو ہذا

عَمَلُ البرِ خَیرُ صاحِب	نیک کام بہترین رفیق ہے
اَحَقُّ ما صانَ الرجلُ اَمرَ دینِہ	مذہب انسان کے لئے سب سے زیادہ حفاظت کا
الالف للدنیا مغمۃ	دنیا سے محبت کرنیوالا دھوکہ میں ہے۔
احسن العفو ما کان عن عظیم الجرم من الزم	بہترین عفو وہ ہے جو کسی بڑے جرم پر ہو جس نے
نفسہ ذکر الآخرۃ اشتغل بالعمل	کی یاد کو اپنے لئے ضروری سمجھ لیا وہ عمل کی جانب بھی
المغبون من طلب ثواب الآخرۃ فی الدنیا	جو شخص آخرت کے ثواب کی دنیا میں توقع رکھے وہ

الاعتراف تودی الی التوبہ	گناہوں کا اعتراف توبہ کی جانب مائل کر دیتا ہے۔
الاصرار دعاءٌ للذنوب	جرم پر اصرار گناہوں کی زیادتی کا موجب ہے۔
الجود من بذل ما یضن بہ	سخی وہی ہے جو ایسی چیزوں کی سخاوت کرے جن سے بخل کیا جاتا ہے
الفکر مفتاح القلب	غور و فکر دل کی کنجی ہے۔
الاستماع اسلم من القول	بولنے سے سننا بہتر ہے۔
کمون الحقود الکمون النار فی العود	پوشیدہ ہی جیسا کہ ایندھن میں آگ
اکرم الاخلاق التواضع	تواضع (اور انکسار) بہترین خصلت ہے۔
التواضع یورث المحبۃ	تواضع سے محبت پیدا ہوتی ہے۔
الکبر مقرون بہ سوء الظن	کبر و خود پسندی سے (دلوں میں) سوءظن پیدا ہوتا ہے
من عذب لسانہ کثر اخوانہ	جس کی زبان میٹھی ہوگی اس کے دوست کثرت سے ہونگے
من استبعد الآخرۃ رکن الی الدنیا	جس نے آخرت (قیامت کو) دور جانا دنیا کی جانب مائل ہوگیا
سرور الدنیا کاحلام النائم	دنیا کی مسرت خواب کی طرح ہے۔
المغبون من طلب الدنیا بعمل الآخرۃ	جس نے آخرت کے کاموں سے دنیا کو طلب کیا وہ دھوکہ میں ہے۔
من اھلک نفسہ فی مرضاۃ غیرہ عظم جنایتہ	جس نے اپنے آپ کو دوسرے کی مرضی کے پیچھے ہلاک کر دیا اس کا جرم بہت بڑا ہے۔
انفع الکنوز العمل الصالح	مفید ترین خزانہ عمل نیک ہے۔
من ابصر العاقبۃ فآثرھا امن الندامۃ	جس نے انجام پر نظر رکھی اور اسی کو ترجیح دی وہ ندامت سے محفوظ رہا۔
من عرف ثمار الاعمال کان حقیقاً ان لایغرس شرا	جو شخص اعمال کے نتائج سے واقف ہوگیا اس سے توقع ہے کہ وہ برا بیج نہ بوئے گا۔

اہن دنیا بائدہ تستکمل کرامتہ	فانی دنیا کو ٹھکرادو اپنی شرافت کی تکمیل کرو
ابغی الجروح مضضاً جرح الآثام	سب سے زیادہ تکلیف کو باقی رکھنے والا زخم گناہوں کا زخم ہے
ائت الی الناس ماتحب ان یوتی الیک	دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جس کو خود تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔
استصغر المشقۃ اذا ادت الی منفعۃ اطلب الرحمۃ بالرحمتہ	اس مشقت کو حقیر سمجھو جس سے کسی نفع کی توقع ہو رحمت کو رحمت ہی سے طلب کرو
احب الاعمال ما دبر بالتقوی	بہترین اعمال وہی ہیں جو تقوے کے ساتھ ہوں
بالحزم تیم الظفر	احتیاط سے کامیابی حاصل ہوتی ہے
الدنیا نوم نائم والدولۃ حلم حالم	دنیا "نیند" ہے اور دولت ایک خواب
من سالم الناس ربح السلامۃ	جس نے لوگوں سے صلح جوئی کا برتاؤ رکھا محفوظ رہا۔
ومن تعدی علیہم کسب الندامۃ	اور جس نے زیادتی سے کام لیا ندامت اٹھائی۔
بادر بعمل الخیر اذا امکنک	نیک کام کے لئے جسقدر ممکن ہو جلدی کرو
الدنیا قد تدرک بالجہل کما یدرک العقل	دنیا جس طرح عقل سے حاصل ہوتی ہے جہالت سے بھی حاصل ہوتی ہے۔
من احب التزکیۃ تعرض للضحکۃ	جس نے اپنی تعریف کو پسند کیا مضحکہ بن گیا۔
احسن العمل الصالح ما کان بصدق النیۃ	بہترین نیک کام وہی ہے جو نیک نیتی کی بنا پر ہو
من حصتن سرہ امن ضرر ذلک	جس نے اپنا راز مستور رکھا اس کے ضرر سے محفوظ رہا
خسر من انفق حیاتہ بغیر حقہ	جس نے اپنی زندگی کو فضول کاموں میں ضائع کیا نقصان میں رہا۔
طوبی لمن ترک دنیاہ لآخرتہ	مبارک ہے وہ ہستی جس نے آخرت کے پیچھے دنیا کو ترک کردیا

لاتحمد نفسک علی ماترکت من الذنوب عجزاً	گناہوں کو مجبوراً ترک کرنے پر اپنی تعریف مت کرو
لارای لمن انفرد برایہ	اس شخص کی کوئی رائے نہیں جو اپنی رائے میں تنہا ہے
من ترک رای ذوی النصیحۃ اتباعاً لما یہوی استوخم العاقبۃ	جس نے اپنی خواہشات کے پیچھے نصیحتوں کو پس پشت ڈال دیا برا انجام دیکھے گا
المشاورۃ اوثق ظہیر	مشورہ قابل اعتماد معین ہے
المستشار موتمن	جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہے
باجالۃ الرائے تظفر بالحزم	ہر بات کے متفرق پہلوؤں پر نظر کرنے سے احتیاط حاصل ہوتی ہے۔
استوجب الطاعۃ من ذوی الرائے بالمودۃ	اصحاب رائے کی اطاعت دوستی سے حاصل کرو
کثرۃ اعمال السوء مضرۃ بالعمل	برے کاموں کی کثرت نقصان رساں ہے
الصنیعۃ عند الکفور لاتثمر الامرا	ناشکر پر احسان کرنا کڑوا پھل پیدا کرتا ہے
اکثر محادثۃ من لعیدقک عن عیوبک	جو تمہارے عیوب راستی سے بتائے اس سے زیادہ میل کرو۔
اکمل النصحاء من لم یکیم صاحبہ نصیحۃ وان استقلہا	حقیقی طور پر نصیحت کرنیوالا وہی ہے جو اپنی نصیحت اور مشورہ کو دوست پر ظاہر کردے خواہ وہ اسے کیسا ہی حقیر سمجھتا ہو۔
استعن بالصبر لاطفار الغضب	غصہ کی آگ فرد کرنیکے لئے صبر سے کام لو
لاتجنین علی نفسک عداوۃ وبغضۃ اتکالا علی ما عندک من العمل والقوۃ والمنعۃ	اپنے اقتدار حفاظت اور عمل پر بھروسہ کرکے خواہ مخواہ کسی سے عداوت وکینہ مول نہ لو۔
کن فی الحرص علی معرفۃ عیبک بمنزلۃ عدوک فی معرفۃ ذلک	اپنے عیوب کی جستجو دشمن کی طرح کرو

البصیر من عرف ضرہ من نفعہ	دور اندیش وہی ہے جو اپنے نفع نقصان کو سمجھتا ہے
ربما تحولت البغضاء مودۃ والمودۃ بغضاء	بسا اوقات محبت عداوت اور عداوت محبت سے بدل جاتی ہے۔
قرب الصالحین داع للصلاح	پاک لوگوں کی صحبت سے انسان میں پاکی پیدا ہوتی ہے
	مفلس کو اس کے عزیز بھی بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔
لا تغتر الاقویاء بفضل قوتہم علی الضعفاء	طاقتور کمزوروں پر اپنی قوت و اقتدار کی وجہ سے دھوکہ نہ کھائیں
الضعیف المحترس من العداوۃ اقرب الی السلامۃ من القوی المغتر	عداوت سے محفوظ رہنے والا کمزور برخود غلط طاقتور سے زیادہ مامون ہے۔
من قل کلامہ حمد عقلہ	کم سخن کی عقل کی تعریف کیجائیگی۔
من عرف قدرہ قل افراطہ	جس نے اپنی حیثیت کا اندازہ کر لیا وہ افراط تفریط سے محفوظ رہا۔
احسن والدولۃ لک عین والدولۃ علیک	اپنی مقدرت کے وقت اچھا سلوک کرو مصیبت کے وقت تمہارے ساتھ بھی سلوک کیا جائیگا۔
من حرم عقلہ رزی دنیاہ وآخرتہ	عقل سے محرومی دنیا و آخرت دونوں کی خرابی کا باعث ہے۔
العجب آفۃ العقل	خود پسندی عقل کی تباہی ہے
الہم مرض العقل	غم و فکر عقل کی بیماری ہے
احذر صولۃ اللئیم اذا شبع	گنوار پیٹ بھرے کے حملہ سے بچو۔

الاحسان یقطع اللسان[۵۱] — احسان زبان کو بند کر دیتا ہے۔

احسن المدح اصدقہ — تعریف میں جتنی صداقت ہو گی اتنی ہی بہتر ہو گی۔

طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ پوری کتاب نقل کر دی جائے اگر قارئین کرام نے پسند کیا اور فرصت ملی تو ارادہ ہے کہ کسی آئندہ صحبت میں ابن مقفع کی اس قسم کی کتابوں کے مفید اقتباسات پیش کئے جائیں۔

---

۵۱ رسائل البلغا مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹ – ۱۲۰

کبیر

ڈاکٹر ٹیگور نے کبیر کی سَو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور Evelyn Underhill نے ان نظموں کے مجموعہ پر ایک دلچسپ تمہید لکھی ہے۔ یہ مضمون اسی تمہید کا ترجمہ ہے

ہندوستان کی تاریخ تصوف میں کبیر ایک نہایت ہی دلچسپ شخصیت ہے۔ وہ ۱۴۴۰ء سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوا۔ مقام ولادت بنارس کے مضافات میں کوئی جگہ تھی۔ روایات اس کے والدین کو مسلمان بتاتی ہیں لیکن اوائل عمر ہی میں وہ مشہور ہندو زاہد راما نند کے حلقۂ ارادت وعقیدت میں داخل ہو گیا۔ راما نند شمالی ہند میں اس دینی اصلاح وتجدید کا مبلغ ہے جس کی جنوبی ہند میں بارہویں صدی مسیحی میں "برہمنیت" کے مصلح اعظم رامانج نے دعوت دی۔ یہ تحریک اصلاح ایک ردِ فعل تھا اُس عہد کی روز افزوں پابستگیٔ رسم ورہ عام" کا۔ نیز اُن ایام کے فلسفۂ ویدانت میں ضرورت سے زاید ذہنی غلو پیدا ہو گیا تھا اور داعیاتِ قلب کے لئے اسمیں کوئی عنصر باقی نہ رہا تھا، پس دل ودماغ کے مطلوبہ توازن کا از سرِ نو قیام بھی مذکورہ بالا حرکت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا مزید براں مشربِ ویدانت میں توحید وجودی کا مسلک مبالغہ آمیز حد تک پہونچ گیا تھا چنانچہ یہ افراط وتفریط بھی محتاج اصلاح تھی۔ رامانج کی شریعت میں ہستی مطلق وشنو دیوتا کی شکل میں جلوہ آرائی ہوئی۔ اور اُسکا مذہب ایک "ملت عشق" کا داعی بنا۔ ہر قوم کی ذہنی ارتقا کی تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں یہ مظہر ضرور نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ نفوس انسانی کے اس مخصوص اقدام میں بجائے دماغی افکار کے دل کے جذبات زیادہ کارفرما ہوا کرتے ہیں، لیکن اس "سیلاب قلب" کے سامنے فلسفہ وحکمت کی ساری دانش آموزیاں خس وخاشاک سے زیادہ سدراہ ثابت نہیں ہوتیں۔

اگرچہ یہ روح ہندو مذہب کی خصوصیت ہے اور بھگوت گیتا کے بہت سے مقامات اس کے روشن مظاہر ہیں لیکن ہندوستان کی تاریخ مذہبیات کے دور وسطیٰ میں اُس نے جو نشاۃ ثانیہ اختیار کی اس میں ایک منفرد قسم کا تضاد بین العناصر پیدا ہو گیا تھا۔ راما نند جس نے اپنی ساری روح کبیر کے سینہ میں منتقل کر دی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب عالم کا ایک بہت بڑا وسیع النظر فاضل تھا۔ اس کے علاوہ وہ داعیانہ جوش و خروش سے ایک لبریز دل رکھتا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ جلیل القدر فارسی شعرائے متصوفین عطارؔ سعدیؔ، رومیؔ، حافظؔ وغیرہم ہندوستان کے افکار مذہبی کو اپنے طوفان تخیل اور طغیانی تصور سے زبردست تھپیڑے دے رہے تھے اور دنیائے قلب و روح کی ان بیرونی حملہ آوروں سے دست و گریباں ہونیکے لئے ہندی فلسفہ و حکمت کے کارزار میں "محاذ کے بدلنے" کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ راما نند وقت کی ضرورت کی اس خاموش آواز پر اٹھا۔ اس نے بجائے طبل جنگ بجانے کے صلح کا سفید جھنڈا بلند کیا اور ایک تجویز مفاہمت و مصالحت پیش کی۔ اس طرح اسلامی تصوف اور برہمنی روایاتی فلسفہ کا ایک "مجمع البحرین" وجود میں آیا۔ بعض محققین اس "ثنویت" کو "تثلیث" کے رنگ میں دیکھتے معلوم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس معجون مرکب میں مسیحی عقائد اور مشرب حیات کا عنصر بھی شامل تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسا معرکۃ الآرا نقطۂ بحث ہے جس پر مستند فضلا بالکل متضاد قسم کی آراء رکھتے ہیں اس لئے اس کو اس جگہ چھیڑنا بے محل ہوگا۔ تاہم مذکورۂ بالا حقیقت معناً ضرور صحیح ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ راما نند اور کبیر کا ہندوستان میں بہایا ہوا یہ چشمہ ایک اسی قسم کی "تربنی" تھا جیسا کہ قرن اول کا مسیحی کلیسا جس میں اسرائیلی مذہب کے بہت سے معتقدات اور یونانی فلسفہ الٰہیات کے بیشتر خیالات و نظریات کی آمیزش ہے لطف یہ ہے کہ ہر دو موقعوں پر یہ تینوں عناصر مشہور "عناصر اربعہ جسم انسانی" کی طرح آپس میں متغائر و متصادم ہیں! کبیر کے استغنائے دماغ کی قدرت، تخلیق و

تسویہ" کا یہ ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اُس نے ان متعارض اجزاء کو ایک واحد مرکب میں مرشتہ اور پیوستہ کرکے باہم شیر و شکر کر دیا!

تجدید مذہب کے کوچہ میں کبیرؔ ایک بے بدل مجدد ہے۔ وہ ایک مستقل ملت توحیدی کا سرچشمہ ہے جو "کبیر پنتھ" کہلاتا ہے اور جس کے رشتۂ عقیدت میں اب بھی شمالی ہند کے قریباً ایک لاکھ ہندو وابستہ گلو ہیں، وہ بالکل صوفیانہ رنگ کا ایک شاعر ہے جو "ترک رسوم" اور "کیش محبت" کا پیام مستانہ دیتا ہے اور آج بھی اپنے دوہوں اور بھجنوں کے اندر "حی ولایموت" ہے! اسکا حشر بھی اُسی کی طرح کے دوسرے "معلنین حق" کا سا ہوا جنہوں نے شاہد حقیقت کے عالم آشوب چہرے کو اپنے "دست بیباک" سے بےنقاب کر دیا اور بیانگ دہل کہدیا کہ۔

حرم جویاں درے را می پرستند   فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد   کہ یاراں دیگرے را می پرستند

یہ تھا کبیرؔ کا نعرۂ رندانہ!

سر خدا کہ زاہد و عابد کسے نگفت   در حیرتم کہ مغبچۂ از کجا شنید!

اس نے خلق خدا کو دوبارہ "عیال اللہ" کے نام سے پکارا! العظمت للہ! لیکن اس بوالعجبی کو دیکھو کہ اُس کے شیدائیوں نے اُس کی محبوب یاد میں ایک ایسی یادگار قائم کی جو اُسی قسم کی بدعت بن گئی جس کے لئے کبیرؔ کا وجود قدسی عرصہ تک "سدّالفتن" بنا رہا!

باز ایں بیت الحرم تبخانہ شد!

لیکن اُس کے ترانے اور زمزمے سچے محتسب بنکر آج بھی "تازیانہ بدست" ہیں اور اسکو اپنے قدیم لباس حقیقت میں تلاشیان مقصود کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔
کبیرؔ کی روح اس کے مستند کلام کے انہی پیکروں میں نظر آسکتی ہے اور اُس

کے نام اور "پنتھ" کے ساتھ بہت سی منسوبات محض حقیقت کو مستور کرنے کا سامان ہیں۔

درسخن نہاں شدم مانند بُو اندر گلے　　　ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

کبیر کے کلام میں عاشقانہ وحق پرستانہ جذبات کی ایک وسیع فضا اپنی ساری ممکن پہنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ بلند ترین حقایق مجردہ، شاہد سرمدیت کے ساتھ اشتیاق وصال، اور معراج عشق و وصول کی ذاتی وارداتیں بڑے پیارے اور گھریلو استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کی گئی ہیں۔ کبیر اپنی زبان میں ہندو اور مسلمان ہر دو اصطلاحات اور الفاظ سے آزادانہ کام لیتا ہے اور ہر دو مذاہب کے اعتقادات و روایات کی بلا تکلف و پرہیز تلمیح وکنایہ کرتا ہے! چنانچہ ان نظموں کے مصنف کی نسبت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا وہ برہمن ہے یا شیخ، سادھو ہے یا صوفی، ویدانت کا معتقد ہے یا وشنو کا پرستار! وہ "لانفرق بین احد منھم" کا کلمہ گو معلوم ہوتا ہے!

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم　　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں!

کبیر کہتا ہے کہ "میں عبد اللہ بھی ہوں اور بھگت رام بھی!"

عارف ہم از اسلام خراب ست وہم از کفر　　　پروانہ چراغ حرم و دیر ندانَد!

الغرض با لفاظِ دیگر بمعنی کبیر۔

یک چراغیست درین خانہ کہ از پرتو آں　　　ہر کجا مینگری انجمنے ساختہ اند!

کبیر کی حیات کے گرد اگرد گوناگوں اور متضاد مطلب داستانوں اور افسانوں کا ہجوم ہے جن میں سے کسی کو تکیہ اعتماد نہیں بنایا جاسکتا۔ ان میں سے کچھ ہندوؤں نے لکھے ہیں اور کچھ مسلمان اہل قصص کی تراوش قلم ہیں اور ہر ایک گروہ باری باری سے اس کو اپنی ملت کا فرد ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اسکا نام بلاشبہ اُس کی مسلم ولدیت کا ایک قطعی ثبوت ہے اور غالباً سب سے زیادہ مستند وہ روایت ہے جس میں کبیر کو بنارس کے ایک مسلمان نور باف کا لے پالک بتایا گیا ہے، لیکن عارفان حقیقت جانتے ہیں کہ کبیر تو اس زمرہ خاصان

خدا کا ایک شخص ہے جن کی نسبت کہا گیا ہے:

بارِ تو آفتاب حسن از لیم ۔۔۔ فرزند نۂ ایم آدم و حوارا!

بنارس کبیر کا مشہور مولد و منشا ہے۔ پندرہویں صدی کے شہر بنارس میں مختلف ادیان و مذاہب کے سرچشموں کے سوتے پہلو بہ پہلو بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ در اصل اس وقت کے مذہبی جغرافیہ میں رُودِ دجلہ اور گنگا ندی کا سنگم اسی "دوسرے پریاگ" (بنارس) میں دکھائی دیتا ہے۔ راما نند کی شہرت کا آفتاب آج کل نصف النہار پر تھا اور اُس کا جدید مسلک اہل ویدانت اور اربابِ تصوف ہر دو کے لئے ایک یکساں دعوت اور ایک مشترکہ مبحثِ نظر بن گیا تھا۔ نوخیز کبیر جس کے سینہ میں آتشِ حق کے شرارے پوشیدہ تھے۔ اُس نے بہت جلد دیکھ لیا کہ اس تصادم احزاب اور جنگ زرگری میں میرا اگر کوئی موزوں مرشد ہو سکتا ہے تو وہ راما نند ہے۔ لیکن کبیر نے دیکھا کہ رسائی شیخ کی راہ میں تفریق مذہب کی کیسی سدِ سکندری حائل ہے!

الغرض اس کو ایک تدبیر سوجھی اور وہ بزبانِ حال یہ کہتا ہوا کہ،

تھوڑی سی اگر خاک ترے راہگذر کی ۔۔۔ ملجائے تو بن جائے دوا دردِ جگر کی!

اُس گھاٹ کی سیڑھیوں پر جا کر لیٹ گیا جو راما نند کے اشنان کرنیکی جگہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی طرف جاتے ہوئے ہندو درویش کا پاؤں لاعلمی میں کبیر پر پڑ گیا اور "رام رام!" مضطربانہ کلمات اُس کی زبان پر تھے۔ کبیر فوراً بول اُٹھا کہ "دو بس میں آپ کا چیلہ ہو گیا اور میں نے گرو کے منہ میں وہ "شبد" سُن لئے جو وہ اپنے مت میں داخل کرتے ہوئے بولا کرتے ہیں!"

یہ ایک عجیب منظر تھا! برہمنوں نے اس بدعت پر سخت اعتراض کیا جس کا مطالبہ کبیر نے راما نند کرنا چاہا تھا۔ مسلمان اہل شریعت نے بھی اس کو ارتداد و الحاد کی ہم معنی سمجھا۔ دونوں ملتوں کے لوگوں کے لئے مذہبی مراسم کے مسلمہ آئین کا یہ استہزا سخت

برافروختگی کا باعث ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر کی یہ نرالی درخواست راما نند کے لئے ناقابل رد ثابت ہوئی اور جلد کبیر، راما نند کا مرید رشید بن گیا۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ کبیر راما نند کے فلسفۂ حیات کی عملی تفسیر تھا۔ ہند و مجتہد و مجدد نے جو نیا مشرب زندگی اپنی زبان و خیال سے پیش کیا تھا اسکو عملی جامہ پہنوانے کا سہرا کبیر کی بیباکانہ اقدام کے سر ہی ہے جس نے راما نند کے قدموں کو بھی اس سطح تک بلند کر دیا جہاں تک ابھی اُس کے شہپر تخیل ہی کی رسائی ہوئی تھی! کبیر کے بعض مسلمان سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ کبیر مشہور صوفی بزرگ پیر تقی جھانسوی کے حلقہ رشد و ہدایت کا ایک فیضیاب ہے، مگر اس نظرئے کو قبول کرنا ذرا مشکل ہے اس لئے کہ خود کبیر اپنے کلام کے صفحات میں جہاں اپنے پیر کی بزم سلوک و طریقت آراستہ کیا کرتا ہے تو وہاں اس مسند ارشاد پر صرف راما نند کو بٹھاتا ہے بیشک اس قسم کے لوگ زیادہ تر "تلامیذ الرحمٰن" کہے جانیکے زیادہ مستحق ہیں اور وہ عملاً کوئی رہبر بجز ہادی مطلق اور اپنے "قلب سلیم" کے نہیں رکھتے، لیکن یہ ایک دوسرا نقطۂ نظر ہے۔ الغرض انسانی مرشدوں میں کبیر کو بجز راما نند کے کسی اور بزرگ سے تلمذ نہیں معلوم ہوتا۔

کبیر کے متعلق جو مختصر اور مستند تاریخ ہم تک پہونچی ہے وہ کبیر کی زندگی کے بارے میں متداول اور معروف روایات کے بیشتر حصہ کی تغلیط کرتی ہے۔ جن جن مراتب معرفت سے وہ اپنے ارتقاء روحانی کے دوران میں گزرا، اور جس طریقہ سے وہ واصل باللہ ہوا اُس کے متعلق ہم یکسر تاریکی میں ہیں۔ وہ سالہا سال تک اپنے آقا کی خدمت، صحبت میں رہا اور اُن بہ کثرت مذہبی و فلسفیانہ مباحثوں و مناظروں میں حصہ لیتا رہا تھا جو راما نند کے ساتھ برہمنوں اور ملاؤں نے کئے۔ ہندو اور مسلمان مکاتب فلسفہ کی جو جو اصطلاحیں اُس کی زبان زد معلوم ہوتی ہیں اُن سے آشنا ہونے کے غالباً یہی موقعے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس نے ہندو جوگیوں اور صوفی مفکرین کے

طریق ذکر وشغل کا اتباع کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس قدر قطعی ہے کہ اُس نے ان سرد و جماعتوں میں سے کسی کے بھی دستور العمل حیات کو کبھی قبول نہیں کیا - وہ نہ کبھی چلہ کش درویش بنا اور نہ تارک الدنیا اور صحرانشین جوگی - اُس نے نہ دماغ و حواس کو مختل کرنیوالے وظیفے پڑھے اور نہ اعضا و جوارح کی تکلیف و تعذیب دینے والی تپسّیائیں کیں! مرشد ازل کی خاموش تربیت نے اُس کے قلب کو یہ سارے ادب آموز اور معرفت آگاہانہ مراتب طے کرا دئے تھے اس کی زندگی بظاہر ایک پاکیزہ مذاق اور خوش باش دنیا دار آدمی کی سی زندگی تھی - وہ موسیقی سے کافی ذوق رکھتا تھا اور مشق سخن کے چسکے سے بھی خالی نہ تھا - سچ یہ ہے کہ بہ صورت ظاہر، وہ بجائے فنافی اللہ درویش کے ایک دنیاوی "صناع" کا شغلہ رکھتا تھا! اُس کے بارے میں جسقدر قصے اور افسانے ہیں سب میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر دیکھی جاتی ہیں: وہ ایک جولاہا تھا اور تعلیم و خواندگی کے اعتبار سے محض اُمّی، اُسکا ذریعہ بقول شخصے اسی طرح تھا کہ وہ "در کارگاہ خود دست و پا میزد"۔ عمر خیام (خیمہ دوز) اور بوہے کفش دوز کی طرح اس کے پیشہ نے بھی اس کو تخیل اور صنعت کے باہمی امتزاج کی تعلیم دی تھی! چنانچہ اس طرح اس کا عامیانہ پیشہ اس کی بلند تر ذہنی اور روحانی زندگی میں ہارج نہ ہوا بلکہ ایک گونہ اُسکا رہنما و معاون بنا! وہ رُہبانیت سے بمراحل دور تھا، اس نے رشتہ ازدواج میں اپنے کو منسلک کیا تھا اور ایک متاہلانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اُسکا دنیاوی گھر زن و فرزند کے غوغا سے آباد تھا! اگرچہ یہ وہ واقعہ نفس الامری ہے جس کے اخفا کرنے کی ہندو سیرت نگاروں نے بیسود کوشش کی ہے، یا بعض نے اگر دبی زبان سے اُسکا اعتراف کیا ہے تو انتہائی ایجاز بیانی سے کام لیتے ہوئے صرف اس کے سرسری ذکر پر اکتفا کیا ہے اور علانیہ اُسکی تفصیل یا توجیہ سے گریز کیا ہے! لیکن حقیقت واقعہ سے انکار ممکن ہے الغرض کبیر، "مخلوق میں شامل" اور "اللہ سے دواصل" ہو کر زندگی بسر کرنے میں

مولانائے رومی کے اس ناقدانہ مسلک حیات کا قائل تھا کہ:

چیست دنیا از خدا غافل بُدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس طرح ہم کو پتہ لگتا ہے کہ کبیرؔ کے اُسی دل سے وہ بلند اور وہ ولولہ انگیز نغمہائے عشق حقیقی نکلے ہیں جو اسی سطح سفلی وارضی پر اُسوقت اُس کے سینہ میں دھڑکا کرتا تھا جبکہ وہ اپنے بال بچوں کے حلقے میں بیٹھا ہوتا تھا! اُسکا سارا کلام جس میں اس نے اپنے نظام فلسفہ کو بے نقاب کیا ہے اُسکی اسی واقعی زندگی کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ وہ بار بار گھر کی زندگی کی تقدیس کرتا ہے، روزمرہ کے اعمال و فرائض حیات کی اہمیت، عظمت اور واقعیت کو بیان کرتا ہے، اور پھر اسی تاہل میں تجرد کی، اور اسی سفلیت میں علویت کی، اور اسی ارضیت میں سماویت کے مواقع اور جلوے شمار کرتا ہے! وہ پیشہ ور جوگی کے نمائشی تقدس کا مضحکہ اڑاتا ہے جو بقول اُس کے "اپنی داڑھی چھوڑکر اور لٹیں بڑھاکر بجائے انسان کامل بننے کے ایک حیوان مکمل (بکرا) بن گیا ہے! اور اسی طرح اس حماقت اور منافقت میں وہ اُن سب لوگوں کو شامل کرتا ہے جو اُس دنیا سے فرار کرنے پر مائل ہیں جو ایک تزکیہ طلب انسان کی ریاضت نفس کا اصلی میدان ہے اور جس کا جمالی پہلو کچھ کم دلکش نہیں، جو حسن و عشق، مسرت والفت، مروت و قربانی کے مناظر و مظاہر سے معمور ہے اور "اُس حقیقت عظمےٰ اور محبت کبرےٰ کا پرتو گاہ ہے جو محیط کل اور مشہور عالم ہے!"

کبیرؔ جس مجتہدانہ وسعت نظر اور جس مجددانہ بیباکی کا پیکر تھا۔ اُسکا اندازہ آسان نہیں۔ ہندو و مسلم دونوں حلقوں کے نمائش گر زہد و اتقا کی بارگاہ میں کبیرؔ علانیہ ایک ناستک یا ملحد کی نوعیت رکھتا تھا! تمام مروجہ مسلکوں اور شریوں سے اُس کی بیزاری جملہ رسمی و بیرونی عبادات سے اس کی نفرت — جس میں وہ ایسا ہی متشدد تھا جیسا کہ عیسائی ممالک کا مسیحی فرقہ کوئیکرز نظر آتا ہے۔ ان سب باتوں میں اہل تقوٰے و

ارباب صلاح کی نگاہوں سے اُس کو "خطرناک آدمی" کا خطاب دلوا دیا تھا اور مسجد و مندر ہر دو جگہ سے وہ مردود و مخرج کر دیا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُس کی نرالی روش نے عام مجالس و معابدِ انسانی کے اندر اُس کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رکھی تھی۔ وہ نہ نماز کا قائل تھا نہ "سندھیا" کا معتقد، وہ "خدا کو نہ کعبہ میں پاتا تھا نہ کیلاش میں"! جو لوگ اُس کے پاس جانا چاہتے تھے اُنکی آنکھوں سے وہ پردہ نہ کرتا تھا لیکن عوام کالانعام کی ذہنیت اور اُس کے دل و دماغ کے مابین ایک وسیع و عریض "حجاباً مستورا" حائل ہو جاتا تھا!۔ کبیر کے صرف خیالات عجیب تھے، ورنہ خود کبیر کا وجود جسدی کوئی ندرت نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ عموماً ہر گلی کوچے میں مارا مارا پھرتا تھا جہاں کہ در و دیوار اس کو خطاب کرتے تھے اور معرفت آموزیِ اس کی "صحبت انام" کا یہ حال تھا کہ وہ "تقدس مآب زاہد ریاکار سے زیادہ دھوبیوں اور بڑھیوں کے لئے زیادہ قابلِ رسائی تھا"! زہد و تقوےٰ اور عبادت و ریاضت کی ساری کارگاہ۔ ہندو ہو خواہ مسلم یعنی قربانگاہ و مسجد، دیوتا اور پوتر جل، مقدس نوشتے اور جبہ پوش مفتی و واعظ۔ یہ سب اس صاحب بصیرت و معرفت شاعر کی آنکھ میں ایک پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ رکھتے تھے وہ اُن کو روح کی جگہ پر جسم حقیقت کے موقعہ پر مجاز، خلوص و صداقت کے بجائے چندیجان اور نقلی چوبین مجسمے سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب حجابات بن کر روح اور اُس کے مطلوب حقیقی ہستیِ مطلق کے درمیان سنگ گراں بن گئے ہیں!

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگِ رہ بود   رفتیم و صنم بر درِ میخانہ شکستیم!

چنانچہ کبیر کہتا ہے:

"بت بیجان پارہائے سنگ ہیں۔ وہ ہرگز بول نہیں سکتے، میں نے اُن کو پکار کے دیکھ لیا ہے۔ پُران اور قرآن محض الفاظ ہیں، میں نے دونوں کتابوں کی جلدیں کھولکر دیکھ لیا ہے"!

ان بت شکن خیالات کو لیکر کبیر ہندوستان کے سب سے بڑے تجانے بنارس

میں اپنی دھونی رماتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے گویا آتش نمرود کو عین مرکز نمرود میں دعوت سوزش دی تھی! برہمنوں کے پاس اس مرد حق کیساتھ نبٹنے کی کوئی طاقت نہ تھی تاہم اپنی مایوسانہ جدوجہد میں انھوں نے ایک طاغوتی کوشش کی اور بخیال خویش فتنہ زن کی سب سے زبردست آزمائش میں اس کو ڈالنا چاہا۔ انھوں نے ایک خوبصورت لڑکی کو اس کے پاس بھیجا، لیکن اس خطرناک ترغیب لغزش کا بالکل برعکس نتیجہ ہوا یعنی خود حسین شکار افگن اس خاکستر مالیدہ مجنونِ حق کا شکار ہو گئی!

حریفوں نے اس پری جمال اور پُرشباب دوشیزہ کو کبیر کے ذوق جمالیت کیلئے بہترین تحفہ سمجھا ہوگا لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ انکا مقابل جو عاشق حق ہے اُس کا شمار اُن ربانی مستوں میں تھا جن کے ایک فرد نے اس سے کہیں زیادہ دلربایانہ پیشکش کے ہدیہ کئے جانے کے وقت کہدیا تھا۔

بلائے جان ہیں شہیدوں کو تری حور و قصور یہ کیا عذاب ملا ہے ثواب کے بدلے؟!

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کبیر بادشاہ وقت (سکندر لودی) کے حضور میں اس جرم پیش کیا گیا کہ وہ آلہی معجزہ کاریوں اور کرشمہ سازیوں کی طاقت کا اپنے میں مدعی ہے لیکن سکندر لودی جیسے شائستہ اور مہذب دل و دماغ کے تاجدار سے ایسی بدمذاقی کا ارتکاب ممکن نہ تھا جس کی توقع ناآشنائے واقعات فتنہ جو لوگوں کو تھی۔ سکندر لودی کے سامنے اسلام کے صوفی شعراء و عرفاء کے بیشمار کلمات و ملفوظات تھے اور کبیر گویا زبان حال سے اپنی برات میں شریعت عاشقی و مجذوبی کی اس آیۂ بینہ کو پیش کر رہا تھا۔

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست!

کبیر برہمنوں کی زد سے کسی قدر باہر بھی تھا کیونکہ آخر کار وہ مسلمان ماں باپ کا فرزند تھا اور کم و بیش ملت اسلامی کے صوفی شعراء کے ذیل میں شمار ہوتا تھا جن کی مستانہ نوائیوں سے مسلمان سلاطین و ارباب اقتدار بے خبر نہ تھے اور جن کے لئے شریعت کے

"باب رخصت" میں کافی رعایت رکھی گئی ہے۔ الغرض کبیر اس قسم کے احتسابات سے عموماً مستثنیٰ تھا اگرچہ مصالح "امن وآئین" کے لئے اتنا ضرور کیا گیا کہ اس کو بنارس سے خارج البلد کر دیا گیا!

جرم عشق کی پاداش میں سیاست مذہب کے دار القضا کی یہ جلاوطنی ۱۴۹۵ء کا واقعہ ہے۔ کبیر کی مستند سیرت کا یہ آخری حادثہ ہے جو ہم تک پہونچا ہے۔ اجارہ داران "امن عامہ" کو کون بتانے والا تھا کہ کبیر کی نقیض امن ہستی توام روحانیت و معرفت کا نمک تھی ؎

ہم سے وفا پرست اگر کار جنوں کو چھوڑ دیں اہل خرد کے درمیان جوش بڑا فساد ہو!

کبیر بنارس سے کیا نکلا اُسکی محدود خلوت ایک وسیع جلوت سے بدل گئی اور یہ سفر ہجرت ہمیشہ کے لئے اس کے پاؤں کا چکر بن گئی اُس نے سارے ہندوستان کا بار بار دورہ لگایا اور بیشمار معتقدین اور اصحاب ذوق واخلاص کو مستفیض کیا "کاشی نواسی" کے بجائے اب وہ پورا "بھارت باشی" ہو گیا!

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو!

کبیر نے اس واقعے کو ایک "امر مقتضیٰ" سمجھا۔ وہ اس بظاہر اتفاقی افتاد میں ایک لطیفہ غیبی نہاں دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ عاشقوں اور ملت عشق کے داعیوں کے اتباع سنت کی سعادت اُسی آوارہ گردی اور غریب الوطنی کے طفیل میں نصیب ہوئی! ع

خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا!

آخر کار ۱۵۱۸ء میں یہ "بڈھا جوان حق" ایسے عالم ضعیفی میں کہ اس کی انگلیاں خشک تار خشک چوب خشک پوست" سے "آواز دوست" نکالنے سے عاری ہو رہی تھیں شہر گورکھپور کے ایک نواحی مقام مگہر میں واصل باللہ ہو گیا۔

ایک بڑا ہی البیلا افسانہ کبیر کے واقعۂ وفات کے ساتھ وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اُس

کے وصال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس حق پر نزاع ہوئی کہ اس کی "مقدس خاک" کا وارث کون سا گروہ ہے ہر دو فریق اپنے اپنے دعوے پر مصر تھے۔ اول الذکر اس کو جلانا چاہتے تھے اور آخر الذکر اس کی تکفین و تدفین کرنے کے درپے تھے۔ الغرض کبیر کا جسد خاکی ہندو اور مسلمان تفرقہ پسندوں اور خود بینوں کو عاشقان ربانی کی بے کیشی کا ایک آخری زندہ سبق دینے کے لئے ایک دفعہ پھر اٹھا! کبیر یکبارگی اپنے دونوں پر خود غلط سوگواروں کے سامنے ایک لمحے کے لئے ظاہر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ جس جنازے کی ملکیت کے جو مدعی ہیں، وہ ذرا کفن اٹھا کر اُس کی شناخت کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کیا دیکھتے ہیں کہ کفن کے نیچے کبیر کی نعش غائب ہے اور میت پھولوں کی ایک سیج بنی ہوئی ہے! فسبحان اللہ عما تصفون!

اے بے خبران راہ نہ آنست نہ ایں!

(۲)

صوفی شاعری کی تاریخ کا تبصرہ کرتے ہوئے اُس کے آغاز کی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ اہل ظاہر کی مادہ پرستی اور استخوان فروشی کے خلاف ایک طبعی ردِ فعل تھا مگر اس کی ولادت میں ایک دوسرے عامل نفسیاتی کو بھی دخل ہے۔ یہ اسکا داعیانہ و مبشرانہ جذبہ ہے۔ جب اجارہ داران مذہب اور عوام کالانعام کی نفس پروریوں اور بے بصریوں سے حقیقت مذہب کے اوپر سینکڑوں پردے پڑجاتے ہیں اور تعصب و تکفیر بین الملل کی وبا عالمگیر ہو جاتی ہے تو ایک صاحب دل مرد خدا اٹھتا ہے اور بیباکانہ شاہد حقیقت کی طلعت زیبا کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ وہ بندۂ خدا کے درمیان کے سارے انسانی و مصنوعی حجابات کو چاک کر دیتا ہے وہ "عاشق و معشوق کے درمیان کے راز سربستہ" کی خلوت میں "کراماً کاتبین" کو بھی حائل نہیں دیکھ سکتا! وہ براہ راست دیار معشوق تک پرواز کرتا ہے اور پھر "وصال دوست کی شب معراج" کے قصہ کو بلا خوف تردید سب کے سامنے بیان کرتا ہے!

وہ عالم وجد میں اپنے قوال روح "سے فرمائش کرتا ہے:-

ہاں مطربم از بہر دل زار بگو   افسانۂ آں شبے کہ با یار گذشت!

ہاں تو صوفیانہ شاعری کے دوگونہ اثرات ہیں۔ وہ شاعر و عاشق کی واردات قلب کی روداد ہے اور چونکہ بیحد محرمانہ، مخلصانہ، صادقانہ، اور پرجوش ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نتیجہ میں اور اپنی ابتدا و انتہا کی یکسانی میں" از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ہوتی ہے۔ وہ ایسا "قال" ہوتا ہے جو عین "حال" ہے، اس لئے اُس سے محفل متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتی اور بیشتر حالات میں سامعین کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے ایک شاعر و عاشق شمع سے مشتاقانہ سوال کرتا ہے کہ،

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی؟   کرمک بیمایہ را سوز کلیم آموختی!

اور یہ حقیقت افروز جواب پاکر اپنے اندر تاثر و تاثیر کی دو طرفہ صفات پاکر اپنی ہستی کی تکمیل کرتا ہے۔

در غم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز   گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

عالم واعظین و مذکّرین کی ہرزہ سرائی کے "صدا بصحرا" ثابت ہونیکی توجیہ اُس کی زبان میں یہ ہوتی ہے:-

شمع محفل بنکے جب تو سوز سے خالی رہا   تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانہ رہے!

کبیر کی شاعری کا یہی آخرالذکر پہلو نمایاں اور اہم ہے۔ اس نے عامۃ الناس کے سواد اعظم کی تلقین و تعلیم کرنی چاہی ہے اور اس عمومی خطاب کے لئے لامحالہ اُس کو عوام کی زبان یعنی ہندی اپنا آلۂ اظہار بنانا پڑی ہے جس کو اُسی نے آسان سے آسان بنانیکے لئے مانوس استعارات و تشبیہات کا مصورانہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے چنانچہ وہ ساری تمثیلیں اور تلمیحیں عوام کی روزمرہ زندگی کے معاملات و مشاہدات سے لاتا ہے چونکہ اپنے مبلغانہ جوش سے وہ کبھی خالی نہیں ہوتا تھا اس لئے اُس سے وہ لغزش کبھی

سرزد نہو سکتی تھی جو یہ ہے ۱۶۰

کہ اہل شوق عوام اند و گفتگو عربی ست!

وہ اپنے حلقہ درس سے اگر تعلیمافتہ پیشہ در اہل مذہب کو قطعاً خارج نہیں کرتا تو اُن کی کچھ زیادہ ہمت افزائی بھی کرتا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اُنکے مکر و ریا اور منافقت و مداہنت سے بیزار ہے اور ان کو قریباً لا علاج "قسم کے" روحانی مریض "سمجھتا ہے! یہی وجہ ہے کہ اُس نے ان کی مذہبی و کتابی زبان کو اپنے خیالات و تعلیمات کا ذریعہ نہ بنایا کیونکہ روئے سخن در اصل دوسروں کی طرف تھا۔

اس بارے میں اُس کی "مجازی لغت" بڑی دلچسپ ہے۔ گرو اور چیلہ، دولھا اور دلہن، کسان اور بنیا، پجاری اور مندر، چڑیا اور آشیانہ وغیرہ وغیرہ اُس کی فصیح اور نیز بلیغ استعارہ طرازی کے عام ساز و برگ ہیں جن کے وسیلے سے وہ بڑے شیریں اور دلنشیں طریقے بلند سے بلند مطالب معرفت و حقیقت کو بیان کرتا رہتا ہے اُس کے نزدیک عالم سفلی اور عالم علوی کی کوئی تقسیم نہیں۔ وہ ہر شے کو خدا کا جلوہ گاہ پاتا ہے اور ہر کوچہ و بازار کے مناظر کو طور کی تجلیوں کا حامل دیکھتا ہے۔ وہ کہیں "لن ترانی" کی امتناعی آواز نہیں سنتا! ۱

وہ حال و مستقبل، دنیا و آخرۃ کی دفع الوقتیوں کو قبول نہیں کر سکتا اس لئے کہ

بمستان وعدۂ محشر حرام ست!

وہ اُن "نظر بازوں" میں داخل ہے جن کی "نگاہ شوق" کی نسبت کہا گیا ہے کہ

دور بیناں ازل کوری چشم بدبیں   ہم درانیجا نگرند آنچہ در آنجا نبینید!

الغرض کبیر اُن معدودے چند ہستیوں میں سے ہے جنہوں نے روئے حقیقت کا چہرۂ انور سر راہ برو کے سامنے الم نشرح کر کے کہدیا کہ ع اب نگر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا!

وہ اکثر اوقات اپنے ادائے مطلب کے لئے ایسے نرالے اور اچھوتے الفاظ استعمال

کرتا ہے کہ متداول مذاق کے لوگ چونک پڑتے ہیں اور کبھی کبھی تو وہ انکو ایسے کھٹکتے ہیں کہ اُنکے اندر ان کو علم بغاوت بلند ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مشاہیر شعرائے متصوفین کے کلام میں اس شوخ چشم رندی و مستی کے بڑے بڑے دلچسپ مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً

در مسجد اگر چہ با نیاز آمدہ ایم   حاشا کہ نہ از بہر نماز آمدہ ایم!
روزے زینجا سجادۂ دزدیدیم   آں کہنہ شدست و باز باز آمدہ ایم!

(عمر خیام)

مسیحی تصوف کی تاریخ کے اندر اس سلسلہ میں جیکوپون ڈا ٹوڈی، رواسبروک، اور بوہمے وغیرہم کا نام لیا جا سکتا ہے۔

کبیر کی شاعری اس کے معلومہ جذبات کی دوگونہ لہروں کی کشمکش کی بنا پر بڑی تشنج آمیز اور ہنگامہ خیز بن گئی ہے۔ وہ بے وقت دیکھتا بھی ہے اور دکھانا بھی چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے یہ دوسری جد و جہد ایک " دوگونہ رنج و عذاب " بن گئی ہے۔ اس کے لئے اُس کو زبان کے گوناگوں پیرائے اختیار کرنے پڑے ہیں۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقتوں کے فرق سے آسمان کا نظارہ کرتا ہے اور پھر اہل لیتی کو اپنے غیر معمولی مشاہدات سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ پس لازمی طور سے اس کے نغمے دو مستقل خطابات کے مجموعے نظر آتے ہیں ایک اپنے سے اور ایک دوسروں سے! وہ یکے بعد دیگرے مابعد الطبیعاتی زبان اور گھریلو محاورے استعمال کرتا ہے، اور اس طرح اس کو بار بار عالم بالا اور دنیائے اسفل کے مابین " سیر عروجی و نزولی " کرنی پڑتی ہے!

کبیر کے انداز بیان کی اس مرکزی خصوصیت کو ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اُس کے بیشتر حصے کی تعبیر اور توجیہ کا دار و مدار اسی شرط ما قبل پر ہے۔

کبیر کو صوفیائے عالم کی اُس مختصر بزم خاص میں شمار کرنا چاہیے جس کے دوسرے ارکان سینٹ آگسٹین، رواسبروک، اور جلال الدین رومی وغیرہم ہیں اور جن کی معرفت و

بصیرت روحانی کے مخصوص امتیاز کی تشریح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ انہوں نے خدا کا گویا ایک "کیمیاوی تصور" حاصل کیا! - انہوں نے ذات و صفات، مادہ و روح، ظاہر و باطن آفاق و انفس اور خلق و امر کی ساری خود ساختہ حد و د و قیود کا تجزیہ کر ڈالا اور ان سب کی صرف ایک "عنصر وحدت" کے سرچشمۂ اول تک سراغ رسی کی۔ انہوں نے اُس ورار الوراہستی کو "اقرب من حبل الورید" - دیکھا اور اس محفل تخلیہ میں باریاب ہوئے۔

اُن کی نظر قلب نے اُس بلندی تک صعود کیا جہاں سے "ما و من" کی تمام تفریقات و تعینیات غائب نظر آتی تھیں

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

کبیرؔ کو ہم عوام الناس کے "محبوب فقیر" کے رنگ میں دیکھتے ہیں جو ہر کہہ و مہ کے ساتھ ہم کلام ہے، ہر روح کیساتھ وابستۂ اعتنا و الفت ہے، اور ہر دل کے ہمراہ ایک مونس و ہمدم! اُسکا حلقۂ محبت بیحد وسیع ہے۔ اُسکا مشرب عشق یگانہ و بیگانہ کی تمیز سے بالاتر ہے، وہ اس تفریق کو بندہ و معبود کے درمیان بھی گوارا نہیں کرسکتا وہ اس "برہما" (خدا) کا قائل نہیں جو "اکاش کی اٹاری"، یا عرش بریں کے قلعۂ معلی کے اوپر اجلال نشیں ہو، وہ ایک ایسے خالق کل کے ساتھ اپنا رشتۂ عقیدت جوڑنا چاہتا ہے جو ہر لمحہ اُس کے یمین و یسار موجود ہو۔ ایسا ہی خدا اُس کی سمجھ میں اپنی دائمی و ابدی رفاقت سے قلب انسانی کی سکینت و طمانیت، اور مسرت و بہجت کا سامان ہوسکتا ہے۔

کبیرؔ نے اپنے اس نظریہ سے معرفت الٰہی کی راہ کے تین عامۃ الورود خطرات کا سدباب کر دیا۔

(۱) وہ غیر معتدل قسم کی جذبات پرستی سے کام نہیں لیتا جو "ملت عشق" کے ہر دل کا عام فتنہ ہے اور خدائے قدوس کا شخصی تصور (جس کو گرم محبت صوفیا کی ذہنیت اُن کے دل و دماغ کے سامنے منعکس کر دیتی ہے) اس ضلالت کو لاحق حال کرنے کا ذمہ دار

بنتا ہے۔ اہل ہند کی تاریخ تصوف اس بے راہ روی کی ایک نمایاں مثال ہے جہاں "اوتار" کے تخیل نے مذہبی معتقدات کے اندر ایک مرکزی اہمیت اختیار کر لی۔ یورپ میں اسی میلان نے ایک دوسرا مظہر قبول کیا اور مسیحی اولیاء کے مجسموں کی کثرت سے ایک خالص موحدانہ سماوی مذہب کے معابد تبخانے بن گئے۔ ہندوستان کے اندر "روح کرشن" کی عقیدت "کرشن دیوتا" کے بت کی پرستش بن گئی۔

خوگر پیکر محسوس ہے انساں کی نظر!

(۲) توحید وجودی کی مضحکہ خیزی سے بھی وہ صاف بچ گیا ہے جو نتیجہ صریح ہے۔ بہت سے مقبول صوفیانہ عقائد کا اس نظریہ کا منشا یہ ہے کہ مخلوق اور خالق دونوں کے وجودوں کا مادہ ترکیبی ایک ہی ہے اور یہ امتیاز تعینات بجز فریب نظر اور ایک نزاع لفظی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس شریعت کے ماتحت انسان کی نجات کا مقام یہی ہے کہ وہ ذات حق میں واصل اور جذب ہو جائے

چنانچہ ایک متعارف صوفی کے نزدیک اس کی اپنی شخصیت، ذات باری کا ایک جزو لاینفک ہے اور حصول معرفت کے معنی یہی ہیں کہ اس "سر مخفی" کو اپنے دل میں جاگزیں کیا جائے۔ اور اس حقیقت کبریٰ کا اعلان عام کیا جائے تاکہ انسانیت اپنے اصلی منصب اور ماہیت سے واقف ہو! حکمت ویدانت کا کلمہ اول یہی ہے کہ "ہمہ اوست" کبیر اس ثنویت کا ابطال کرتا ہے لیکن ذات حق کے "رگ گلو سے زیادہ قریب" ہونے کی حقیقت نفس الامری کی بشارت بھی دیتا ہے اور اپنے انکار و اقرار کو اپنے دو رویہ کلمات میں یوں ادا کرتا ہے کہ "وہ ہم سے ممتاز ہے لیکن ہم سے منفصل نہیں!"

مردان خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند!

عالم علوی و سفلی ہر دو اس روح اعظم کے مقدس "نقش قدم" ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے ساتھ بندے کا تجاذب ایک "وصال محبت" کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دوطرفہ کشش سے ترکیب پاتا ہے لیکن پھر ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟ وہ اس تشبہ باللہ

ہی کو اصل نصب العین اور سعادت سمجھتا ہے۔

واقعی سب سے بڑی ذات ہے ذات باری　　واقعی سب سے بڑی بات ہے بندہ ہونا!

وہ ایک مناسبت معنوی اور الفت روحانی کے جو بندے اور خدا کے باہمی قرب کی حقیقی تعبیر ہے حلول اور اتصال بنانے کو ممنوع اور ملعون قرار دیتا ہے۔ تمام صحیح و صالح مذاہب توحید میں انفرادیت و یکسانیت کا یہ توازن خاطر خواہ طریقے سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ میزان اعتدال قریبًا ہمیشہ اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی رہی ہے اور افراط و تفریط اسکا نتیجہ ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں پندرہویں صدی میں جس تجدید دین کا علم بردار رامانج بنا اور جو شریعت و شنوی کی امتیازی روح تھی وہ اسی نوع کی ایک اصلاح سے تعبیر کیجا سکتی ہے۔ رامانج کا خلیفہ اول راما نند بنا اور راما نند کی معرفت اس مشرب وسطیٰ کو کبیر کے قلب نے لبیک کہا۔

(۳) بلاشبہ کبیر ایک پرجوش عاشق الٰہی ہے لیکن اپنے جذبات کی رو میں وہ کبھی یہ تقاضا نہیں کرنے لگتا کہ

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل　　لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!

چنانچہ وہ جس قسم کے الفاظ و خطابات کو اپنے معشوق حقیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے (مثلاً رفیق روح، مونس قلب، جان جان، پیا، دو لھا وغیرہ وغیرہ) وہ خدا کے تصور کو عام صوفیا اور بیشتر فلاسفہ کے مجرد ما بعد الطبیعاتی توہمات تک منحصر ہونے سے باز رکھتے ہیں اور اس کے مسلکِ محبت کو اُس "داعی عیاشی" کی سطح اسفل السافلین تک نہیں گرنے دیتے جو اہل ویدانت کے دور متاخرین کی بدعت و لعنت بن گئی! اُس کا مذہب بکسر محبت ہے لیکن یہ پروانۂ محبت شمع محفل کی ہم آغوشی کے شوق میں اُس سے اتنا واصل ہونا نہیں چاہتا کہ اُس کی آغوش ہی اس کی سلامت خیال کی قبر بن جائے ؎

اگر خواہی سلامت در کنار ست!

وہ اسی وصالِ الفت کو اپنی معراج کہتا ہے اور اپنے گوشۂ قلب کے اسی جذبہ کو اپنے کنشتِ دل کی تنہا مورت سمجھتا ہے!

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو   اس "ہردوارِ دل" میں لا کر حسین بسائیں!

تمام کائنات اس کو اسی کرشمہ سازِ واحد کی "لیلا" نظر آتی ہے جس کے اندر اس کی محبت و رحمت کی بیشمار زبانیں اُس کے سامعہ کو گویا سنائی دیتی ہیں۔ محبت کے اس سرچشمۂ اصلی کا طوفانِ محبت اُس کو ایک سیلِ بیکراں دکھائی دیتا ہے جس میں ہر چیز غرق ہے اور "چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور تکلیفوں کے کہر کے آگے یہی کلدیپ موجیں مار رہا ہے"۔ سارے مظاہر و مناظرِ ارض و سما اس کو ایک بازیٔ عشق کا تماشہ دکھاتے ہیں جن کے اندر وہ اپنی محبوب کی صورت کو بڑے ہی دلچسپ خط و خال کے ساتھ دیکھتا ہے، جو ہر آن مصروفِ کار اور ہر لمحہ وقفِ جلوہ گری ہے۔ کبیر اپنی شاعرانہ روح اور حیرت انگیز ادبی زبان کے ذریعے اپنے ان مشاہدات کے لئے کیسی کچھ البیلی اور پیاری تشبیہیں اور تعبیریں لاتا ہے۔ وہ کبھی اس کاروبار کو ایک "رقصِ حسین" کہتا ہے اور کبھی اُسکا نام "گہوارہ محبت" رکھتا ہے جو اسی کے لفظوں میں "پریم کی ڈوریوں سے جھول رہا ہے!"

تمام متصوفانہ ادبیات کی یہ ایک تحیرزا خصوصیت رہی ہے کہ اگرچہ صاحبِ سخن کتنا ہی قادرالکلام اور نازک بیان ہو مگر وہ ایک بالواسطہ طریق ہی ادائے بیان کے لئے اختیار کرتا ہے!

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

اگرچہ کتنے ہی لطیف اور پیچیدہ حقائق و غوامضِ معرفت ہوں، مادی استعارات اور محسوس تشبیہات کو کبھی ترک نہیں کیا گیا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام نبتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر!

حقیقت آگاہوں اور محرمانِ راز کے لئے یہ زبان شایانِ شان نہ ہو لیکن ایسے موقعوں پر اُنکے ملفوظاتِ لسان اور رشحاتِ خامہ کے اصلی مخاطب عوام ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے کو قابلِ فہم بنانے کی غرض سے اُن کو مادّیات کی اس سطحِ زیریں تک اترنا پڑتا ہے۔ بقول صوفیٔ اعظم جلال الدین رومی کے بچوں کو تعلیم دیتے ہوئے ایک فاضلِ اجل کو بھی اپنا کبھی کا " ابجدی آموختہ دہرانا پڑتا ہے!۔ الغرض درسگاہ وحدت اور معبد حقانیت میں بھی الفاظ کی اس تنگری سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹتا! گویہ ظاہر ہے کہ

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

مگر عوام سے خطاب کرتے ہوئے اس طریق کار کی اہمیت اور ضرورت ظاہر ہے اس ذریعے سے اُن کے لئے گویا عرش فرش پر اتر آتا ہے۔ ذہن و روح کی ساری متوہرانہ معراجیں آیاتِ بینات بنجاتی ہیں، اور اکثر ایک واحد لفظ یا فقرہ اُنکو یکبارگی اس قعرپستی سے اٹھا کر اُس اعلیٰ علیین تک لیجاتا ہے جو صرف شاعر کے " براقِ قلم " کا تنہا " خرقِ عادت " ہے!

یہی عام فہم زبان ہے جو شاعروں کے منہ میں پہونچکر اس طرح بولتی ہے کہ " ہم خدا کی روشنی کا " مشاہدہ " کرتے ہیں، ہم اُس کے نغمۂ جاں نواز کو اپنے کانوں سے " سنتے " ہیں، اس کی شیرینیت و محبوبیت ہماری زبان سے " مس " کرتی ہے اُسکی " خوشبو و نکہت " سے ہمارا مشامِ جان معطر ہے، اور ہم اُس سے ہر لحظہ " ہم آغوش " رہتے ہیں!"

انھی عوام میں جو بعض لوگ بے محل طریقے سے ظاہر پرستی کے غیر معمولی رجحانات پیدا کر لیتے ہیں انکے لئے مغالطہ کا شکار ہونا ناگزیر ہے لیکن انکی روح کا ان " جسمانی تشنوں " سے خستہ و ہلاک ہونا کیسا افسوسناک ہے!

چنانچہ کبیر نے بھی، اگرچہ بہت سے مروجہ آدابِ شاعری سے انحراف

کیا ہے، لیکن شعرا، وصوفیا کی قدیم مجازی زبان کے معاملہ میں اُس نے کسی اجتہاد سے
کام نہیں لیا، چنانچہ اُس کو بھی ہم دوسروں کی طرح اسی قسم کی باتیں کرتے سنتے ہیں جیسے
کہ "میں نے برہما کا موہن مکھ دیکھا ہے، میں نے اُسکا امرت پیا ہے، اس نے اپنی بجلی دوڑا دینے
والی انگلیوں سے میرے انگ کو چھوا ہے، اور بہشتی پھولوں کی خوشبو میں نے سونگھی ہے!"
لیکن کبیر کی اصلی روح شعر و موسیقی ہے، توازن اور ترنم اُس کے نزدیک حسن فطرت اور
جمال صداقت کا اصلی پیراہن ہیں، ان تمام خصائص کے اعتبار سے اس کو اپنے مغربی
مثیل رچرڈ رول سے خاص طور پر تشبیہ دیجا سکتی ہے جو معرفت و حقیقت کے نغموں کو
چنگ و رباب ہی کی زبان سے سنتا تھا۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست از کجا می آید ایں آواز دوست؟!

کبیر کے الفاظ میں "ساری کائنات ہستی ایک مجسم ساز معرفت ہے جس میں سے
ایک حسین موسیقی ایک "سفید پھول کی طرح کھل رہی ہے!"

ہستی کا ہر حجاب ہی پردہ ہے ساز کا!

محبت کے پھول رشتۂ موسیقیت میں گوندھے جاتے ہیں۔ زہد خشک ایک دلِ خشک
پیدا کرتا ہے جو تہی مغزی کے ساتھ اصل رنگینیٔ عشق کی بے احترامی کرتا ہے۔

رعنائی خیال کو ٹھہرا لیا گناہ زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور!

موسیقی ہی وہ چیز ہے جو زمین اور آسمان دونوں جگہ کی محبوب شے ہے۔ اُس
سے ایک دیہاتی کے کانوں کو بھی مزہ آتا ہے اور ایک عارف کامل کے گوش حقیقت
نیوش کے لئے بھی وہ ایک پیام وجد و کیف ہے! اور خود مُنَشِّی بشر پر بھی ایک ستار ہے
جس کے تار برہما کی انگلیوں سے ایک مسلسل حرکت میں رہتے ہیں "محفل ہستی کے گوش
گوش میں کبیر کو ایک "سرودِ خموش" سنائی دیتا ہے جس کی سامعہ نوازی سے وہ ہر دم
مست و سرخوش رہتا ہے۔

بے نئے و مطرب و نغمہ ہمہ در وجد سماع! بے مئے و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش!

"وہ کرشن" محبت کی "بنسی" کا متوالا ہے، جس کو وہ ایک مطرب فطرت کا مظہر سمجھتا ہے اور اس کی روح پرور تانوں کی نشید شیریں کے سحر موسیقیت سے تمام عرش و فرش ایک عالم رقص و حال میں ہیں" عالم موجودات کے لئے یہی چیز غذائے روح ہے اور اُنکے خالق کل کی یہی عبادت۔

یعنی بجب گردش پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے!

لیکن اس سرمستی اور مدہوشی کے طوفان میں جو کبیر کے سینہ سے ہر دم اٹھتا رہتا ہے وہ حیات مادی کے شب و روز کے مشاغل کو نہ فراموش کرتا ہے اور نہ نظر انداز۔ اُس کے قدم زمین پر ہیں لیکن وہاں وہ کسی طرح پا بگل نہیں۔ اُسکا بیدار و دور بیں دل و دماغ اُس کے جسمانی سینے اور کاندھوں پر نہیں ہے بلکہ وہ فرش عرش پر نظر آتا ہے! کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ! اس کی اس ہوشمند اور غیر فراموش کار روح کے مظاہر بہت نمایاں ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک صاف و شفاف تخیل رکھتا ہے۔ ایک عام فہم اور غیر مشتبہ زبان بولتا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاحات اور تجریدی طرق ادا سے سختی کے ساتھ محترز ہے۔ ظاہر پرستی اور ظاہر داری کا بے رحم ناقد ہے اور ہر قسم کی ریاکاری اور نمائش طلبی کے بُری طرح بخیئے ادھیڑتا ہے۔ "کائنات کی جملہ اشیا خدا کے اوتار ہیں" اور "مطلوب حقیقی ہر لمحہ آنکھوں کے آغوش میں رہتا ہے" "وہی سرچشمۂ اصلی ہے اور تمہاری تشنہ لبی اُسی وقت سیرابی سے بدلیگی جبکہ تم اُس تک پہنچ جاؤ گے"۔ پس جو لوگ اس "اصل و بیخ" کو اپنی "گرفت ذہن" میں رکھتے ہیں، انکو مختلف شاخ و شاخسار اور برگ و بار میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ مذہب و ملت، مسلک و مشرب، مکتب و منبر، وغیرہ کا معاملہ قطعاً ایک ضمنی سوال ہے اور جو اصل منزل مقصود کو پیش نظر رکھتا ہے اُس کے لئے مختلف راہوں میں کسی ایک کا انتخاب و ترجیح چنداں اہمیت نہیں رکھتی! لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْهُمْ مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ

فِی الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ !

پس کبیر کیش و ملت کی ان شرائط و ضوابط، اور حدود و قیود سے بالاتر ہے وہ مروجہ مذاہب میں سے کسی کا بھی قائل نہیں اور پھر وہ سب کا ہم مشرب نظر آتا ہے۔ وہ اُس بلند مقام تک صعود کر گیا ہے جہاں سے تیز نادمن غائب ہوگئی ہے اور سارے گونا گوں نقاط نظر ایک ہی مرکز انعکاس پر مرکوز و متحد ہوگئے ہیں۔ یہی راز ہے جو اس کے مسلک صلح کل" کی ان بو العجبیوں کی کلید ہے، کہ کبھی وہ وشنو کا پجاری ہے اور کبھی ویدانت کا شیدائی، کبھی حلولی ہے اور کبھی تناسخی، کبھی مشرک ہے اور کبھی موحد، کبھی ساد ہو ہے اور کبھی صوفی، اور کبھی ہندو ہے اور کبھی مسلمان !!

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں !

وہ پیشہ سے ایک جولاہا ہے اور مختلف تاگوں کے ہم رشتہ کرنے اور تانے بانے کا تار و پود گوندھنے میں ایک طبعی مہارت رکھتا ہے، مختلف اور متضاد کیش و مشرب کی پیچ در پیچ آویزشوں کو آمیزشوں کی صورت میں تبدیل کر دینے کا کام اُس کے چابکدست دماغ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا! الغرض سارے منابیر مذہب اور تمام مکاتب فلسفہ اس کی مسندِ درس کے ایک ہی حلقے میں داخل ہیں۔ ہم کو اگر اس ایک نقطۂ مرکزی تک پہنچنا ہو تو تمام خطوط قطری پر سفر کرنے کی ضرورت ہوگی اور ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے کا مانع و مزاحم نہوگا بلکہ باہدگر موید و ہتم ! انیتنڈ کی اگر اُس "سورج مکھی ہستی" کے درشن کرنا ہیں جو تمام "تاریکیوں سے ورا را لورا واقع ہے" تو اختلافات مذاہب و ملل کی ان تمام گوناگونیوں اور نیرنگیوں کو لازم و ملزوم سمجھنا پڑے گا جو آفتاب وحدت اور شمس حقیقت کی ایک "شعاع سفید" کے "الوان ہفتیں" ہیں! پس تصوف و طریقت کا یہ "مجدد و جدید" تمام مذاہب معرفت کا ناسخ ہونیکے باوجود بھی سب کی روایات و کلیات کا مصدق و معتقد بھی ہے! صوفیا کے سلک نے کبھی بھی قشر و پیرہن کی پرستش نہ کی اس لئے سب نے بڑی آسانی کے ساتھ کبیر کی کملی کو اپنا وقتی شعار بنانے میں تامل نہ کیا سب نے

اپنے اپنے میخانوں کی شرابیں کبیر کی نئی "مینا" میں بھردیں! کبیر کی شریعت معرفت کی اس "ترجمان گل" نوعیت کی تصریح اُس کے اکثر دوہوں میں پائی جاتی ہے جہاں وہ شاہد حقیقت کی "بازیگر" (لیلا) "کلدیپ کی لہروں اور موجوں"، "طائر روح کی ہمہ سمت پرواز"، اور ایک "صد برگ کنول" کا ذکر کرتا ہے!

ہر لحظہ برنگ دگراں یار برآمد!

کبیر لاکھوں لباسوں میں کرشمہ ساز ازل کو دیکھتا ہے اور ہزار داستان کی سی ہزارہا زبانوں سے اس کی نقاشی کرتا ہے۔ اسکا دفتر معرفت گویا ایک "بتخانہ وحدت" ہے جس کی گوناگوں صورتیں اُس کے اسمائے حسنیٰ کی مظہر ہیں۔ کبیر کے نئے نئے اور نرالے نرالے پیرایہ ہائے بیان بڑے ہی دلچسپ و دلنشیں ہیں جن میں وہ تمام ممکن مطالب عرفان وسلوک کی تعبیر وتشریح کرتا ہے اور جو ہندوستان کی روزمرہ زندگی اور تمدن کے کاروبار ومعاملات کے استعاروں اور تلمیحوں سے لبریز ہیں۔ خالص ہندی فضا جس طرح کبیر نے اپنی شاعرانہ زبان کے اندر بسائی ہے اس نے اس کی متصوفانہ ادبیات کو مصورانہ بنانے کے علاوہ اس درجہ میٹھا اور مدھ بھرا بنا دیا ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتا ہے "مندر کے گھنٹے اس کی روح کی پتری کو جگانیوالی سہیلیاں ہیں!" "سسرال سے ڈولی لیکر آنیوالے کہار" اُس کے داعیات انبساط وانشراح صدر ہیں! "بیاہ" اسکی روح کا وصال عشق ہے! "تیرتھ جاترا" اسکی پرواز روح ہے نشیمن سماوی کیطرف! "ستی" اس کے قلب کا مقام فنا وجذب ہے! وغیرہ وغیرہ! کبیر ہندوستان کے مخصوص موسموں کی زبان میں بھی بار ہا بولا ہے۔ الغرض در و دیوار، کوچہ و بازار زمین وآسمان، اور تمام کون ومکان سے اس نے حقائق معرفت اور مطالب وحدت کی بڑی فصیح اور بلیغ تفسیریں اور تعبیریں کرائی ہیں اور عرفان اور گیان کا ایک حیرت انگیز "آئینہ خانہ" کھولکر رکھدیا ہے!

خدا کی ذات وصفات عموماً مبہم وموہوم اور عام اذہان وعقول سے ماورا ہیں

اس تاریکی کی حالت میں وقتاً فوقتاً مظاہر جلال وجبروت انسان کو خدا سے اور بھی دور بھگا دیتے ہیں، مگر کبیر نے خالق ہستی کو اپنے مانوس پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ گویا وہ ایک "گھریلو چیز" ہو گیا ہے۔ نیز اس کو ایسے پیارے اور موہنی لباس پہنائے ہیں کہ وہ ہر سننے والے کا "محبوب دلہا" بن گیا ہے!

درس حقیقت ار بود زمزمۂ محبتے — جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ ان نظموں کو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا ہے اور کتابوں اور تذکروں سے لیکر سینہ بسینہ زبانی روایات تک کو اسکا ماخذ بنایا گیا ہے۔ چنانچہ بہت سے دوہے جو ملک میں کثرت سے زبان زد عوام ہیں بعض مشہور بھاٹوں کی معرفت نقل کئے گئے ہیں۔ کبیر کے کلام کی اس تدوین میں کافی نقد وتنقید کی ضرورت پیش آئی ہے اور تابمقدور کوشش کی گئی ہے کہ اس مجموعے کے اندر غیر اصلی عناصر نہ آنے پائیں۔ کبیر کے مروجہ کلیات کا معتد بہ حصہ الحاقی ہے اور بعض مجموعوں میں ممکن ہے کہ "زائد" کے علاوہ "حشو" بھی ہو مشرق میں بالخصوص ایسے شعرا کا کلام دست اندازی کا تختۂ مشق بنایا گیا ہے جو ایک نئے مسلک تخیل یا مکتب ادب کے بانی ہوئے ہیں تاکہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے معتقدات اس میں مخلوط کر کے ان کو قبول عام کا جامہ پہنائیں اور ان مجتہدین وناسخین کو انکی وفات کے بعد اپنا ہمنوا اور حواری بنائیں! یہ تحریف ایک گونہ تشابہ کے رنگ میں بھی ہوئی ہے۔ اکثر مقلدین اور معتقدین نے ان مجددین وقت اور استادان زبان کے تتبع میں طبع آزمائی کی ہے اور انکے رشحات قلم قدرۃً اصلی سرچشمہ میں مدغم ہو گئے ہیں۔ پس اس قسم کے ایک شاعر کے کلام کی تنقیح وتقطیر میں جو مشکلات ہو سکتی ہیں انکا اندازہ بآسانی ممکن ہے۔ ایک بالغ نظر نقاد ادب اور ایک پورا محرم راز محقق ہی اس پُر اشکال کام سے عہدہ برا ہو سکتا ہے کبیر کے کلام کی اس مذکورہ بالا ترتیب میں اس معیار تنقید وتالیف کے تمام مقتضیات ممکن

ہے پورے نہ کئے جا سکے ہوں لیکن شاید کبیر کے ملفوظات وکلمات طیبات کا یہ مستند ترین مجموعہ ہے جس تک موجودہ وسائل تحقیق وتفتیش کی حد تک ہماری رسائی ہو سکتی تھی۔

یہ سَو نظمیں ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں جو کبیر کے تخیل ونظر کے جملہ دستیاب شدہ رنگوں کا ایک یکجائی مرقع ہے کبیر کی روح کا جذب وکیف، جوش وخروش، وارفتگی وسرخوشی واردات - انبساط وانقباض، بیم ورجا، اضطراب واضطرار، اور طمانیت وسکینت، ناز ونیاز فنادگی وخستگی، قربانی وفداکاری الغرض اس کے لمعات تخیل کے جملہ نقوش قدم اس میں موجود ہیں۔ کائنات ہستی کے متعلق وہ جس قسم کی وسعت نظر اور وسیع المشربی رکھتا ہے اُسکا اندازہ اس قطعے سے کیجئے۔

" دریا اور اُس کی لہریں ایک ہی سطح آب سے عبارت ہیں۔ کیا ان جیسی یک وجود یکجان چیزوں میں بھی کوئی تفریق کیجا سکتی ہے؟ سکون اور تموج آبی کے اوقات مختلف ہیں پانی کی سطح مستوی اور اسکے پست وبلند کے مناظر میں کوئی دو چیزیں نظر نہیں آتیں کیا محض اس وجہ سے کہ پانی کے ایک ٹکڑے کا نام 'لہر' رکھدیا گیا ہے اس کی قلب ماہیت ہو جائیگی؟ مختلف مذاہب وملل ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں اور سب دانوں کا "امام" انگشت قدرت میں ہے!"

(۲) عشق حقیقی کا جب اس پر نزول ہوتا ہے تو اس میٹھے بلاوے کی شیرینی چکھئے، ساتھ ہی اس آواز غیب کی سماعت وشناخت کے سلسلے میں جو خطرات، تشابہات، اور فتنے ہیں اُنکی طرف بھی کتنا بلیغ اشارہ کیا ہے اکتا ہے۔

"سسرال سے۔ ڈولی مجھے لینے کے لئے آئی اور میرا دل سینہ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ الغرض میں سوار ہو کر اپنی منزل مقصود کو روانہ ہوگئی۔ لیکن ایک جگہ میں نے ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا تو یہ معلوم کرکے میری حیرت اور دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ غدّار کہار مجھکو ایک لق ودق میدان میں لے آئے ہیں! میں ان کہاروں کے پاؤں

پڑتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ذرا میری ڈولی تھوڑی دیر کے لئے میرے میکے کی ڈیوڑھی میں پھر رکھدو کہ میں اپنے عزیز واقارب سے رخصتی ملاقات تو کرلوں!' (بتوار دھائی)

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا　　خطرہ انہیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر　　"بھیڑوں" کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما!

مبدء اصلی کیطرف اس کی روح کی تڑپ اور لگاوٹ کو دیکھو۔

"ای سدر ہنس! مجھ سے اپنی کہانی کہہ۔ تو کس دیس سے آتا ہے، اور کس آشیانے کی سمت میں تیری اڑان جاری ہے؟ اچھا ہوتے ہنس! آج تڑکے ہی اٹھ اور میرے ساتھ ہم پرواز ہو۔ تجھے ایک دیس سے چلوں جہاں رنج و غم اور خوف و خطر کا پرندہ پر نہیں مارتا! جہاں کے نواسیوں کی کان" موت "کے لفظ سے نا آشنا ہیں! جہاں کے دائمی موسم بہار نے جنگلوں اور پہاڑوں کو رنگ و بو سے بھر دیا ہے! ہاں یہی وہ چمنستان ہے جہاں دل کا بھونرا خوشنما اور امرت بھرے پھولوں میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کے متحرک پر ہمیشہ کے لئے آسودۂ سکون ہو جاتے ہیں!

(۳) گمراہ اور گمراہ گردوں کو انکا اصلی معبد دکھاتا ہے۔

"اے ملاّ! اگر اللہ مسجد ہی میں ہے تو کیا اس محدود چار دیواری سے باہر کی دنیا اسکی حکومتِ وجود سے خارج ہے! اے برہمن اگر برہما اس مندر کی مورتی کے بطن ہی میں مقید ہو کر رہ گیا ہے تو اس کی بے بسی اور قید تنہائی رحم کے قابل ہے! اے نافہمو اپنے کعبۂ قلب اور اپنے "ہر دوار دل" کی زیارت اور جاترا کی تمہیں کب توفیق ہوگی؟"

(۴) نزاع ہفتاد و ملت کی جنگ زرگری۔

"سادھو اور صوفی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ گا رہے ہیں اور ایک کی راگنی دوسرے کے نغمے کی موسیقی سے دست و گریبان ہے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اس منموہن کا مکھ نہیں دیکھا ورنہ ایک دوسرے سے الجھنے سے فارغ ہو جاتے!

(۵) اہلِ دنیا کی فضول کاوی اور تضیع اوقات۔

"دنیا کے تاجرو اور دوکان نشینو! جس بازارِ جزا و سزا کی طرف تمہارا کاروانِ عمر رواں ہے وہاں نہ کوئی دوکانیں ہیں اور نہ کوٹھیاں! یہ ساری محنت و مشقت آخر کس لئے!

جلال الدین رومی اپنے جذبۂ جلال میں یہی خطاب یوں ادا کرتے ہیں۔

اہلِ دنیا کافرانِ مطلق اند　　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

اہلِ دنیا چہ کہین و چہ مہیں　　لعنت اللہ علیہم اجمعین!

کبیر کو ٹیگور کے وجود میں اس عہد کے اندر ایک بہترین مترجم ملا ہے۔ اُس کے قلم نے کبیر کے لفظوں کا "ترجمہ" کیا ہے اور اُس کی روح نے ترجے کی بین السطور میں کبیر کی حقیقی آتما کی "ترجمانی" کا کام انجام دیا ہے! "گارڈنر" اور "گیتانجلی" کبیر کے سچے "اوتار" کی زبان معلوم ہوتی ہیں!

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست!

اسرائیل احمد

از قائم گنج

ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک

گزشتہ ابواب میں ہم نے اس انقلاب کے خاص خاص حصوں کا ذکر کیا ہے جو ترکی قوم کی زندگی میں رونما ہوئے۔ لیکن ہم نے ابھی یہ نہیں بتلایا کہ یہ انقلاب بے روک ٹوک اور خط مستقیم میں اپنی منزل کو نہیں پہونچا بلکہ اپنے سفر میں اس کو بہت سی کجیوں اور موڑوں سے گزرنا پڑا۔ جو خود بھی بہت اہم ہیں اور اپنے نتائج کی وجہ سے تمدنی تحریک کے لئے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہم انہی کجیوں اور موڑوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ کجی قوم کے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ میں پیدا ہوئی، اس طبقہ کی کیفیت گویا کل قوم کی کیفیت رہی ہے اور آج بھی ہے، قدیم ترکی میں یہ طبقہ ایک متحدہ جماعت تھا، اور اس کی ذہنی اخلاقی اور مذہبی خصوصیات قوم کی ساری تمدنی زندگی پر اثر رکھتی تھیں۔ جب تمدن میں عام انحطاط پیدا ہوا تو زوال کی رو اس طبقہ کو بھی اپنے ساتھ بہالے گئی، لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں کے شروع میں ایک نیا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا جو قدیم طبقہ سے اس طرح مختلف تھا کہ قدیم عثمانی اور اسلامی تعلیم کے ساتھ اس نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس دوسری تعلیم کی وجہ سے ان کو دوسروں پر جو فوقیت حاصل تھی اس نے باوجود مخالفتوں کے انہیں برسر اقتدار پہونچا دیا۔ انکو اس بات کا موقعہ تھا کہ قوم کے قوائے زندگی کو اندر سے نشو ونما دیں اور ماضی سے یک بیک غیر ضروری طور پر قطع تعلق ہونے سے روکیں۔ اس وجہ سے یہ تعلیم یافتہ طبقہ جس تبدیلی کا حامل بنا اس میں پہلے پہل قومی و اسلامی رنگ پایا جاتا ہے اور وہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشو ونما اور قوم کے قدیم جماعتی، سیاسی

اور مذہبی اداروں کے ارتقاء کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ بات ظاہر تھی کہ اس طبقہ کے غیر معمولی اشخاص عوام کے ذہن میں ایک خاص شکل اختیار کرلیں اور انکی تعلیم مغربی تمدن کی طرف لوگوں کو توجہ دلائے چنانچہ ان کی وجہ سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ خود اپنی قوت سے آگے بڑھنا ممکن نہیں اور اب ضروری ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا جائے۔ چنانچہ مغربی تہذیب وتمدن سے واقفیت رفتہ رفتہ مقصود بالذات بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہتر اور افضل تمدن کا سامنا ہے اور بہتیرے تھے جنہوں نے بلا تنقید اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔ یورپ نے اسلام اور ترکوں پر جو نکتہ چینی کی تھی، اس نے انکو یقین دلایا کہ خود اپنے تمدن کو یک قلم چھوڑ دینا اور مغربی تہذیب میں اپنے آپ کو جذب کر دینا لازمی ہے یعنی بالفاظ دیگر یہ تحریک مغرب پرستی کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس سے ترکوں کے تمدن میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد اسکا ردعمل بھی شروع ہوا، جس نے قوم پرستی اور اصلاح مذہب کی شکل اختیار کی۔ ذیل کی سطروں میں ہم انہی چیزوں پر بحث کریں گے۔

مغرب پرستی اور ذہنی انتشار

عثمانی ترکوں میں مغربی تمدن کی طرف رجحان ایک پرانی چیز ہے۔ ترکی مورخ احمد رفیق جامعہ استنبول کے اپنے درس میں مغربیت کے ان رجحانوں کو اٹھارہویں صدی کے نصف اول تک لے جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی آگے جانا ممکن ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود سلطان محمد ثانی نے جو سیاست فتح قسطنطنیہ کے بعد اختیار کی اسکا مقصد مشرقی و مغربی تمدن میں باہمی مصالحت ہی تھی ورنہ

جنوبی اٹلی پر اس نے جو فوج کشی کی اس کو خالص فوجی کارروائی سے کون تعبیر کر سکتا ہے۔ حامد نے محمد فاتح پر جو نظم لکھی ہے اس میں کہتا ہے کہ "ساری انسانیت سے اسلام کا اتحاد کرانا تیری نیت تھی" (مرقد فاتحی زیارت، در الہام وطن) لیکن اس عظیم الشان کارروائی کے شروع میں جاکر ہم دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے واقعی مغربی تہذیب سے قربت حاصل کرنیکی کوشش کی جس کی تحریک خارجی حالات نے کی اور جس کو مدد اندرونی کیفیات سے پہونچی، لیکن چونکہ قرب یا صلح پیدا کرنے کی ان کوششوں میں ترک قوم نے اپنی تمدنی حیثیت کو قائم رکھا۔ اس لئے اس کو مغرب پرستی نہیں کہہ سکتے۔ مغرب پرستی تو اسوقت شروع ہوئی جب اپنے تمدن سے بیزاری شروع ہوئی اور ہر چیز میں مغربیت کو منتہائے تمدن تسلیم کیا گیا۔ اب ذرا اس مغرب پرستی کی تفصیل سنئے۔

یہ مغرب پرستی اول اول تو شاعری میں ایک نئے انداز تحریر کی شکل میں رونما ہوئی، ہم ایک پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ ترکی میں نئی دنیا کی خلاق۔ یہ شاعری ہی ہے۔ ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ مغرب پرستوں کو کامل اقتدار حاصل ہونے تک عہد جدید کا سب سے بڑا ترکی شاعر حامد ترکی فنون لطیفہ کے تصورات پر پورے طور پر حاوی تھا۔ اور اس کے ساتھی شاعروں پر مغرب کی رومانی تحریک کا اثر تھا۔ لیکن جس وقت ترکی میں مغرب پرستی شروع ہوئی ہے تو یورپ میں اس فلسفیانہ رومانی عہد کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ تصورات پر علوم طبیعی اور مادہ پرستی کی فرمانروائی تھی اور فنون لطیفہ میں واقعیت پسندی اور فطرت دوستی کا دور دورہ تھا۔

فلسفی۔ رومانی عہد میں آرزوئے اتحاد کی جو عظیم الشان لہر اٹھی تھی اس کا خاتمہ ذہنی انفرادیت نے مغرب کی ساری تمدنی زندگی میں کر دیا تھا۔ چنانچہ فنون لطیفہ کے اس انفرادی اصول کا دور دورہ تھا کہ فن کو فن کے لئے ہونا چاہیے۔ مغرب پرستی تو مغرب کی ہر چیز میں حسن مطلق کا نظارہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے رومانی تحریک اور

اس کے ساتھ ساتھ حامد اور اس کے تصور شاعری کو چھوڑنا ضروری سمجھا، ان لوگوں کی نظر سے حامد کی اخلاقی عظمت اور اسکا تمدنی مشن پوشیدہ تھا۔ انہیں ضیا پاشا اور کمال کی نظموں میں جو حامد سے بہت قریب تھے کوئی جماعتی مقصد یا شاعرانہ افادیت نظر آتی تھی جس نے گویا قدیم عثمانی شاعری کے مذہبی مقاصد کی جگہ لے لی تھی۔ ترکی شاعری کی تاریخی روایات اور اس کے تمدنی مشن کو جسے حامد نے نہایت خوبی کے ساتھ فن شعر کی ضروریات کے ساتھ ملا دیا تھا۔ اس ان لوگوں نے ہاتھ سے دیدیا تھا۔ شاعری یہی نہیں کہ قوم کی زندگی پر اثر ڈالنے سے دست کش ہوگئی بلکہ زندگی سے اسکے تمام رشتے کٹ گئے۔ قدیم شاعری میں عربی ایرانی تخیل حاوی تھا اس کی جگہ اب مغربی خصوصاً فرانسیسی تخیل نے لے لی۔ حامد اور اس کے ساتھیوں کے برخلاف یہ جذبۂ شاعری اب صرف اپنے انداز بیان ہی میں مغربی نہ تھا بلکہ بلحاظ مطالب بھی۔ اب تو خیالات و احساسات اور طرز تحریر سب کچھ مغربی ہوگیا تھا۔ شعر کے مضامین و مطالب بھی مغربی یا مغرب پرستوں کی زندگی سے حاصل کئے جاتے تھے، لوگوں کا جی تو یہ چاہتا تھا کہ ہو سکے تو کسی مغربی زبان میں لکھیں بھی لیکن خیر اس کی نوبت نہیں آئی، ہاں اس کے عوض زبان کو ایسا بنا یا گیا کہ اس میں مغربی تصورات و تخیلات کی ترجمانی ہو سکے۔ زبان اس طرح سادہ اور لوچدار تو ہوگئی لیکن قوم کے لئے اب بھی اتنی ہی ناقابل فہم رہی جتنی فارسی و عربی عناصر سے لبریز قدیم زبان۔

(باقی)

آزادی

(مشہور جرمن شاعر اور مصنف ہائنرش ہائنے کے سفرنامہ سے)

میری آنکھیں ٹیمس کے ہرے بھرے کناروں کو دیکھ رہی تھیں اور میری روح کے گوشہ گوشہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بلبلان خوش نوا ابھی ابھی اپنے خواب سے چونک پڑے ہیں۔ جہاز پر ایک زرد رو آدمی میرے پاس کھڑا تھا "اے سرزمین حریت"، میں بے اختیار پکار اٹھا "تجھے میرا سلام۔ اے آزادی، نوجوان دنیا کے آفتاب تازہ، تجھکو بھی میرا سلام۔ وہ پرانے آفتاب: محبت و ایمان، زرد پڑ گئے ہیں سرد ہو چلے ہیں۔ اب یہ روشنی ہی دے سکتے ہیں نہ حرارت۔ شہدا کے وہ جنگل کے جنگل جن میں کبھی کثرت آبادی کے باعث ریل پیل تھی آج اجاڑ پڑے ہیں اور کہیں کہیں نازک شاخوں میں اکّا دکّا آشیانہ نظر آتا ہے۔ وہ قدیم گنبد گر رہے ہیں جنہیں کبھی ایک ایسی پر از مذہبیت نسل نے جو اپنے ایمان و عقیدہ کی عمارت کو آسمانوں تک لیجانا چاہتی تھی اس درجہ بلند بنا دیا تھا۔ یہ سب برباد و مسمار ہو رہے ہیں اور ان کے دیوتا خود اپنے اوپر ایمان نہیں رکھتے۔ ان دیوتاؤں کی زندگی کے دن پورے ہو چکے اور ہمارے عہد میں اتنا تخیل نہیں کہ نئے بت تراشے۔ قلب انسانی کی ساری قوت نے اب عشق حریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور حریت (آزادی) ہی شاید عہد جدید کا مذہب ہے۔ یہ بھی ایسا ہی مذہب ہے جس کی تلقین مالداروں کو نہیں بلکہ ناداروں کو کی گئی ہے۔ اس کے بھی مبلغ ہیں، شہید ہیں، منافق ہیں۔

زرد رو شخص نے کہا "جوشیلے نوجوان، تم جو ڈھونڈتے ہو وہ تمہیں یہاں نہ ملے گا۔ ممکن ہے تمہارا یہ خیال ٹھیک ہو کہ حریت ایک نیا مذہب ہے اور ساری

دنیا میں پھیل رہا ہے۔ لیکن جیسے پہلے ہر قوم نے جس نے عیسائیت کو قبول کیا اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالا اسی طرح ہر قوم اس نئے مذہب حریت سے بھی بس وہی اخذ کرے گی جو اس کی مقامی ضروریات اور سیرت قومی کے مطابق ہے۔

انگریز ایک گھریلو قوم ہیں، یہ نہایت محدود، گھری ہوئی خاندانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انگریز اپنے متعلقین کے حلقہ میں وہ اطمینان روح تلاش کرتا ہے جو اس کی فطری جماعتی بے بسی کے باعث اسے گھر سے باہر کہیں نصیب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انگریز اس آزادی سے مطمئن ہے جو اس کے شخصی حقوق کو محفوظ کر دے اور اس کی ذات، اس کی ملک، اس کی خانگی زندگی، اس کے عقائد، حتیٰ کہ اس کے تعصبات تک کو اپنی پناہ میں لے۔ اپنے گھر میں انگریز سے زیادہ اور کوئی شخص آزاد نہیں ہوتا۔ ایک مشہور قول کو نقل کروں تو انگریز اپنی چار دیواری کے اندر بادشاہ بھی ہے اسقف بھی۔ اور اس کی یہ عام کہاوت کچھ نہیں "میرا گھر میرا قلعہ ہے"۔

اگر انگریزوں کو بہت زیادہ خواہش ہوتی ہے شخصی آزادی کی تو فرانسیسی ضرورت کے وقت اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے آزادی عام کے اس حصہ سے فیضیاب ہونے دیجئے جسے ہم مساوات کہتے ہیں۔ فرانسیسی کوئی گھریلو قوم نہیں۔ بلکہ بہت ملنسار قوم ہے۔ یہ اسے پسند نہیں کرتے کہ پاس بیٹھے ہوں اور چپ رہیں۔ اس خاموشی کو تو یہ "انگریزی گفتگو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ قہوہ خانہ سے قمار خانہ، اور قمار خانہ سے محفل رقص کا گشت لگاتے ہیں۔ انکا ہلکا، شمپین جیسا خون اور انکی فطری میل جول کی صلاحیت انہیں مجلسی زندگی پر مجبور کرتی ہے اور اس زندگی کی اول اور آخر شرط نہیں اس کی روح یہی چیز ہے: مساوات۔ چنانچہ اس مجلسی زندگی کے نشو و نما کے ساتھ مساوات کی خواہش کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اور ہر چند انقلاب فرانس کی وجہ اس کے میزانیہ میں تلاش کرنی چاہئے لیکن پھر بھی اس کے لئے آواز بلند کی ان عوام نے جو

پیرس کے سیلونوں میں امراء کے ساتھ بظاہر برابر کی زندگی بسر کرتے لیکن کبھی کبھی انہیں ان کی وہ گہری اور تکلیف دہ عدم مساوات یاد دلادی جاتی تھی چاہے اس کی وجہ کوئی شکل سے محسوس ہونے والا لیکن اس وجہ سے اور بھی زیادہ دکھ دینے والا تبسم امارت ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ بات کہ مساوات کی خواہش ہی انقلاب کا بنیادی اصول تھی۔ اس وجہ سے اور بھی قابل پذیرائی ہے کہ ایک اہل فرانس اپنے عظیم الشان شہنشاہ کے زیر سایہ پھر نہایت مطمئن اور خوش خرم تھے جس نے ان کی خودسالی کا خیال کرکے انکی آزادی کو اپنی سخت نگرانی میں رکھا تھا اور انکے لئے بس مکمل وقابل ستائش مساوات کی مسرت چھوڑدی تھی۔

جہاں تک جرمنوں کا تعلق ہے سو انہیں نہ حریت کی ضرورت ہے نہ مساوات کی۔ یہ ایک تخیلی قوم ہیں، تصور پرست، آگے سوچنے والے یا پیچھے دیکھنے والے، یہ خواب دیکھا کرتے ہیں، ماضی میں زندگی گزارتے ہیں یا مستقبل میں۔ انکا حاضر کوئی نہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا حاضر ہے انکے لئے ہر دن اپنے اندر اپنے مقابلے اور جھگڑے رکھتا ہے ہر دن کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ جرمن کے پاس کچھ نہیں جس کے لئے اسے لڑنا ہو، اور جب اس نے شیخی سے یہ سوچنا شروع کیا کہ ایسی چیزیں ضرور ہونی چاہئیں جن کا حصول پسندیدہ ہو تو اس کے فلسفیوں نے اسے ایسا خوب سبق دیدیا کہ وہ ایسی چیزوں کے وجود ہی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس سے تو انکار نہیں کہ جرمن بھی آزادی سے محبت کرتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جیسے اور دوسری قومیں۔

انگریز آزادی کے ساتھ ایسی محبت رکھتا ہے جیسے اپنی منکوحہ بیوی کے ساتھ۔ اس کا اس پر قبضہ ہے اور اگرچہ کچھ بہت پیار محبت نہیں کرتا لیکن اگر وقت پڑے تو مردوں کی طرح اسکی حفاظت کرنا جانتا ہے اور خدا بچائے اس لال کوٹ والے کو جو اس کے مقدس خوابگاہ میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ چاہے عشقباز بنکر چاہے لچے و بدمعاش کی طرح۔

فرانسیسی کو آزادی کے ساتھ ایسی محبت ہوتی ہے جیسے آمیز اپنی معشوقہ کے ساتھ، یہ اس کے عشق میں تمتایا جاتا ہے، آگ پکڑے لیتا ہے۔ یہ اپنے کو مبالغہ آمیز سے مبالغہ آمیز تعریفوں کے ساتھ اس کے قدموں پر ڈالے دیتا ہے۔ اس کی خاطر زندگی اور موت سب کچھ نثار کرتا ہے اور اس کے لئے ہزاروں حماقتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔

جرمن آزادی سے یوں محبت کرتا ہے جیسے اپنی بڑھی دادی سے۔

انسان بھی عجیب چیز ہے! وطن میں ہم لوگ بھرے بیٹھے رہتے ہیں، وہاں کی ہر ایک حماقت ہر ایک غلطی سے جو اکتایا جاتا ہے۔ لڑکوں کی طرح ادرجی چاہتا ہے کہ وسیع دنیا میں نکل بھاگیں لیکن جہاں واقعی اس وسیع دنیا میں آئے تو پھر یہ بھی ضرورت سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور دل ہی دل میں ہم پھر وطن کی انہیں حماقتوں اور غلطیوں کی تمنائیں کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر جی چاہتا ہے کہ اسی پرانے جانے پہچانے کمرہ میں گرم گرم بیٹھے ہوتے اور کوئی جرمن اخبار پڑھتے ہوتے۔ یہی حال میرا سفر انگلستان میں ہوا تھا کل ہی سے جرمن ساحل میری نظروں سے اوجھل ہوا تھا کہ دل میں انہیں نیوتانی مہربان سست عناصر کی عجیب سی محبت کارفرما ہونا شروع ہوئی جنہیں میں نے ابھی ناراض ہو کر چھوڑا تھا۔ اور جب وطن آنکھوں سے پوشیدہ ہو گیا تو میں نے اسے پھر اپنے دل میں پالیا۔

اس لئے شاید میری آواز میں کچھ رقت ہوگی جب میں نے اس زرد رو آدمی کو جواب دیا کہ "مہربان! میرے سامنے جرمنوں کو کیوں برا کہتے ہو۔ مانا کہ یہ خواب دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے بہتوں نے ایسے اچھے خواب دیکھے ہیں کہ میں اپنے پردسیوں کی جیتی جاگتی حقیقت سے انہیں کبھی بدلنے پر تیار نہ ہوں گا۔ ہم چونکہ سب کے سب سوتے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں اس لئے شاید ہمیں آزادی کی اتنی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ ہمارے ظالم حکمراں بھی تو سوتے ہیں اور اپنے ظلم کا بس خواب ہی دیکھتے ہیں۔ ہاں اس

وقت ہم ضرور جاگے تھے جب کیتھولکی اہل رومانے ہماری خواب دیکھنے کی آزادی ہم سے چھینی تھی۔ اس وقت ہم میدان عمل میں آئے فتحیاب ہوئے اور پھر پڑ رہے اور خواب دیکھنے لگے۔ اے حضرت ہمارے خواب دیکھنے والوں کا مذاق نہ اڑائیے۔ نیند میں بڑبڑانے والوں کی طرح یہ خواب دیکھنے والے کبھی کبھی عجیب باتیں کہہ جاتے ہیں اور انکے الفاظ آزادی کے تخم بن جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ حالات کیا صورت اختیار کریں۔ بد مزاج برطانی اپنی بیوی سے بیزار ہوکر ممکن ہے اس کے گلے میں رسی باندھے، اور اسمتھ فیلڈ میں اسے بیچنے کے لئے لے آئے۔ پھڑ پھڑیا فرانسیسی شاید اپنی معشوقہ سے بیوفائی کرے اور اسے چھوڑ کر ناچتا گاتا اپنے شاہی محل کی خاتونوں کے پاس پہونچے۔ لیکن جرمن اپنی بوڑھی دادی کو کبھی اپنے در سے دھکا دیکر نہ نکالیگا۔ اس کے لئے ہمیشہ آتش دان کے پاس جگہ ہوگی جہاں بیٹھکر یہ ہمہ تن گوش بچوں کو کہانیاں سنا سکیگی۔ خدا نہ کرے اگر ساری دنیا میں کبھی آزادی مفقود ہوجائے تو کوئی جرمن خواب دیکھنے والا اپنے خوابوں میں پھر اسے ڈھونڈھ نکالے گا۔

———————— (ذ۔ ح۔ خ)

کیمیاگر

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک اُن کی حکومت کسی قدر مستحکم ہوگئی تھی، مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے صرف چند حملے کئے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی، اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی۔ اور اس بے چینی کو دور کرنیکے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہوجانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اُسکا گھر سب کا گھر ہے، اُسکا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لیکر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہونچے تو انہیں حکم ملا کہ جونپور کیطرف کچھ اور نو وارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا خالد پور نام رکھا گیا تھا مسلمان آبادی کی بنیاد ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آگئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہوگئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی، اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہوگئے اور ترکستان میں اُنکے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ اُن کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرادی، جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں اُن

کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں، وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار رہتے تھے، تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دئے تھے، انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہوتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیعت کے اخلاق سے کتنا، اُن کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض اُن کی توجہ کو کافی علاج سمجھتے تھے، لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے یہاں تک کہ اُنکی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح، باوجود اپنی ہر دلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی، کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ دنیا جتنی دیکھنی تھی دیکھ چکے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان سے واپس جانا ممکن نہیں، اور وہ یہیں مرینگے اور یہیں دفن ہونگے۔ اُنکا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو نہ اپنے جیسے آدمی سمجھ سکتے تھے نہ ہندوستان کو اپنے وطن جیسا ملک، اُن پر کچھ اثر ان کی بیوی اور اُن کی سسرال کا بھی تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے، اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو اُنکی اس قدر عزت، اُن سے اتنی محبت کرتے تھے کہ انکا اپنی سسرال والوں کا ہمخیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن اُن لوگوں کے تعصب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح سے گھل مل سکے جیسا کہ اُن کی فطرت کا تقاضا تھا۔ اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اسکا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لئے بھی طبیعت میں وہ سکون

پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں اُن کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور اُن کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش مجھے ایک ایسا کیمیاگر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا۔"

اس کے جواب میں اُن کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا۔

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیاگر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کا مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی اُنکے مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا، لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہئے۔ اُنکے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہونچائی گئی، اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہونچے اور انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے تو سب نے اُسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے، اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر اُن کی بیوی اُن سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ تمام نوکر چاکر بوکھلائے ہوئے ادھر اُدھر پھر رہے

ہیں اور اُنکی بیوی رو پیٹ رہی ہیں پہلے تو انہیں یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار بنا ہے، مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہیں کا ماتم ہو رہا ہے۔ اُنکی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود رونا دھونا نہیں شروع کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی اور ہر ایک کو رو رو کر اُنکے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ اُنکے خسر اور سالے آ گئے اور انہیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اسقدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دینا چاہتے تھے، اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے اُنکے ہاتھ پکڑ لئے، خدا اور رسول اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں، اُن کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا۔ اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو، اور کسی مسلمان کو اُس کے بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنا چاہئے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنیکے لئے سوچ رکھی تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر اُن کے خسر اور سالے نے اُن کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اُٹھے:

"ارے وہ بیچارہ تو کچھ کہتا ہے نہیں، وہ خود جانے پر تیار ہے!"

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے، لیکن اُن کی بیوی، جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر انکے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں۔

"آپ لوگوں کے کہدینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہوگا جب یہ خود اپنی زبان سے کہدیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

" چلیں گے کیوں نہیں"، حکیم مسیح کے سالے نے کہا، " تم سامان تیار کراؤ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لیجائیں گے "

یہ کہکر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا، اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنیکے لئے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست، جن کی صحبت کے بغیر انکا زندہ رہنا دشوار ہوتا، یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے۔ مگر حکیم مسیح نے انکی طرف کوئی توجہ نہیں کی، انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ انکا خالدپور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلا جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالدپور میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا ہوگا، انکے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائیگا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور انکے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لئے کوئی مسلمان نہ ہوگا خالدپور چھوڑنا انکے لئے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا۔ مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سی بھی انہیں آسان معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے، اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

اُن کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منالیں گے لیکن بدقسمتی سے اُن کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گزشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر انکا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لحہ ایک نیا صدمہ پہونچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی

اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں انکے دروازہ کو کھڑ کھٹا رہے ہونگے۔ کہیں کوئی بچہ رو دیا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے خالدپور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لئے تڑپ رہے ہوں گے کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو اُن کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کے بار ہا آنکھوں میں آنسو بھر آئے، سر جھکا کر کھانے لگا، لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلہ نے خالدپور سے کوئی دس کوس پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہوگی۔ اور ہوا بھی یہی۔ کچھ دیر تک تو ان پر ایک غفلت سی طاری ہو گئی جس سے اُنکا تکان جاتا رہا۔ لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے۔ کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے۔ جس کی تہ میں ایک خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں انہیں خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں، ایک تیز آندھی آئی جس میں اُنکا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اُڑ گیا، اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں انکے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں کی گھٹا میں گم ہو جاتی ہے سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے، اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کے ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رُخ وہی تھا

تھوڑی دور چلنے کے بعد اُنہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہونچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لئے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ اُنہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور آگے بڑھ گئے۔ مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد اُنکا گھوڑا ارک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اُسے جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ

تیار تھا، آگے معلوم ہوتا تھا کہ اُسی مردہ لیجانا بھی شکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اُسکا مزاج درست کرنے کے لئے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔

مڑتے وقت انکی نظر پھر اُس مسافر پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا اُنہیں تک رہا تھا گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کرلیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اُسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا سا تھا۔ یعنی ایک نیچی موٹے سوت کی دھوتی، اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی، اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھدی تھی اُس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا، سینہ چوڑا پٹھے تنے اور اُبھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولا کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی پتلی ناک، چوڑی پیشانی، چہرہ کا نمایاں سکون، سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اُسکا جسم آہنی ہے۔ مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا، اُس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی اور محبت تھی جو اس کے جسم کی مضبوطی، اس کے قد وقامت پر حاوی تھی اور اُسے دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا کہ وہ اسکا دوست اور ہمدرد ہے اور یہ مجسمہ طاقت، مجسمہ محبت اور ایثار ہے۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا، وہ جواب میں مسکرا دئیے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا۔

"اے آہنی جسم کے مسافر، تو کہاں جا رہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا، پھر اُن سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا، "خالدپور"

"مگر وہاں تو طاعون ہے!"

"ہاں میں اسے لئے جا رہا ہوں"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی، اور انہیں اس خوبصورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اے مسافر، کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

"مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے، اور ہمیشہ عزیز رہے گی" مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "جتنی وہ مجھے عزیز ہے اُتنی ہی وہ خدا کو عزیز ہو گی اگر میں نے اس کی راہ میں جان دی"

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اسکا قول پکا ہے، اُنہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ شخص دنیا میں اکیلا ہو، اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لئے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر، کیا دنیا میں تجھ سے محبت کرنیوالا نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنیوالے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کبھی بھلائی سے نہیں روکتی۔"

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینہ میں تیر کی طرح لگا اور وہ بیتاب ہو گئے۔

"اے مسافر تو آخر کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں کسی ملک کا باشندہ نہیں"، مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہونچا دے وہی میرا وطن ہے، اُسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہو گا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی بچے کچھ نہیں . . . . میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں، جہاں نیند لگی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر، تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میرے اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اُس کے قدموں پر گرتا، اور اُس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستہ پر چلا سکتی ہے، چل، میری رہبری کر، میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں . . . ."

"مگر مسافر، طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے پر تیار تھے، بدن پسینہ سے شل ہو گیا تھا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے۔ محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے۔ ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگے

"حکیم مسیح،" مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کوئی کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا، اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو اپنے سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکئے بھیگ گئے تھے لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی انہوں نے "یا رسول" کا نعرہ مارا، پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سنکر خالدپور کی آبادی میں اودہم مچ گئی۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آگئی جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کرنے کے لئے اُنکے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اُس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ اُنکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شرمندگی سے اُنکی نظریں نیچی تھیں، مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

ادہر سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اُس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسول" کا ایک نعرہ سنا تھا، لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالدپور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالدپور چلیں۔

جب وہ اپنے گھر پہونچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں، نہ پانی پیا ہے نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں۔ آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا، مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہونچنے میں بہت دیر لگی، اور جب وہ پہنچ بھی گیا تو حکیم صاحب نے نہ اُسے پہچانا نہ اسکی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بیتابی سے انتظار کیا، لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہونچیں، وہاں بھی سے لوگ موجود تھے۔ لیکن انہیں دیکھکر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئیں۔ حکیم مسیح اُنہیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ لیکن جب پہچان لیا۔

تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

لالہ سیتا رام کی بیوی بیمار ہیں میں نے دوا بھیج دی ہے، لیکن اُن کی تیمار داری کے لئے کوئی نہیں اگر آپ وہاں چلی جائیں . . . . . ''

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی پچھلے دنوں کے تکان کا نام و نشان نہ تھا، آنکھیں اب بھی سرخ تھیں، مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں، یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتا رام کے گھر پہنچ گئیں . . . .

خالد پور میں دو مہینہ طاعون کا دورہ رہا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت اُن کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور اُنکے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے لیکن یہ بھی اُن کو تسکین دلانیکے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازوں کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لئے ان کو کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانہ میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو اُن کی بیوی کی اور بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہونچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے۔ اور اُنکے ضمیر نے ملاقات کے لئے فرائض ترک

کرنیکی اجازت نہ دی۔ مگران کے دلوں میں خدا پراس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ یاپوسی خودغرضی یا خوف انکے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ اُن کی روحوں کو جدا نہ کر سکے۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا، اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے، کام کم ہوا، فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار دھرم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے۔ ماہران فن قدر دانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایت کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے انکے پاس آتے تھے، اور دل میں اسکا افسوس واپس لیجاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ انکی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہوجاتا تھا، انکے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان کپڑے، جواہرات، ایسے جو بادشاہوں اور لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔ مگر حکیم صاحب اور انکی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے، تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اُسی محبت سے دوسروں کو دیدیتے تھے جس سے وہ انکی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔

خالدپور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور انکی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوا انکے اور انکے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے، انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں

کے دل کہیں اور ہیں، اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں، اُسی محبت کا ایک دھندلا عکس ہے جس میں اُنکی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں، وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے۔ خود بخود نہیں پیدا ہوئی، اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی انکی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اُس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی، اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت زیادہ مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالدپور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانیکی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے۔ بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ کر کے ایک عالیشان عمارت بنائی جائے، لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے تھوڑے دنوں میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اُسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ رکھنے کے لئے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لیکر اس مسجد میں جایا کرتے تھے، اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو، کبھی ساری رات گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے سے ذرا دیر ہو گئی وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، اُن کی بیوی پڑھ رہی تھیں، حکیم مسیح اُنکی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ اُن کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے اُنکے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اُس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے اُن کو خالدپور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکے تھے، اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی نہیں میسر ہوئی۔ مگر اس پر بھی وہ اُن سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پہ گرے۔ اور اس سے التجا

کی کہ اپنی محبت سے اُن کی ہمت دوگونہ کر دے، اُنکے فرائض یا دولاتی رہے اور انہیں ادا کرنیکی طاقت بخشے۔

جب انکی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے اُن کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے، پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:

"تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے، اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہونچ گئے تھے۔ انکی بی بی نے انکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما، اُنکے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی، اور پھر دونوں اپنے کیمیا کے تصور میں محو ہو گئے۔

(محمد مجیب بی اے (آکسن))

کلام شیدا

جو فرصت درد سے ملتی تو کچھ فکر دوا کرتے

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کا کچھ غیر مطبوعہ کلام مرحوم کے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خانصاحب نے عطا فرمایا ہے۔ اسمیں سے چند شعر ہم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں بقیہ کلام باقساط شائع ہوتا رہیگا اور دیوان شیدا کی طبع ثانی پر انشاء اللہ اسکو بھی داخل کر دیا جائے گا۔

ہمارے چارہ گر ناحق ہمیں الزام دیتے ہیں — جو فرصت درد سے ملتی تو کچھ فکر دوا کرتے
نہ سِلتا حشر تک ایسا پھٹا تھا جوش وحشت میں — اگر دست تصور سے بھی ہم داماں سیا کرتے

بلبل ز سر بہ صحن چمن نغمہ خواں رسید — در گوشم از بہار نوید فغاں رسید
ساقی بدام بادۂ گلگوں بجام ریز — علیم مکن کہ رفت بہار و خزاں رسید
در باغ بو داز خم سنبل حکایتے — آمد صبا و حرف ز زلفت بیاں رسید
آں دلبرے کہ از من دیوانہ می گریخت — یارب چہ شد کہ در بر من ناگہاں رسید
در حیرتم کہ آہ دل بے قرار چوں — ناجستہ از لبم بہ در آسماں رسید
ساقی بہ عشوہ آمد و بلبل بہ نغمہ شد — غافل مشو کہ وقت سبو از عواں رسید
تنہا نہ من کہ چشم جہانش ندید ہم — لیلی ز دیدہ در دل من آنچناں رسید
بہر گناہگار نوشتند مغفرت — منعی بر کنہ گفتہ من کے تواں رسید

شیدا اے بادہ ہستی و باک از خداست نیست
یعنی کہ از درش بتوسطاں رسید

شذرات

جامعہ کا ایک وفد بہ سرکردگی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب الہ آباد اور بنارس گیا تھا۔ دونو جگہ موجودہ صورت حالات کو دیکھتے ہوئے معقول کامیابی ہوئی۔ مفصل کیفیت ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو سکی انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں درج کیجائے گی اور اُن سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جائے گا جنہوں نے وفد کی امداد کی۔

اردو اکادمی کی مطبوعات کے سلسلہ میں تاریخ مغربی یوروپ مترجمہ محمد یحییٰ صاحب تنہا اور مل کی آزادی مترجمہ سعید انصاری صاحب زیر طبع ہیں۔ انشاءاللہ دونوں کتابیں آخر اگست تک شائع ہو جائیں گی۔

مس میو کی شورش انگیز کتاب مادر ہند کے بہت سے جوابات اور اس پر بہت سی تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں مگر ان میں سے زیادہ تر ایسی تحریریں ہیں جن میں جائز غصہ کے اظہار پر یا الزام کے جواب میں الزام لگانے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ایسی تنقیدیں بہت کم نظر آتی ہیں جن میں اس پر نظر ڈالی گئی ہو کہ مس میو کے بیان کے کون سے حصے صحیح ہیں اور کون غلط۔ اغلاط کے وجوہ کیا ہیں اور اُنکے نقصانات سے بچنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ حال میں ڈاکٹر پرنجپے کا ایک مضمون ڈیلی میل میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہندوستان کی عورتوں کی سچی حالت" اس میں ڈاکٹر صاحب نے مس میو کے الزامات کا ذکر کیا ہے اور ان پر متانت سے غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ الزام ایک زمانے میں صحیح تھا مگر اب نہیں کہ لڑکیاں بالغ ہونیکے بعد عرصہ تک کنواری رہتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی اب کم ہوتی

جاتی ہے کہ میاں بیوی کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہو کیونکہ ایک طرف تو لڑکیوں کی صغر سنی کی شادی کم ہو رہی ہے اور دوسری طرف بیواؤں کے بیاہ کے بھی اب لوگ زیادہ مخالف نہیں۔ آپ کے خیال میں اعلیٰ ذاتوں میں سے اسی فیصدی ایسی ہیں جن کے یہاں بیواؤں کی شادی اور طلاق دونوں جائز سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ ہندوستان کے نظام معاشرت میں خرابیاں موجود ہیں اور ہندوستان والے اپنے غیر ملکی ہمدردوں شلاً مسز بیسنٹ۔ ڈاکٹر انڈریوز۔ مسٹر نو یڈیٹا وغیرہ کی تنقید اور تنبیہہ کی دل سے قدر کرتے ہیں لیکن مس میو کی سی شپرہ چشم کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

جن لوگوں نے "مادر ہند" کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں ہندوستانی سماج کی خرابیوں کی مثال میں جو واقعات لکھے گئے ہیں وہ اکثر صحیح ہیں مگر یا تو اُن سے نتائج بالکل غلط نکالے گئے ہیں یا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے ہر صفحہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والی نے یہ نظریہ پہلے سے قائم کر لیا تھا کہ ہندوستان نیم وحشی ملک ہے اور اس سے متاثر ہونے کے بعد واقعات کو دیکھا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اسے ثابت کرنے کیلئے واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں محض تصنیف کو دیکھنے کے بعد بغیر مصنفہ سے مزید واقفیت کے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ یا تو ہندوستان کی نادان دوست یا دانا دشمن ہے لیکن جب اُس کی دوسری تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ نہ وہ نادان ہے اور نہ کسی حیثیت سے ایشیائیوں کی دوست بلکہ امریکی اور برطانوی سامراج کی شاہ ہراول ہے۔

اس کتاب سے ہندوستان کی شہرت کو یقیناً سخت نقصان پہونچ رہا ہے لیکن ہمارے خیال میں اس نقصان سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اہل الرا خود ایسی کتابیں شائع کریں جنہیں ہندوستان کی سماجی خرابیوں کی صحیح تصویر ہو اور ان کو شش

ا ذکر ہو جو خود ہندوستانی انہیں دور کرنیکے لئے کر رہے ہیں اور جن سے مس میونے جان بوجھ
رچشم پوشی کی ہے۔ ان کتابوں کو لوگ بہت شوق سے پڑھیں گے اور ان سے متاثر
ونگے۔ اس قسم کے جوابوں سے جو آج کل لکھے جا رہے ہیں جن میں ہندوستان کی جا بجا
ریف اور یوروپ و امریکہ کی جا بجا مذمت ہوتی ہے نہ غیر ملک والوں پر کوئی اچھا اثر
ے گا اور نہ خود ہندوستانیوں پر۔

آزادی کی تحریک نے ایرانی مدبرین میں جو بیدار مغزی پیدا کر دی ہے اسکا اظہا
لاوہ اور باتوں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ ایران والے اپنی تعلیم کو غیر ملکیوں کے اثر سے
زاد کرنیکی کوشش کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال وزارت تعلیم نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ
م مدارس میں تعلیم سرکاری ضابطہ کے مطابق ہونا چاہیے یعنی ہر چھوٹے اور بڑے
رسہ کو علاوہ اور علوم و فنون کے اسلامیات اور فارسی زبان کی تعلیم بھی دینا چاہئے
اوہ اس کے مذہب عیسوی کی دینی تعلیم پر جس میں مذہبی خلوص سے زیادہ سیاسی
لحتیں شامل ہوتی ہیں کچھ قیود عائد کئے گئے تھے۔ اس حکم پر غیر ملکی مدرسے خصوصاً
ران کا امریکی کالج اور اصفہان کا برطانوی کالج بہت چراغ پا ہوئے اور غالباً ان دونوں
ں کی حکومتوں کی جانب سے دولت ایران پر ناجائز دباؤ ڈالا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا
یک دوسرے فرمان کی رو سے آئندہ جون سے تمام ملک کے مدارس میں ہر طرح کی
ی تعلیم روک دی گئی ہے۔ یعنی بائبل کے ساتھ قرآن کی تعلیم کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

جہانتک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بائبل کی تعلیم کو روکنے میں حکومت ایران نے مذہبی
مب سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے ملکی مصالح کی بنا پر وہ ایسی سختی پر مجبور تھی۔ لیکن اس
، ساتھ اسلامی مذہبی تعلیم کو بھی بند کر دینا یا تو کمزوری کی دلیل ہے یا مذہب سے بیزاری

کی۔ چونکہ مغربی تعلیم پائے ہوئے ایرانیوں کو بھی ترکوں کی طرح یورپ کی تقلید خصوصاً اُس کی لامذہبی کی تقلید کا شوق ہے اس لئے خیال ہوسکتا تھا کہ شاید یہ شاگردان مغرب اپنے اُستادوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے اور انہوں نے مذہبی تعلیم کو ضعیف الاعتقادی سمجھکر ممنوع قرار دیا۔ لیکن سلطنت پر علماء کا اثر دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے ممکن ہے کہ یہ محض سیاسی کمزوری کا کرشمہ ہو یعنی پادریوں کی سیاست آگیں مذہبی تعلیم کو روکنے کا یہی ایک ذریعہ نظر آیا کہ سرے سے مذہبی تعلیم ہی بند کردی جائے۔ دونو صورتوں میں معاملہ نہایت افسوسناک ہے اور ذمہ داری صریحاً علماء کی گردن پر ہے۔
خداوند تعالیٰ انکو ایسی غیرت اور ہمت دے کہ اسلامی مذہبی تعلیم کو جاری کرنے کے لئے کم سے کم اتنی ہی کوشش کریں جتنی مفید اصلاحوں کی مخالفت میں کیا کرتے ہیں اور ایرانی مدبرین کی اس مغرب پرستی کو دور کرے کہ وہ مذہب کی مخالفت میں اس قدر تعصب کا اظہار کر رہے ہیں۔

ہمارے پاس بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا سنہ ۱۹۲۷ کا دستور العمل آیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کو ایک کمیٹی چلاتی ہے جس کا دفتر نیویارک میں ہے۔ اس کی بنیاد سنہ ۱۸۶۲ء میں ڈاکٹر ڈانیل بلس نے امریکی مشن کے ایماء سے ڈالی تھی ڈاکٹر بلس نے امریکہ اور انگلستان کا سفر کیا تاکہ لوگوں کو شام میں ایک مشن کالج کھولنے پر آمادہ کریں اور اس کے لئے چندہ جمع کریں سنہ ۱۸۶۴ میں امریکہ کی مجلس مقننہ نے چند ٹرسٹیوں کو شامی پروٹسٹنٹ کالج قائم کرنیکی اجازت دی سنہ ۱۸۶۶ میں ایک کالج کھولا گیا جس میں ۱۶ طالب علم تھے سنہ ۱۹۲۰ میں یہ کالج ترقی کرکے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچ گیا اور اسے ایک نیا چارٹر عطا ہوا جس کی رو سے اسکا نام امریکی یونیورسٹی بیروت رکھا گیا۔ امریکہ کی حکومت اس یونیورسٹی کو کوئی امداد نہیں دیتی نہ اس کے کام میں مداخلت کرتی ہے۔

اس یونیورسٹی کے دو شعبے ہیں ایک شعبہ فنون عامہ و سائنس دوسرا شعبہ طبی۔ علاوہ اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ملحق ہے۔

مدرسہ کی تعلیم آٹھ برس کی ہے۔ لازمی زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی بھی پڑھائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ایک سال تک طلبہ کو تجارت وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے جس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کالج میں داخل ہوتے ہیں۔ کالج کا نصاب تین برس کا ہے جو لوگ اسے پورا کر لیتے ہیں انہیں بی۔اے کی ڈگری ملتی ہے۔ معاشیات، علم تجارت، انجنیری اور زراعت میں بھی ڈگری ملتی ہے۔

طب کی تعلیم کے لئے وہ لوگ داخل کئے جاتے ہیں جو کم سے کم کالج کے پہلے سال کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں طبی ڈگری کے لئے مدت تعلیم پانچ سال ہے۔

دندان سازی کے ڈپلوما کے لئے بھی داخلہ اسی معیار سے ہوتا ہے اس کی مدت تعلیم چار برس ہے۔ دندان سازی کی تعلیم تین سال میں ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ لوگ داخل کئے جاتے ہیں جنہوں نے درمیانی سال کی تعلیم ختم کی ہو۔

آپکا چندہ جون میں ختم ہو گیا

مفصلہ ذیل حضرات کا چندہ ماہ جون میں ختم ہو گیا۔ ہمارے اور آپکے لئے آسانی، سہولت اور کفایت اس میں ہے کہ براہ کرم آپ آئندہ سال خریداری کا اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر مبلغ پانچروپے یوا یسی مرحمت فرمائیں وی۔پی میں طوالت کے علاوہ ۵ ر کا صرفہ زاید ہوتا ہے منی آرڈر نہ آیا تو جولائی کا پرچہ بذریعہ وی پی حاضر ہوگا

(منیجر)

نمبر خریداری	نام	مقام
۱۸۶	منیجر صاحب	حیدرآباد
۱۸۷	مولوی نورالرحمٰن صاحب	"
۱۸۸	پرنسپل صاحب	"
۱۸۹	مظفر حسین صاحب	"
۱۹۰	غلام علی امام الدین قاضی صاحب	سیارا
۱۹۱	حافظ دین محمد عبدالقادر صاحب	کامٹی
۱۹۲	زین الدین صاحب فاروقی	امراوتی
۱۹۳	اقبال احمد خانصاحب	اعظم گڈہ
۱۹۴	احمد حاجی صدیق کھتری صاحب	بمبئی
۱۹۵	محمد خلیل امیر صاحب جلال	کلیان
۱۹۶	محمد یوسف احمد صاحب	"
۱۹۷	غلام رسول امیر ملا صاحب	"
۱۹۸	حاجی احمد برہان الدین صاحب	"
۲۰۰	افتخار حسین خانصاحب	شاہ آباد
۲۰۱	سردار محمد خاں "بزم احباب"	شملہ
۲۰۲	ایس ایم رحمٰن صاحب	یوت مل
۲۰۳	محمد حسین صاحب	رنگون
۲۰۴	ایس-آر ملا صاحب بی اے	مدچھلا
۲۰۵	آنریری سکرٹری	بڈنیرا
۲۰۶	تفضل حسین صاحب انجمن اتحاد	امراوتی
۲۰۷	میجر عظمت اللہ صاحب	سیف آباد-دکن
۲۰۹	آنریری سکرٹری صاحب	الہ آباد
۲۱۰	فریدالدین صاحب انصاری	آرموڈ کنا
۲۱۱	حاجی محمود یوسف صاحب بھائی میاں	رنگوں
۲۱۲	نورالحسن خانصاحب	غازی پور
۲۱۳	محمد الیاس صاحب	نیلنگہ

نمبر خریداری	نام	مقام
۲۱۴	سید رضا عالم صاحب	کھاگول
۲۱۵	سکرٹری صاحب	امراؤتی
۲۱۶	محمد جان صاحب	اُدگیر
۲۱۷	سید احمد صاحب	رامپور
۲۱۸	محمد داؤد داب خانصاحب	کُنی
۲۱۹	حاجی عبدالرشید خانصاحب (بتوسط فدا احمد خانصاحب شیروانی)	بلونہ
۲۲۰	عبدالعظیم منادی صاحب	بمبئی
۲۲۱	قربان حسین صاحب کڑشاہ	ناگپور
۲۲۴	حسن محمد حیات صاحب	بھوپال
۲۲۵	سید ظہیر الحسن صاحب نقوی	لکھنؤ
۲۲۶	عبدالحنان صاحب	خنڈولہ
۲۲۷	ملک خدا بخش صاحب	ڈیرہ اسمٰعیل خاں
۲۲۸	محمد عظیم خانصاحب	کوٹڑی
۲۳۰	سید نصیر الدین صاحب علوی	فتحگڈھ
۲۳۱	حافظ عبدالرب صاحب	دہلی
۲۳۴	رسالدار میجر نذیر علیخاں صاحب	قائم گنج
۲۳۵	مولوی عبدالحافظ خانصاحب	״
۲۳۶	محمد ضمیر الحق صاحب	بانکی پور
۲۳۷	مولوی سید عزیز الدین علیخانصاحب	حیدرآباد دکن
۲۴۱	ایم ابوالحسن جعفری صاحب	الہ آباد
۲۴۵	مولوی سعید الدین صاحب	״
۲۴۶	مولوی محمد یوسف صاحب	نگینہ
۲۴۹	مرزا احمد اللہ بیگ صاحب	حیدرآباد دکن
۲۵۱	سید طلحہ صاحب	لاہور

مطبوعات جامعہ

ذکری

تفسیر پارۂ عم جس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہی مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ خواجہ صاحب کا سلسلہ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہی جس میں پارۂ عم کی تفسیر مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہی قیمت صرف تین روپے

قومی تعلیم

جناب ڈاکٹر سر پی۔ سی۔ رے کے اس مشہور و معروف خطبہ صدارت کا اردو ترجمہ ہے جو ڈاکٹر موصوف نے جامعہ ملیہ کے دوسرے جلسہ تقسیم اسناد میں پڑھا تھا اس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی حیرت انگیز علمی ترقی کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا ہے قیمت صرف چار آنے اصل انگریزی مع مقدمہ عبدالمجید خواجہ صاحب ۱ار

عربوں کا تمدن

مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب بی۔ اے (جامعہ) چند سال ہوئے ڈاکٹر جوزیف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی نے عربی تمدن پر ایک مختصر مگر جامع کتاب شائع کی تھی جس کا انگریزی ترجمہ ہر جگہ مقبول ہوا۔ دنیا کی کسی زبان میں تمدن اسلام پر ایسی مختصر مفید تصنیف موجود نہیں جسمیں جدید ترین تحقیقات کی بنا پر تمام ضروری معلومات کو جمع کر دیا گیا ہو تمام وہ حضرات جو مسلمانوں کے قدیم علمی و عملی کارناموں کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں اس کتاب کو اپنے لئے غیر معمولی طور سے مفید پائیں گے۔ مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بڑھا دی ہی۔ یہ تاریخ اسلام پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہی

قیمت صرف دو روپے (عہ ر)

تاریخ فلسفہ اسلام

از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج دی بور کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہی قیمت عہ ر

مسلمانوں کی تعلیم

از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اس رسالہ میں ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر نہایت دلچسپ اور مفید بحث کی ہی نیز بتایا ہے کہ جامعہ مسلمانوں کی ان ضروریات کو کس طرح پورا کر سکتی ہی۔ قیمت ۸ر

شمع

پیش فرمائیے

کیا جناب کو علم و ادب کا ذوق ہے ؟

کیا جناب کو سیاست سے دلچسپی ہے ؟

کیا جناب کو تاریخ سے شوق ہے ؟

کیا جناب اپنی زبان میں یوروپ کا لٹریچر دیکھنا پسند کرتے ہیں ؟

کیا جناب ہندوستان کے بہترین شعرا کا پاکیزہ کلام ہر ماہ دیکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اخلاقی و تمدنی مضامین سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اعلیٰ پیمانہ کے افسانوں سے نیک سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب جدید ترین ترقیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب جدید ترین مطبوعات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب مصوری کے لاجواب نمونے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب تاریخی اور کمیاب تصاویر کے شائق ہیں ؟

کیا جناب اپنے فاضل وقت کو بہترین شغلہ میں صرف کرنا چاہتے ہیں ؟

اگر آپ ان میں سے ایک بھی خواہش کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو رسالہ شمع کو ضرور ملاحظہ فرمائے
آج ہی ۱۰ ار آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب فرمائے لکھائی چھپائی بہترین چندہ سالانہ ۶ے رش
جنوری ۲۷ء سے مصوری کے بہترین نمونوں کی شاہان اودھ کی نہایت قیمتی اور
تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج

ہمارے نبی

خدا کے پیارے ہمارے نبی رسول پاک صلعم کی زندگی کی کہانیاں نہایت آسان زبان میں۔ اس کتاب میں آپ کے بچپن سے آخر عمر تک کے تمام حالات درج ہیں۔ سب بچے مزے لے لے کر اسے پڑھتے ہیں۔ چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے اس کے لکھنے والے ہندوستان کے مشہور پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے ہیں صرف چند کتابیں باقی رہ گئی ہیں فوراً لکھ دیجئے ورنہ دوسری بار چھپنے کا انتظار کرنا پڑیگا

قیمت صرف ۱۲؍

ازہار العرب

یہ عرب کے مشہور شعراء کے منتخب کلام کا ایک گلدستہ ہے جس میں پند و نصائح علم و حکمت، ہمت و شجاعت، سخاوت و مروت اور اخلاق حمیدہ پر بہترین عربی اشعار جمع کئے گئے ہیں، یہ ایک نہایت بیش قیمت ذخیرہ ہے از مولانا سورتی استاذ جامعہ قیمت صرف ۸؍

سرکار کا دربار

سیرۃ پاک پر آسان سلیس شگفتہ عبارت میں عجیب عزیب کتاب ہے حسب ضرورت اور موزونیت کے لحاظ نہایت تفصیل و تشریح کیساتھ پیدائش سے وفات تک کے حالات اور خاص خاص واقعات اسقدر دلچسپ اور پیارے انداز میں لکھے ہیں کہ کتاب شروع کرنے پر بغیر ختم کے نہیں چھوڑ سکتے خانہ کعبہ، مسجد نبوی روضہ پاک اور بیت المقدس کے تین ہاف ٹون فوٹو سرورق اتنا خوبصورت اور دلکش دیدہ زیب کہ آج تک ایسا حسین اردو کتابوں کا نہیں دیکھا گیا۔ جس پر روضہ پاک کا فوٹو بھی دیا گیا ہے تقریظ مولانا عبدالماجد بی اے اڈیٹر سچ لکھنؤ صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت عہ

الورد والریحان

از مولانا فتح محمد خانصاحب۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب مع ترجمہ نظم و نثر قیمت ۲؍

انتخاب میر

زبان اردو کے زندہ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطہ نظر سے انتخاب کیا گیا ہے ابتدا میں میر کے حالات زندگی اور محاسن کلام میر پر ایک فاضلانہ مقدمہ درج ہے غرض کہ ہر اعتبار سے دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ مرتبہ مولوی نورالرحمٰن صاحب بی اے (علیگ)

مجلد خاص قیمت صرف عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت

مولٰنا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

ایک تصویر

لیئونارڈو دا ونچی (Leonardo da Vinci) نے اُس زمانہ میں ایک تصویر بنائی تھی جب اطالیہ میں قدیم یونان کا اثر اپنے عروج پر تھا۔ ملک کے تمام روشن ضمیر لوگ یونانی جمالیات کے بادۂ کہنہ سے مست تھے، اور یونانی تخیل گہرے سے گہرے جذبات تک سرایت کر گیا تھا۔ لیئونارڈو بھی انہیں روشن ضمیر لوگوں میں سے تھا، لیکن اُس کی اپنی شخصیت اسقدر مضبوط اور تخلیقی تھی کہ وہ دوسروں کی طرح یونانی تہذیب میں فنا نہیں ہو گیا تھا، بلکہ اُس کے اثرات کو اپنے جذبات کے قوی اور دل کے وسیع بنانے کے لئے استعمال کیا۔ دوسرے یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے عشق میں کلیسا اور حضرت عیسیٰؑ اور دینِ عیسوی کو بھول گئے، لیئونارڈو نے یونانی جمال کو عیسائی اطاعت اور ایثار کے رنگ میں رنگا، اور ایک تصویر بنائی جو صدائے مستانہ بھی ہے اور فلسفہ بھی، عشق بھی اور مذہب بھی۔

یہ تصویر حضرت یوحنا کی ہے، ایک ولی جو مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوئے۔ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں بسر کرتے تھے، اور جو لوگ ان کے پاس جاتے ان سے کہتے تھے کہ "میں مسیح نہیں، اس کا پیش رو ہوں۔ میں مسیح کے قدم چھونے کے لائق بھی نہیں۔ میں صرف اُس کا راستہ صاف کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے نالہ کو ہوش سے سنو، اور بپتسمہ کے پانی سے اپنے گناہ پاک کرو۔" اعتقاد اور انکسار، جوش اور خود فراموشی کا بہتر نمونہ عیسائی مذہبی تاریخ میں مشکل سے ملے گا۔ اسی واسطے لیئونارڈو نے انھیں اپنی تصویر کے لئے سب سے مناسب سمجھا۔ انہیں صحرا میں دکھایا، ان کے چہرہ کو روشن کیا، ہاتھ میں صلیب دی۔ یہ سب عیسائی روایات کی پیروی تھی، باقی جو کچھ تصویر میں ہے وہ یونانی جمالیات کا جوہر ہے۔

یونانی تصور انسانیت کے معموں میں اس قدر مشغول، اس کی عظمت کا اتنا دلدادہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی کافی تعظیم اور توصیف نہ کر سکا۔ یونانی شہری ریاستوں کی طرح یونان کا عالمِ بالا

بھی مختلف دیوتاؤں میں تقسیم تھا۔ ہر دیوتا آزاد، خود مختار، بے نیاز انسان کے اُس جذبہ یا انسانی زندگی کے اُس پہلو پر حکومت کرتا تھا جو اُس کے سپرد تھا۔ منروا عقل و دانش کی دیوی تھی، وینس حسن کی، کیسٹر اور پولکس جہاز رانی کے، ڈایونسیس انگور اور شراب کا۔

ڈایونسیس اُس وقت یاد کیا جاتا تھا جب دنیاوی امور سے فراغت ہو، اور خوشی اور مستی مقصود ہو۔ ڈایونسیس کا مندر صحرا اور چشمے اور درختوں میں چھپی ہوئی وادیاں اور پہاڑیاں تھیں، وہیں اس کے پجاری جا کر اُسے یاد کرتے، اور اپنی مجلس اور شراب خواری میں شریک ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ عوام کے تصور میں ڈایونسیس خوش مزاجی، موٹے ہونٹوں، مخمور آنکھوں اور نمایاں توند کا مجموعہ تھا اور اُسے پجاری بھی ایسے ہی ملتے تھے۔ مگر وہ قوم جو مشرقی شاعری میں ناصح اور واعظ کے نام سے مشہور ہے اِسے کب روا رکھ سکتی تھی۔ اُس نے طے کیا کہ ڈایونسیس کی مستی شراب کی نہیں، شراب اور شراب خواری محض تمثیلیں ہیں۔ ڈایونسیس ایک سنجیدہ، خوش اخلاق بلکہ نہایت درجہ پارسا دیوتا ہے۔ اُس کا نشہ روحانی ہے اس لئے اس کی پرستش میں شراب خواری بغرض مستی و مدہوشی ہرگز جائز نہیں۔ یونانی آرٹسٹ کو نہ عوام کی پیروی منظور تھی نہ اخلاقی رہنماؤں کی۔ اُس نے ڈایونسیس کو ایک خوبصورت مرد کی شکل دی، ایسا جسے خوش مذاق اور سنجیدہ لوگ اپنی عیش و طرب کی مجلسوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اُسکی آنکھوں میں ایسا خمار پیدا کیا جو روحانیت اور شراب خواری دونوں کا حیرت انگیز مجموعہ تھا.......

یونانی تخیل کا نیا دور جس میں لیونارڈو کی شخصیت نے نشو و نما پائی تھی، نہ پرانے دیوتاؤں کو اُن کی دیرینہ شکل میں پیدا کر سکا، نہ ان کے پجاریوں میں صحیح اور فطری عقیدت۔ ظاہر تھا کہ اگر عیسائی عقیدت نے اُن کو اپنے زیر سایہ نہ لیا، یا وہ اپنی صورت دنیا اور تہذیب کی نئی شکل کے مطابق نہ بدل سکے، تو دونوں کو سخت نقصان ہوگا۔ عیسائی مذہب ایک خاص لحاظ سے لوگوں کی فطرت میں سرایت کر چکا تھا، لیکن اُس میں تعمیر اور تخلیق کی طاقت اتنی کم رہ گئی تھی کہ پرانے دیوتاؤں نے اُس کے قلعہ کو آسانی سے فتح کر لیا۔ ان دونوں میں مطابقت کرنا، اس مطابقت سے ایک نئے مذہب کا کام لینا

اس زمانہ کی تہذیب کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کوشش کا ایک نہایت کامیاب نمونہ ہے۔

حضرت یوحنا ایک صحرا میں رونق افروز ہیں، ہاتھ میں صلیب، کندھے پر کملی ہے مگر صحرا پرستی کالی گھٹا کی طرح چھائی ہے، یہاں تک کہ ان کی صلیب کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ان کے سامنے ایک کھوہ ہے ویسا ہی جس میں ڈایونسیس کے پجاری اپنی مجلسیں کیا کرتے تھے۔ حضرت یوحنا کے بال لٹوں میں بندھے ہیں، انکا جسم ویسا ہی سفید اور نرم اور خوبصورت، ان کا انداز ویسا ہی مستانہ، ان کی آنکھوں میں وہی ذومعنی خمار ہے جو ڈایونسیس کے لئے مخصوص تھا، لیکن وہ صلیب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، گویا یہ ساری دنیا، یہ خمار، یہ حسن، سب اُسی کا کرشمہ ہیں۔ اسی اشارہ میں تصویر کا سارا فلسفہ ہے۔

کلیسا نے شروع سے نفس کشی اور رہبانیت کو روحانی ترقی اور نجات کا اکیلا، صحیح اور سیدھا راستہ قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر یہی مانا گیا تھا کہ انسان جسمانی خواہشات، دنیاوی مسرتوں سے دل کو ہٹالے اور نفس کو روح پر قربان کرے۔ صدیوں کی عادت سے لوگوں کی ذہنیت میں پارسائی کے یہی معنی اور اُس کی یہی صورت مقرر ہو گئی تھی۔ لیکن صدیوں کے تجربہ نے انہیں کچھ مایوس بھی کر دیا۔ رہبانیت اور زہد کی دشواریوں نے ان کی ہمت پست کر دی۔ جب انہوں نے قدیم یونان کا رنگ دیکھا، یونانی انسانیت کی عظمت کا انہیں احساس ہوا، تو وہ اپنے مذہبی عقیدوں اور اصولوں سے منہ پھیر کر اس نئے دین کے معتقد ہو گئے۔ اس دین میں جذبات اور نفسی خواہشات کے نشو و نما کا موقعہ تو ضرور تھا لیکن اخلاق کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ کچھ لوگ کلیسا کے دھرے پر چلنا چاہتے تھے اور انہوں نے یونان اور یونانی تہذیب کو شیطان کا جال بتایا، اور قوم کو آگاہی دی کہ اگر فلاح کی خواہش ہو تو اس سے محفوظ رہیں، زیادہ تر بغیر اپنے عقیدوں کا اعلان کئے ہوئے دونوں تہذیبوں سے لطف یا فائدہ اُٹھاتے رہے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے مذہب کو بالائے طاق رکھا اور یونانی دیویوں پر عاشق ہو کر نفس کی لگام ہاتھ سے چھوڑ دی۔

ان میں سے کوئی طریقہ بالکل صحیح نہیں تھا مگر کسی فریق کی نظر میں اتنی وسعت نہ تھی کہ حضرت عیسیٰ اور قدیم یونان کو ایک ہی دل میں جگہ دے سکے۔ لیئونارڈو داونچی نے علاوہ اور کارناموں کے یہ معجزہ بھی دکھایا۔ یوحنا کی تصویر میں صلیب پر فوراً نظر جمتی ہے، انکی ظاہری مستی پارسائی اور ایثار کا پیغام دیتی ہے، لیکن تصویر پر یہ بھی صاف لکھا ہے:

من ایں مے چوں مغان دو پیشیں
زچشم مست ساقی وام کردم

حسن پرستی اور پارسائی کی عداوت صرف عیسائی مذہب کی خصوصیت نہیں۔ یہ عداوت ہر مذہب، ہر ادب، ہر دل میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو اس زمانہ سے جب انسان میں اخلاق اور مذہب کا احساس پیدا ہوا ابھی تک جاری ہے، اور اس کا انجام ابھی تک کچھ نہیں نکلا۔ حسن پرستی نے عموماً لوگوں کو ورغلایا ہے، برباد کیا ہے، پارسائی نے اکثر اُن کی برسوں کی جفاکشی کا کوئی صلا نہیں دیا۔ دونوں فریق میں ایسے افراد ہیں جو اپنی تمناؤں کی بےکسی، اپنی آرزوؤں کی نااُمیدی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مخالفین پر حملہ آور ہو کر عام توجہ انکی کمزوریوں کی طرف منتقل کراتے ہیں، کہ اُن کی اپنی خامیاں چھپی رہیں۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہر شخص صرف اپنے لئے کرسکتا ہے، اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی اُس کی طبیعت کو اسقدر نہیں سمجھ سکتا جتنا اس کے قطعی فیصلہ کے لئے ضروری ہے۔ ہمارا مقصد بھی واعظ اور رند کے درمیان صلح کرانا نہیں ہے بلکہ وہ سلسلہ خیالات بیان کرنا جو لیئونارڈو داونچی کی تصویر میں پوشیدہ ہے اور اس کو دیکھنے سے ہم میں یکبارگی ایک عجیب سا نشہ پیدا کر دیتا ہے۔

لیئونارڈو نے براہ راست یہ نہیں ظاہر کیا ہے کہ جمال یا جمالیات انسان کو منزل مقصود پہنچاتے ہیں۔ اُس کی تصویر ایک عاشقانہ یا صوفیانہ شعر نہیں ہے۔ حضرت یوحنا کو ڈائونیسس کا لباس پہنا کر اس نے ڈائونیسس یا اُس کے پجاریوں کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہی ہے، اگر ہم اس کے مطلب کو تعلیمی شکل دینا چاہیں تو اُس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا۔ دنیا عموماً سمجھتی ہے کہ ز

کا لطف حسن اور نفس پرستی میں ملتا ہے، اور یار سا جنے کے لیے جو ایثار کرنا ہوتا ہے وہ زندگی کو بالکل بے لطف اور ویران کر دیتا ہے۔ لیو نارڈو نے ایسے لوگوں کو حقیقت سمجھانے کیلئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے، اور اس کا دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو "مے مردافگن" کا حریف بننا چاہتا ہے، اور حسن لازوال کی دیدار کا آرزومند ہے، اُسے چاہیئے کہ ایثار اور محبت میں حضرت عیسیٰ کا پیرو بنے، اسی طرح جیسے حضرت یوحنا تھے۔ جس قدر وہ اس راستہ پر سفر کریگا اُس کا ذوق بڑھتا رہیگا، "ہمت رندانہ" اپنے کرشمے دکھائیگی اور اُس پر ایسی مستی چھائے گی جو صرف دار اور صلیب پر چڑھنے سے اتر سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ماہرینِ نفسیات نے یہ دریافت کیا ہے کہ تمام جذبات دراصل صرف جنس کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ روحانیت، مذہب بھی شامل ہیں۔ مذہبی جوش، چاہے وہ زہد کی صورت اختیار کرے، چاہے قلندری کی، صرف جنسی ضبط اور اور پرہیز کا نتیجہ ہے، اور اس میں اور کوئی بڑا بھید نہیں۔ معمولی انسان شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اپنے پیشے اور دوسری دلچسپیوں میں اپنی قوت ضائع کرتے ہیں۔ اگر وہ بجائے اس کے زاہد یا قلندر یا مذہبی رہنما بنجائیں اور جنسی جذبات کی پوری قوت محفوظ رکھیں تو وہ بھی عقیدت اور روحانیت کے وہی معجزے دکھا سکتے ہیں جنہوں نے چند شخصیتوں کو مشہور کر دیا ہے۔

سائنس کی تعلیم سے قطع نظر کرنا یا بلا سائنس داں ہوئے اُس کے نظریوں کی تردید کرنا خطرناک ہے، لیکن اگر ہم اس نظریہ میں سے مادیت کی بو نکال دیں تو اُس کی صحت کا اقرار کرنے میں کوئی بے ادبی نہیں، اور بزرگوں کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ضبط نفس کی ساری مصلحت یہی ہے کہ اُس سے انسان کی فطری قوت ضائع نہ ہو، اور ارادہ سے جس طرف حاجت ہو، قوت منتقل کر دی جائے۔ جو شخص اپنے جنسی جذبات حیوانی رغبتوں سے پاک رکھتا ہے وہ بے حس نہیں ہو جاتا، اسکے جذبات خود بخود یا تربیت کے بعد اپنے لئے کوئی اور راستہ نکال لیتے ہیں۔ شہوت محبت بن جاتی ہے، محبت ایثار، عشق کا انجام شادی اور بال بچے یا رنگیلے شعر نہیں ہوتے، نظر ہوس کا پیغام نہیں

دیتی۔ اور جب یہ ضبط بالکل فطری ہو جائے، اور انسان اس نئی کیفیت میں نشو و نما پانے لگے تو حسن اُسے اپنا پوشیدہ راز بتا دیتا ہے، عشق میں اُسے آزادی کی لذت ملتی ہے اور ہر تکلیف میں اُس کیلئے عیش کا سامان ہوتا ہے۔

یونانی تہذیب جمالیات کے اس پہلو اور ضبطِ نفس کی لذت سے بخوبی واقف تھی۔ افلاطون نے جمال اور حق کو خدائی کا درجہ دیا ہے، اور حسن پرستی کی، جسکا ہر جگہ اور ہمیشہ چرچا رہتا ہے، عین بدمذاقی بھی ثابت کی ہے۔ جمال کا احساس اور نفس پر قابو رکھنا اسکے نزدیک انسانیت کی شرط ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ یونانی دل اسقدر پاک تھے کہ وہ اس تعلیم کے تمام لوازمات پورے کر سکیں، اور ایک فلسفیانہ نظریے سے یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ مذہبی عقیدے کا کام دے۔ یونانی انسانیت کا ہی ایک کرشمہ ہے کہ اسنے بغیر کسی پختہ مذہب کی مدد کے اخلاق اور تہذیب میں اسقدر بلند رتبہ حاصل کیا۔ بہرحال عیسائی رہنماؤں کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اخلاق کی بنیاد صرف جمالیات کی صحیح تعلیم مقرر کریں۔ انکا تصور کمزور تھا، وہ اسی منطق کے قائل تھے جسپر دنیا چلتی ہے۔ انہوں نے جسم کو بذات خود ہوس پرور پایا، اور اُسی تکلیف پہونچانے کیلئے نئے نئے طریقے سوچے، ضبطِ نفس کو ناکافی سمجھ کر روحانی نشو و نما کیلئے نفس کشی لازم کی گویا ارادہ کیا بلند پروازی کا اور شہ پر کاٹ دیئے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ ملت کے لئے اُن کی پیروی دشوار ہو گئی اور انکی آبرو اس لئے بچ رہی کہ انسان اپنے عیب کامیابی سے چھپا سکتا ہے۔

اس تنگ نظر "ہیچو مارے برخود پیچیدہ" تہذیب میں جب یونانی انسانیت کے راز فاش ہوئے تو اودھم مچ گیا۔ عام زندگی میں کسی قسم کا توازن یا اعتدال ناممکن ہو گیا، اور اُسی جسم نے جو صدیوں سے ہلاک ہو رہا تھا روح پر بدلہ لیا۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ سمجھ لیا کہ انسانی زندگی میں ایک بہت عظیم الشان انقلاب ہونیوالا ہے، اور اس نے اپنے طرز پر رہبری بھی کی۔ اُس کے تصور نے اُسے ان تمام منزلوں کی سیر کرائی جو یونانی انسانیت طے کر چکی تھی، مگر اس نے ایک قدم آگے بھی رکھا۔ یونانی انسان کے پاس ضبطِ نفس کی رغبت دلانے کیلئے کوئی روحانی آرزو نہیں تھی، نہ کوئی رہنما جو اُس کی کیفیتوں سے واقف ہو۔ عیسائی تہذیب کا جوہر ایک صاحبِ دل کی سرگزشت تھی، ایک دل کا افسانہ، جسکے سمجھنے کیلئے اُس میں کافی وسعت نہ تھی۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ دیکھ کر رند کے ہاتھ میں صلیب دی، مذہب میں نشہ پیدا کیا اور عشق کو پختہ کار بنا دیا۔

اگر میں واعظ ہوتا؟

عنوان بالا سے ۴ جنوری ۱۹۲۹ء کے ڈیلی ٹیلیگراف میں برٹرنڈ رسل کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے - برٹرنڈ رسل کے اس مضمون میں ہندوستان کے قومی ماہرین تعلیم کے لئے غور وفکر کا کافی مواد موجود ہے جو بچوں کو بید مار کر ڈرا دھمکا کر (اور یہ رسم ہمارے سارے ہی مدارس میں ہے) کچھ کراتا، ان کی آئندہ زندگی کے بعض خطرناک عیبوں کے پیدا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے - اچھا ہو اگر ہماری آزاد قومی تعلیم ایسے افراد پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ان عیبوں سے بمقابلہ دوسروں کے زیادہ پاک ہوں۔

یوسف

اگر میری جان لی جا رہی ہو اور اس وقت مجھے صرف ۲۰ منٹ اپنی آخری الوداعی تقریر کے لئے دئے جائیں تو میں کیا کہوں گا؟

اس وقت ضرورت ہوگی کہ میں سادگی اور اختصار سے کام لوں - میں سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت ایک بات پر سب سے زیادہ زور دوں گا اور وہ بات ہوگی انسانی دل سے ڈر دور کرنے کی اہمیت۔ میرا خیال یہ نہیں کہ انسانیت اس طرح مکمل کیجا سکتی ہے - کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور باقی رہے گی - لیکن بہت سے عیب جو ہمارے نوجوانوں میں ہوتے ہیں انکی وجہ وہ تعلیم کی غلطیاں ہیں جنکا تدارک ممکن ہے - ان غلطیوں میں سب سے اہم دل میں ڈر پیدا کرنا ہے۔

والدین، ملّا اور حکومتیں اس بات میں مایوس ہو چکی ہیں کہ عقلِ انسانی کی اپیل سے اپنا رعب داب قائم رکھ سکیں - انہیں کمینے ڈرپوک غلام بنانا پسند ہے - مجھے یقین نہیں کہ ڈر کے ذریعہ کوئی اچھی بات حاصل کیجا سکتی ہے - میرا اعتقاد یہ ہے کہ اس طریقہ سے جو وفاداری حاصل کیجاتی ہے اس کا نہ حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے - ڈر پر، بہ حیثیت ایک اجتماعی قوت کے دو اعتراض وارد ہوتے ہیں - وہ جو ڈراتے ہیں

اثر بُرا اثر اور وہ جو ڈرتے ہیں ان پر۔ دونوں اہم ہیں اگرچہ آخرالذکر زیادہ اہم ہیں۔

شروع میں انہیں لیجئے جو ڈراتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بے رحم اور دوسروں کو دبانے کے خوگر ہو جائیں۔ اُن میں اختلاف گوارا کرنے اور دلیل سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ایسی کوئی حجت جو یہ بتاتی ہو کہ وہ اپنا رعب و داب غلط طریقہ پر استعمال کر رہے ہیں انہیں سننا گوارا نہیں۔ وہ اُن لوگوں کو ترجیح دینے لگتے ہیں جو بے اصولے ہیں اور جن میں اپنی ذاتی عزت کا احساس نہیں (دراصل) وہ خود ڈر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اپنے اسی رعب داب کو نہ کھو بیٹھیں جو بے انصافی پر مبنی ہے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ان کے ماتحت، واجبی طور پر، اظہار خفگی نہ کریں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں دنیا زیادہ سمجھدار نہ ہو جائے۔ ان خطروں کے باعث وہ اپنی بے رحمی کو بڑھاتے ہیں اور بے رحمی کی ہر زیادتی سے ان کے دلوں میں بدلوں کا خوف بڑھتا ہے۔ غرضیکہ اس طرح یہ ایک چکر ہے جو ظلم اور ڈر کی برائیوں کے تعلق کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔

ڈر کا اثر اُن پر جو ڈرتے ہیں اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے۔ ڈروں کی مختلف قسمیں ہیں۔ انمیں جسمانی ڈر، جسے روایتاً سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، سب سے کم نقصان دہ ہے۔ اخلاقی اور ذہنی ڈر بہت زیادہ بُرے ہیں۔ ہر ڈر تھوڑا بہت غصہ پیدا کرتا ہے لیکن چونکہ جس سے ڈر ہوتا ہے اس پر غصہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کا اظہار ظلم کی صورت میں کمزور پر ہوتا ہے جس طرح اہل قوت کے دل میں ظلم سے ڈر پیدا ہوتا ہے بالکل اسی طرح اُن کے غلاموں کے دلوں میں ڈر سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر موجودہ دنیا میں، کمینے پن اور نامہربانی کے بڑے سببوں میں سے ہے۔ لوگ راس، اجتماعی ناپسندیدگی کے اظہار سے اس لئے محفوظ ہوتے ہیں کہ وہ خود اس کے ڈر سے دب چکے ہیں۔ جب آدمی اپنے پڑوسیوں کی اچھی رائے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی کرتا ہے تو اُسے بڑا غصہ آتا ہے جب اور کوئی ویسی ہی قربانی کرنے سے انکار کرے۔ وہ ایک خوفناک اخلاقی بن جاتا ہے۔ اور یا بہت گناہ گار کو سزا دینے کی ٹھان لیتا ہے۔ اُن گناہگاروں میں جو اجتماعی ناپسندیدگی کے سزا یافتہ ہیں، وہ سب شامل ہیں جو بیگانہ رہیں، وہ سب جن کے پاس نئے خیالات ہیں جو زندگی

طور پر خالص سائنٹفک نہ سہی، وہ سب جو اپنے گردہ سے زیادہ وسیع، کم سخت گیر اخلاق پر عمل کرتے ہیں کے لئے اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر پیدا کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اجتماعی تعاون خود اپنی خوشی اور عقلا کے ہونا چاہئے نہ کہ ہر فرد کی (جماعت کے آگے) ڈرپوک پنے سے تسلیم۔

ڈر کے بُرے اثرات میں سب سے زیادہ بُرا اثر یہ ہے کہ اُس سے حماقت پیدا ہوتی ہے عق کے لئے ایک ذہنی بے خوفی ضروری ہے۔ اس کے لئے ذہنی آزادی درکار ہے اور ذہنی آزا وہاں مشکل ہی سے ملے گی جہاں اجتماعی آزادی نہیں۔ اس لئے وہ جماعتیں جو اجتماعی ربط پر زور دیتی ہیں، ضرور ہے کہ احمق انسانوں پر مشتمل ہوں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر نہ اجتماعی تر کر سکیں گی نہ علمی۔ جوشیلے سے جوشیلا حقوق نسواں کا مدعی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عو نے اب تک بمقابلہ مردوں کے بہت کم ذہنی آزادی کا ثبوت دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس کی سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بمقابلہ مردوں کے "اخلاق خوف" کے ماتحت سختی سے ر ہیں۔

میں اُن سے کانپتا ہوں جنکا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسانی روح اور انسانی ذہن کو زنجیر وا رکھیں۔ میں اس (فہرست میں) پروہتوں، مدرسوں، ۹۰ فیصدی مجسٹریٹوں اور ججوں، اور ا سے اکثروں کو جنہوں نے سخت ظاہری اخلاقی معیاروں پر پابندی سے عمل پیرا ہو کر جماعت عزت حاصل کی ہے، شامل کرتا ہوں۔ یہ مختلف انسانی طبقے، الگ الگ طریقوں سے، اجتما ناپسندیدگی یا تعزیرات کے ذریعہ اُن دعوؤں میں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر گو محقق مشتبہ سمجھتا ہے اور جنہیں اعداد و شمار کا ہر طالب علم اجتماعی طور پر نقصان دہ خیال کرتا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ کہا جائیگا کہ نوجوان اس وقت تک نیک، نہیں ہو سکتے جب تک ان غلط دعوؤں میں یقین نہ رکھیں۔ یہ عجیب انداز ہے اور یہ دو منطقی مغالطوں پر مبنی ہے پہلے یقین کر لیا گیا ہے کہ "عمل صالح" ایک ایسی بات ہے جس کی تائید میں کوئی عقلی دلیل نہیں دی جا دوسرے یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ خلاف عقل اور جھوٹی دلیلیں اس کے لئے کافی ہیں کہ اُن کے ذر

تکلیف وہ اشیاء کرایا جا سکے جس کی تائید میں مسلمہ طور پر کوئی عقلی وجہ نہیں۔

عقلی چلن سکھانا واقعی مشکل ہے۔ لیکن یقیناً وہ عقلی طریقہ سے سکھانا بمقابلہ خلاف عقل طریقوں کے سکھانے کے زیادہ آسان ہے۔ ایک بچے کو یہ بات فرض کرنے کا عادی بنا دیجئے کہ جو آپ اُس سے کہتے ہیں اس کے لئے اچھی دلیلیں موجود ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس امر کی تصدیق کر سکے اُسے کرنے دیجئے۔ اُسے اُس وقت تک کچھ نہ کہئے جب تک آپ خود کسی بات کی سچائی میں یقین نہ رکھتے ہوں اس کی سائنٹفک اسپرٹ کی نشوونما کیجئے تاکہ جب کبھی ہو سکے وہ آپ کے دعوؤں کی تصدیق کر سکے۔ اس طرح آپ ایک ایسا انسان پیدا کرینگے جو صاحب عقل ہوگا۔ یہ بات انکے لئے ناممکن ہے جن کی پرورش گناہ کے اس تخیل پر ہوئی ہے جو جبری مذہبی امتناع پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عاقل انسان اس سارے اخلاقی آئین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جو کلیسا نے رائج کئے ہیں، تو اس آئین کی مٹی پلید ہے۔

ڈروں کی ایک اور قسم ہے جہاں خطرہ واقعی موجود ہے لیکن جسے کافی ہوشیاری سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سیدھی سادی مثالیں جسمانی خطرے ہیں۔ مثلاً وہ خطرے جو پہاڑوں پر چڑھنے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اور دوسرے بھی بہت سے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اجتماعی ناپسندیدگی کے ڈر کو لیجئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ ایک آدمی گھوڑا چرا سکتا ہے حالانکہ دوسرا آدمی ٹٹی کیطرف بھی نظر نہیں ڈالے گا۔ اس فرق کیوجہ وہ خاص مزاجی رجحان ہے (شروع سے) دوسرے لوگوں کیطرف ہوا کرتا ہے۔ وہ آدمی جو بھائی بندوں کے سامنے دوستانہ بے خوفی کے ساتھ آتا ہے وہ اپنے اس رویہ کی تصدیق نتائج سے کر سکے گا۔

وہ بچے جو کتوں سے ڈرتے ہیں اُن سے بھاگتے ہیں۔ اسی لئے کتا بھونکتا ہوا انکی طرف لپک آتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ بچے جو کتوں سے محبت کرتے ہیں کتے بھی انہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے رویہ کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ اچھا نتیجہ مخالفت (ناپسندیدگی) کے مقابلہ میں ہمت کرنے سے نہیں نکلتا۔ وہ تو صرف خلوص (سچی) دوستی اور اسی کی توقع سے پیدا

ہو سکتا ہے۔

خطروں کی ایک اور تیسری قسم ہے جس سے الگ نہیں رہا جا سکتا بلکہ جو آدمی کے نقطہ نظر کے مطابق خوفناکی اختیار کر لیتے ہیں۔ مالی خسارہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکثر انسانوں کی زندگی کا بیشتر حصہ غربت کے ڈر سے ڈھکا رہتا ہے، سخت غربت اُسی مزدور کی سی جس کے پاس کام نہیں، ایک خوفناک برائی ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ غربت ہے جس کا کھاتے پیتے تاجروں کو خوف رہتا ہے۔ اغراض اور مزاجوں کے غلط راستہ پر لیجانے سے یہ ایک بڑی برائی بن سکتی ہے۔

میں یہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کہ صرف ڈر کی عدم موجودگی ہی سے اچھا انسان پیدا ہو سکتا ہے بلاشبہ دوسری باتیں بھی ضروری ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈر سے نجات حاصل کرنا اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔ عقلمندی سے تعلیم دینے سے، بمقابلہ اور دوسری اچھی خصائل کے، یہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ڈر سے نجات ملنے سے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مس مارگرٹ مک ملن اس بات کیطرف اشارہ کرتی ہیں کہ جن بچوں کو بار بار برا بھلا کہا جاتا ہے وہ ٹھیک طریقہ سے سانس نہیں لیتے۔ بمقابلہ دوسرے بچوں کے یہ بچے (adenoids) ناک کی بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اس امر کے ثبوت میں دیجا سکتی ہیں کہ کس طرح ڈر سے تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔ خصوصًا اسکا دخل ہاضمہ کے ساتھ مسلم ہے۔

ڈر سے جو اخلاقی نقصان پہونچتا ہے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ صحت کا نقص ہوتا ہے، جیسا کہ یہ اب مسلم ہے کہ اکثر خطرناک اخلاقی عیوب کا تعلق ہاضمہ کی حرکت سے ہے۔ مثال کے طور پر لالچ کو لیجئے۔ لیکن ڈر سے جو سب سے زیادہ اہم برائی پیدا ہوتی ہے وہ دنیا کے خلاف غصہ کا انداز ہے۔ جب آدمی اپنے ہم جنسوں سے ڈرتا ہے تو مدافعت کے لیے ردِّعمل اس طرح کرتا ہے جس طرح وہ اسوقت کریگا جبکہ کوئی اس کی آزادیٔ نقل و حرکت میں دخل انداز ہو۔ جہانتک کہ جذبات کا تعلق ہے اس کے ردِّعمل کی یہ حالت ہوتی ہے لیکن اس کے چھپے ہوئے غصہ کا اظہار، کچھ حد تک، اس کے ڈروں سے ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈھتا ہے۔ اسے یہ راستہ (ممکن ہے) مذہبی اور

اخلاقی سزا وسنجیدگی، جنگ وجدل کی محبت اپنے بچوں پر ظلم کرنے، یا ان تمام کے مجموعے میں ملجائے۔ یہ ساری خباثتیں، دس میں نو دفعہ، چھپے ہوئے ڈروں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ذہنی طور پر بھی ڈر کے بڑے نقصان دہ نتائج ہیں۔ کسی غیر معمولی رائے کے ڈر سے انسان اپنے پڑوسیوں کی احمقانہ رایوں کے برخلاف نہیں سوچتا۔ پھر موت کا ڈر ہے جس کے باعث لوگ مذہبی معاملات پر سیدھا نہیں سوچتے۔ اور پھر اپنی راہ آپ ڈھونڈنے کا ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے فیصلہ کی تائید کے لئے کسی اور کی مشل تلاش کرتے ہیں۔ ڈروں کی مختلف شکلیں دنیا کی آدھی حماقت کی ذمہ دار ہیں۔ ڈر کا بڑا حصہ، جس سے عورتوں اور مردوں کو عمر بھر سابقہ پڑتا ہے، انکے بچپن کے شروع کے چھ سالوں میں جاگزیں کیا جاتا ہے۔ یا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو نیک بنایا جائے یا وہ والدین کے ڈروں کا اثر ہوتا ہے۔ جہانتک میرا تعلق ہے میں اس نیکی کی مطلق پروا نہیں کرتا جو ڈر پر مبنی ہے۔ میں ہر جگہ یہ چاہتا ہوں اور خصوصًا بچپن کی تعلیم کے زمانہ میں، کہ ایسے انسان بنائے جائیں جو اجتماعی تعاون کی ضرورت کے مطابق اہل ہوں۔ ان اسباب کی بنا پر جنکا ڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں اخلاقی تعلیم کا اصل مسئلہ یہی ہے۔ یہ مسئلہ ناقابلِ حل نہیں۔ صرف تعصبوں کے بوجھ اور بے رحم روایت کیوجہ سے مشکل ضرور ہے۔

اشتراک؟

انسان کی جماعتی زندگی پر نظر ڈالیے۔ ہر طرف دو متضاد قوتیں کارفرما دکھائی دیں گی۔ ایک قوت جوڑتی ہے دوسری توڑتی ہے۔ ایک باندھتی ہے دوسری کاٹتی ہے۔ ایک ملاتی دوسری جدا کرتی ہے۔ ایک وحدت و نظم کی طرف لیجاتی ہے دوسری کثرت و انتشار کی طرف۔ ایک محبت کی قوت ہے دوسری نفرت کی۔ ایک مثبت ہے دوسری منفی، ایک الٰہی ہے دوسری ابلیسی۔

ایک وہ ہے جس نے معنی و مفہوم سے خالی فرد کو جماعت میں لاکر بامعنی بنایا، فرد کے سینہ میں جماعتی زندگی کی لگن لگائی، آدمی کے بچہ کو اور سب جانداروں سے زیادہ اپنے والدین کا دست نگر بناکر زبان، روایات، تمدن کا سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرایا اور ماضی کو مستقبل سے مربوط کیا۔ خاندانوں سے قبیلے اور قبیلوں سے قومیں بنوائیں۔ اور جب ملکوں کی حدود بھی تنگ معلوم ہوئیں تو مختلف ملکوں کے ہم نسل باشندوں کی وحدت پیدا کی، پھر اس تفریق کو بھی ہٹایا اور عقاید کے اشتراک سے ملک و نسل کے امتیازات کو مٹایا۔ اور عقاید کے اختلافات کے باوجود ایک خالق اور ایک رب کو سب سے سوا کر بندوں کے انتشار کو آقا کی وحدت میں گم کر دیا اور انسانی برادری کا تصور قائم کیا۔

دوسری وہ ہے جس نے ایک ہی آقا کے چاکروں سے باہم ایک دوسرے کی گردنیں کٹوائیں، جس نے قرونِ وسطیٰ کی ایک عیسائی دنیا کو درجنوں وطن پرست قوموں میں بانٹا، جو آج ایک عالمِ اسلامی کو ترک و عرب، افغان اور ایرانی میں تقسیم کر رہی ہے۔ جس نے خود ان قوموں سے ہر ایک میں دو دو قومیں بنا دیں، ایک امیر ایک غریب، ایک حاکم دوسری محکوم۔ ایک فاعل دوسری منفعل۔ جس نے خاندانی زندگی کے سکون اور وحدت کو عورت اور مرد کے 'حقوق' کے چکر میں ڈال کر فنا کیا، جس نے جماعت کو افراد میں تحلیل کر دیا، اور ایک قادر اور کافی بالذات فرد کا تصور پیدا کر کے جماعتی تعمیر کی تمام بنیادوں کو — ان کا نام مذہب ہو یا معیشت، فنونِ لطیفہ یا اخلاق — کھوکھلا کر دیا۔

سماجی زندگی کے مطالعہ کرنیوالے کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ صرف دوسری قوت ہی نہیں
بلکہ پہلی بھی اپنے کو اکثر چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ کل انسانیت بحیثیت ایک
جسم کے بہت کم عمل پیرا ہوسکتی ہے۔ البتہ پہلی قوت کی بنائی ہوئی اور دوسری قوت کی مظہر جماعتوں میں
روح و ذہنیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ پہلی اگر ٹولیاں بناتی ہے تو اس لئے
کہ اتحاد ہو سکے، دوسری اتحاد بھی کراتی ہے تو اس لئے کہ اختلاف شدید بنجائے۔ ایک کی ویرانیاں
آبادی کی خاطر اور دوسرے کی آبادیاں بھی ویرانی کے لئے ہوتی ہیں۔

ان قوتوں کے اثر سے جو جماعتیں بنتی ہیں وہ اپنے لئے یا اپنی قدر مشترک کے لئے کوئی نہ کوئی
نام تجویز کرتی ہیں۔ یہ نام رواج پکڑتے ہیں اور بہتیرے انھیں بے سمجھے استعمال کرتے اور انکو طلیقوں
پر لکھ لکھ کر اپنی پیشانیوں پر لگا لیتے ہیں۔ بہت کم ہوتے ہیں جو ان ناموں کی تہ میں جو قوت کارفرما ہے
اُسے تلاش کریں اور سمجھنے کی تکلیف اُٹھائیں۔ نادانی سے اچھے اور نادانی سے بُرے بنجانیوالوں کی
تعداد دنیا میں بہت ہے۔ بے سمجھی سے ان ناموں کو استعمال کرنیوالے، اُن کے لئے جینے اور اُن
کے لئے مرنیوالے، ان ناموں میں متضاد معانی کو اسطرح یکجا کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ان کے
مفہوم کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ انسانوں کے سینے خیر و شر دونوں
کے جولانگاہ ہیں۔ ان کے اعمال و افکار بُرے ناموں میں اچھے معانی اور اچھے ناموں میں بُرے
معانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اُسی نام کو اچھے بھی لیتے ہیں بُرے بھی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ابھی اس نام
کی چِٹھی اپنے ماتھے پر نہیں چپکائی ہے حیرت سے منہ تکتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟

"سوشلزم" اسی قسم کا ایک نام ہے۔

یہ نام یوں تو نیا ہے۔ شاید سب سے پہلے اٹلی کے ایک مصنف گیو لیانی نے اسے ۱۸۰۳ء
میں استعمال کیا تھا۔ لیکن اس سے مفہوم تھا پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلہ میں کیتھولک مذہب۔ پھر
شاید سین سیموں کے ایک مقلد ٹرانسیٹر نے ۱۸۳۲ء میں اسے استعمال کیا۔ لیکن نام نیا ہو اسکا اطلاق
تو پرانی چیزوں، پرانی شخصیتوں اور تحریکوں پر بھی ہوتا ہے۔ کوئی "سوشلزم" کی اس تیرہ کاری تاریخ

کو اٹھا کر دیکھیے جو کاؤٹسکی اور برن شٹائن نے شائع کی ہے تو حیرت میں رہ جائیے کہ آخر اس نام میں کیا کیا شامل ہے؟ اگر اس میں سماجی زندگی کے ابتدائی اشتراکِ املاک کا ذکر ہے تو فلاطون کی "ریاست" کا بھی۔ اسپارٹا کے دستورِ اساسی پر بھی نظر کی گئی ہے تو قدیم مسیحی جماعتوں کے "اشتراک" پر بھی۔ رہبانوں کے اشتراک کا بھی ذکر ہے اور پیراگوئے میں جیسوئٹوں کی ریاست کا بھی۔ پھر اُس سب کی داستان بھی ہے جو انیسویں صدی میں اس نام سے دنیا میں ہوا۔ ان مختلف النوع مظاہر کو اس نام میں کیسے جمع کر دیا گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت کا پیام لانے والا مسیح اور نفرت کا دین پھیلانے والا کارل مارکس دونوں "اشتراکی"، "سوشلسٹ" ہوں؟ فلاطون اور تجارین دونوں پر ایک ہی نام کا اطلاق کیسے ہو گیا؟

سوشلزم کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے یہی دشواری پیش آتی ہے۔ اس نام میں اسے خیر بھی ملتی ہے، شر بھی، نور بھی، تاریکی بھی، محبت بھی، نفرت بھی۔ اور متضاد طبائع کے انسان انہیں متضاد عناصر کی موجودگی کے دھوکہ میں اس نام کی چھپی اپنے ماتھے پر لگا لیتے ہیں۔ کوئی یہ چھپی لگا کر اپنے کو مسیح، اور فلاطون کے ساتھیوں میں سمجھتا ہے کوئی مارکس اور لینن کے ہم کابوں میں۔

اس دشواری کو سوشلزم کے مستند مورخوں نے محسوس کیا ہے اور بڑے بڑے علما نے اس کی ایک تعریف بتانے سے اپنے کو قاصر بتلایا ہے مثلاً مشہور جرمن مصنف اشٹاملر اس سے معذوری ظاہر کرتا ہے کہ ان متعدد اور مختلف مظاہرِ ذہنی و جماعتی کے لئے جنہوں نے اپنے لئے اس نام کا استعمال کیا ہے کسی ایک تصور کا تعین کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مختلف سوشلسٹ نظریوں اور نظاموں کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اشٹاملر کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم صرف اُن مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیشِ نظر رکھیں جو سوشلزم اور اسکی متعدد اقسام کی امتیازی خصوصیت ہیں تو شاید ہم کوئی تصور قائم کر سکیں۔

دنیا میں لوگوں نے جب سے سیاسیات پر لکھنا شروع کیا ہے اُسی وقت سے یہ مسئلہ پیشِ پیش

ہے کہ انسانوں کی سماجی زندگی کے لئے سب سے اچھی اور سب سے مفید تشکل کیا ہے۔ انہیں سے اکثر کا یہ خیال رہا ہے کہ ہر معقول سماجی نظام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی طاقت بالادست لازمی ہے۔ بلا کسی قسم کے آئینی جبر کے ان لوگوں کے نزدیک سماج کا منظم ہو سکنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک مذہب اور ہے جس کے نزدیک سماجی زندگی کی بہترین صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی قسم کا جبر آئینی نہ ہو نہ کوئی طاقت بالادست۔ آدمی بس اپنی مرضی سے باہم ملیں اور جب چاہیں سماج سے باہر ہو جائیں۔ اس مذہب کو نراج کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سماجی زندگی کی دو ممکن بنیادی شکلیں ہوئیں: ایک وہ جس میں جبر ہو، ایک وہ جس میں کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

سماج کے جن نظاموں میں جبر کی جگہ ہے اُن کی بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے چونکہ مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے ان قسموں پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ مادی اشیاء کی فراہمی اور تقسیم کے لحاظ سے یعنی معاشی زندگی کے اعتبار سے ان جبری نظامہائے جماعت میں تفریق و تقسیم کی سب سے اہم و جہ مسئلہ املاک ہے۔ مختلف نظاموں نے بھی مختلف حل پیش کئے ہیں لیکن اصولاً دو تقسیمیں ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ جبری نظام جنہیں املاک شخصی و انفرادی ہو، دوسرے وہ جنہیں املاک اجتماعی اور سماجی ہو۔

آج دنیا کے بڑے حصہ میں سماج کا جو نظام مقبول ہے وہ وہ ہے جس میں جبر آئینی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شخصی و انفرادی املاک کو سماج کی معاشی زندگی کی بہترین اساس مانا جاتا ہے۔ جبری نظام کی دوسری قسم یعنی وہ جہاں ملکیت شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہو یا تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں پائی جاتی ہے یا اب روسی انقلاب کے بعد سے بڑے پیمانہ پر روس میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ لیکن روس کے تجربہ ہی کو اجتماعی نظام کی ایک ممکن شکل سمجھنا غلطی ہوگی۔ اصولاً و تاریخاً ایسے نظاموں کی جنہیں معاشی زندگی کی بنیاد مشترک جماعتی ملکیت ہے تین قسمیں کیجا سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے وقتاً فوقتاً رائج الوقت انفرادی و شخصی ملکیت کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے انہوں نے مندرجہ ذیل تین شکلوں میں سے ہی ایک شکل کو اسکی قائم مقامی کے لئے پیش کیا ہے۔ وہ

تین قسمیں ان ناموں سے معروف ہیں : (۱) سوشلزم (۲) کمیونزم (۳) زرعی سوشلزم ۔ ذیل کی سطور میں ہم انکی مختصر سی تعریف کریں گے۔[1]

(۱) سوشلزم تو وہ مذہب ہے جس کے نزدیک پیدائش دولت وثروت کے ذرائع و وسائل پر کسی شخص کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ ایک تو یہ پسندیدہ نہیں اور دوسرے سماجی زندگی جس طرز اور رفتار سے ارتقار کے منازل طے کر رہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہے کہ ان وسائل دولت آفرینی پر سے شخصی املاک کا حق مٹ جائے۔ ہرشخص جانتا ہوگا کہ وسائل و ذرائع دولت آفرینی سے مراد وہ مادی چیزیں ہیں جنسے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی دوسری مادی چیزیں تیار کرنےمیں مدد ملے ۔ اسمیں تمام زمین آجاتی ہے، تمام صنعتی اوزار۔ اور کلیں آجاتی ہیں، کارخانے، مشینیں، اجناس خام، اجناس نیم خام سب اس کے تحت میں آتے ہیں ۔ ہمارے رائج الوقت نظام معاشی میں ان چیزوں پر افراد کا تصرف ہے ۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ یہ تصرف افراد سے لیکر جماعت کے سپرد کر دیا جائے۔ جماعت میں کوئی فرد ایسا نہ ہونا چاہیئے جو کہہ سکے کہ یہ کھیت میرا، وہ کارخانہ میرا ۔ ان تمام وسائل دولت آفرینی پر ملکیت کا حق ہیئت اجتماعی کو منتقل ہوجانا چاہیئے اس کا نام ریاست ہو یا اور کچھ۔ لیکن سوشلزم انفرادی و شخصی ملکیت کو صرف وسائل دولت آفرینی پر سے ہٹانا چاہتا ہے۔ شخصی صرف کی چیزوں پر سے نہیں ۔ سوشلزم کے متعلق یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس میں کسی قسم کی شخصی آمدنی کو روا نہ رکھا جائےگا ۔ ہاں سوشلزم یہ نہیں گوارا کرتا کہ صرف بعض مادی اشیار پر حق ملکیت رکھنے کی وجہ سے کسی فرد کو کوئی آمدنی حاصل ہو ۔ لیکن وہ کام کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے صرف کرنے کا مخالف نہیں ۔

(۲) کیمونزم سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے ۔ اس کی خواہش ہے کہ شخصی ملکیت

---

[1] ان تصورات کو جدا جدا پیش کرنے اور واضح کرنے کی خدمت علم المعیشت کے لئے جرمنی کے مشہور استاد کارل ڈیل نے انجام دی ہے ۔

صرف وسائل دولت آفرینی ہی پر سے نہ ہٹ جائے بلکہ اشیاء استعمال وصرف پر بھی کسی کو شخصی و انفرادی ملک حاصل نہ ہو۔ سوشلزم کی رو سے تو ایک فرد اپنے کام کے معاوضہ میں جو آمدنی حاصل کرے اس پر خود تصرف رکھتا ہے اور اُسے اپنی حاجتیں رفع کرنے میں جسطرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے معاوضہ میں اُسے جو مزدوری ملی ہے اُس سے وہ چاہے تو معمولی کھانا کھا کر اچھے اچھے کپڑے پہن سکتا ہے، یا زردہ پلاؤ کھا کر پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کر سکتا ہے۔ جو کچھ بچے اُس سے چاہے تو کتابیں خریدے، چاہے سگریٹ؛ اُس کا جی چاہے تو ٹکٹ خرید کر کسی بڑے عالم کا لیکچر سنے چاہے ٹکٹ خرید کر بڑے سے بڑے سینما اور تھیٹر میں جا بیٹھے۔ غرض اپنی محنت کے معاوضہ کو جن چیزوں سے چاہے بدل لے۔ لیکن کمیونزم اس کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں صرف کارخانے، زمین، مشینیں اور اوزار ہی شخصی تصرف سے نکال کر جماعت کے سپرد نہیں کئے جاتے بلکہ جماعت ہی کو یہ طے کرنے کا حق بھی ہے کہ افراد کو کھانے کے لئے کیا اور کتنا، پہننے کو کیا ملے، تفریح کے کیا سامان ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی سوشلزم اگر ذرائع کار پر سے شخصی ملکیت کو ہٹاتا ہے تو کمیونزم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ "نتائج کار" پر سے بھی اسکو مٹانا چاہتا ہے۔

(۳) زرعی اشتراک۔ جہاں کمیونزم شخصی ملکیت کو مٹانے کے بارے میں سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے وہاں زرعی اشتراک سوشلزم سے ایک قدم پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ سوشلزم اگر تمام ذرائع دولت آفرینی کو جماعت کے ہاتھ میں دینا اور افراد سے چھین لینے کا طالب ہے تو زرعی اشتراک تمام ذرائع دولت آفرینی میں سے صرف ایک کو یعنی زمین کو اس غرض کے لئے علیحدہ کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمین پر کسی فرد کو شخصی ملکیت کا حق تسلیم نہ کیا جائے۔ باقی دوسرے ذرائع دولت آفرینی خوشی سے شخصی ملکیت میں آ سکتے ہیں۔

خارجی نتائج اور مادی مقاصد کے اعتبار سے تو ہم نے ہیئت اجتماعی تعمیر نو کے متذکرہ بالا تین نظریوں کو پیش کر دیا لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں انہیں سے ہر ایک کے عالم وجود میں آنے اور فروغ پانے کے وجود ایک سے نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ہم نے سوشلزم کی ایک تعریف کر دی

تو ہر اشتراکی نظام کی تہ میں ایک ہی سے فلسفیانہ تخیلات، ایک ہی سی روح کارفرما ہے۔ نتیجہ ایک سی لیکن نیت ایک نہیں۔ مختلف الخیال، مختلف المزاج لوگ اگر اس مقصد کے لئے ساعی نظر آتے ہیں تو مختلف محرکات ہیں جو انہیں اسپر آمادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان نظریوں کے فہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان مختلف خیالات اور محرکات میں بھی اپنے لئے کوئی ترتیب پیدا کرلیں جنسے اشتراک، کمیونزم، یا نراج وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم سوشلزم کی بابتہ یہ کوشش کریں گے۔

اپنے بنیادی محرکات اور فلسفیانہ اساس کے اعتبار سے ہم تمام اشتراکی نظاموں کو دو انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) تصوری اشتراک (۲) ارتقائی اشتراک۔

'تصوری' اشتراک والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی 'تصور' کسی مطمح نظر' کی خاطر مشترک ملکیت کے خواہاں ہیں۔ اس خیال سے کہ اس 'تصور' اس 'عین' کی تکمیل ان کے نزدیک، اشتراکی جماعت ہی میں ممکن ہے۔ یہ اشتراک کے طالب مثلاً اس لئے ہیں کہ عدل کا تصور دنیا میں مکمل طور پر پورا ہو، یا مساوات عین کی فرمانروائی ہوجائے، یا 'اخوت' کا دور دورہ ہو۔ یا اسی قسم کے کسی اور تصور کی تکمیل ممکن بنائی جاسکے۔ چنانچہ یہ اشتراکی اپنے مخصوص مطمح نظر کو سامنے رکھکر ایک نظام بناتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جماعت سے اس نظام کو منوائیں۔

ارتقائی اشتراک والے کسی تصور کے قائل نہیں، کسی عین کے دلدادہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے کچھ نہیں، ہمارا مطالبہ کچھ نہیں، ہم تو جو جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ہم یہ کچھ نہیں کہتے کہ کیا کرو، ہم یہ سناتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خواہش اور رائے کا معاملہ نہیں۔ تم چاہو نہ چاہو اشتراکی نظام جماعت آکر رہے گا۔ جسطرح ہمارے گردوپیش کی مادی اشیاء پر قدرت کے قوانین عمل پیرا ہیں اسی طرح جماعتی زندگی بھی قوانینِ نشو و ارتقا کی پابند ہے اور ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو۔

تصوری اشتراک کی اگر دو بڑی بڑی تقسیمیں کریں تو ایک مذہبی کہلائیگی دوسری اخلاقی۔ اول الذکر اپنے تصورات مذہبی دنیا سے لیتا ہے اور ایک اشتراکی نظام کا مطالبہ اس لئے کرتا ہے کہ

بلااس کے خاص قسم کی مذہبی زندگی ناممکن ہے۔اسکے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہبی زندگی کے کامل نشوو نما کے لئے ایسا نظام جماعتی ہی کام دے سکتا ہے جسمیں شخصی املاک نہ ہو۔خصوصاً عیسائی مذہب میں اس قسم کے بہت سے عناصر ہیں جو اشتراکی زندگی کی طرف لیجاتے ہیں۔تاریخ میں متعدد مثالیں ایسے عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہوں نے چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اشتراکی زندگی کا نظام قائم کیا۔آج بھی امریکہ میں متعدد نوآبادیاں بعض عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہیں اشتراک املاک پر عمل ہوتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اشتراکی تجربوں میں اگر کامیابی ہوئی ہے تو انہیں مذہبی جماعتوں کو۔

اخلاقی اشتراک وہ ہے جو کسی نہ کسی اخلاقی قدر کو دنیا میں مکمل اور رائج کرنے کے لئے اشتراک املاک کا نظام پیش کرے۔ یہ اخلاقی قدریں بہت مختلف ہو سکتی ہیں اور اس اعتبار سے اخلاقی اشتراک کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اصولاً یہ انہیں دو قسموں میں رکھہ سکتے ہیں۔ ایک وہ جسمیں جماعتی اصول پیش نظر ہو ایک وہ جسمیں انفرادی اصول کو سامنے رکھا جائے۔

جماعتی اصول سے مراد یہ ہے کہ نظام جماعت کی ترتیب میں فرد کو کل میں جزو کی، جسم میں عضو کی حیثیت دیجائے۔مقصود کل کی فلاح ہو اور جسم کی صحت نہ کہ کسی فرد کی بہبودی یا کسی عضو کی ترقی۔ یہاں افراد کو بہت سے 'حقوق' دیکر خوش کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ افراد سے بالاتر 'جماعت' یا 'ریاست' کے نشوونما اور ارتقا کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔اسی اصول کے ماتحت فلاطون نے اپنی مشہور کتاب 'ریاست' لکھی ہے۔یہی اصول اسکی دوسری تصنیف 'قوانین' میں اسکے سامنے ہے۔ ان تصانیف نیز دیگر یونانی فلسفہ کی تعلیمات کے اثر سے 'ریاست' یا 'جماعت' کو کائنات مفصل اور اور افراد کو کائنات مجمل سمجھا جانے لگا۔افراد کی طرح 'ریاست' کی بھی ایک 'شخصیت' تسلیم کیگئی اور افراد کو اس شخصیت کا خادم مانا گیا۔اس نظریہ میں انسان کے حقوق کی جگہ اس کے فرائض سے پُر ہوتی ہے اور یہ فرائض تمامتر جماعت کی خدمت گزاری سے عبارت ہوتے ہیں۔ہر وہ چیز جو فرد کو اس خدمتگزاری سے روکے اس نظریہ کی رو سے عیب ہے اس لئے یہ ایسی چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے۔شخصی ملکیت چونکہ اس خدمت گزاری کی راہ میں سب سے بڑا پتھر ہے اس لئے اسکا مٹانا بھی ضروری ہے۔

اسی نظریہ کے ماتحت لوگوں نے اشتراک ازدواج وغیرہ کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ متاخرین میں اس مذہب کا مشہور پیامبر جرمن اشتراکی راڈبرٹس ہے۔

اس کے بالکل مخالف انفرادی اصول ہے۔ اسکی بنیاد افراد کے حقوق پر ہے۔ جماعت یہاں افراد کی بنائی ہوئی اور ان کے فائدہ کے لئے ہے۔ ان سے افضل اور اعلیٰ نہیں۔ یوں تو یہ اصول بھی شاید اتنا ہی پرانا ہو جتنا خود انسان لیکن اسکو ترقی ہوئی۔ جدید آئین فطری کے نظریہ سے جسکی بنیادیں سب سے پہلے گروٹیس نے ۱۶۲۵ء میں استوار کیں۔ اسی نے انسان کے ازلی اور فطری حقوق کی صدا اُٹھائی۔ روسو نے اس آئین فطری اور حقوق ازلی کے نظریہ کو اور آگے بڑھایا۔ اور جماعت کو افراد کے معاہدہ پر مبنی بتلایا۔ روسو نے انسانی حریت اور مساوات کے اس نظریہ سے مساوات سیاسی کے مطالبہ کو تقویت دی۔ اور بعد کو انفرادی اصول والے اشتراکیوں نے اسی کی بنا پر مساوات املاک کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مذہب کے اشتراکی شخصی املاک کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ ہر فرد کو املاک پر اپنا اپنا مساوی حق حاصل ہو جائے۔ اور تقسیم دولت کی موجودہ عدم مساوات مٹ جائے۔

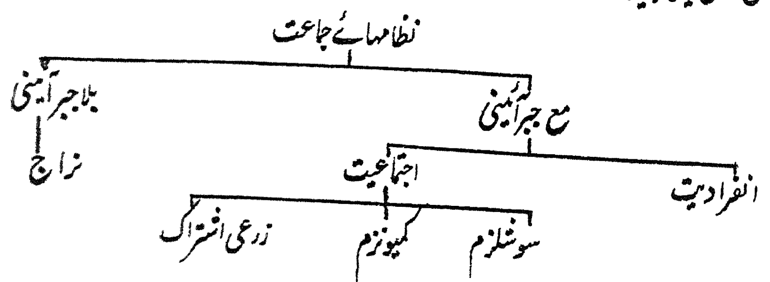
اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر اشتراکی نظام کے مؤیدین کے مقابلہ میں ایک ارتقائی مذہب ہے۔ جو کسی قدر جماعتی کا دلدادہ نہیں۔ کسی اصول کا شیدائی نہیں۔ یہ "حکما" کا گروہ ہے جو دنیا کی رفتار اور جماعت کے ارتقاء کو سمجھنے کا مدعی ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ "آرزوؤں" کے سراب سے نکلکر "حکمت اور علم" کی محکم چٹان پر پہونچ گیا ہے۔ یہ صرف یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ جماعتی نشو و ارتقا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نظام اشتراکی قائم ہو جائے۔

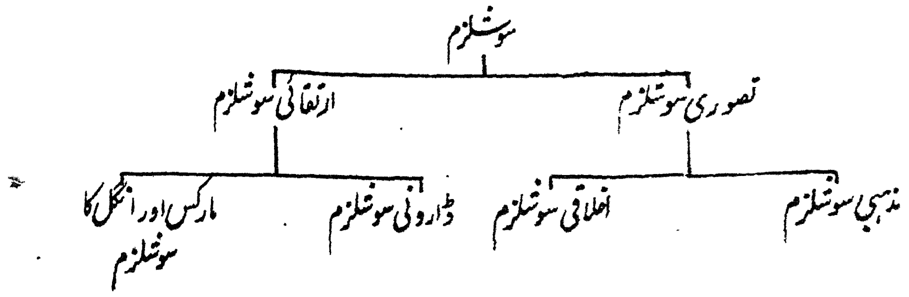
اس مذہب میں بھی دو فرقے ہیں ایک ڈارونی فرقہ اور دوسرا مارکس اور انگلس کا۔ ڈارونی فرقہ تو جماعت انسانی پر ماحول فطری کے تمام قوانین کو عاید کر دیتا ہے۔ اور مدعی ہے کہ تمدن انسانی بھی اپنے ارتقا میں تطبیق، توارث، اور تنازع للبقا کے حیاتیاتی قوانین کا اتنا ہی پابند ہے جتنی کہ غیر انسانی دنیا۔ سرمایہ داری کا نظام دراصل اس کشمکش حیات میں رکاوٹ ڈالتا ہے جو

ترقی انسانی کے لئے ضروری ہے - یہ صرف تجارتی مقابلہ کا موقع دیکر بجائے ترقی کے جماعتی تنزل پیدا کر رہا ہے - اس لئے ضرورت ہے کہ پیدائش دولت میں مقابلہ کے مواقع پیدا کئے جائیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر کام کرنیوالے کے پاس پیدائش دولت کے ذرائع بھی موجود ہوں - اس کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع دولت آفرینی چند اشخاص کی ملک نہ ہوں بلکہ جماعت کے تصرف میں ہوں جو سب افراد کو ان کے استعمال کا موقع دیسکے - اس مذہب کا ممتاز معلّم وولٹمان ہے -

دوسرا ارتقائی فرقہ مارکس اور انگلس کا ہے - یہ لوگ ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ ارتقا کو تو جماعتی زندگی پر نہیں لگاتے، لیکن انہوں نے تمدن انسانی کے نشو و ارتقا کے بعض قوانین خود بنائے ہیں - جو ان کے مادیاتی نظریہ تاریخ کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے ہیں - عملی دنیا میں سب سے زیادہ فروغ اسی آخری فرقہ کو ہوا ہے - اُس کے اشتراکی اسی فرقہ کے لوگ ہیں - یورپ کے ہر ملک میں مارکس کی ملت موجود ہے اور بڑھ رہی ہے - خود ہندوستان میں مارکس 'رشی' کے نام لیوا پیدا ہونے لگے ہیں - اس مذہب کے پیدا ہونے کے اسباب' اس کی نشو و نما' اس کے فلسفہ کے پیچ، اس کی حکمت کے فریب' انکی تاثیر کا راز یہ سب ایسے مباحث ہیں جنپر اسوقت بحث و نظر ہمارے ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن یہ تفصیل کے طالب ہیں اسلئے ہم اس مضمون میں اس فرقہ پر زیادہ نہیں لکھتے - انشاءاللہ آئندہ مفصل بحث کرینگے -

ذیل میں قارئین کرام کی سہولت کے لئے اس مضمون کے مطالب کا خلاصہ ایک نقشہ کی شکل میں پیش کر دینا غالباً مفید ہوگا :-




سوشلزم
تصوری سوشلزم
ارتقائی سوشلزم
مذہبی سوشلزم
اخلاقی سوشلزم
ڈارونی سوشلزم
مارکس اور انگل کا سوشلزم



عراق عرب

مسٹر جے، ایم، بالفور نے جو دولت ایران کے نائب مشیر مالیات رہ چکے ہیں اپنے قیام ایران کے زمانے کے مشاہدات تجربات اور دیگر معلومات پر ایک کتاب ("تازہ شیون ایران") لکھی ہے۔ مسٹر موصوف کا زمانہ ملازمت جنگ عظیم کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب ۱۹۲۱ء کے اختتام کے ساتھ ختم ہوتی ہے اسلئے کہ اُس کا دیباچہ مسٹر بالفور کے قلم سے فروری ۱۹۲۲ء میں نکلا ہے۔ مسٹر بالفور لارڈ بالفور کا ہمقوم ہے لیکن غالباً آخر الذکر بالفور کے نقطۂ نظر سے اول الذکر بالفور اپنے ملک و ملت کا ایک ناخلف فرزند ہوگا جسکی "اولین جنبش قلم" سے ایسی کتاب نکلی۔ بیچارے مسٹر بالفور کو خود بھی اپنے اس "ننگ قومی" کا احساس و اعتراف ہے، چنانچہ دیباچہ کے صفحات میں اس کا علانیہ اظہار ہے۔ لکھتا ہے:

ملک کے اندر اس عقیدۂ سیاسی کا ایک "مکتب" موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ ارکان حکومت و اکابر سیاست کی غلطیوں کا اعلان کرنا [illegible] ہے۔ بڑے لوگوں کی غلطیاں اگرچہ "محفل خاص" کے اندر [illegible] کرتی ہیں لیکن عوام الناس کے سامنے ان کو بے نقاب کرنا سخت مخدوش بات ہے؛ وہ واقفکار لوگوں کے درمیان ایک راز سربستہ کا احترام رکھتی ہیں اور ان پر [illegible] تنقید مفاد عامہ کے خلاف ہے اور مصالح سلطنت کے منافی۔ لیکن میں اس "دستور زبان بندی" کا قائل نہیں ہوں [illegible] میرا خیال یہ ہے کہ غلط کار لوگوں سے تعرض نہ کرنا ان کی ہمت افزائی کرتا ہے اور مزید مفاسد کی دعوت دیتا ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ کلمۂ حق بلند کیا جائے [illegible] حکومت کی مسندوں پر قابض ہیں وہ ایک فریب خوردہ پبلک کی غلط پشت پناہی سے محروم ہو جائیں [illegible]

خطرناک اربابِ حل و عقد سے نجات ملے۔ سیاستِ خارجہ کے بہت سے میدانوں میں اس تلافی مافات سے آخری و انقطاعی حوادث کا سد باب ہوجائیگا۔ محاربہ عظیم نے اس احتساب جمہور کو فرائض مؤکدہ بنادیا ہے۔ ان ایام میں بڑے بڑے ناخدایانِ کشتی سلطنت نے خطرناک چٹانوں سے تصادم کرائے ہیں اور مشکل سے اُن کے ہاتھ اب اس قابل رہے ہیں کہ زمام حکومت ہنوز ان کی انگلیوں میں رکھی جائے۔ ایران کے اندر اس بے راہ روی سے جو نقصان پہونچا ہے اس کا کوئی نعم البدل اور علاج اب ممکن نہیں۔ ہندوستان، مصر، عراق عرب اور فلسطین اسی تیز خرامی سے پامال ہورہے ہیں اور جلد یا بدیر یہاں بھی کم و بیش ایسا ہی حشر ہونیوالا ہے۔ پس ان حالات نے مجھکو لب کشائی پر مجبور کیا اور میرا یہ مضبوط اعتقاد ہے کہ ان معاملات میں خاموش رہنا ایک مجرمانہ سکوت ہوگا اور ملت و سلطنت کی خیانت!"

اس احساس ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ مسٹر بالفور نے یہ کتاب لکھی ہے۔ قارئین کرام کے لیئے یہ توقع کرنا بالکل قدرتی ہوگا کہ مصنف موصوف نے برطانوی و دیگر دول متعلقہ کے خداوندانِ سیاست کی بڑی بڑی دسیسہ کاریوں کے ورق کھولے ہونگے اور نیز ایران کے متعلق ایک عینی شاہد اور بالغ نظر ناظر کی حیثیت سے جو حالات سپرد قلم کئے ہوں گے وہ اس قریباً مجہول الحال ملک پر درجہ اول کی روشنی ڈالتے ہوں گے۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے اور بدرجۂ نہایت ایسا۔ چنانچہ اپنی صاف گوئی اور حق بیانی کے اقتضا سے اُن کو خود اہل ایران کے متعلق بعض تلخ حقائق کا اظہار کرنا پڑا ہے جس کے لیئے وہ بجا طور سے اُس درگذر کے مستحق ہیں جس کی التماس انہوں نے اپنے ان ایشیائی میزبانوں سے کی ہے۔

مسٹر بالفور کی کتاب جو بقول اُن کے "اُنکی پہلی اور شاید آخری تصنیف" ہے اور جو انہوں نے محض مصنفانہ شوق رقمطرازی کے داعیات کے ماتحت نہیں لکھی ہے بلکہ صرف عرض حقیقت کی خاطر (بلاتشابہ عرض ہنر)، تین سو صفحے کی کافی ضخیم کتاب ہے جس میں انہوں نے ملکِ ایران

کی تاریخ سیاسیات اور بالخصوص مسائل مالیات کے تمام ضروری عنوانات سے بحث کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس صحبت میں اُس کے آخری باب کے مطالب کا ایک حصہ ناظرین کے سامنے پیش کریں جسمیں مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک خصوصاً عراق عرب کے مطلع سیاسی کا "نظارۂ طائرہ" آگیا ہے۔

ہم نے بجائے لفظی "ترجمہ" کے مصنف کے مفہوم کی "ترجمانی" کا اُصول پیش نظر رکھا ہے۔

عراق میں قدم رکھتے ہی میرا پہلا احساس یہ تحیر تھا! اور جیسا کہ واقعہ ہے کہ یہ احساس ہر ناظر کے ساتھ مشترک رہا ہے، کہ کسی سلطنت کو عراق جیسے ملک میں قدم رنجہ فرمانیکی روئے زمین پر کونسی چیز دعوت دے سکتی ہے! دوسری بات جس نے میرے تخیل کو مس کیا اُس نظر باز سپاہی کا قول تھا جس نے عراق کے منظر وحشت وہلاکت کا مشاہدہ کرکے کہدیا تھا کہ "انگریزوں کو اُن کے اس مقبوضہ سے نکال باہر کرنیکے لئے کسی جدا لی حملہ آور کی شمشیر آتشیں کی ضرورت نہ ہوگی!" عجیب تر یہ ہے کہ برطانیہ اس فضولکاری اور تباہ کاری پر بُری طرح مُصر ہے اور اس حماقت آمیز اور ناعاقبت اندیشانہ فعل کو شرف مداومت عطا کرنے پر تُلی ہوئی ہے!

اوائل جنگ عظیم میں جن مقاصد نے عراق عرب کی پہلی فوجی مہم کو ضروری بنایا تھا اُن کی معقولیت کو بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایرانی چشمہائے روغن گل کی حفاظت اشد ضروری تھی، نیز خلیج فارس کی بحری کمینگاہ سے جرمنوں اور ترکوں کو محروم کر دینا بھی ایک اہم جنگی پیش بینی پر مبنی تھا۔ مگر بصرہ اور اُس کے حوالی کے قبضہ نے ان ہر دو معلوم ومشہور مصالح کی کافی ضمانت کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعد "بڑھاؤ تام جہام" کے اصول پر بغداد کی تسخیر اور سارے ملک کی فتح اور تصرف کی جو غایت اور مصلحت تھی وہ ایک راز سربستہ ہے! کہا گیا تھا کہ بصرہ کے قبضہ نے دشمن کو چھیڑ دیا تھا اور اُسکی جوابی یورشوں کے سد باب کے لئے ضروری تھا کہ ہم ساحل سے ذرا آگے بڑھکر کسی ایسے عسکری مرکز پر گرفت حاصل کریں جہاں سے غنیم کے خطرات سے مامون ہوجائیں، لیکن دنیا جانتی ہے اور برطانوی افواج کے ذاتی تلخ تجارب ہیں کہ ہم نے اس "علاج بالمثل" سے اپنے مصائب وافکار کو المضاعف کر لیا! اس راز کا اصلی حل میری تشخیص میں یہ ہے کہ ہمارے بعض نو آمیز اور شوقین اہل حرب اس بات کے بہت مشتاق تھے کہ اصل مرکز جنگ سے ہٹکر غیر اہم اطراف میں، اپنے ہتھیاروں کی کچھ نظر فریب نمائش کر دیں تاکہ قلب رزمگاہ میں ہاتے

سینہ پر جو ضربیں پڑی ہیں اُن کی قدرے اشک شوئی ہو جائے! پس بغداد کی فتح محض ایک "انعطاف توجہ" والی حرکت سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے دفتر جنگ کے ناآشنائے جغرافیہ و تاریخ ارکان کی اُن حسین خوابوں کے اندر عراقی مہم کا خاکہ کھینچا گیا ہو جنہیں بغداد کا مرقع الف لیلہ کے افسانوں کو سنکر چشم تصور کے سامنے آیا ہو، اور لندن کے رہنے والے، ہارون الرشید اعظم کی عروس البلاد (بغداد) کا فاتحانہ نظارہ کرنا چاہتے ہوں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر گئے ہوں کہ بغداد اور "بہشت شداد" کی بہاروں کو دست برد زمانہ کی خزانی ہواؤں نے ایک "عالم ہو" میں تبدیل کر دیا ہے!

سامراجی مقاصد کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تحفظات تھے وہ بصرہ کے قبضے سے حاصل ہو گئے تھے۔ اس نواح میں زیادہ پاؤں پھیلانے کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ اس سے ہمارے لئے ایک آئندہ "فصل مشکلات" کی تخم ریزی ہو جائے۔ عراق عرب پر ہمارا دخل ترکی اور عرب باشندوں دونوں کے لئے ایک وجہ اشتعال تھا۔ اسمیں ایک مذہبی اہانت کا پہلو نکلتا تھا اور یہ چیز وسطی اور مغربی ایشیا کے ممالک میں جہاں مذہبی حسیات و جذبات بہت اہم عنصر ہیں ایک مخدوش مادہ آتشگیر ہو سکتی تھی۔

اس سمت میں برطانوی مصالح کبھی رونما نہیں ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق مسٹر ونسٹن چرچل کی سیاسی تفریح بازیوں کے لئے ایک دلچسپ بساط ہے اگر از کم وزیر ممدوح کی جدت طبع اور ندرت تخیل کا ثبوت یہ اسکیم ضرور ہے، لیکن جہاں اُس کی اس قابل داد خوبی سے انکار نہیں وہیں کچھ غیر مشتبہ علامات اس حقیقت مخفی کے بھی پائی جاتی ہیں کہ ان خوابوں کی "نقشہ بندی" میں مسٹر ہیتھ رابنسن کے دل و دماغ کو بھی کافی دخل رہا ہے!

ہم کو یہ تاریخی حقیقت بتائی گئی ہے کہ دجلہ و فرات کا دوآبہ ایکوقت میں دنیا کا غلہ کا گودام تھا اور یہ کہ وہ بہت آسانی سے اپنی یہی عالمگیر اقتصادی حیثیت دوبارہ اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی بات کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں لیکن دوسرے جملے میں جو بیباکانہ اعلان کر دیا گیا ہے وہ ہمارے ارباب حل و عقد کی طفلانہ آسان پسندی کا ایک دلچسپ مظہر ہے۔ بیشک عراق دنیا کے رزق کا مخزن پھر بن

سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ ساتھ ہی وہ ایک "کانِ زر" کا مطالبہ بھی کریگا! معلوم ہونا چاہئے کہ اقوامِ عالم میں برطانیہ ہی تنہا وہ ملک نہیں ہے جو عراق عرب کے زرعی امکانات کا "عرفان" رکھنے کا مدعی ہو۔ شاید لوگوں کو یہ سنکر کسی قدر غیر مطبوع قسم کا استعجاب لاحق ہو کہ ترک بھی اس مسئلہ میں پوری بیداری کا ثبوت دے چکے ہیں! چنانچہ قبل ازیں ترکی حکومت نے ایک ممتاز ماہر و انجینیر کا تقرر اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ عراق کے "احیاء ثانیہ" کے بارے میں اپنی آراء و سفارشات پیش کرے۔ چنانچہ جو رپورٹ گذری وہ یہی تھی کہ یہ مہم بالکل معقول اور ممکن العمل ہے، بشرطیکہ اس کام کے لئے وہ ذخیرہ پہلے سے فراہم کر لیا جائے جو ناگزیر ہو گا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو جو تخمینہ تیار کیا گیا تھا وہ قریب قریب چالیس ملین تھا اور اگر ان غیر متوقع ضروریات و اخراجات کو بھی محسوب کر لیا جائے جو ایسی عظیم الشان عزائم میں ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں تو اصلی مصارف کی میزان کل پچاس ملین سے کم نہ ہو گی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کیا ضرور ہے کہ کل کام کو بدفعۃ واحدہ ہاتھ میں لے لیا جائے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ بالاقساط اسی خاکہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کام کی عملی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس تقسیم کے اصول کو قبول نہیں کریگا۔ ملک کے طول و عرض میں ریگستان اور دلدلیں پائی جاتی ہیں اس لئے آبپاشی اور اخراجِ آب کے مسائل کی بناء پر کام کا جزوِ اعظم بیک گردش عمل ہی انجام دینا پڑے گا۔ پھر آج جو تخمینہ اخراجات بنیگا اس کے اعداد و شمار دیکھنے چاہئے کہ کیا ہونگے۔ کم از کم ترکوں کے تخمینہ کو دو چند تو کر دینا چاہئے اور اس انداز میں قطعاً کسی مبالغہ کا شائبہ نہ سمجھنا چاہئے۔ تو اب سو ملین کی رقم وہ رقم ہے جسکی اس جیسے یکسوئی طبع اور فراغتِ معاش والے کام کیلئے بہم رسانی حکومتِ عراق اور انگلستان ہر دو کیلئے کارے دارد کا مضمون ہے۔

بظاہر حالات اس مجموعی تعداد کی ایک کسر کی دستیابی کی بھی مستقبل قریب میں دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی۔

بفرضِ محال اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ مالی مسئلہ حل ہو جائیگا تو آگے بڑھکر پھر یہ دوسری مشکلات کی بہت سی لاعلاج منزلیں رکھتا ہے مثلاً مصارف کے بعد مزدوری کا مرحلہ آتا ہے۔ عراق کے اندر وہ آدمی کہاں مل سکینگے جو نئی برآوردہ شدہ آراضیات کا تردد کریں گے؟ ملک کی کل مردم شماری تین ملین نفوس پر مشتمل ہے اور اس آبادی کا وہ حصہ جو زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے پورا کا پورا اسی پیشہ میں مشغول ہے۔ میرے کان اس تجویز سے بھی آشنا ہوئے ہیں کہ مذکورہ بالا مشکل کا یہ علاج کیا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے مختلف اقطاع کے خانہ بدوش اور بادیہ نشین قبائل کو

عراقِ جدید میں اقامت گزیں ہونے اور آیندہ فلاحین کی سی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیجائے جسکو ممکن ہے کہ وہ لبیک کہیں۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ علی مہمات شیخ جِلّی کی ان خوابوں پر مبنی نہیں کیجاسکتیں! قرینہ غالب ہے کہ آخری جواب میں ہندوستان کے فراہم شدہ قُلیوں کی طرف دعوت نظر دیجائے لیکن اوّل تو عراق کے اندر ہندوستانی عنصر روز بروز تقلیل کی طرف مائل ہے جس کے اسباب کا آئندہ بھی سدِ باب نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک بڑے پیمانہ پر ہندی مزدوروں کی درآمد کی کوشش کی بھی گئی تو اوّل تو خود عراق کی عرب آبادی اُن کو خوش آمدید کہنے میں سخت متأمل ہوگی اور اس اقدام کو "بین النہرین" کے اندر گنگا اور جمنا کے دوآبہ والے ایک نئے "وطن الھنود" کی بنیاد ڈالنے سے تعبیر کریگی اور ان قومی خدشات کے ماتحت ہندوستانی تارکانِ وطن کیلئے اپنے ملک کی زمین حتیٰ المقدور گرم کردیگی۔ دوسری طرف خود ہندوستان میں اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائیگا اور یقیناً ایک شدید احتجاج کی لہر اُٹھیگی۔ اس نکتہ کو محسوس کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے اربابِ سیاست اور اصحابِ حرفت جو بیرونِ ہند میں اقامت رکھنے والے ہندی مزدوروں کی مظلومانہ حالت پر اس قدر شور و غوغا مچاتے ہیں اسمیں حبِّ وطن اور ہمدردیِ نوعِ بشری کی گلبانگوں کے ساتھ غرض پرستی کے جذبات کی بھی کچھ صداہائے بازگشت ہوتی ہیں! ہندوستانی کارخانہ داروں کے لئے یہ سوچنا بالکل قدرتی ہے کہ اس طرح ملکی بازارِ مزدوری کو روز بروز خشک کرتے رہنے کا ان پر براہ راست یہ اثر پڑیگا کہ یہ جنس پھر خود ہندوستان کے اندر نسبتہً کم رہجائیگی اور مزدوروں کا یہ قحط خواہ مخواہ اُن کو گراں نرخ بنادیگا! ان گوناگوں مشکلات و معاملات کی بنا پر عراق کے اندر کوئی ایسی مہم سر نہیں کیجاسکتی جسکی امید پر برطانیہ اپنے دخل عراقِ عرب کو جاری رکھے ہوئے ہے، نیز جسکو وہ اپنی اس پُرخار اور گرانبار مصارف پالیسی کی تائید اور نعم البدل کے طور پر پیش کیا کرتی ہے۔

عراق عرب کی زرعی "حیات بعد ممات" کی اسکیموں کے بعد اس ملک کے وہ چشمہائے روغنِ گِل ہیں جنکے اندر انگلستان پاگل ہورہا ہے اور جو پورے عراق کی قربانیوں کی قیمت سمجھا جاتا ہے لیکن اس ضمن میں اوّل تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ برٹشین آئل کمپنی کی معرفت جو مراعات ہمکو حاصل ہیں وہ ہم کو شکم سیر

کرنے کیلئے کافی ہیں اور برطانوی بیڑہ ابھی سالہا سال تک اُس پر اپنی اوقات بسری کر سکتا ہے۔ اب اگر عراق میں بھی تیل کے لئے "کوہ کندن" کیا جائے گا تو مصارف کی کثرت کے عدم تناسب کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بھی "کاہ برآوردن" سے زیادہ نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ خزینۂ روغن تنہا برطانیہ کا اجارہ نہ ہوگا، لیکن کچھ ہو سارے اخراجات وخطرات کے لئے تو انگلستان بلا شرکت غیرے ماشاءاللہ سینہ سپر ہو گیا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ "نیلا تیل" کتنے زیادہ "سرخ انسانی خون" کے معاوضہ میں خریدا جائیگا اور ابھی کتنے اور "دینارِ سرخ" خرچنے ہوں گے جو بیعنامہ پر حق برطانیہ مہر تصدیق و توثیق ثبت کرسکیں گے!

اصل یہ ہے کہ انگریزی سرمایہ داروں کی اندرونی ریشہ دوانیاں اور فرمانفرمائیاں اس پالیسی کے اختیار کرنے میں حقیقی کارفرما عنصر ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جنگ عظیم سے قبل ہی ایک برٹش سنڈیکیٹ نے ترکی حکومت سے نواح موصل کے "چاہات روغن" کا ٹھیکہ لیا تھا۔ یہ سب حلقے اسوقت خاموش نہیں بیٹھ سکتے!

تیل کی یہ حقیقت، زرعی فتوحات کی وہ سرگزشت، اور امپیریل مقاصد کی وہ دور رازکاری، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر سرزمین عراق میں بجز خرمے کے درختوں اور نینوا و بابل کے تاریخی آثار کے اور کیا رہجاتا ہے جس کے لئے انگلستان فوج دخل اور ایک دو عملی انگریزی عربی حکومت کے گراں مصارف کو برداشت کر رہا ہے۔ وہمی وفرضی اغراض ومصالح کیلئے کسی سلطنت نے کبھی اپنے کو اس طرح کی خود طلبیدہ مصائب وافکار کے لئے وقف نہ کیا ہوگا۔

اس راز سربستہ کے حل کی جستجو میں سارے گوشوں سے ناکام پھرنے کے بعد آؤ ہم ذرا ان لوگوں پر تو ایک متجسسانہ اور مفتشانہ نظر ڈالیں جو بغداد کی سڑکوں پر سفید عبائیں اور سرخ طربوش پہنے ہوئے ادھر اُدھر ہشاش بشاش چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جنکی آنکھوں سے عیاری اور سارے سراپا سے مرفہ الحالی ٹپکتی ہے! یہ عراق کے یہودیوں کا حلیہ ہے۔ بنی اسرائیل کے مسئلہ نے آج بہت سے ارباب سیاست کو اس سے زیادہ پریشان بنا رکھا ہے جتنا کہ اُس قوم نے ماضی بعید میں انبیا ورسل کو

بنایا تھا! میرے لئے یہ امر بہت معنی خیز تھا کہ یہودی جوق جوق ملحقہ و بیرونی ممالک سے ترکِ اقامت کر کر کے عراق میں آ رہے تھے اور اس ملک میں روز بروز اپنے عنصر کو تقویت پہنچاتے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات خالی از علت نہ تھی۔ صرف بغداد شہر کے اندر یہ لوگ آبادی کے پورے ایک ثلث حصہ پر قابض ہیں اور ان کے تمول کا تناسب اُنکے تعدادی شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر یہودیوں سے متعلق ہم نے اپنے کسی قسم کے مصالح کو عراق عرب کے قبضہ کے ساتھ منسلک کیا ہے تو ان منصوبوں کی لاینعنیت محتاج تصریح نہیں۔ میں اس بارے میں پورا متیقن نہیں ہوں اور مجھے یہ خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ان خبروں اور افواہوں کے پیچھے کچھ بھی نہ ہو لیکن پھر بہت سی علامات و قرائن ایسے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ موجودہ برطانوی وزارت کے ساتھ یہودی عمائد و اعیان کا جو خلا ملا رہا ہے اُس کے متعلق ایک سے زیادہ موقعوں پر افشائے راز عشق ہو چکا ہے۔ یہ تعلقات ہنوز روز افزوں ہیں اور پھر ان کی وسعت و نفوذ کا یہ حال ہے کہ مسٹر لائڈ جارج اور شاہ فیصل دونوں کی سیاسی خلوت گاہیں بنی اسرائیل کے "مالی مشیروں" کے راز و نیاز سے معمور ہیں!

یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دام سخت کے حلقوں میں مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے۔ فلسطین کے قبضہ کے وجوہات اُس سے کم نامعقول نہ تھے جتنے کہ عراقی دخل کے اسباب تھے اور اب اس قبضہ کے تسلسل کے جو تجارب و نتائج پیش آئے ہیں وہ عالم آشکارا ہو چکے ہیں اور ہمارے لئے کسی فریب نظر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ارض مقدس کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا اور اس سلسلے میں انگلستان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے اخراجات کے ایک معتدبہ حصہ کی فراہمی میں برطانوی ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی! سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی یہ ہدایت یافتہ اُمت بیت المقدس کی طرف اس ہجرۂ عظمیٰ کا ثواب آخر کیوں کمانا چاہتی ہے؟ نہایت معقول جواب یہ ہے کہ قوم یہود کی یہ متفقہ اور عالمگیر تمنا ہے کہ ارض یہودیہ کے اُجڑے گھر کو پھر بسائیں! لیکن

عرض یہ ہے کہ اس بستی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کی جو خانہ ویرانی لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سند جواز ہے؟ کسی ملک میں توطن پذیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانے کی صرف آرزو اُس ملک کا "تملیک نامہ" تحریر نہیں کر سکتی! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کونسے دلائل و براہین ہیں؟

قریباً تین ہزار برس ہوتے ہیں کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ اپنی داخلی کمزوری سے معذور ہو کر سلطنتِ مصر نے اپنی قلعہ نشین افواج کو فلسطین سے ہٹا لیا تھا یہودیوں نے دریائے یردان کو عبور کیا اور ملک کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے۔ جس بربریت و سبعیت کا ثبوت انہوں نے ان معرکہ آرائیوں میں دیا اُس کے سامنے جرمنی کا حربی اسٹاف بھی اپنا سر نیاز جھکا دیگا اور کبھی ہمسری کی ہمت نہ کریگا! فلسطین دو قدیم عظیم الشان تمدنوں کی باہمی شاہراہ کی ایک منزل تھا اس لئے اس خطہ پر یہودیوں کا عرصہ دراز تک کوئی دخل ممکن نہ تھا، چنانچہ ایک وقت آیا کہ وہ یہاں سے نکالدئے گئے اور مختلف اقطاع و دیار میں جلاوطن کر دئے گئے۔ اور بعد ازاں جب سائرس اعظم کے عہد میں انکو واپسی کی اجازت دیگئی تو اس دعوت پر ان کے ایک قدر قلیل جزو نے لبیک کہی۔ ایرانیوں سکندر اعظم کے جانشینوں اور رومیوں کے دور میں یہ لوگ عموماً ایک قسم کی غلامی اور مقہوریت کی حالت میں رہے اور مؤخر الذکر تاجداروں کے زمانہ میں تو انہوں نے شام و فلسطین کے اندر ایک گونہ آئرش مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنے مسلسل فسادات اور آتش افروزیوں سے شاہ وقت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سب کو بیک بینی و دو گوش اس نواح سے خارج البلد کر دے!

یہ ہے یہود کی شاندار تاریخ فلسطین! ان یادگار تاریخی نظائر کو پیش کر کے وہ ارض مقدس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں اور بعض دیگر دول بھی ان کی تائید و پشت پناہی میں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ کر لئے گئے ہیں۔ لیکن اگر اہل مغرب کو خدا نے ایسی ہی توفیق دی ہے تو "حق بحقدار رسانیدن" کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع ہونا چاہئے۔ قبل اس کے کہ یہودی باب بیت المقدس میں داخل ہوں، مراکش کے مورش عربوں کو قرطبہ و غرناطہ میں، اور امریکہ کے سرخ

ہندوستانیوں کو واشنگٹن میں :۔

قدم نما د فرو د آ کہ خانہ خانۂ تست

کی صلا دینی چاہیئے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکیوں کے جذبات معدلت گستری و مظلوم نوازی کی رگ یہاں حرکت میں نہیں آتی! آہ! بیچارے موریش عرب اور ریڈ انڈینس، یہودیوں کی طرح دنیا کے صرافہ پر تو قابض نہیں ہیں جس کے زور پر وہ سلطنتوں اور حکومتوں کی نظارتہائے خارجیہ کے ایوانوں میں بیٹھکر ملکوں اور قوموں کے کاتبانِ تقدیر ہیں!

برطانیہ ماشاءاللہ اس بات کا پورا مُسکن قلب اطمینان دلاتی ہے کہ وہ فلسطین میں عدل نوشیروانی کا سکہ چلائیگی! لیکن ابھی تک تو یہ تمام اعلانات "دروغ مصلحت آمیز" سے زیادہ ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ فلسطین کے عربوں پر اس نئے دور حکومت میں جو بیت رہی ہے وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے۔ ہم فلسطین کے عربی وفد کے اظہارات و معروضات کے بعض اہم نقاط کو یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ ارکانِ سفارت نے کہا تھا کہ (ملخصاً):

"واضح رہے کہ ہم اعراب فلسطین اپنے قلوب میں کسی قسم کے منافی "سامیت" جذبات نہیں رکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہودیوں کے لئے اُس وقت مامن و ملجا رہے ہیں جبکہ مغرب کے مسیحی ممالک کے اندر وہ کُشتنی و سوختنی سمجھے جاتے تھے! ہمارے لئے جو چیز ناقابل برداشت ہے وہ یہودیت کے بجائے صیہونیت ہے جو فلسطین کے اندر مہمان بنکر آنا نہیں چاہتی بلکہ مالکانہ اور فاتحانہ حیثیت سے داخلہ چاہتی ہے!

عبرانی زبان جو مشکل سے ملک کی ایک فیصدی آبادی کی بولی ہوگی فلسطین کی سرکاری زبان بنائی جاتی ہے! صیہونی نووارد مزدور عرب غربا کو اُن کے قوتِ لایموت سے محروم کرتا ہوا آتا ہے۔ وہ عرب کے مقابلہ میں نصف کام کرتا ہے اور ڈبل اجرت پاتا ہے! تعمیراتِ عامہ کے قریباً سارے ٹھیکے یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں جنکے سامنے غریب عرب "نرخ بالا کن" کی مبارزت میں ٹھہر نہیں سکتا! فلسطین کا ہائی کمشنر، معتمد قانونی،

خزینہ دار ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت وحرفت اور صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں اور صیہونی مشرب ومسلک کے یہودی! اسی طرح تمام دفاتر ومحاکم میں نو آموز اور ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے! سارا دفتر تشریعی عرب کشی اور یہود نوازی کی روح سے معمور ہے! گفتگو صحائف وجرائد کی ناطقہ بندی کیجاتی ہے۔ حب وطن اور دلسوزی ملک کا نعرہ بلند کرنیوالے عرب قائدین ملت کو اس عذر پر طوق وسلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ انکی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں! اُن مزارعین وفلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلاً بعد نسلٍ، قرنہا قرن سے "فرزندان زمین" بنے ہوئے ہیں، یہ مطالبہ کیاجاتا ہے کہ وہ اپنی آراضیات کا بیعنامہ حکومت کے نام کردیں اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے تمام حقوق زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہوگئے ہیں! یہ بیع نما ضبطی زمین بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے عطیۂ جاگیرات بننے والی ہے!

شریعت اسلامیہ کے مسلمہ واعلان کردہ آئین کو پامال کرکے صیہونیت مآب یہودی حکومت، فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم ونسق میں بیباکانہ مداخلت کے درپے ہے! یونانی راسخ الاعتقاد (تقلید مسلک) کلیسا کے وہ تمام اوقاف جنکو ترکوں نے ملک خدا سمجھکر کبھی ہاتھ نہ لگایا آج یہی حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار دیتے ہیں اور ایک سرکاری کمیشن کے زیر اہتمام عمداً انکی بڑی بڑی مقداروں میں وائرنیلام کئے جاتے ہیں کہ بجز یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برا نہ ہوسکے!

اور یہ محض ایک مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ عرب روزانہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بے شمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے!

عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا انکی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟"

باوجود دیکیطرفہ ہونے کے یہ سب بیانات حق بجانب ہیں۔ برطانوی پبلک کو بالکل تاریکی میں رکھا گیا ہے ورنہ سیاہ وسفید کے مختار لوگ ایسا اندھیر کرنے میں کچھ متامل ہوتے۔ لیکن ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی دار الوزارت عظمیٰ) میں یہودیوں کو جو رسوخ حاصل ہے وہ اب بھی اس اپیل کو بیسود رکھیگا۔ متمدن دنیا کے دار العدل میں جو استغاثہ کیا گیا ہے یقیناً وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوگا۔ بیشتر مغربی ممالک نظاہر اس "کارنیک" کے سلسلے میں درحقیقت اپنے اپنے ہاں کی آبادی کے اُس عنصر سے گلوخلاصی کی فکروں میں ہیں جو اُن کے لئے صدیوں سے ایک عذاب و لعنت بن رہا ہے! پھر اس سے بڑھکر کیا بات ہوگی کہ برطانیہ تنہا "خون دوعالم" اپنی گردن پر لینے کو تیار ہے! لیکن "کشتوں کا یہ خون" مستقبل قریب میں بڑے ہولناک طریقے سے رنگ لائیگا اور اُس وقت برطانوی حکومت کے موجودہ کاربردازوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی مہلک راہ پر گامزن تھے!

کیسی بوالعجبی ہے کہ یہ سلوک عربوں کو جنگ عظیم کی اُن فتوحات کا انعام ہے جنکے حصول میں اصل فاتح کارآلہ عربوں کی "جان و ایمان" کی وہ قربانیاں تھیں جو اس فریب خوردہ قوم نے اتحادیوں کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً پیش کی تھیں!

انگریزی وزارت جو پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے وہ یقیناً بہت ہی اندوہناک ہے بیت المقدس میں کے ایک برطانوی افسر سے جب میں نے اس بارہ میں تبادلہ خیالات کیا تو اُس نے فی الفور کہا کہ "یہ نہ سمجھئے کہ فلسطین کے، لاکھ عرب غیر معین زمانہ تک، ہزار یہودیوں کے مظالم و مفاسد کا اپنے کو تختۂ مشق بنائے رکھیں گے۔ اُن کی یہ قومی مصیبت بلاشبہ ناقابل برداشت ہے اور جلد یا بدیر اُن کی تلوار سے ضرور ایک قتل عام کا فوارۂ خونی بہہ نکلیگا! بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آفت یہیں تک محدود نہ رہیگی۔ جواب میں یقیناً برطانوی جنگی بیڑہ حرکت میں آئیگا اور انگریزی سنگینیں فلسطین کے تمام عربوں کو ذبح کر ڈالینگی ایلحقہ ممالک اور بیتر اسلامی ہندوستان کے مطلع پر ان خونچکاں حوادث کا جو عکس پڑیگا اُس کو چشم تخیل سے دیکھا جاسکتا ہے!

برطانیہ میں جتنے لوگ ماہرین مشرق کہلائے جانیکی اہلیت رکھتے ہیں ان کا بیشتر حصہ اس روش

کو سخت مخدوش کہتا ہے۔ لارڈ سڈنہم نے اُس تقریر پیچ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت انہوں نے ارشاد فرمائی تھی کہا تھا کہ: "لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کے لئے اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے ایک ڈائنامیٹ کا گولہ ثابت ہوگا! فلسطین کے خرمن امن میں اس حرکت سے ہم جو شرارہ لگائیں گے وہ تمام مشرق میں آتش وسیع آتش جدال و قتال کو مشتعل کریگا کہ ہمارے سارے وسائل اُس کو سرد کر نہیں سوخت ہو جائیں گے!"

میں اسی قول فیصل پر فلسطینی مسئلہ کی بحث کو ختم کرتا ہوں، اور عراق کی طرف پھر بازگشت کرتا ہوں۔

عراق عرب کے اندر ۱۹۲۰ء میں جو بغاوت ظہور پذیر ہوئی اُس نے دو طرفہ اپنا زبردست خراج خون و زر وصول کرنے کے علاوہ اگر اور کچھ نہیں کیا تو کم از کم زبان آتشیں سے یہ اعلان تو کر دیا کہ ملک کی عام آبادی برطانوی دخل کو کسی طرح خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لطف یہ ہے، جیسا کہ مجھکو نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، کہ اس ناکامیاب انقلاب کے اصل داعی شاہ فیصل کے عین ہواخواہوں میں سے ہیں! نیز یہ کہ اس مہم کے تغذیہ کیلئے جو روپیہ ملا تھا وہ اُس رقم نذرانہ کا ایک حصہ تھا جو برطانوی خزانہ ملک الحجاز کو پیش کیا کرتا ہے! انگلستان کو دیکھنا چاہیئے کہ کہاں تک وہ اپنی کمائی "بنائے حرام رفت" کی قربانگاہ پر چڑھاتا رہے گا!

عراق اور شاہ عراق کیساتھ جو دوستانہ معاہدات اور خوشگوار تعلقات ہیں وہ در اصل ایک سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ فیصل کے تخت شاہی کے پائے برٹش سنگینیں ہیں، اور اگر انگریزی فوجی طاقت عراق سے مراجعت کر آئے تو برطانوی ہائی کمشنر کے نقوش قدم پر ہی جناب فیصل بھی زمین ناپتے ہوئے نظر آئیں گے!

فیصل کی تخت نشینی فی الحقیقۃ اُس "بل" کی ادائگی کی ایک قسط تھی جو دوران جنگ میں شریفی خاندان کی خدمات کی بنا پر برطانیہ کے ذمہ واجب الادا سمجھا جاتا تھا! ورنہ باستثنائے نوجوان عرب پارٹی کے عراق عرب کے تمام علماء، تجار، کرد، اور وادی فرات کے جملہ قبائل فیصل کو اپنا سرتاج بنانے

کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے۔

فیصل کی تائید میں عراق عرب کے اندر جو مصنوعی استصواب عامہ کرایا گیا وہ بھی ایک نا قابل رشک انتخاب تھا۔ عالم بالا سے تمام ہدایات پیشگی صادر ہو چکی تھیں! اگر کسی نے کوئی کلمۂ "حق بر زبان جاری" کیا تو سخت مؤاخذہ و محاسبہ کے شکنجے میں کسا گیا۔ انہی گناہوں کی پاداش کے سلسلے میں مشہور زعیم طالب پاشا کی جلاوطنی سیلون کافی تشہیر حاصل کر چکی ہے۔

اپنی محرومیٔ قسمت سے میں شاہ فیصل کی تاجپوشی کی تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے وقت پر بغداد نہ پہنچ سکا، حالانکہ تمام لوازم کے اعتبار سے یہ موقع قابل دید و قابل داد تھا۔ ادنیٰ کمال یہ ہے کہ اتنے عظیم الشان قومی جشن کو منانے کے لئے کوئی قومی ترانہ بجز "God save the King" کے نہ تھا!

عراقی حکومت کے اخراجات اپنی گرانباری کی بنا پر ضرب المثل ہو رہے ہیں، اس پر طرہ یہ ہے کہ ملک کے سرچشمہائے آمدنی کے بعض صیغے ابھی سے اغیار کے ہاتھوں میں جا پڑے ہیں۔ عراقی ریلویجات اور بندرگاہ بصرہ (جو ملک کا تنہا بحری تجارت کا دروازہ ہے) ایک برطانوی کمپنی کے اجارے میں ہے جو اپنے حلقے کے اندر سیاہ و سفید کی مختار کل ہے اور حکومت کا اس پر کوئی اقتدار نہیں۔ حکومت کی جیب میں اتنے ٹکے نہیں جو وہ ریلوے کمپنی کی کل متاع و حقوق کو خرید سکے اور کمپنی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی ذاتی اغراض و مصالح کو ملک کے مفاد کی خاطر قدرے نظر انداز کرے گی!

برطانوی کابینۂ وزارت کی اُن تمام حرکات مذبوحی پر جن پر وہ مشرق قریبہ اور ایشیائے وسطیٰ میں عمل پیرا ہے ہم ایک عمومی و مجمل نظر ڈالتے ہیں:

ہندوستان اور مصر کے اندر وہ انتہا پسندوں کو مہمیز لگا رہی ہے، عراق عرب اور فلسطین میں باشندگان ملک کی پامالیٔ جذبات اور اغماض حسیات کی ابتدائی مہم جاری ہے، افغانستان کے متعلق اُس کی روش کو شاید صورت حالات کا جائز فتویٰ کہا جائے، لیکن ٹرکی کے معاملے میں وہ اپنی شاہراہ عمل سے نہایت افسوسناک طریقے سے پیچھے کھڑی ہے۔ روس کے بارہ میں اُس کی حکمت عملی کسی واضح

اصول پر مبنی نہیں۔ علاقہ قفقاز کی نوزائیدہ جماہیر کو ہم اس لئے درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ حشرات الارض جیسی حکومتیں جلد یا بدیر روسی پارٹی میں جذب ہو جائینگی۔

برطانوی حکومت کی پالیسی پر ایک اصولی تنقید ان الفاظ میں کیجا سکتی ہے کہ جس جگہ مضبوط بننے کی ضرورت ہے وہاں وہ نہایت مضرت رساں نامردی کی نمائش کرتی ہے اور جس جگہ "سپر باید انداختن" کا مقتضا ہوتا ہے وہاں وہ ناعاقبت اندیشانہ مظاہرات طاقت برپا کر دیتی ہے۔ ایک دوسری لغویت یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں سے ہو کر سلطنت کے مقاصد کے نکلنے کی کبھی کوئی بعید ترین توقع بھی نہیں ہو سکتی وہاں وہ آدمیوں اور روپیہ کا دریا بہا دیتی ہے! سلطنت کے طول و عرض کے اندر مختلف و گوناگوں اقدامات کے مابین کوئی یکسوئی و یکجہتی اور مقصد واحد و مشترک نظر نہیں آتا! مخفی معاہدات اور خفیہ سیاست بازی ایک دوسرا بے سود اور مضر مشغلہ ہے جو برطانوی وزارت کو بہت مرغوب معلوم ہوتا ہے!

سائل

"حضور..... سرکار..... بندہ پرور..... تین دن ہو گئے ہیں..... فاقہ ہے.... کھیل اڑ کر جو منہ کو گئی ہو۔ برف پڑ رہی ہے۔ دوانی بھی نہیں کہ جا کر چھت تلے رات بسر کروں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ اُس کی مرضی..... آٹھ برس ایک دیہاتی مدرسہ میں پڑھا چکا ہوں۔ نہ کچھ خطا نہ قصور۔ انسپکٹر نے معائنہ بُرا لکھ دیا۔ اب سال بھر سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں......"

وکیل صاحب، اسکورز و نے سائل کے پُرانے نیلے کوٹ پر نظر ڈالی، اس کی گدلی گدلی مخمور اور غمگین آنکھوں کو دیکھا، گالوں پر لال لال ٹیکے دیکھے اور نہ جانے کیوں اُسے یہ یقین سا ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس آدمی سے میں پہلے ضرور کہیں مل چکا ہوں۔

"اور حضور۔ ابھی جو پہونچ سکوں تو کلسگا کے ضلع میں ابھی آج مجھے ملازمت ملجائے۔ لیکن کرایہ کے لئے بھی تو کوڑی پاس نہیں۔ سرکار۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔ مسیحؑ کے نام پر میری کچھ مدد کیجئے۔ مجھے مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ مصیبت بری بلا ہے۔"

وکیل صاحب نے سائل کے ربر کے جوتوں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ ایک جوتا اونچا تھا، ایک نیچا۔ نگاہ پڑنا تھی کہ کچھ یاد آگیا۔

"سنئے مو جی، میاں صاحب، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم تم پرسوں کہیں مل چکے ہیں۔ اُدھر بازار میں۔ مگر اُس وقت تم دیہاتی مدرس نہیں تھے۔ بلکہ مدرسہ سے نکالے ہوئے طالب علم تھے۔ کیوں، ٹھیک ہے نہ؟"

"نہ..... نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن ہے۔" سائل نے دبی دبی آواز سے کہا "میں تو مدرس ہوں۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذات دکھلا دوں۔"

"بس ان فضول کی جھوٹی باتوں کو رہنے دو۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم طالب علم تھے، یہ تک

بتایا تھا کہ کس وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ کئے گئے۔ کیوں، یاد آیا کہ نہیں؟"

مخاطب نے سر ہلایا۔ وکیل کو کچھ غصہ سا آیا اور اُس نے اظہار نفرت کے طور پر اس مفلوک الحال سائل کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور غصہ سے کہا: "یہ تو پلے درجہ کا کمینہ پن ہے۔ کیوں جی تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہارا علاج تو بس یہ ہے کہ تمہیں گرفتار کرا دیا جائے۔ لاحول ولا۔ مانا کہ غریب ہو، بھوکے ہو لیکن اس وجہ سے یہ تھوڑی ہے کہ بیشرمی سے جو جا ہو جھوٹ بک دو"

سائل کچھ گھبرا کر اور پریشان ہو کر ذرا پیچھے کو ہٹا اور دروازہ میں جو موٹھ لگی تھی اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا "میں نے ..... میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذ دکھا دوں۔"

"تم کیے جاؤ، یقین کون کرتا ہے۔ لوگوں کو طالبعلموں اور دیہاتی مدرسوں سے جو ہمدردی ہے اس سے اس طرح بیجا فائدہ اٹھانا سخت کمینہ پن ہے۔ ذلیل، قابل نفرت۔ شرماؤ جی شرماؤ۔"

اسکورزو کو غصہ آگیا اور اُس نے نہایت بے رحمی سے سائل کو جھڑک کر نیچے اُتار دیا۔ جھوٹ کی وجہ سے اسکورزو کے اندر اس سے نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو انسانیت پر جو یقین تھا اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ چڑھ سا گیا تھا کہ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے اس طرح کمینہ پن کے ساتھ فائدہ اٹھا کر یہ شخص اس خیرات کو آلودہ کرنا چاہتا ہے جو یہ نہایت صدق دل اور خلوص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ سائل نے اپنی بریت میں کچھ اور کہنا چاہا۔ قسمیں کھائیں۔ لیکن بالآخر خاموش ہو گیا، شرما کر گردن نیچی کر لی۔ اور سینہ پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا۔ "ہاں، حضور، سچ ہے۔ میں نے واقعی ...... واقعی جھوٹ بولا۔ میں نہ طالب علم ہوں نہ دیہاتی مدرس۔ یہ سب غلط تھا۔ میں گرجا میں گا یا کرتا تھا۔ پھر پینے کی لت لگ گئی اس لئے مجھے نکالدیا گیا۔ لیکن میں کروں تو کیا کروں؟ بے جھوٹے کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ سچ کہتا ہوں تو کام نہیں چلتا۔ سچ بولوں تو کوئی ایک دمڑی نہ دے۔ سچ بولوں تو بھوکوں مر جاؤں۔ آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ بالکل درست ہے لیکن آخر کروں کیا؟"

"کروں کیا؟ مردِ آدمی، پھر مجھسے پوچھتے ہو کہ کروں کیا؟" اسکورزو نے بہت نزدیک آکر کہا، "کر دکیا، کام کرو، کام۔"

"کام کروں ـــــ بہت ٹھیک - مگر کام پاؤں کہاں ؟ مجھے کوئی کام نہیں دیتا۔"

"بکواس کرتے ہو - تم ابھی نوجوان ہو، ہٹے کٹے ہو، تندرست ہو - کام کرنا چاہو تو کام کیوں نہ ملے۔ نہیں - تم تو سست ہو گئے بیکار بن گئے ہو - عادت بگڑ گئی ہے - شراب میں مست رہتے ہو، شراب میں - دس قدم پر کھڑے ہو تو شراب کی بو آتی ہے - جھوٹ تمہارے گوشت پوست میں داخل ہو گیا ہے۔ اور تم بس اب جھوٹ بول سکتے ہو اور بھیک مانگ سکتے ہو - اور اگر کبھی کام پر آمادہ بھی ہوتے ہو گے تو ضرور ہے کہ کام ہلکا ہو اور مزدوری بھاری - کیوں ہے نہ ؟ کسی گھر میں خدمتگاری یا کارخانہ میں مزدوری یہ تو آپ کو پسند نہ ہوگی ؟ ٹھیک ہے، آخر اپنا اپنا مزاج بھی تو ہوتا ہے اور اپنی اپنی پسند !"

سائل کے لبوں پر نہایت تلخ تبسم رونما ہوا اور اُس نے کہا "آپ آخر ایسی باتیں کیوں فرماتے ہیں ...... مجھے کام کہاں مل سکتا ہے ؟ Kommis کے لئے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، اسے تو لڑکپن ہی میں شروع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - صحیح عرض کرتا ہوں نہ ؟ گھر میں خدمتگار مجھے کوئی بناتا نہیں - اس لئے کہ شکل صورت ایسی ہے کہ لوگ 'تو'، 'تو' کہتے ذرا رکتے ہیں - یہی حال کارخانہ میں مزدوری کا ہے - اس کے لئے آدمی کو کوئی دستکاری آنی چاہئے - سو مَیں اس سے بھی نابلد ہوں ...... لیکن ۔"

"جی - جی - عذروں کی تو تمہارے پاس کبھی کمی نہ ہوگی - لیکن یہ تو کہو لکڑیاں چیرنے کا کام کیسا ہے ؟" "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں - خوشی سے - لیکن آجکل تو خود پیشہ ور لکڑہاروں تک کے لئے کام نہیں ہے ۔"

"اچکّے اور نکمّے ہمیشہ یہی کہتے ہیں - ابھی اگر میں تمہیں یہ کام دوں تو ظاہر ہے انکار کر دو گے۔ یا نہیں، لکڑی چیرنے پر تیار ہو ؟"

"جی ہاں - خوشی سے ۔"

"بہت اچھا - پھر کیا ہے ۔"

اسکورزو نے کچھ شرارت آمیز طریقہ سے اپنے ہاتھ ملے اور گھر میں سے ماما کو بلایا ۔

ماما لگا۔ انکو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ وہاں لکڑیاں چیریں گے"

سائل نے کندھے اچکائے۔ اُس کے چہرے سے شبہ سا ظاہر ہوتا تھا کہ کروں کیا۔ اسی شبہ کی حالت میں باورچی خانہ کی طرف چلا۔ ظاہر تھا کہ اُس نے یہ کام صرف اس لئے قبول کر لیا تھا کہ پھر سے وکیل صاحب اسے جھوٹا، کذاب نہ کہہ سکیں۔ ورنہ نہ کام کا شوق تھا، نہ بھوک کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہوا تھا۔ اس پر اسوقت شراب کا اسقدر اثر تھا اور اُس کے اعصاب اسقدر کمزور تھے کہ کام کی طرف تو اسمیں ذرا بھی رغبت نہ تھی۔

اسکورزو جلدی جلدی اپنے کمرہ میں گیا۔ کھڑکی میں سے لکڑی کا گودام اور نیچے صحن کی تمام کارروائیاں اُسے اچھی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ ماما اور سائل صحن میں آئے اور میلے میلے برف پرسے چلکر باورچی خانہ کی طرف گئے۔ اولگا اپنے ساتھی پر عجیب بُری نظریں ڈال رہی تھی اور اظہار نفرت کے لئے مڑ مڑ کر تھوکتی جاتی تھی۔ ماما نے گودام کا دروازہ کھولا اور پھر زور سے کواڑ بند کئے۔ اسکورزو نے دل ہی دل میں کہا "شاید ماما بیگم چاء پی رہی تھیں۔ سلوگ مخل ہوئے۔ اسپر بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی عجیب مخلوق ہے"

پھر اُس نے دیکھا کہ یہ سائل، جھوٹ موٹ کا طالبعلم اور مدرس، لکڑی کے ایک بوسٹے پر بیٹھ گیا، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیا اور نہ معلوم بیٹھ کر کیا سوچنے لگا۔ ماما نے زور سے لاکر کلہاڑی اس کے پیروں کے پاس دے ماری اور پھر کچھ منہ بنا کر تھوتھو کرنے لگی۔ سائل نے لکڑی کا ایک ٹکڑا بڑی بے دلی سے اپنی طرف گھسیٹا اور پاؤں سے دبا کر اُس پر کلہاڑی چلائی۔ کلہاڑی پھسل گئی اور لکڑی ایک طرف اچھل کر گری۔ سائل نے اسے پھر ٹھیک ٹھیک رکھا اور پھر کلہاڑی چلائی۔ لیکن وار پھر پورا نہ پڑا اور لکڑی اچھل کر ایک طرف کو گری۔

اسکورزو کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ بلکہ اُسے اب اپنے طرز عمل پر کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ بھلا یہ کونسی انسانیت ہے کہ ایک تعلیمیافتہ، آرام طلب، اور شاید بیمار آدمی کو اس کڑاکے کی سردی میں ایسے سخت کام پر مجبور کیا جائے۔ لیکن اُس نے سوچا "کہ خیر، یہ سب اسکے فائدہ ہی کے لئے ہے"

کوئی آدھ گھنٹہ میں او لگا آئی اور وکیل صاحب کو اطلاع دی کہ لکڑی سب چر گئی۔ "اچھا تو اسے ایک روپیہ دیدو اور اس سے کہدو کہ جی چاہے تو ہر مہینہ کی پہلی کو یہاں آکر لکڑیاں چیر جایا کرے۔ دنیا میں کام کی کمی نہیں ہے۔"

دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو سائل پھر موجود تھا۔ پیر لڑکھڑاتے تھے اور کھڑا ہونا مشکل تھا۔ مگر اس دفعہ بھی وہ ایک روپیہ کما کرے گیا۔ اب تو یہ اکثر آنے لگا اور ہر مرتبہ اسے کچھ نہ کچھ کام مل ہی جاتا۔ کبھی راستہ سے برف ہٹانی ہوتی، کبھی صحن اور گودام میں جھاڑو دینی ہوتی، کبھی قالین اور دریاں جھاڑنی ہوتیں، اور ہر دفعہ اسے روپیہ بارہ آنے مل ہی جایا کرتے۔ اور ایک دفعہ تو کچھ پُرانے کپڑے بھی مل گئے تھے۔

وکیل صاحب نے جب اپنا مکان بدلا تو اسی سے تمام سامان ٹھیک کرا کے بھجوایا۔ اس دفعہ تو اس کے حواس بھی درست تھے۔ یہ پئے نہ تھا لیکن ذرا چپ چاپ اور کھنچا کھنچا ضرور تھا۔ جب سامان گاڑی پر لد گیا تو یہ سر جھکائے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاڑی والوں نے اسکی کمزوری، اسکی سستی، اور اس کے پیوند لگے ہوئے کوٹ پر فقرے کسنے شروع کئے تو بیچارہ چپ رہا اور سردی میں سوں سوں کرتا سر جھکائے چلا گیا۔ جب اسکورزو دوسرے مکان میں پہونچ گیا تو اُس نے اسے اپنے کمرہ میں بُلایا اور اُس سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ کا تم پر اثر ہوا ہے یہ لو، یہ پانچ روپیہ کا نوٹ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اب پیتے نہیں اور کام سے بھی جی نہیں چُراتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"لُشکو!"

"ٹھیک، میں اب تمہارے لئے ایک دوسرا بہتر کام تجویز کرتا ہوں۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں!"

"تو یہ خط لیکر کل میرے دوست ـــــ کے پاس جانا۔ وہ تمہیں نقل کے لئے کاغذات دیں گے۔ خوب جی لگا کر کام کرنا۔ پینا چھوڑ دو۔ اور میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اس کا خیال رکھو۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

اس بات سے دل میں خوش ہوکر کہ اس نے ایک انسان کو کام کا خوگر بنایا، اسکورزو نے سائل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رخصت کے وقت اس سے ہاتھ تک ملایا۔ لشکو خط لیکر رخصت ہوا اور پھر یل صاحب کے یہاں کبھی دکھائی نہ دیا۔

دو برس گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت اسکورزو ایک تھیٹر کے سامنے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے بازو میں ایک شخص بالوں کا کوٹ پہنے اچھی سی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ یہ آخری درجہ کا ٹکٹ مانگ تھا اور قیمت میں تانبے کے ادھنے دے رہا تھا۔

اسکورزو نے اپنے پرانے لکڑی چیرنے والے کو پہچان لیا اور بول اٹھا "لشکو! کیا تم ہو؟ ، کیا کرتے ہو؟ کیا شغل ہے؟ کیا حال چال ہیں؟"

"شکریہ۔ بس گزرتی ہے۔ میں آجکل ایک مختار کے یہاں ملازم ہوں اور مہینہ میں ۳۵ روپیہ ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ لشکو! سچ کہتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ میں نے ہی تمہیں کام سے لگایا۔ تمہیں یاد ہے کہ میں کیسا بگڑا تھا۔ ے شرم کے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ خیر، خدا کا شکر ہے کہ میری باتوں کا اثر ہوا۔"

لشکو نے کہا "میں آپ کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ اگر میں اس وقت آپ کے پاس نہ تا تو شاید اس وقت بھی اپنے کو طالب العلم یا مدرس بتاتا ہوتا۔ جی ہاں۔ آپ ہی نے میری ح کی۔"

"میں سچ کہتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی ہے۔"

"میں پھر آپ کے الفاظ اور آپ کی مہربانیوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے ن خوب کہا تھا۔ میں آپ کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ سے زیادہ آپ کی ماما کا۔ خدا اس ، ایماندار عورت پر اپنی رحمتیں بھیجے۔ آپ نے اس وقت خوب باتیں کہیں اور میں مرتے مرتے آپکا رہونگا لیکن نجات دلائی مجھے اُسی آپ کی ماما اوٹگا نے۔"

"میری ماما او نگانے؟ وہ کیسے؟"

"بہت معمولی طریقے سے۔ جب میں آپ کے یہاں لکڑی پھاڑنے آتا، تو وہ شروع کرتی، اے شرابی۔ بدقسمت آدمی۔ جیتا کیسے ہے، ابھی تک ختم کیوں نہیں ہو گیا؟" پھر وہ میرے سامنے بیٹھ جاتی، نہایت غمگین آنکھوں سے مجھے دیکھتی، روتی اور کہتی: "بدنصیب، کمبخت! تیرے لئے اس دنیا میں کوئی آرام نہیں کوئی خوشی نہیں اور شرابی ہے، اُس دنیا میں بھی جہنم میں جلیگا۔ ہے بے غریب گنہگار"۔ غرض ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتی۔ اس نے میری وجہ سے کتنی کوفت نہیں اُٹھائی۔ کتنے آنسو میری ہمدردی میں نہیں بہائے۔ میں آپ سے کیا بیان کروں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ میری جگہ آپ کی لکڑیاں پھاڑیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے، میں نے آپ کے مکان میں ایک چیپ لکڑی کی نہیں پھاڑی۔ وہ یہ سب کیوں کرتی تھی اور اُس کے اثر سے میں کیسے بالکل بدل گیا اور پینا کیسے چھوڑ دیا۔ میں خود نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی باتوں سے اور اس کے شریفانہ برتاؤ سے میری روح میں ایک انقلاب ہو گیا۔ میری اصلاح اُسی نے کی اور میں اُسے کبھی نہ بھولوں گا..... لیکن معاف فرمائیے۔ اب وقت ہو گیا ہے، وہ گھنٹی بج رہی ہے۔"

شکو نے سلام کیا اور اپنے درجہ میں جا داخل ہوا۔

غزل

(از مولانا محویؔ صدیقی)

اک ذرا بجلی سی چمکی تھی نقابِ یار سے
جگمگا اُٹھی ہے دنیا تابشِ انوار سے

بے خبر تھی بزمِ حسن و عشق کے اسرار سے
ہو گئیں سرگوشیاں دل اور نگاہِ یار سے

دل کی رنگیں حسرتیں تھیں خون کی بوندیں تھیں
رات بالیں پر جو ٹپکیں دیدۂ بیدار سے

بیخودیٔ شوق کی اللہ رے سادہ دلی!
آرزوئے التفات اور وہ بھی چشمِ یار سے!

لڑکھڑا کر جب گرا تو پائے ساقی پر گرا
یہ ہوا ہے کام اک دیوانۂ ہشیار سے

اس قفس کی زندگی نے کر دیا ایسا اُداس
جی نہ بہلا پھر کبھی نظارۂ گلزار سے

ہیں وہی نا آشنائے لذتِ دیوانگی
جو نظر آتے ہیں اس محفل میں کچھ ہشیار سے

اک نظر میں ہو گیا دل بے نیازِ کائنات
نعمتِ دارین کیا پائی نگاہِ یار سے

تھا کچھ ایسے درد سے لبریز سوزِ دل کا حال
چھا گیا محشر میں سناٹا مری گفتار سے

دیدنی ہیں دستِ قدرت کی ستم آرائیاں
پھول ہم آغوشِ گلشن میں ہوئے ہیں خار سے

بن گیا ناسور وہ زخمِ جگر اے ضبطِ غم
آج تک جس کو چھپایا اپنے ہر غمخوار سے

جی بھر آیا آگئی محویؔ جوانی اپنی یاد
جھوم کر اُٹھی گھٹا جب دامنِ کہسار سے

دوشیزۂ سحر

(از حضرت دردؔ کاکوروی)

دوشیزۂ سحر تو محبوبۂ فلک ہے　　تیری جبینِ روشن فطرت کی اک جھلک ہے
آمد کے تیری ہر سو سب راگ گا رہے ہیں　　جنگل کے بسنے والے تانیں اڑا رہے ہیں
کیفِ مجسم ایسا رقصاں طیور میں ہے　　ہر طائرِ خوش الحاں گویا سرور میں ہے
اس درجہ خامشی سے دریا جو بہہ رہے ہیں　　فطرت کے چپکے چپکے سب راز کہہ رہے ہیں
دوشیزۂ سحر کی آنے کو ہے سواری　　کیوں چھوڑ دیں نہ رستہ تاریکیاں فضا کی
کر ہی چکی تھی فطرت ہر ایک شے پہ پالش　　اک دم ہوئی ہوا کو پھر غیب سے جو جنبش
اتنے میں اک حسینہ رقصاں ہوئی فضا میں　　خورشید کی کرن تھی ٹانکے ہوئے ردا میں
وہ دیکھو ظلمتوں کو پُر نور کر رہی ہے　　عالم میں نام اپنا مشہور کر رہی ہے
ہر شے پہ رقص میں ہے ہر ڈالی جھومتی ہے　　دوشیزۂ سحر کے قدموں کو چومتی ہے
دوشیزۂ سحر تو جلوے دکھا رہی ہے　　فطرت کی چلمنوں سے یا مسکرا رہی ہے
یہ تیری مسکراہٹ رنگینیوں کی ہیکل　　عالم کا کھولتی ہے دروازۂ مقفل
وہ دیکھو لے رہی ہے دل میں نسیم موجیں　　آغوش میں لئے ہے نورِ سحر کی فوجیں
شبنم کے برگِ گل پر قطرے پڑے ہوئے ہیں　　فطرت کے یا چمن میں موتی جڑے ہوئے ہیں
کیا مست کر رہے ہیں طائر چہک چہک کر　　کیا نغمے گا رہی ہیں چڑیاں پھدک پھدک کر

اے دردؔ ہو گیا ہوں دیوانہ سحر میں
لیلائے رنگ و بو ہے عالم مری نظر میں

"ہندو کُش" عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب ہندو کتابیں

(کتبخانۂ جامعہ میں)

جامعہ ملیہ کی پُراصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا، اور اسی تقریب سے اُس کے کتبخانہ کی سیر کرنی پڑی۔ ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے کتبخانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی۔ اِس وقت اُس کے کتبخانہ میں کم و بیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں جن میں عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو کی کتابیں داخل ہیں، جو قرینہ کے ساتھ الماریوں میں رکھی ہیں اور مرتب ہیں۔ ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں جنکی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اِن دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اُس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اُس کے دشمن اور مخالف ہندو کش، ہندو علوم و فنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں، لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اُس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں۔

ان میں سے ایک کتاب کا نام "[illegible]" اور دوسری کا نام "ردّ کفر" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کی دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں۔ پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری

ایک نومسلم ہندو کی پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اُس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی۔

۱۔ مت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۴۱۲ صفحوں میں ہے، کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ فروری ۱۸۴۸ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۲۶۳ھ کو اختتام کو پہنچایا ہے۔ کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خاں "سررشتہ دار محکمہ کچہری صدر امین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیسا کہ اس کے آخر میں بیان ہے۔

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ نسخہ بحد غلط ہے۔ دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ ولک ہے) نام ایک رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا۔ اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی اس لئے گوسائیں بکیانیر (؟) نے اس کو نئے سرے سے مرتب کیا اور اس کا خلاصہ کیا، اور "مت اچھرا" نام رکھا۔ اسی خلاصہ کا سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری ولد رائے کاشید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور جو اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا، ۱۰۶۶ھ میں سو بھاسکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، تاکہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں اور فائدہ اٹھائیں۔ یہ سو بھاسکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف منجھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے۔

کتاب کا موضوع جیسا کہ دیباچہ میں ہے "احکام و مذاہب و اوامر و مناہی (نواہی؟) ہنود" ہے۔ کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔

مقالہ اول "در آچار ادھیائے کہ آنرا بزبان عرب عبادت گویند" اسمیں ۹ فصلیں ہیں۔

مقالہ دوم " در بیان ادعیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اسمیں ۵۴ فصلیں ہیں۔

مقالہ سوم " در پرائشچت ادعیائے کہ آں را کفارت (کفارہ) خوانند" اسمیں ۔ فصلیں ہیں۔

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے مگر اس ترتیب و تعبیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں، جس طرح آج ہمارے حکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بیقرار ہیں۔

اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندو کش عالمگیر" کو جن آداب و القاب سے یاد کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ، خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید، ظل اللہ، سلیماں بارگاہ، مظہر الطاف الٰہی، مطلع انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، پرداختۂ حضرت منان، گماشتۂ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت، مشتری آسمان سلطنت، ظل ظلیل سبحانی، واسطۂ انتظام انسی و جانی، شیرازۂ نسخۂ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی، خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اشتہار سلطان بن سلطان، خاقان زمین و زمان، منتخب فرمانروایان حال و ماضی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ و سلطانہ، کہ دورش چوں دور قدح پُرنشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بروز از فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی دولت را نظم و نثر از حد بیشتر است۔"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جارہی تھی اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جارہی تھی، مگر با ایں ہمہ ان جذبات کا اظہار نمونہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اُس عہد کے ہندو اُسکو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اُس کو کیا سمجھ رہے ہیں۔

آگے چلکر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے:۔

"پیش نہاد خاطر احقر العباد علی بہاری ولد رنی پرساد کا سید سنگھ متوطن بوجپور من

مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبہ اکبر آباد کہ رگ و پے ایں تربیت یافتہ یک خاندان والا دودمانِ عز و علا نواب سپہر جناب، خورشید القاب، عالمیان تاب، رکن السلطنۃ العظمی، اعتقاد الخلافۃ الکبری، سزاوار است آں عیوقی، چراغ دودمان سلجوقی، بسط الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اللہ وردی خاں عالمگیر شاہی است"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲۔ ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "ردّ الکفر بحجت القوی" ہے۔ اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے۔ اور معلوم نہیں کہاں سے جامعہ میں آ گئی ہے۔ اس کا مصنف نو مسلم ہندو ہے۔ اس کا پہلا نام ہر کشن تھا اور اسلامی نام عبد القوی ہے۔ وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے، مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:۔

"بندہ فقیر حقیر عبد القوی ساکن سامانہ بخدمت اہل اسلام الناس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہر کشن بود، ایمان آورد بر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است، وکفر باطل، کفر را رد ساختہ، اسلام را حق شناختہ، نام خود را عبد القوی نہاد۔۔۔۔ شوال ۱۰۸۸ھ از دور خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہِ غازی، صدقہ کہ صدق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عدلہٗ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، علمہ کہ علم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، وشجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ، خلد اللہ ملکہٗ و عمرہٗ وسلطنتہ در خاطر رسید مردمان کہ در کفر اند۔۔۔۔ (عبارت غلط ہے) رد کفر در قلم باید آورد و تا کذب کفر و صدق اسلام معلوم گردد۔ واگر مسلمان بخواند سلامتی ایمان است، اگر کافر بخواند در باب ایناں خدائے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام ایں کتاب ردالکفر بحجت القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے) نہادہ شد، امید کہ ایں نسخہ کمترین

بندگان بدست ہر مسلمان کہ برسد کیفیت ایں رسالہ منتشر گرداند، سعادت دارین یابد، بطرف دلائل وعقاید نظر کنند نہ بطرف املا وانشا نظر کنند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح بدہد، ایں نیز ثواب ایماں باشد۔"

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے۔ ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ آخر سے کچھ ناتمام ہے۔ ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقائد ورسوم کو لیکر اس کی تفصیل کی ہے اور اسکی خرابیاں دکھائی ہیں اور اس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں۔

بہر حال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی

فاؤسٹ کے چند ورق

فاؤسٹ جرمنی کے بادشاہ سخن گوئٹے کا مشہور ڈراما ہے۔ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاءاللہ اکتوبر تک انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوجائے گا۔ اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایک دیباچہ ہے جس میں گوئٹے نے دکھایا ہے کہ ڈراما لکھنے والے کو کس طرح مختلف مذاق کے لوگوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(عابد)

تماشاگاہ کا تمہیدی سین

منیجر، شاعر، مسخرا۔

منیجر - تم دونوں نے بارہا مصیبت اور پریشانی میں میری مدد کی ہے، اب یہ تو کہو، تمہارے خیال میں ہمارا کام جرمنی کی سرزمین میں چلے گا یا نہیں؟ مجھے تو عوام کو خوش کرنے کی فکر ہے کیونکہ اُن کا عمل اس پر ہے "جیو اور جینے دو" کھمبے کھڑے ہوچکے ہیں، تختے جڑے جاچکے ہیں۔ اب ہر شخص ہم سے روحانی ضیافت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ دیکھو تماشائی پالتھی مارے، بھویں چڑھائے بیٹھے ہیں اور ایسی چیز دیکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ حیران رہجائیں۔ میں اُن کے مذاق کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن اس بار میں ایسا پریشان ہوں کہ کبھی نہ تھا۔ یہ مانا کہ وہ اعلیٰ درجے کے تماشے دیکھنے کے عادی نہیں، لیکن کمبخت ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آخر انہیں کیا چیز دکھائیں جو نئی اور انوکھی ہو، معنی خیز ہو، مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہو؟ کیونکہ سچ پوچھو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے سے تھیٹر میں تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ اور وہ چیختے چلاتے، داخلے کے تنگ دروازے پر یوں پلے پڑتے ہیں گویا وہ جنت کا دروازہ ہے۔ چار بجے دن ہی سے ٹکٹ گھر کے سامنے ان میں دھکم دھکا

ہونے لگتی ہے، اور ہر شخص ٹکٹ کے لیے جان لڑا دیتا ہے جیسے قحط کے زمانہ میں نان بائی کی دوکان پر۔ یہ معجزہ بس شاعر ہی دکھا سکتا ہے، تم بھی آج یہ دکھا دو تو کیا بات ہے۔

شاعر ۔ میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ لو، جسے دیکھکر رفعت خیال رخصت ہو جاتی ہے۔ مجھے اُٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ مجھے تو اُس گوشۂ تنہائی میں لیجاؤ جہاں بہشت کا سا سکون ہے۔ جہاں اُس خالص مسرت کے پھول کھلتے ہیں جس کا لطف بس شاعر ہی اُٹھا سکتا ہے، جہاں دل کو محبت اور دوستی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ باغ جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا اور سنوارا ہے۔ ہائے کیا غضب ہے کہ وہ اچھوتے مضامین جو شاعر کے قلب کی گہرائی میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنہیں اسکی زبان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، بُرے بھلے انداز سے بیان کرتی ہے، موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ بن جاتے ہیں (حالانکہ اکثر شاعر کی افکار برسوں کی ریاضت کے بعد مکمل صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہیں)۔ ملمع کی چیزیں موجودہ لمحے کے لئے ہیں، اور کھرا سونا آیندہ نسلوں کے لئے امانت رہتا ہے۔

مسخرا ۔ آیندہ نسلیں! بخشئے حضرت، اگر میں آیندہ نسلوں کی فکر میں رہوں تو موجودہ نسلوں کو کون ہنسائے؟ یہ بھی تو ہنسنا چاہتی ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ مانا کہ یہ لوگ بچے ہیں مگر بچے بھی تو آخر انسان ہیں، جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلون کا رونا نہیں روتا، اِس کے لئے تو جتنا بڑا دائرہ ہو اتنا ہی اچھا۔ اس میں اُس کی اور بھی جیت ہے۔ تو سمجھے بھائی ذرا ہمت کر ڈالو، ہمیں وہ گیت سناؤ جس میں تخیل اپنے پورے لطائف کے ساتھ ہو اور حکمت بھی ہو، عقل سلیم بھی ہو، جذبات بھی ہوں، جوش بھی ہو، مگر یہ یاد رہے، مسخرا پن بھی ضرور ہو۔

منیجر ۔ خصوصاً واقعات بہت سے ہوں۔ لوگ اس لئے آتے ہیں کہ کچھ ہوتا ہوا دیکھیں۔ اگر قصے میں بہت سے دلچسپ سین ہوں، کہ لوگ حیرت سے منہ پھیلائے دیکھا کریں تو بس سمجھ لو کہ تمہاری شہرت پھیل گئی، اور تم ہر دلعزیز ہو گئے۔ بہت لوگوں کو رجھانے کے لئے بہت سی چیزیں چاہئیں تا کہ ہر شخص کو کوئی چیز اپنے ڈھب کی ملجائے۔ جو بہت کچھ دیتا ہے وہ بہتوں کو کچھ دیتا ہے اور ہر شخص خوش خوش گھر جاتا ہے۔ اگر تم قصہ دکھاتے ہو تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دکھاؤ۔ ایسے پسندے لوگوں کو پسند آئیں گے۔ ایسا قصہ لکھنا بھی آسان ہے اور دکھانا

بھی آسان، اگر مسلسل تماشا دکھایا بھی تو کیا فائدہ، دیکھنے والے سلسلے کو توڑ ہی کے دیکھیں گے۔

شاعر - اور تماشا جو مٹی میں ملجائے گا! اگر تمہیں اس کا کیا احساس، تم کیا جانو اس میں شاعر کی کیسی ذلت ہے۔ تم تو بازی گر شاعروں کی تُک بندی کا کلمہ پڑھتے ہو۔

منیجر - تم خوب اعتراض کرو، میں بُرا نہیں مانتا۔ جو کوئی اپنے کام میں کامیابی چاہتا ہے، وہ مناسب اوزار استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا تو سوچو تمہیں کن خامکاروں سے سابقہ ہے، جن کیلئے تم لکھتے ہو ذرا ان کو بھی تو دیکھو۔ کوئی دتماشے میں بے شغلی سے اکتا کر آیا ہے۔ کوئی الوانِ نعمت سے سیر ہو کر، اور قیامت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ اخبار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بہتوں کو سوانگ دیکھنے کی امید، شوق کے پروں پر اڑا کر لائی ہے۔ خواتین بناؤ سنگار کئے ہوئے (بالا نشین تماشائیوں کو) مفت کا تماشا دکھاتی ہیں۔ تم تو اپنے شاعری کی چوٹی پر تخیل کے مزے لیتے ہو، تمہاری بلا سے تھیٹر بھرا ہو یا خالی ہو۔ ذرا اپنے قدر دانوں کو قریب سے دیکھو، آدھے بھس ہیں اور آدھے بے تمیز۔ ایک تو تماشے سے جاکر تاش کھیلے گا، اور دوسرا کسی بیوہ کے آغوش میں رات گزاریگا۔ ان بیچارے سادہ لوحوں کو کیوں ستاتے ہو، کہاں یہ اور کہاں آرٹ کی دیویاں! بس تم تو لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ، اور لکھو، اور لکھو، پھر تمہاری کامیابی یقینی ہے، ایسی ترکیب کرو کہ لوگ چکر میں آجائیں، ان کو خوش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ ہائیں یہ تمہیں کیا ہوا۔ خوش ہو گئے یا خفا ہو گئے ہو؟

شاعر - جاؤ دور ہو یہاں سے، کسی اور غلام کو ڈھونڈ! کیا خوب! شاعر تیری خاطر اپنے عزیز ترین حق کو، فطرت کے عطا کئے ہوئے حقِ انسانیت کو، مسخرے پن میں برباد کر دے! اُس کے پاس کیا چیز ہے جس سے وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، اور سارے عناصر پر حکمرانی کرتا ہے، بجز اُس ہم آہنگی کے جو اُس کے دل کو ساری کائنات سے متحد کر دیتی ہے؟ جب فطرت ابدی رشتۂ تقدیر کو بے پروائی سے کات کر بل پر بل دیے جاتی ہے اور ربابِ زندگی کے اُلجھے ہوئے تاروں سے بے سُری صدائیں نکلکر سامعہ خراشی کرتی ہیں تو کون دیدہ ریزی سے ان تاروں کو سلجھاتا ہے اور اُن کو کسکر نغمۂ حیات میں روانی پیدا کرتا ہے؟ کون انفرادی روح کا سُر کائنات کے مہا سُر سے ملا کر ہم آہنگ، دلکش راگ سناتا ہے؟ کون جذباتِ قلب کی شورشوں سے طوفان کا منظر دکھاتا ہے؟ کون سنجیدہ تفکر سے شفقِ شام کا سماں باندھتا ہے؟ کون بہار کے سارے خوش رنگ پھولوں کو محبوب

کی رہ گزر میں بچھا دیتا ہے؟ کون بے حقیقت عنبر پتوں سے عزت کے ہار بنا کر سورما کے گلے میں ڈالتا ہے؟ کون کوہ اولمپس[1] کی حفاظت کرتا ہے اور دیوتاؤں میں میل کراتا ہے؟ وہی قوتِ انسانی کا اعلیٰ مظہر جسے شاعر کہتے ہیں۔

مسخرا اچھا اب مجھ سے سنئے یہ قوت کیونکر ظاہر ہوتی ہے، شاعری کا دھندا اسی طرح چلتا ہے جیسے عاشقی کا سودا ہوا کرتا ہے۔ کوئی اچھی صورت نظر آئی دل پر چوٹ لگی، قدم رک گئے اور رفتہ رفتہ ہم دامِ الفت میں اسیر ہو گئے، پہلے تو قسمت یاوری کرتی ہے پھر اُس سے لڑائی ٹھن جاتی ہے پہلے زمانے نے مسرت کی ایک جھلک دکھائی پھر ستم ظریفی شروع کر دی۔ بس چشم زدن میں ایک رومان تیار ہو گیا۔ آؤ ہم بھی ایک تماشا دکھائیں۔ ہم اپنا موضوع انسانی زندگی کو بنالو، اسے بسر سب کرتے ہیں مگر سمجھتے کم ہیں، اُس کا جو رخ لیلو وہی دلچسپ ہے۔ گوناگوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم، غلطیوں کا انبار اور حقیقت کی ایک ذراسی چنگاری۔ اس نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے ساری دنیا کو سرور اور تقویت حاصل ہو۔ پھر دیکھنا تمہارے تماشہ میں کیسے کیسے حسین جوان آتے ہیں اور تمہاری لن ترانیوں کو کس شوق سے سنتے ہیں۔ پھر ہر دردآشنا دل تمہارے کلام سے حسرت و اندوہ کا لطف اُٹھائے گا، کوئی بات ایک کو تڑپائے گی، کوئی دوسرے کو اور ہر شخص کو وہی چیز نظر آئیگی جو اُس کے دل میں ہے۔ یہ نوجوان اب تک ذراسی بات میں ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔ اب تک زورِ کلام کی قدر کرتے ہیں اور ظاہری خوبیوں پر سر دھنتے ہیں پختہ مغزوں سے بیشک کوئی امید نہیں لیکن خام کار نوجوان تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

شاعر اچھا تو مجھے بھی وہ دن واپس لادو جب میں انکی طرح جوان تھا، جب میرے سرچشمۂ فکر سے لگاتار نئے نئے نغمے اُبلتے تھے، جب دنیا میری نظروں میں ایک طلسم اسرار تھی اور ہر کلی ایک رازِ سربستہ۔ آہ اُس زمانے میں سب وادیاں پھولوں سے مالامال تھیں اور یہ سب پھول میرے دامن میں تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اور سب کچھ تھا۔ یعنی ایک دل جس میں حقیقت کی طلب تھی اور مجاز کا عشق لاؤ مجھے وہ من

---

[1] یونانی علم الاصنام میں اولمپس اُس پہاڑ کا نام ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

-

کی موجیں اسی اگلی سی وحشت کے ساتھہ واپس دے دو۔ وہ گہری پُر درد لذتیں، وہ نفرت کی قوت اور محبت کی طاقت، لاؤ پھر مجھے جوانی پھیر دو۔

مسخرا ۔ میرے پیارے دوست تمہیں جوانی کی ضرورت جب ہوتی کہ تم میدانِ جنگ میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوتے یا کوئی خوبصورت نازنین تمہارے گلے میں بانہیں ڈالکر زور سے بھینچ لیتی، یا تم دوڑ میں مقابلہ کرتے اور انتہا تک پہونچنے کی قوت نہ پاکر انعامی ہار کو دور سے دیکھہ کر للچاتے، یا دیوانہ وار رقص کرنے کے بعد رنگ رلیاں مناتے اور شراب وکباب میں رات بسر کرنے کے قصد سے بیٹھتے۔ مگر بڑے میاں، تمہارا کام تو یہ ہے کہ سازِ زندگی کے جانے بوجھے تاروں کو ہمت اور خوش اسلوبی کے ساتھہ بجاؤ اور جو منزل تمہارے پیشِ نظر ہے وہاں تک بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جاؤ۔ یقین جانو کہ اس سے ہمارے دل میں تمہارا احترام کم نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کہ بڑھاپے میں بچپن لوٹ آتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپن نہیں جاتا۔

منیجر ۔ بس باتیں بہت ہوچکیں اب عمل کی باری ہے۔ جتنا وقت اِس چنین وچنان میں ضائع ہوا اسمیں کوئی مفید کام ہوسکتا تھا۔ یہ بیکار عذر ہے کہ طبیعت موزوں نہیں۔ جو ہچکچاتا ہے اُس کی طبیعت کبھی موزوں نہیں ہوتی۔ جب تم شاعر بنتے ہو تو شاعری کی باگیں سنبھالو۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے، ہمیں زوردار شرابِ معنوی چاہیئے، بس دیر نہ کرو جھٹ پٹ تیار کردو۔ جو کام آج نہ ہوا وہ کل بھی نہ ہوگا۔ کوئی دن بیکار نہ کھونا چاہیئے۔ ہمت مردانہ وقت کو ایسا مضبوط پکڑتی ہے کہ وہ نکل کر جا نہیں سکتا تب اُسے چار ناچار کام کرنا پڑتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ ہماری جرمن اسٹیج پر جس کا جو جی چاہے دکھا سکتا ہے اس لئے تم بھی پردوں اور مشینوں سے دل کھول کر کام لو، ہلکی اور تیز روشنی دونوں کو استعمال کرو اور ستاروں کی بھرمار کردو۔ ہمارے یہاں پانی، آگ، پہاڑ، چرند، پرند کی کمی نہیں۔ بس اسی لکڑی کے تنگ گھرونڈے کے اندر ساری کائنات کا نقشہ دکھادو، آسمان سے زمین، زمین سے پاتال تک سیر کرو، تیزی سے مگر سنبھلے ہوئے۔

اقتباسات

"یورپ کا فرض"

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کیلئے روس اور امریکہ بھی اسیطرح 'یورپ' ہیں جیسے خود 'یورپ' وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاؤنٹ کیزرلنگ کی نئی کتاب 'یورپ' کو بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے پڑھینگے۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے: "آج یورپ کے ذمہ جو فرض عاید ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اسپر کبھی عاید نہیں ہوا تھا۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات اس وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اسمیں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اسے بجھنے سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے۔" جدید یورپ کے اہلِ نظر میں اس وقت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے، ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے تاریک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بپتسمہ دیں۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چلکر انحطاط تمدن تک کا چکر جو ہر تمدنی زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کیلئے بھی قریب الختم ہے۔ اور اب کیزرلنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ایک نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی بلند ترسطح پر پہنچا دے۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمامتر توجہ کا مادی اور جماعتی مقاصد پر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹتا ہونا۔ اس طرح امریکہ بھی اس کے نزدیک ایک نئے دور تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان رقیبوں کے درمیان آپھنسا ہے جن میں صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظر انداز کیجائیں گی۔ بعض جدید ماہرین نفسیات کا خصوصاً آڈلر کا ذکر کرکے کیزرلنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا

مطمح نظر دراصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی "انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت۔ میں، گروہ میں۔ بھر گم کردے۔

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم الشان تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں بقول کیزرلنگ یورپ پر اس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہو جائے تو اس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل و عشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں۔ کوئی چیز جس میں ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو مؤثر نہیں ہو سکتی۔ لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جلکر خاکستر مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہو جائیگا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن ہو نہ پائیگا۔ یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں اور جبلت و جذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں۔ جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔

رچارڈ ریس دراید لفی، لندن

حکومت ہند کی طرف سے ہر سال ہندوستان کے متعلق ایک رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیجاتی ہے جسمیں سال کے تمام اہم معاملات کا ذکر اور ان پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے ۱۹۲۷-۲۸ء کی رپورٹ جسے مسٹر کوٹ مین نے مرتب کیا ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس میں تعلیم پر جو حصہ ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ کُل ملک میں ابتدائی تعلیم ۱۱۴ بلدیوں میں اور ۱۵۲۷ دیہی علاقوں میں جبری ہے۔ ذیل میں جو نقشہ درج ہے اِس سے ظاہر ہوگا کہ مختلف صوبوں میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی تقسیم کیا ہے۔ اس تحریک میں پنجاب کا حصہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ٹھیک نصف تعداد بلدیوں کی اور ۲۸ چھوڑ کر سب کے سب وہ دیہی علاقے اس صوبہ میں ہیں جہاں ابتدائی تعلیم جبری ہے۔ نقشہ درج ذیل ہے:-

صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے	صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے
مدراس	۲۱	۳	برما	۰	۰
بمبئی	۷	۰	بہار و اڑیسہ	۱	۴
بنگال	۷	۰	صوبہ متوسط	۳	۲۱
صوبہ متحدہ	۲۵	۰	اسام		
پنجاب	۵۷	۱۴۹۹	میزان کل	۱۱۴	۱۵۲۷

پنچ ذاتوں کی تعلیم کے متعلق رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ برما اور آسام کو چھوڑ کر باقی ۷ صوبوں میں پنچ ذات کے طلبہ کی تعداد چھ لاکھ سرسٹھ ہزار ہے۔ یعنی پنچ ذات کی کل آبادی میں سے ۲،۳ فی صدی۔ ان طلبہ کی زیادہ تر تعداد ابھی ابتدائی مدارج میں ہے اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بہت ہی کم۔ مثلاً ۲۶-۱۹۲۵ء میں مدراس میں کل ۲۳ ایسے طلبہ کالجوں میں پڑھ رہے تھے، بمبئی میں کل ۱۴، صوبجات متحدہ میں صرف ۱۱، صوبہ متوسط میں ۸، بہار و اڑیسہ میں صرف ۱، اور پنجاب میں ایک بھی نہیں۔

" یہ احساس عام ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی حالت کمیت کے لحاظ سے چاہے کتنی ہی اطمینان بخش ہو، کیفیت کے اعتبار سے اس میں بہت ہی کمیاں ہیں۔ یہ خیال خاص طور پر ثانوی

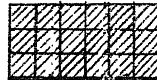
تعلیم کی بابتہ درست ہے جو بہ حیثیت مجموعی مغربی معیار کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہے اور بعض حصوں میں غیر منظم۔ طریق تعلیم ناقص ہے؛ اساتذہ اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتے؛ اور طلبہ کا مطمح نظر بس روپیہ کمانا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں تعلیم کے اخلاقی، جماعتی اور جسمانی پہلو پر بہت کم توجہ کیگئی ہے اور ذہنی پہلو سب کچھ رہا ہے۔"

ہر تعلیمی کام کرنے والا جانتا ہے کہ تعلیم عمر بھر کا دھندا ہے؛ اور اگر ملک میں جمہوری اداروں کو چلانا ہے تو عام بالغ لوگوں کی تعلیم کا انتظام لازمی ہے تاکہ وہ اپنے حق رائے کو مناسب طور پر استعمال کر سکیں۔ تعلیم گاہوں کے کام کو شہروں میں وسعت دینا تو دشوار نہیں البتہ دیہی آبادی کا معاملہ بہت نازک ہے۔ پچھلے زمانہ میں اس آبادی کے لئے مختلف تدبیریں ہندوستان میں اختیار کیگئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ صحت اور عام مفید باتوں پر تقریروں کا انتظام کیا گیا۔ دوسری تدبیر مدارس شبینہ کا قیام ہے۔ ایک اور صورت یہ کیگئی کہ علمی پیشہ کے لوگوں کو گاؤں میں رہنے کی ترغیب دیجائے۔ کہیں یہ کیا گیا کہ گاؤں میں کتب خانہ یا ابتدائی ادبی اور علمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ ذیل میں ہم وہ اعداد نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں مدارس شبینہ کی تعداد اور ان میں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ اسمیں بمبئی، پنجاب، برما اور صوبجات متوسط کے اعداد میں تو صرف بالغ شامل ہیں لیکن دوسرے اعداد میں بالغ اور نابالغ دونوں ہیں۔

صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ	صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ
مدراس	۵۲۸۷	۱۳۶۶۲۶	برما	۱۹	۱۰۶۵
بمبئی	۱۹۰۱	۷۷۳۰	بہار و اڑیسہ	۱۰۳۶	۲۲۷۰۱
بنگال	۱۴۴۵	۲۶۷۷۳	صوبجات متوسط	۴۱	۱۰۶۷
پنجاب	۳۲۰۸	۸۵۴۲۲	میزان کل	۱۱,۳۲۷	۲۸۲,۳۸۴

ذیل میں ہم اس رپورٹ سے چار نقشے نقل کرتے ہیں جو یقین ہے کہ ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

برطانوی ہند میں خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کا تناسب

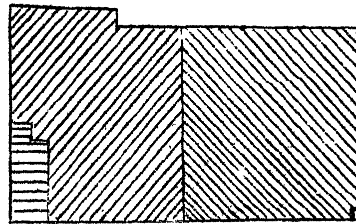


ہر مردم شماری پر نیز ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء و ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کی تخمینی آبادی میں مرد اور عورتوں کا تناسب اور خواندہ و ناخواندہ مرد و عورتوں کی تعداد

آبادی (ملین میں: ملین = ۱۰ لاکھ)

۱۸۷۲

مرد ۱۰۶ عورتیں ۱۰۰ کل ۲۰۶

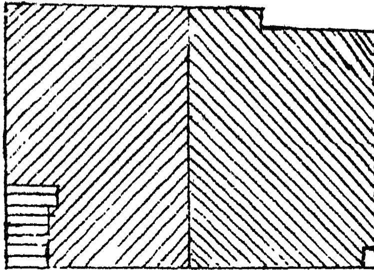


خواندہ: مرد ۹ ملین۔ عورتیں ۲ر۔ کل ۲ر۹

آبادی (ملین میں)

۱۸۸۱

مرد ۱۳۰ عورتیں ۱۲۴ کل ۲۵۴

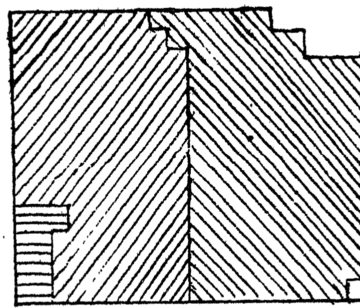


خواندہ: مرد ۵ر۱۰۔ عورتیں ۴ر۔ کل ۹ر۱۰

آبادی (ملین میں)

۱۸۹۱

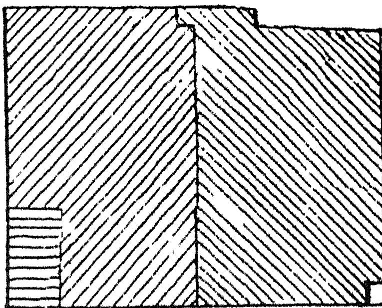
مرد ۱۴۷ عورتیں ۱۴۰ کل ۲۸۷



خواندہ: مرد ۵ر۱۱۔ عورتیں ۵ر۔ کل ۱۲

آبادی (ملین میں)

مرد ۱۴۹ عورتیں ۱۴۴ کل ۲۹۳

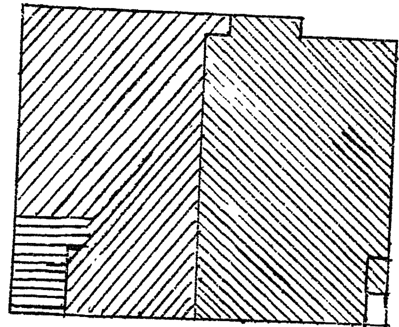


خواندہ: مرد ۷ر۱۴۰۔ عورتیں ۱۔ کل ۷ر۱۵

آبادی (ملین میں)

۱۹۱۱

مرد ۱۶۱ عورتیں ۱۵۴ کل ۳۱۵

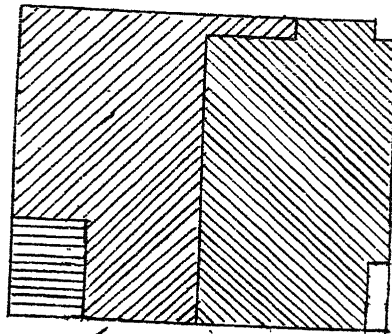


خواندہ: مرد ۱۶٫۹ - عورتیں ۱٫۶ - کل ۱۸٫۵

آبادی (ملین میں)

۱۹۲۱

مرد ۱۶۴ عورتیں ۱۵۵ کل ۳۱۹

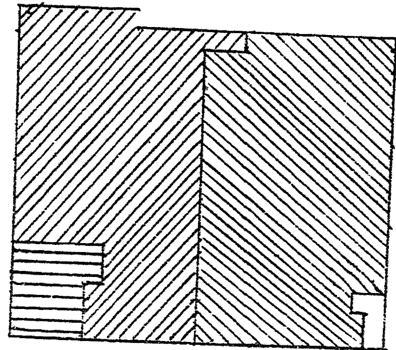


خواندہ: مرد ۱۹٫۸ - عورتیں ۲٫۸ - کل ۲۲٫۶

آبادی (ملین میں)

۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء

مرد ۱۶۸ عورتیں ۱۵۸ کل ۳۲۶

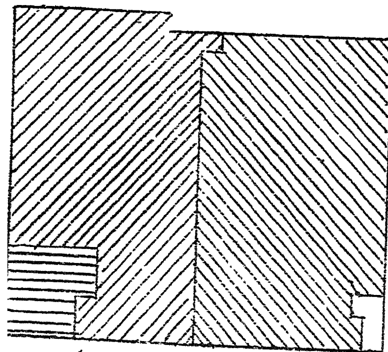


خواندہ: مرد ۲۲ - عورتیں ۳٫۳ - کل ۲۵٫۳

آبادی (ملین میں)

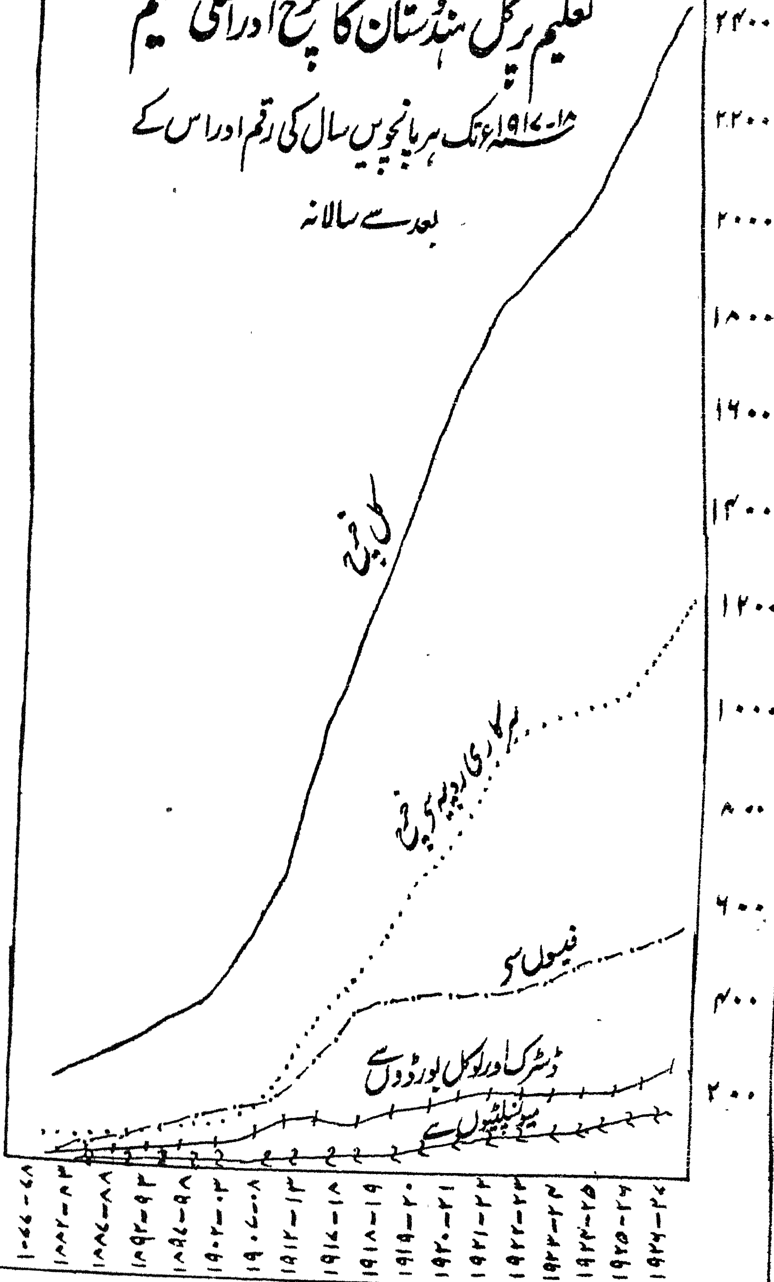
۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء

مرد ۱۶۹ عورتیں ۱۵۹ کل ۳۲۸



خواندہ: مرد ۲۲٫۷ - عورتیں ۳٫۵ - کل [illegible]

مردوں کی آبادی — عورتوں کی آبادی — خواندہ مرد — خواندہ عورتیں


تعلیم پر کل ہندوستان کا خرچ اور اسکی تقسیم
سنہ ۱۹۱۷ء تک ہر پانچویں سال کی رقم اور اس کے
بعد سے سالانہ
کل خرچ
پراونشل ریونیو سے خرچ
فیسوں سے
ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں سے
میونسپلٹیوں سے
۲۴۰۰
۲۲۰۰
۲۰۰۰
۱۸۰۰
۱۶۰۰
۱۴۰۰
۱۲۰۰
۱۰۰۰
۸۰۰
۶۰۰
۴۰۰
۲۰۰

"گڑیا کا گھر"

قومی زندگی اور قومی مسائل کے مقابلۃً تنگ دائرہ سے گذرنا، دوسری سرزمین، دوسرے ماحول میں انسانی زندگی کا مشاہدہ کرنا ذہنیت کی صحیح تربیت کے لئے لازم ہے، اُسی طرح جیسے آب وہوا کی تبدیلی جسمانی صحت کی شرط ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور محدود تجربہ تعصب اور بیہودہ خودستائی پیدا کرتے ہیں، اور جس قوم کو اپنی عظمت کا مغالطہ ہو جائے اُس کی نشوونما سمجھنا چاہئے ختم ہوگئی۔ ہندوستانی ذہنیت اس مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت ہر روشن خیال ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی اخلاقی حالت پر غور کرکے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے معیار اور نصب العین مقرر کرے۔ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ اُنکی آرزوؤں کا امتحان لے۔

یورپین تہذیب کے ہندوستان میں بہت سے دوست ہیں اور بہت سے دشمن اُسے سمجھنے والے کم ہیں۔ یہ اندیشہ ہر سب کو ہے کہ ہم اس کے اثرات سے بالکل بچ نہیں سکتے، اور اسی وجہ سے دوستی اور دشمنی دونوں میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ ہم یورپین تہذیب کی اصل صورت دیکھنے سے عموماً محروم رہتے ہیں، تو ہم اکثر غلط فہمیاں معاف بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض بھی ہو جاتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے یورپین تہذیب کی سیرت کو سمجھیں اور سمجھائیں اور نظر کے فریبوں سے گزر کر اس کی اصلیت تک پہونچیں۔

مشرقی زندگی ہمیشہ سے ایسے تخیلات کے ماتحت رہی ہے جو عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے، جن کے مطابق زندگی کے ہر پہلو کے لئے معیار اور قوانین مقرر ہوتے تھے۔ مغربی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلا دھکا اس بات سے پہنچتا ہے کہ وہ کوئی عام اخلاقی

اصول تسلیم نہیں کرتی، اور ریاست کے قانون کے حدود میں فرد کو کامل آزادی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کے لباس تک کو مذہبی تعلیم کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یورپ میں لباس کیا اخلاق تک ہر عورت اپنے لئے طے کر سکتی ہے اور جب تک وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس کی قانوناً سزا مقرر ہے عام رائے بھی اُس کی زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ اس آزادی کے نتائج برے بھی ہوئے ہیں اور اچھے بھی، مگر برے ہوں یا بھلے، وہ انسانی تجربہ کا ایک ذخیرہ ہیں جس سے مستفید نہ ہونا سخت حماقت ہوگی۔ ہمارے پاس اپنے معیار موجود ہیں۔ ہماری تاریخ کا سلسلہ قائم ہے، پھر یورپین تہذیب کے فریب سے ہمیں کیا اندیشہ، اُس کے تجربہ کو کام میں لانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

افراد کی آزادی کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس تنقید اور نکتہ چینی اور انصاف پسند سماجی ضمیر نے یہ آزادی رفتہ رفتہ قائم کی ہے اُس کی اہمیت اور ضرورت کو ہمیں بلا تکلف تسلیم کر لینا چاہئے۔ افراد کی موجودہ آزادی کی عمارت کلیسا کے کھنڈروں پر تعمیر کی گئی ہے، اور یہ تخریب اور تعمیر دونوں اسی تنقید اور انصاف پسند سماجی ضمیر کے کارنامے ہیں۔ بیچ کی صدیوں میں مذہب اور خدا دونو کلیسا کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے گویا انسان کی فلاح کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ مارٹن لوتر نے یہ ٹھیکہ اُس کے قبضہ سے چھین کر ریاست اور ملکی کلیسا کے سپرد کیا۔ اس لئے کہ اُس کا ضمیر کیتھلک کلیسا کی تعلیم اور اس کے طرز عمل کی درستی کو نہیں تسلیم کر سکا دو تین صدیوں بعد جو آگ لوتر نے جلائی تھی، بجھنے لگی۔ تو یورپین ضمیر نے تنقید کے ذریعہ سے اُس تخیل کی جڑ کاٹ دی جو لوتر کے زمانے سے اس وقت تک غالب رہا تھا۔ کیتھلک کلیسا کا اصول "ایک خدا، ایک کلیسا، ایک قانون" تھا۔ لوتر نے خدا کی وحدت تو قائم رکھی مگر کلیسا اور قانون میں اختلاف اور رنگا رنگی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اٹھارہویں صدی کے انقلاب نے اس انتشار کو ایک درجہ اور بڑھا دیا، اور خدا کی وحدت بھی قائم نہ رہنے دی۔ ایک لحاظ سے تو یہ انقلاب برحق تھا، اس لئے کہ پرانے مذہبی اور اخلاقی اصول بالکل مردہ ہو گئے تھے، اور

اُنکے محافظوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُن میں دوبارہ جان پھونکنے کا حوصلہ کریں۔ مذہب اور اخلاق کی حفاظت یوں ہی ہو سکتی تھی کہ ہر شخص اپنے عقیدے کا ذمہ دار کر دیا جائے اور اُن کی درستی یا غلطی کا خود فیصلہ کرے۔ اس انقلاب کے پہلے رہنماؤں کی امیدیں کچھ بھی رہی ہوں۔ فتح اس میں عقل کو حاصل ہوئی، اور سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا، اس لئے کہ اُسکی سماجی حیثیت بالکل جاتی رہی اور افراد کی ذہنیت پر عقل اور تجربہ کی خواہش اور مادی رجحان اس قدر غالب آ گئے کہ مذہب کے لئے نہ دماغ میں گنجائش رہی نہ دل میں۔

مذہب کے ساتھ لازم تھا کہ اخلاقی معیار بھی شک اور تجربہ پر قربان کئے جائیں، اور ہر فرد اپنے لئے بہترین اخلاقی اصول دریافت کرنے کا بار اٹھائے۔ قانون نے شرط لگائی کہ جرم نہ سرزد ہوں، عام رائے نے شرط لگائی کہ کامیابی ہو، باقی افراد کو خود مختاری دیدی گئی۔ ہر انسان اپنی فلاح ہی چاہتا ہے، خواہ روحانی ہو یا جسمانی، موت سے پہلے یا موت کے بعد، اور چونکہ تجربہ کا میدان اسقدر وسیع تھا، اس لئے جو لگام مذہب نے چھوڑی وہ تنقید کے ہاتھ میں پہنچ گئی، اور یورپ میں تمام روشن خیال لوگ رہبری کے لئے اُن شخصیتوں کی طرف مڑے جو اُن کی زندگی میں نکتہ چینی کر سکتی تھیں، اور عوام کے ضمیر کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے مختلف اصول اور اُنکی عملی صورتیں پیش کر سکتی تھیں۔ ان نقادوں کے مشورے پر عمل کرنا کسی شخص پر لازم نہیں رہا ہے۔ لیکن یورپ کی موجودہ اخلاقی حالت بڑی حد تک انہیں کی بنائی اور بگاڑی ہوئی ہے۔

یورپ میں کوئی عام مذہبی یا اخلاقی نصب العین باقی نہیں رہا ہے لیکن اُس کی بجائے تہذیب اور تاریخ نے کامل انسانیت کی ایک آرزو پیدا کر دی ہے جو مذہب اور اخلاق کی جگہ پر محرک کا کام دیتی ہے۔ اسی انسانیت اور اسی کمال کی تمنا نے کیتھلک کلیسا کی بنیاد اکھاڑی مذہب سے جبر کی تعلیم اور تاثیر نکالدی اگرچہ اس کے ساتھ مذہب کے اڑ جانے کا بھی اندیشہ تھا اور اب یہی انسانیت یوروپین تہذیب کا مایۂ ناز ہے۔ اُس کی تلاش میں ہزار ہا زندگیاں تباہ

ہوئی ہیں، اور ہو رہی ہیں، اور اس پر بھی جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ممکن ہے بہت تھوڑا نظر آئے، لیکن کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوا ہے۔ اور ہر انسان کو اُس کی قدر کرنا چاہیئے

ہم کو بہر حال اس حوصلہ اور ایثار کا مشاہدہ کرکے اپنی غلامی اور غفلت یاد کرنی چاہئے، ہمارے مذہب میں بے شمار خوبیاں ہیں، ہمارے اخلاقی اصول نہایت صحیح ہیں لیکن ہم نہ اپنے مذہب کے اہل رہے ہیں نہ اپنی اخلاقی تعلیم کے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا ہے۔ بے سمجھ اور بے زبان جانوروں کی طرح جس طرف منہ موڑا گیا اُدھر چلائے، اور کبھی یہ نہ سوچا کہ انسانیت کے فرائض کیا ہیں۔ مذہب کن صورتوں میں قومی زندگی کا محرک ہوتا ہے، کن صورتوں میں نہیں۔ ہمارے ضمیروں پر غفلت طاری ہوگئی، دل بے حس ہوگئے اور اخلاقی پستی نے ہم کو غلام بنا کر چھوڑا۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں کی بداخلاقی پر افسوس کرتے ہیں جو اس وقت آسانی اور بے فکری سے ہمارے ملک اور ہماری ذہنیت پر حکومت کر رہے ہیں۔ اب اگر ہمارے لئے انسانیت کے اہل بننے کی کوئی صورت باقی ہے تو وہ یہی کہ ہم یورپ سے تنقید اور ذاتی تجربہ کی دقعت کرنا سیکھیں۔ اپنے ضمیروں کو بیدار اور ذہن حسن بنائیں۔ قومی زندگی سے کنارہ کش اور بیگانہ ہونے کی بجائے قوم کی ہر دشواری اپنی مصیبت سمجھیں، بُروں سے لڑیں، اچھوں کی مدد کریں۔ اور اپنے ماحول کی حالت پر غور کرکے اپنی اور اپنے عقیدوں کی خامیاں معلوم کرتے رہیں۔

ہم میں سے جو کوئی قومی اصلاح کی آرزو رکھتا ہے اُسے اِبسن کا کچھ دنوں شاگرد رہنا چاہئے۔ ابسن صرف ایک ایسا نقاد نہیں تھا جو قومی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہو۔ اور ایسی باتیں بتائے جو اخبار اور پولیس کی زد سے باہر ہوں۔ وہ انسان کی فطرت سے اس قدر واقف تھا کہ نظر اُسے کبھی کوئی فریب نہ دے سکی۔ اور وہ مبالغہ اور مغالطہ دہی سے بچا رہا۔ اُس نے صرف عام زندگی کو اپنا منظر بنایا ہے، مگر جن مسائل پر اس نے بحث

کی ہے وہ ہر انسان اور ہر ماحول کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اُسکا تصور بھی ایسا وسیع تھا کہ اُس نے چند ڈراموں میں یورپین زندگی کے تقریباً تمام اہم مسائل پر رائے زنی کی ہے، اور ساتھ ہی فطر انسانی کی بہت سی دلچسپ اور عبرت آموز خصوصیات ظاہر کی ہیں۔ وہ صرف ڈراما نویسی میں ایک نئے طرز کا موجد نہیں تھا، نہ آرام پسند اور مطمئن انسانوں کی بغل میں ایک نیا کانٹا۔ وہ ایک نئی زندگی کا پیغام بھی لایا، ایسی زندگی جس میں ایثار اور بلند اخلاقی حوصلہ قومی اور انفرادی زندگی کی سب سے عزیز دولت ہوں، جس میں ساری جماعت ہر فرد کی تکلیفیں محسوس کرے، اور ہر فرد اپنے فرض کو اپنا حق سمجھے۔ اُس کے ہر ڈراما میں کسی نہ کسی شکل میں یہ پیغام سنایا گیا ہے، اور یہ پیغام ایسا ہے جسے سن کر ایشیا اور یورپ کا ہر باشندہ اپنے دل میں جوش پیدا کر سکتا ہے۔

تمدنوں کی ترقی اور تنزل، اُن کی زندگی اور موت ایسے قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو انسان کے قابو میں نہیں ہیں۔ لیکن جہانتک انسان کو اختیار ہے اُس اختیار میں مرد اور عورت یکساں شریک ہیں، اور شاعر نے اگر عورتوں کو آئین حیات کا محافظ تصور کیا تو بیجا نہیں۔ ایک نسل سے دوسری کا تعلق انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس تعلق کو جو حیثیت چاہیں دے سکتی ہیں۔ قوم کی اصلاح بھی اسی وجہ سے عورتوں کی اصلاح پر منحصر ہے کیوں کہ جو اثر وہ قبول کریں مشکل سے قوم میں دیرپا ہو سکتا ہے۔ اُنکی طبیعت میں قرار اور استقلال بھی مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، اور برے اثرات اُن تک سرایت کر جائیں تو اُنکا دور کرنا بھی نسبتاً دشوار ہوتا ہے۔ یورپ میں مردوں اور عورتوں کی باہمی زندگی کی جو صورت ہے وہ کسی ڈراما نویس کے لئے عورتوں سے قطع نظر کرنا ناممکن بنا دیتی ہے، مگر ابسن نے انہیں اپنی تصانیف میں خاص اہمیت دی ہے، اور زندگی کے ان پہلوؤں پر جو عورتوں سے متعلق ہیں، بہت روشنی ڈالی ہے۔ "گڑیا کا گھر" ہمارے نزدیک ابسن کے سب سے کامیاب ڈراموں میں سے ہے، اور جو شخص اس کی تعلیم کو ذہن نشین نہ کرے وہ عورتوں کی کبھی عزت نہیں کر سکتا۔ اور اُس سے اُنکا حق کبھی ادا نہ ہوگا۔

عورت کو گڑیا تصور کرنا ابسن کے زمانہ یا یوروپین زندگی کی خصوصیت نہیں ہے "عورت"

کے کئی مفہوم ہیں، جن میں سے "گڑیا" بھی ایک ہے، اور ابسن نے اُس کی طرف توجہ اس وجہ سے دلائی ہے کہ بہت سی عورتیں خود گڑیا بننا اور گڑیا کی زندگی بسر کرنا اپنی ہستی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں اور جو مرد اُن کی طبیعت پر تسلط کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں بڑی آسانی سے اس وہم میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضہ کچھ اور ہے، اور جس عورت نے اپنے فرائض محسوس نہ کئے وہ محض ایک گڑیا ہے اور اس کی ساری زندگی انسانیت کی تباہی کا ایک دردناک منظر۔ ابسن نے "گڑیا کے گھر" میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی ہے جو گڑیا بننے کے لئے بچپن سے تیار کی گئی تھی۔ شادی کے بعد وہ آٹھ برس تک گڑیا بنی رہی اور خوب شاد آباد رہی۔ پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ اُسے تھوڑی دیر کے لئے انسان بننا اور انسانی فرائض ادا کرنے ہوئے مگر یہ قلب ماہیت اُس کے شوہر کو بہت ناگوار گذری، دونوں نے اپنا فلسفہ زندگی واضح کر دیا، جس کا یہ انجام ہوا کہ گڑیا نے انسان بننے کے لئے گھر بار عیش و آرام، شوہر اور بچوں کو خیرباد کہا، اور اندھیری رات میں اپنی گذشتہ زندگی پر دروازہ بند کر دیا۔

"گڑیا" کے شوہر پر اُسکا اس طرح سے چلا جانا بہت شاق گذرتا ہے، اور ڈراما کے پڑھنے والے کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ خیالات کی تبدیلی "گڑیا" کو ایسے سخت رویہ پر مجبور کرتی ہے۔ ابسن کا مطلب دراصل گڑیا اور عورت کا فرق دکھانا ہے۔ حضرت عیسٰی نے کسی زمانہ میں اپنے پیروؤں سے کہا تھا کہ "جب تک تم دوبارہ پیدا نہ ہو، تم جنت میں داخل ہونے کے لائق نہیں بن سکتے"۔ ابسن ہر گڑیا کو بتانا چاہتا ہے کہ جب تک وہ غربت اور تنہائی کے مرحلے طے نہ کرے، اور اپنی پچھلی زندگی کی یادگار، پرانی محبتیں، پرانے رشتہ بالکل مٹا نہ دے، وہ گڑیا رہے گی اور عورت نہیں بن سکتی۔ اس لئے جب اسے قطعی احساس ہو کہ وہ ایک گڑیا سمجھی جاتی ہے تو اُسکا فرض ہے کہ عورت بننے کے لئے وہ ہر چیز قربان کر دے، کیونکہ انسانیت ایک ایسا بے بہا جوہر ہے کہ اس کے عوض میں جو دولت بھی قربان کیجائے کم ہے۔

ہماری زندگی میں عورتوں کا دخل اس قدر کم ہے کہ گڑیا اور عورت میں فرق کرنا، یا عورت کو انسان بننے کی ترغیب دینا کچھ سعی لاحاصل سا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر انسان بننے کی

شرط یہ ہے کہ عورت اپنے گھر بار کو چھوڑ کر تجربہ حاصل کرنے کے ارادہ سے نکل کھڑی ہو۔ تو "گڑیا" کے شوہر کی طرح ہم میں سے اکثر حیرت اور افسوس میں دیوانے ہوجائیں گے، اور عورتوں پر یہ الزام لگائیں گے کہ وہ انسان بننے کے بہانے سے اپنے فطری فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ مگر ابسن کی یہ ہرگز تعلیم نہیں ہے کہ عورتوں کو امور خانہ داری یا اولاد کی پرورش سے کنارہ کش ہوجانا چاہئے۔ ان فرائض کا پورا کرنا مرد اور عورت کی باہمی زندگی کی شرط ہے، مگر عورت کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس نے گھر کا انتظام کرلیا اور بچے پیدا کرلئے تو اس نے اپنی انسانیت کا حق ادا کردیا۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی کا ایک نصب العین ہو جس کی تمنا دونوں کے دلوں میں یکساں ہو۔ دونوں ایک ہی کوشش میں مصروف ہوں اور ایک دوسرے کی ناگزیر ہونے کا اقرار کریں۔ دونوں کو اپنا ضمیر بیدار رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ انسانیت ایسی دولت ہے جو بہت آسانی سے گم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا گم ہونا ہر مصیبت سے بدتر ہے۔ ابسن گڑیا کا گھروندا صرف اس ارادہ سے توڑتا ہے کہ اس کی جگہ پر عورت اپنا گھر بنا سکے، اور اسے اپنی انسانیت کی رونق سے منور کرے۔

ابسن کے بلند حوصلہ کو دیکھ کر جب ہم اس کے ہندوستانی قدردانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں کچھ مایوسی ہوتی ہے "گڑیا کا گھر" ایسی تصنیف ہے جسے قومی اصلاح کا محرک بنایا جاسکتا ہے، عورتوں کے لئے ایک آئینہ جس میں وہ اپنے اصلی اور لازوال حسن کا مشاہدہ کریں، مردوں کے لئے ایک حقیقت نما تصویر جس سے وہ ساری زندگی کے لئے عبرت اور سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے ناشرین کو اس سے محض ادبی دلچسپی ہے، وہ اس کی اخلاقی تعلیم اور فلسفیانہ نظریوں میں نہیں الجھنا چاہتے، اسی خیال سے غالباً ڈراما کا "مشرقی چربا" بھی اتار گیا یعنی اشخاص کے نام بدل دیئے گئے، کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ اور وہ بحیثیت ڈراما اور ادبی کارنامے کے "گڑیا کے گھر" کا پورا لطف اٹھا سکیں۔ یہ طریقہ ہماری رائے میں غلط ہے۔ اگر ہندوستانی پبلک کی واقفیت بڑھانا مقصود ہے تو ہمیں چاہئے کہ یورپین ماحول کی خصوصیات سمجھائیں اسے

کی بیوی سے باتیں بھی کرلیں اور مہاتما جی کو اپنا سلام بھی پہنچا دیا۔ اپنے ہموطنوں کے ایک مجمع میں گیا تو سب سے بغلگیر ہوا اور اکثر کی پیشانی پر بوسے دئے۔ لوگوں نے بادشاہوں میں یہ باتیں نہ دیکھی تھیں اس لئے اس نوجوان پر سب کے سب بلا تمیز مذہب و ملت عاشق سے ہوگئے۔

اس نوجوان بادشاہ نے یہی نہیں کہ ہندوستانیوں کے دل اپنے قبضہ میں کرلئے۔ یہ ہندوستان سے زیادہ خوش نصیب، زیادہ مالدار، آزاد، بادشاہتوں اور جمہوریتوں میں گیا۔ استعماری اور اشترا کی دولتوں کا مہمان رہا اور ہر جگہ اس نے لوگوں کے دل مسخر کئے۔ یہ کیسے؟ اس لئے کہ یہ آدمی تھا اور اپنی آدمیت کے آگے اپنی بادشاہت کو بھول جاتا تھا۔ اس لئے کہ ایسی ملت کا بادشاہ تھا جس میں فضیلت کا معیار دولت اور تاج و تخت نہیں بلکہ نیکی ہے۔ جس کے شاہ و غلام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو کر اپنے معبود کے آگے سربسجود ہوتے ہیں، اور جس میں "سروری" اور "خدمتگری" مترادف الفاظ ہیں۔ یہ آدمیت اس نے یورپ سے نہ سیکھی تھی، مغربی انجنیروں سیاست دانوں، تاجروں نے جن سے اسے کچھ نہ کچھ سابقہ پڑتا رہا تھا اسے اور کچھ سکھایا ہو لیکن آدمیوں میں آدمی بننا نہ سکھایا تھا۔ بیشک یہ یورپ میں مغربی وضع میں اور مغربی لباس پہنکر گیا تھا، لیکن اس کے استقبال کرنے والوں میں لاکھوں اس سے بہتر اور مغربی فیشن کے قریب تر وضع کا لباس پہنتے تھے۔ ان میں کچھ نہیں تو لاکھوں ایسے تھے جو اپنی داڑھی کے مونڈنے میں اس سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اس لئے اس کی عزت اس کے مغربی لباس اور مونڈی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بے نفس خدمتگذاری، اس کی سیرت، اس کی انسانیت کی وجہ سے ہوئی۔ اور یہ جاہل قوم کا بادشاہ اپنی شخصیت کی وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ ملکوں کے بادشاہوں اور مدبروں پر بھاری پڑا۔

اس نوجوان بادشاہ کے گرد کچھ لوگ تھے جنہوں نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ جن کے نزدیک یورپ کی ہر چیز مستحسن اور ایشیا کی ہر چیز معیوب ہے۔ انھوں نے اپنے کو اپنی ملت اور

مذہب کی قضا سے علٰحدہ کر لیا تھا اور ابھی کسی دوسری تمدنی سرزمین میں انکی جڑیں مضبوطی سے قائم نہ تھیں۔ اور کیسے ہوتیں؟ تمدنی روایات نہ ایک دن میں بنتی ہیں اور نہ ایک دن میں منتقل ہوتی ہیں۔ کچھ ان مصاحبوں، اور مشیروں کا اثر، کچھ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی یورپ کی مادی مرفہ الحالی نے اس نیک دل اور اپنی قوم کے عاشق بادشاہ پر یہ اثر ڈالا کہ میری قوم بھی اگر دنیا میں بڑھنا چاہتی ہے تو اسے اس قسم کی مادی ترقی کرنی چاہیئے۔ اس کی رگوں میں جوان خون تھا اس نے ان مشیروں کی بات مان لی خود اپنے تاثرات سے مغلوب ہو گیا اور اپنے ملک کو ایک جنبش قلم سے ایک جدید، اور متمدن ملک بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ جدت کے اس شوق نے اس کی نظر کو قوموں کے عروج کی عمیق حقیقتوں اور اخلاقی و مذہبی قوتوں کی طرف سے ہٹا دیا اور ظاہری تبدیلیوں کو غیر ضروری اہمیت دلا دی۔ "تمنا، کی بے تابی" میں وہ، بھول گیا کہ "عاشقی" بہت "صبر طلب" چیز ہے۔ قوم میں قدامت پرستی کے جو عناصر تھے، اس میں بہت سے برے اور تھوڑے ہی سے اچھے سہی، لیکن وہ سب مجتمع ہو گئے اور انہوں نے "جدت پسندی" کی اس قوت کو ایک مرتبہ تو ضرور شکست دیدی اب یہ نوجوان بادشاہ اپنے پایہ تخت سے دور پڑا ہے اور دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کر رہا ہے۔

یہ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان کا قصہ ہے۔ قدامت پرست خوش ہیں کہ جدت پسندی نے منہ کی کھائی۔ لیکن ابھی یہ خوشی ذرا قبل از وقت ہو اس سے کچھ آگے ایک ملک ترکی بھی ہے اس میں قدامت پرستی ایسی ہی منہ کی کھا چکی ہے۔ اس لئے اس معرکہ کی فتح و شکست کو اتنی اہمیت اس وقت نہیں جتنی خود اس معرکہ کی حقیقت کو ہے۔ اس لئے کہ یہ معرکہ ترکی و افغانستان تک محدود نہیں۔ یہ تمام ایشیا اور افریقہ میں، نہیں ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور آج ہی نہیں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ دنیا نے اپنی ساری تاریخ سے اس کے متعلق کوئی عملی سبق نہیں لیا۔ اور ہمیشہ پچھلی غلطیوں کی تکرار ہوئی۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی اور اجسام نامی کی حیات میں بڑی مشابہت ہو۔ باشعور نامی اجسام کی زندگی سے ہمیں جماعتی زندگی کے اس معرکہ کے متعلق کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی باشعور نامی جسم اپنی حالت پر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہتا۔ تغیرات کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور ہر لمحہ یہ جسم پہلے لمحہ سے مختلف ہوتا ہے لیکن کیا اس وجہ سے اس کی شعوری زندگی کا تسلسل اور اس کی توحید قائم نہیں رہتی۔ اس موخر الذکر تسلسل و توحید کے ختم ہوتے ہی زندگی ختم ہوجاتی ہے یا کم از کم صحت کی زندگی۔ ماضی کو حال سے مربوط رکھنے اور استقبال کے لئے ان دونوں سے کام لینے تک ہی صحیح زندگی کا قیام ہے۔ قومیں اور جماعتیں بھی اپنی زندگی کے لئے اس تسلسل کی دست نگر ہیں۔ یہ "نفسہائے رمیدہ" ہی سے زندہ اور حفظ ناموس کہن، سے باقی رہتی ہیں۔ یہ رشتہ ٹوٹا اور ان کا شیرازہ بکھرا۔

حیاتیات اور تاریخ دونوں کا سبق یہی ہے کہ جس طرح تغیر انفرادی اور قومی زندگی کا لازمہ ہے اسی طرح قدامت پسندی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں میں صحیح تناسب قائم رکھنا قاید کا کام ہے۔ جب قدامت پسندی پرانے اداروں، پرانے معیاروں، پرانی قدروں کو بے جان بنا دیتی ہے اور ان کو محض منوانے کی خاطر منواتی ہے اس وقت قاید کا کام یہی نہیں کہ وہ نئی قدریں، نئے معیار، نئے ادارے پیدا کردے۔ اس لئے کہ نئی قدریں ہیں کہاں؟ کون سا معیار ہے جسے انسان نے استعمال نہ کیا ہو؟ کون ادارہ ہے جس کی آزمائش نہ ہو چکی ہو؟ قائد ان قدیم قدروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ اپنے دل کی گرمی سے ان اداروں کے مردہ دل پجاریوں کے دل بھی گرما دیتا ہے اور اپنی سینہ کی آگ سے وہ روحانی اور اخلاقی عناصر تیار کرتا ہے جن کے بغیر قومی ترقی اور ملی فلاح کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتے

ترکی اور افغانستان دونوں کے بظاہر متضاد حالات میں ہمیں یہ مایوس کن حقیقت

اتی دیتی ہے کہ اگر ایک جگہ چند ظاہری تبدیلیاں کامیابی سے کرلینے کو حیات قومی کی تجدید
جا رہا ہے تو دوسری جگہ دنیاوی اور دینی رہزنوں کی کامیابی کو دین و مذہب کی
سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ ترکی میں جدت پسندی کی فتح ہوئی ہے اور نہ افغانستان میں
کی۔ نہ وہاں وہ ذہنی انقلاب ہوا ہے جس کے بغیر ساری جدت پسندی محض اٹکلی نقالی
، نہ یہاں دین کی وہ سچی تعبیر ہے جو دنیا کی زندگی کے لئے بھی کافی ہو اور حیات قومی کے
وارتقا کی راہ بتائے۔ وہاں تعیش کی فتح ہے، یہاں تعصب کی۔

یہی قوتیں ہمارے دروازوں پر بھی معرکہ آرا ہیں۔ کیا یہاں بھی نتیجہ ایسا ہی
رفہ ہوگا جیسا ترکی میں ہوا، یا جیسا کہ افغانستان میں؟ ربنا! اہدنا الصراط المستقیم۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ

تاریخ الامت | مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ اب تک ذیل کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول . . . . عمر

(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ . . . . عار

(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ . . . . عمر

(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول . . عار

(۵) حصہ پنجم " " جلد دوم عار

(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عار

تاریخ فلسفۂ اسلام۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹی۔ جے۔ ڈی بوئر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفۂ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت عہ

ذکریٰ۔ تفسیر پارہ عم۔ مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے قیمت عہ

عبرت۔ تفسیر سورۂ یوسف بسلسلہ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد . . . . عہ

برہان۔ سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر قیمت . . . عہ

تاریخ الدولتین۔ اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت . . . . . عمر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۲

گیارہویں صدی عیسوی

کے نصف اوّل میں

علوم صحیحہ کی حالت

یہ عہد قرونِ وسطیٰ کی علمی ترقیوں کے لئے معراج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں متعدد جیّد حکماء نظر آتے ہیں اور پہلے پہل مورخ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کس کو افضل قرار دے 'ابن یونس'، 'ابن سینا'، 'ابن الہیثم'، 'البیرونی'، 'علی ابن عیسےٰ الکرخی'، 'ابن جابر الاندلسی'، یہ سب اپنے اپنے فن کے امام ہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حکماء میں سب سے ممتاز 'البیرونی'، اور 'ابن سینا'، ہیں، انہیں دونوں کی بدولت یہ عہد علمی تاریخ کا زرین عہد بن گیا۔ ان دونوں حکما میں باہم ملاقات تھی مگر انکی طبیعتوں میں بے حد فرق تھا، 'البیرونی'، منچلا آدمی تھا اور نقادانہ انداز رکھتا تھا اور 'ابن سینا'، ترکیب و امتزاج کا بادشاہ تھا۔ 'البیرونی'، میں نئے حقائق کی دریافت کا مادہ زیادہ تھا، اس لئے وہ ہمارے زمانے کے سائنس داں کے نصب العین سے زیادہ قریب ہے، 'ابن سینا'، کا نمایاں جوہر ترتیب و تنظیم، قاموس نگاری اور فلسفیانہ غور و فکر ہے۔ مگر دونوں سائنس کی دیوی کے سچے پجاری تھے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے۔ البتہ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں 'البیرونی'، کی عمر کا زیادہ حصہ گذرا ہے اس لئے ہم اس دور کو اس کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں، 'ابن سینا' کی عمر گیارہویں صدی کے پہلے سال میں بیس برس کی تھی اور اس

نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ مگر البیرونی ۱۰۰۰ء میں ۲۷ برس کا تھا۔ اس کی پہلی اہم تصنیف آثار الباقیہ، اسی سال تکمیل کو پہنچی اور وہ ۱۰۴۸ء تک زندہ رہا اس لئے گیارہویں صدی کے نصف اول کو "البیرونی" کا عہد کہنا ہر لحاظ سے مناسب ہے۔

فلسفیانہ بنیاد | اس زمانے میں علم کا مرکز لاطینی ممالک کے مغربی حصے سے ہٹ کر عرب اور اندلس، یا یوں کہئے کہ مسیحی دنیا سے سرک کر اسلامی دنیا میں قرار پا چکا تھا۔ اسکی صریح دلیل یہ ہے کہ ان حکما کے مقابلے میں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے مسیحی دنیا میں صرف "نوٹکر لیبیو" (Notkar Lābeo) نظر آتا ہے۔ یہ شخص "سینٹ گال" کے علمی مذہب کا سب سے ممتاز نمائندہ تھا اور اس نے فلسفے کی بہت سی کتابوں کا لاطینی سے جرمن میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ جو علوم اس کی بدولت جرمن زبان میں منتقل ہوئے انکی کسی نے علمی مذاق کی کمی کے سبب سے قدردانی نہ کی لیکن اس کی خدمات بہر حال قابل ستائش ہیں۔

یہودیوں کا علمی معیار مسیحیوں سے بہت بلند تھا کیونکہ انہیں مسلم حکما کی جید تصانیف سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل تھا، سچ پوچھئے تو یہودیوں کے فلسفیانہ خیالات اس زمانے میں ہر لحاظ سے وہی تھے جو مسلمانوں کے؛ آزاد خیال یہودی معتزلہ کے اثر میں تھے اور قدامت پرست یہودی مسلم فقہا کی قدامت پرستی سے استفادہ کرتے تھے۔ اس میں انہیں بڑی سہولت یہ تھی کہ انکا تعلیم یافتہ طبقہ عبرانی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف تھا بلکہ وہ خود عموماً اپنی کتابیں عربی ہی میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے یہودی فلسفی ابن جابر الاندلسی نے جو یہودیوں کا افلاطون کہلاتا ہے، اپنی مشہور کتابیں ینبوع الحیات وغیرہ عربی میں تصنیف کیں مسیحی سولاسطی جس حد تک اس اندلسی یہودی کے خیالات سے متاثر ہوئے خود اپنے ہم مذہبوں کے خیالات سے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ابن جابر الاندلسی کی

تصانیف نے مخلوط یونانی اسلامی فلسفے کو مسیحی دنیا تک پہنچانے میں اہم ترین واسطے کا کام دیا ہے۔

ایران میں یہ دور ادبیات کی ترقی کا ہے۔ ۱۰۱۰ء میں فردوسی نے اپنا قومی رزمیہ ”شاہنامہ“ مکمل کرلیا تھا۔ اس عظیم الشان نظم کی اشاعت تاریخ تمدن میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اس کا مطالعہ نہ صرف اس عہد کے ایران کے سمجھنے کے لئے بلکہ ایرانیوں کی آئندہ ذہنی نشو و نما کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ بغیر شاہ نامے کو پڑھے ”ایران کی ذہنی زندگی کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہے جیسے بغیر ”ہومر“ کی ”ایلیڈ“ کو پڑھے ہوئے۔ یونانی تمدن کو سمجھنا یا بغیر ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی Divine Comedy کو پڑھے ہوئے اطالیہ کی تہذیب کو سمجھنا۔

اب تک ہم نے جن فلسفیانہ خیالات کا ذکر کیا ہے وہ بجائے خود کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسلامی فلسفے کے مقابلے میں ان کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ اسلامی ممالک میں فلسفے کا رواج ڈھائی سو سال سے تھا اور اب اُس میں بڑی زبردست ترقی ہو چکی تھی۔

مسلمانوں میں اس عہد میں، چار حکیم تھے، جو وسعت معلومات کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا مدمقابل نہ رکھتے تھے۔ مصر کا ابن الہیثم، ایران کے ”البیرونی“ اور ”ابن سینا“ اور اندلس کا ”ابن حزم“۔ ”ابن الہیثم“ میں فلسفیانہ گہرائی ان سب سے کم تھی لیکن علمی تجربے میں جو سلیقہ اُسے تھا، اُس کی مثال سارے قرون وسطیٰ میں کہیں نہیں ملتی۔ ”البیرونی“ اور ”ابن سینا“ کی اہمیت کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ ”البیرونی“ کی وقعت قدردانان سائنس کے دل میں اُس کی بے تعصبی، اُس کی علمی تلاش و جستجو اور اسکی ہمت کے سبب سے ہے۔ مثلاً وہ پہلا مسلمان تھا، جس نے

ہندو فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور دنیا کے دو بڑے تمدنی خطوں یعنی دنیائے اسلام اور ہندوستان کے درمیان واسطہ بنا۔ ابن سینا، ذہانت میں اُس سے کم نہ تھا، البتہ اُس میں باہر کے خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم تھی، کیونکہ اُس کا اصلی کام نئی معلومات حاصل کرنا نہ تھا بلکہ پرانی معلومات کو ترتیب دینا اور نظام بنانا۔ اُس کی تصانیف میں اسلامی فلسفہ، جو ارسطو کی روایات کا افلاطونیت اور مذہب اسلام سے امتزاج کرنا چاہتا تھا، معراج کمال کو پہنچ گیا۔ یہ یاد رہے کہ ابن سینا محض فلسفی نہ تھا بلکہ سائنس میں بھی ذہن خلاق رکھتا تھا اور اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک جامع قاموس یا معلم مرتب کرے۔ برخلاف اس کے اندلسی ابن حزم، محض فلسفی بلکہ عالم دین تھا۔ اس کا ذکر سائنس کی تاریخ میں محض اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس کے خیالات نے مغربی دنیا پر بہت وسیع اثر ڈالا ہے۔

لاطینی، انگریزی، اسلامی اور ہندو ریاضی اور ہیئت

اس زمانے میں ہمیں لاطینی کتابوں میں ریاضی خیالات کا ایک چھوٹا سا چشمہ نظر آتا ہے جو روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن اس میں دریا کی وسعت عرب کے سحاب کرم سے دو سو سال تک فیضیاب ہونے کے بعد تیرہویں صدی میں جاکر پیدا ہوتی ہے۔ زیر بحث عہد میں سوئٹزرلینڈ کے "نوٹکر لیبیو"، ہالینڈ کے اڈیبولڈ، Adebold اطالیہ کے گوئیڈو Guido اور انگلستان، کے بائرٹ فرتھ Byrhtferth کی کوششوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ انہوں نے جربرٹ، کی روایات کو زندہ رکھا۔

اسکے مقابلے میں جب ہم اسلامی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شب تاریک سے روز روشن میں یا عالم خواب سے عالم بیداری میں پہنچ گئے۔ آسانی کے لئے ہم مسلم ریاضی دانوں کی تقسیم تین طبقوں میں کرتے ہیں:- اندلسی، مصری، مشرقی۔ نفس امر کے لحاظ سے بھی یہ تقسیم صحیح ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ اسلام کی عالمگیری نے

آمد و رفت میں سہولت پیدا کر دی تھی، مقامی حالات کے اثر سے ان خطوں کی ذہنی فضا میں اختلاف تھا۔

اندلس کے ریاضی دانوں میں کوئی اہم شخصیت نظر نہیں آتی۔ الکرمانی سے 'اخوان الصفا' کے ریاضی خیالات اندلس میں رائج کئے؛ ابن السمح نے تجارتی ریاضی اور ہندسے وغیرہ پر رسائل لکھے۔ اُس نے اور 'ابن الصفا' نے 'اصطرلاب' کا استعمال سکھایا اور 'ہندی سدھانتا' کے اصول پر ہیئت کے نقشے ترتیب دئے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا ہیئت داں اور ہندسہ شلث کا سب سے بڑا ماہر قاہرہ کا 'ابن یونس' تھا، مجموعی حیثیت سے وہ مسلمان ہیئت دانوں میں سب سے ممتاز تھا اور فاطمیہ مصر کی قدردانی کی بدولت اُسے اپنے کام میں بڑی مدد ملی۔ دولت فاطمیہ کے چھٹے حکمراں 'الحاکم' کے زمانے میں قاہرہ میں ایک 'دار الحکمۃ' قائم ہوا تھا اور مامون کے عہد کی اکادمی طرح اس کے ساتھ ایک رصدگاہ بھی تھی۔ 'ابن یونس' نے ان سہولتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا اور بعض ثوابت کی صحیح پیمائش کر کے بہت سے ہیئت کے نقشے ترتیب دئے جو اس کے مربی 'الحاکم' کی نسبت سے 'حاکمی نقشے' کہلاتے ہیں، اُس نے علم مثلث کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا۔ کروی Spherisal مسائل کے نئے حل دریافت کئے اور پہلا Posthah seretical ضابطہ قائم کیا۔ ابن الہیثم، جو الحاکم کے 'دار الحکمۃ' میں اُس کا رفیق کار تھا ماہر طبعیات کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک جید ریاضی داں اور ہیئت داں بھی تھا۔ اُس نے یہ عجیب و غریب کوشش کی کہ ہیئتی انحراف اور شفق کی شعاعوں کے طول کی بنا پر کرۂ ہوا کی پیمائش کرے اس نے 'المانی' کی مساوات کو اور اُس مسئلے کو جو اُس کے نام سے مشہور ہے متقاطع مخروطات intersecting Conics کی مدد سے حل کیا۔

مشرق میں ریاضی دانوں کی بڑی کثرت تھی اور اگرچہ اُن میں ابن یونس

کے پائے کا کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن اُن کی علمی خدمات کا عام معیار بہت بلند ہے اور جدت طبع کا ثبوت دیتا ہے۔ ابن لبّان کو علم مثلث سے خاص دلچسپی تھی، اُس نے مماس کے وظیفے tangent function کا گہرا مطالعہ کیا اور ہیئت کے نقشے ترتیب دئے جن کا تھوڑے ہی دن بعد فارسی میں ترجمہ ہوگیا۔ اُس نے علم نجوم اور علم حساب پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ 'ابن الحسین' نے یونانی ہندسے کے قدیم مسائل پر غور کیا۔ (مثلاً مکعب کی تضعیف duplication of acube اور انہیں محض ہندسے کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی۔ 'ابوالجود' بھی ہندسہ داں تھا۔ اُس نے سالم مسبع اور متسع regular Pentagon and enneagon کا اور ان مسائل کا خاص طور سے مطالعہ کیا جو محض مسطر اور پرکار کی مدد سے حل نہیں ہوسکتے؛ اس نے قطوع المخروطات Conic sections کے لحاظ سے مساواتوں کی باقاعدہ تقسیم کی کوشش کی یہ شخص منجملہ ان ریاضی دانوں کے ہے جنہوں نے اس کام کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر 'عمر خیام' نے انجام دیا۔ ان سب میں سربرآوردہ 'الکرخی' تھا جس کا خاص فن حساب اور جبر و مقابلہ تھا۔ اُس نے متعدد diophantine مسائل حل کئے اور اس کے نئے سلسلے دریافت کئے۔ اس کی تصانیف میں کئی خصوصیتیں ہیں لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے ہندی ہندسوں کے استعمال سے جان بوجھ کر پرہیز کیا۔ جہاں ہندسوں کی ضرورت تھی وہاں اُس نے اعداد کے پورے نام حرفوں میں لکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندسے استعمال کرنا اہل علم کی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ 'النسوی' نے فارسی میں عملی حساب پر ایک کتاب لکھی اور کچھ دن کے بعد اسکا عربی میں ترجمہ کیا۔ اُس نے ہندی قاعدوں کی تشریح کی اور ان سے مشکل حسابی مسائل میں کام لیا؛ اس میں اس نے ستونی کسور کی جگہ جو ہیئت کی پیمائش میں استعمال ہوتی تھیں کسور اعشاریہ استعمال کیں۔ 'ابن طاہر' نے بھی عملی حساب پر کئی رسائل لکھے اور میراث کے

اُن پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا طریقہ بتایا جو اسلامی فقہ کی دقت پسندی کی بدولت پیدا ہوگئے تھے، البیرونی نے ہندوستان کے ہندسوں کی جو تشریح کی ہے وہ قرونِ وسطیٰ کی بہترین تشریح سمجھی جاتی ہے۔ اُس نے ہیئت کی ایک قاموس لکھی اور ریاضی ہیئت اور نجوم پر ایک عام رسالہ تصنیف کیا، وہ ریاضی کی پیچیدہ سے پیچیدہ مشقوں سے ذرا بھی نہ گھبراتا تھا اور اس نے اپنے عہد کے سارے دقیق ہندسی مسئلے حل کر ڈالے جو اس کے نام پر "مسائل البیرونی" کہلاتے ہیں۔ اُس نے رسم الاجسام (Stere ography) کا بہت سہل قاعدہ دریافت کیا، کہا جاتا ہے کہ ابن سینا کو ریاضی کے جزئیات سے ذوق نہ تھا، مگر اس کے فلسفیانہ پہلو سے بہت دلچسپی تھی۔ پھر بھی اُس نے بعض علمی مسائل کے متعلق مفید اشارات لکھے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اگر اُس کی تصانیف کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اُس نے اور بھی قابلِ قدر باتیں دریافت کی ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ قاموس نگاروں کی تالیف و ترتیب کی خدمات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ خود اُنہوں نے جو تھوڑی بہت علمی تحقیق کی ہے اُس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اتنا سب جانتے ہیں کہ ابن سینا نے باوجود کثیر مشاغل کے کسی طرح وقت نکال کر ہیئت کے متعلق متعدد مشاہدات کئے اور علم ہیئت کے فنی پہلو technique کی بہت کچھ اصلاح کی۔

ہم نے حتی الامکان ان مشرقی ریاضی دانوں کا ذکر ترتیب زمانی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس سبب سے انکی علمی جدوجہد کی وسعت اور گوناگونی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے کسی عالم نجوم کا ذکر نہیں کیا۔ علاوہ اس کے ہیئت کے علمی حصے میں ضروریات وغیرہ پورا کرنے کے لئے جو کام کیا گیا اُس کا بیان بھی ہم نے ترک کر دیا ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو مشرقی ممالک میں ریاضی کے دو علیحدہ مذہب تھے:۔ ایک وہ جس پر نظری رنگ غالب تھا اور جس کے نمائندے

"ابن الحسین"، "ابوالجود"، اور "الکرخی" تھے۔ دو سرا وہ جو زیادہ تر علمی ذوق رکھتا تھا یعنی "النسوی"، اور "ابن طاہر" وغیرہ کا حلقہ۔ "البیرونی"، اور "ابن سینا" کو ہم ان میں سے کسی مذہب میں شامل نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں دقیق سے دقیق نظری مسائل اور عملی چیزوں سے یکساں دلچسپی تھی اور وہ جزئیات کو نظر حقارت سے نہیں دیکھتے تھے کیوں کہ بڑے دماغ کسی بات کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔

ہندوستان میں اس عہد میں صرف ایک ریاضی داں "سری دھر" کا نام ملتا ہے جس نے ریاضی پر ایک ابتدائی رسالہ لکھا۔ مگر اس میں صفر کے تمام حسابی قاعدوں کے متعلق ہندوستان کے ریاضی دانوں کے خیالات نہایت وضاحت سے لکھے ہیں۔ البتہ تقسیم کا ذکر نہیں۔ غالباً مساوات درجۂ ثانیہ **quadratic equations** کے حل کرنے کا ہندی طریقہ اُسی کا نکالا ہوا ہے۔

لاطینی، انگریزی، شامی، اسلامی چینی، طبیعیات کیمیا اور صنعتی علوم

اس عہد کے لاطینی مصنفوں کی کتابیں زیادہ تر موسیقی پر ہیں مغرب میں اس زمانے میں موسیقی کی ترتیب کا بہت زور تھا۔ غالباً اس میں اسلامی اثر یا کم سے کم اسلامی تحریک کو بڑی حد تک دخل تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس عہد کی لاطینی کتابوں میں جو خیالات نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے مسلم حکماء مثلاً فارابی کے یہاں (دسویں صدی کے وسط میں) نظر آتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی سائنس کا اثر دسویں صدی سے مغربی ممالک پر موسیقی کے پردے میں پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم روایات کی بنا پر جو "فیثاغورث" کے زمانے سے چلی آتی تھیں موسیقی سائنس کا جزو سمجھی جاتی تھی اور جب آگے چل کر (پانچویں صدی کے نصف آخر میں) "مارٹیانس کاپیلا" نے اور (چھٹی صدی کے نصف اول میں) "بوئتھیس" نے اس فن کو علم اربعہ میں شامل کر لیا تو اس کو بڑی تعلیمی اہمیت حاصل

ہوگئی جو عہد جدید کے آغاز سے کچھ پہلے تک باقی رہی۔ اس لئے یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہم اپنے تبصرے میں قرون وسطیٰ کی موسیقی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔

زمانہ زیر بحث میں 'اڑنیٹ کے اڈیبولڈ' نے موسیقی پر ایک رسالہ لکھا لیکن اس عہد کی سب سے اہم اور سب سے مقبول تصانیف 'اریزو کے گوئیڈو' کے قلم سے نکلی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہو لیکن اس کی کتابوں سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں موسیقی خاص ترقی کر چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے انگریز نجومی اور عالم جرثقیل 'ما لمسبری' کے 'اولیور' نے ایک مینار کی بلندی پر سے مصنوعی پروں کی مدد سے اترنے کی کوشش کی خدا جانے یہ قصہ کہاں تک صحیح ہے مگر اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پرواز کی خواہش انسانوں کے دل میں ابتدا سے چلی آتی ہے۔

مشہور شامی مورخ 'الیاس بارشینیا' نے عربی زبان میں ایک رسالہ ترازو پر لکھا۔ اس میں سکّوں، وزنوں اور پیمانوں کا مفصل ذکر ہے اور مختلف قسم کی ترازوؤں اور کانٹوں کا استعمال بتایا ہے۔ مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر 'ابن الہیثم' سے شروع کرنا چاہیئے جو اس صدی کے آغاز میں قاہرہ میں رہتا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں سب سے بڑا عالم طبیعیات گذرا ہے بلکہ تمام قرون وسطیٰ میں اس علم میں کوئی اس کا ہمسر نہیں تھا۔ ہندسی اور عضویاتی بصریات میں اس نے جو تحقیقات کی ہے وہ عہد قدیم اور سولہویں صدی کے درمیان اپنا مثل نہیں رکھتی۔ اس نے آنکھ کی تشریح اور نظر کی توجیہ میں کمال کیا ہے۔ مسلم سائنس دانوں نے کثافت نوعی کی پیمائش کا خاص مذاق پیدا کر دیا تھا۔ البیرونی نے ان روایات کو قائم رکھا اور اس نے ۱۸ قسم کے جواہرات اور دھاتوں کا صحیح وزن نوعی معلوم کیا۔ اس نے مشاہدے سے یہ دریافت کیا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے بدرجہا زیادہ ہے۔ 'ابن سینا' نے طبیعیات کے ان

تمام مسائل کی تحقیقات کی جو اُس کے زمانے میں چھڑے ہوئے تھے، وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ روشنی کی رفتار خواہ کتنی ہی زیادہ ہو مگر محدود ہے۔ اُسکا علم موسیقی کا مطالعہ خاص طور سے اہم ہے اور اُس زمانے کی لاطینی تحقیقات سے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، بہت آگے ہے۔

ماسویہ المارد ینی نے جو قاہرہ کے 'دار الحکمۃ' میں 'ابن الہیثم' کا رفیق کار تھا، اشیا کو آگ پر جوش دیکر تیل نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ 'ابن سینا' کے خیالات علم کیمیا کے متعلق عام روش سے علیحدہ تھے۔ مسلم کیمیا گروں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دھاتوں پر رنگ یا ملمع کرنے سے اُنکے خواص بدل جاتے ہیں لیکن 'ابن سینا' اس کا قائل نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ دھاتوں کی ماہیت میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک دھات سے دوسری دھات کا بننا ناممکن ہے۔ الکاشی نے ۱۰۳۴ء میں ایک رسالہ علم الکیمیا پر لکھا۔

چین میں ۱۰۴۱ اور ۱۰۵۰ کے درمیان پی شینگ نے ٹائپ کی چھپائی ایجاد کی۔ سب سے پہلے مٹی کے ٹائپ بنائے گئے لیکن وہ ناقابل اطمینان ثابت ہوئے۔ پی شینگ نے لکڑی کے ٹائپ سے بھی تجربہ کیا۔

اسی عہد میں ایک چینی حکیم ڈونگ بھی تھا جس نے مختلف قسم کی شراب کشید کرنے کے متعلق ایک رسالہ لکھا۔ مگر ہمیں اس واقعے کے متعلق پوری تحقیق نہیں، جو حضرات بہتر معلومات رکھتے ہوں وہ اس کی تردید یا تائید فرمائیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ثابت ہو گا کہ چین والوں کو شراب کشید کرنے کا طریقہ یورپ والوں سے پہلے معلوم تھا۔

اسلامی تاریخ موالید

البیرونی کی کتابوں میں علوم فطرت کے متعلق بہت سی قابل قدر معلومات موجود ہے۔ مثلاً اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ پھولوں کی پتیوں میں ایک حد تک باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ نسطوری عالم طبیعیات 'ابن الطیب' نے علم نباتات کے ایک رسالے کا عربی میں ترجمہ کیا جو 'ارسطو' کی طرف منسوب ہے اور اس کے ساتھ اسی موضوع

کی بعض اور کتابوں کا خلاصہ بھی شامل کر دیا۔

آئس لینڈ والوں کا امریکہ کو دریافت کرنا لاطینی جغرافیہ، اسلامی جغرافیہ، معدنیات اور طبقات الارض

اس زمانے کا سب سے اہم جغرافی واقعہ یہ ہے کہ آئس لینڈ کے جہازرانوں نے بحر اٹلانٹک کے بعض شمالی امریکی ساحلوں کو دریافت کیا۔

فرانس کے ایک سوانح نگار یعنی فلیوری کے ایموان (Aimoin) نے فرینک قوم کی تاریخ لکھنا شروع کی جس کے ساتھ ایک جغرافی مقدمہ بھی تھا۔ یہ مقدمہ بجائے خود قابل ذکر نہیں لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس عہد کے مغربی مسیحی ممالک کی جغرافی دلچسپی کا تنہا نمونہ ہے۔

مسلم جغرافیہ دانوں نے نویں صدی میں، اور اس سے بھی زیادہ دسویں صدی میں اس قدر جد و جہد کی تھی کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گیارہویں صدی کے نصف اول میں جغرافی علوم کے بارے میں ان پر مقابلتاً جمود کی حالت طاری تھی۔ بیشک اس عہد میں البیرونی، موجود تھا، جس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے جغرافیہ دانوں میں کیا جا سکتا ہے، لیکن سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے مختلف پہلوؤں سے جغرافی علوم کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ اول تو اس نے اس کے ریاضی عنصر کی نشو و نما میں بڑی مدد دی، علم ہندسہ اور مساحت کی مدد سے پیمائشیں کیں اور بہت سے مقامات کے طول البلد اور عرض البلد معلوم کئے۔ دوسرے اس نے رسم الاجسام کا بہت سہل طریقہ دریافت کیا۔ ہندوستان کے متعلق اس نے جو معلومات جمع کیں وہ علم جغرافیہ کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ اس نے علم سکون سیالات کے قوانین کے مطابق قدرتی چشموں اور کنوؤں کے محل وقوع کی توجیہ کی۔ اس کا خیال تھا کہ دریائے سندھ کی وادی غالباً پہلے سمندر کی ایک کھاڑی تھی جو رفتہ رفتہ دریا برآمد مٹی سے بھر کر زمین بن گئی۔

ابن سینا نے معدنیات پر جو رسالہ لکھا تھا وہ یورپ کے مغربی ممالک میں نشأۃ ثانیہ Renaissance کے زمانے تک علم طبقات الارض کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔

لاطینی، بازنطینی، اسلامی (یا عربی) اور چینی طب

اس عہد میں یورپ کے مسیحی ممالک میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور نہایت نتیجہ خیز واقعہ ہے۔ یہ اصل میں بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن محسوس نتائج گیارہویں صدی کے وسط کے قریب ظاہر ہوئے۔ اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ عربی کتابوں سے بہت کم درجے کی تھیں، لیکن انکی اہمیت یہ ہے کہ اُن سے فن طب کی ایک نئی، ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔

دو بازنطینی طبیب جن کا صحیح زمانہ معین نہیں کیا جا سکتا، غالباً اسی عہد میں تھے۔ ایک تو ڈمیناسٹس جس نے حاملہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور دوسرے اسٹیفانوس مگینٹیس جو ایک قرابادین کا مصنف تھا۔

مگر طب کی اصلی ترقی دیکھنے کے لئے عالم اسلامی پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس عہد میں مسلم طبیب اس کثرت سے تھے کہ یہاں بھی ہمیں اندلسی، مصری اور مشرقی کی تقسیم سے کام لینا پڑے گا۔

اندلس

"الکرمانی" کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، وہ ریاضی داں بھی تھا اور جراحی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ "ابن الوافد" نے ایک رسالہ مفردات پر لکھا جس کے ایک حصے کا ترجمہ لاطینی میں ابتک موجود ہے۔

مصر

مصر میں چار طبیب خلفائے فاطمیہ کی قدردانی کو دعائیں دیتے تھے۔ ماسویہ الماردینی نے ایک ضخیم قرابادین لکھی جس کی یورپ میں قرون وسطیٰ میں بہت اشاعت ہوئی۔ صدیوں تک یہ کتاب اس موضوع پر سند مانی جاتی تھی۔ آنکھ کا علاج کرنیوالے مسلم اطبا میں "عمار" جدت خیال کے لحاظ سے سب میں ممتاز تھا لیکن اس کے

مشرقی ہم عصر علی ابن عیسیٰ، کی تصانیف نے اس کی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ عمار، نے آنکھ کے علاج پر جو رسالہ لکھا ہے۔ اسکا جراحیاتی حصہ خاص طور سے اہم ہے۔ تیسرے طبیب ابن الہیثم کا بار بار ذکر آچکا ہے، لیکن یہاں اسکا نام لینا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس نے عضویاتی بصریات میں قابل قدر تحقیقات کی ہے۔ علی ابن رضوان، نے یونانی طب پر متعدد رسائل لکھے جن میں اسکا وہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس نے جالینوس کی کتاب Ars parva پر لکھا تھا۔ اس نے ایک رسالہ مصر کے حفظان صحت پر لکھا، جس کا نام ہے "دفع مضار الابدان بارض مصر" ان میں سے ماسویہ عیسائی تھا اور باقی سب مسلمان تھے۔

مشرق | اپنے عصر کا سب سے بڑا طبیب اور دنیا کے بڑے بڑے طبیبوں کا ہمسر ابن سینا تھا۔ اس کی عظیم الشان طبی قاموس یعنی قانون چھ صدی تک نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ مسیحی ممالک میں بھی طب کی سب سے مستند کتاب مانی گئی۔ اسمیں بہت سے نئے مشاہدات بھی تھے، لیکن لوگوں پر اسکا اتنا اثر صرف اس کی ترتیب و تنظیم اور اذعانیت dogmatism کے سبب سے تھا۔

ابن الطیب نے یونانی طب کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ابو سعید عبید اللہ نے جو بختیشوع کے مشہور خاندان سے تھا، مرض عشق پر ایک کتاب لکھی اور ان فلسفیانہ اصطلاحوں پر تبصرہ کیا جنہیں اطبا استعمال کرتے تھے۔ علی ابن عیسیٰ علم علاج العیون Ophthalmology کی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس عہد کے تین جید طبیب ابن الطیب، ابو سعید عبید اللہ اور ابن بطلان عیسائی تھے اور بغداد میں رہتے تھے۔ اس سے بغداد کے عیسائیوں کی وفاداری اور مسلمانوں کی رواداری ثابت ہوتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ ان عیسائی طبیبوں سے مسلم طبیب کہیں زیادہ اہم تھے۔

چین میں ۱۰۲۷ء میں " وانگ وائی ٹے " نے جسم انسانی کے دو ڈھانچے تانبے سے تیار کئے تاکہ فن شوکۃ الابرۃ acupuncture یعنی سوئیاں چبھو کر علاج کرنے کا طریقہ سمجھائے۔

جرمن، عبرانی، شامی اور چینی لسانیات

نوٹکر نے لاطینی سے جرمن میں جو ترجمے کئے ہیں وہ لسانیات میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمے جرمن زبان میں علمی اور فلسفیانہ تصانیف کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ نوٹکر نے اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کی جو کوشش کی ہیں، اسکا مقابلہ شاہ "الفریڈ" کی انگریزی کو رواج دینے کی کوششوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُسے اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی الفریڈ کو ہوئی تھی۔ سراغوسہ کے "ابن جناح"، نے جو قرون وسطیٰ میں عبرانی لسانیات کا سب سے بڑا ماہر تھا اُس کام کو انجام تک پہنچایا جو دسویں صدی کے نصف آخر میں اندلسی یہودیوں نے شروع کیا تھا۔ قرطبہ کے سموئیل نے بھی صرف و نحو پر کئی کتابیں لکھیں۔

"الیاس بار شینایا نے، شامی زبان کی صرف و نحو اور ایک عربی شامی لغت لکھی، جو قرون وسطیٰ کی آخری شامی لغت ہے۔

اس دوران میں 'چین میں، قاموس نگاری میں بہت ترقی ہوئی۔ چینگ نِگ نِین نے لوفائن کی صوتی لغت اور کو یہہ وانگ کی مفصل لغت پر نظر ثانی کی۔ اب یہ کتابیں جدید تحقیق کا ماخذ ہیں۔ سنگ چی اُس عظیم الشان صوتی لغت 'جی یون' کے مدیروں کا صدر تھا۔ جس میں پچاس ہزار سے زیادہ حروف تہجی جمع کئے گئے تھے۔ سنگ چی کے رفیقوں میں ٹنگ ٹو نے اس قسم کی ایک چھوٹی لغت شائع کی۔ جس میں صرف دس ہزار حروف تہجی تھے۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اختتامی تبصرہ

گیارہویں صدی کے نصف اول کی علمی جدوجہد کا جائزہ لیتے وقت پہلی ہی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اہل جاپان نے کوئی حصہ نہیں لیا، ہندی

اور بازنطینی حصہ بھی قریب قریب صفر ہے، کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں محض "سریدھر" تھا جو دوسرے درجے کا نحوی تھا اور بازنطینی ممالک میں صرف دو طبیب تھے، بلکہ انکا اس عہد میں ہونا بھی محقق نہیں۔ تاریخ علوم میں یہ ہوا ہی کرتا ہے کہ جب بعض قومیں کام کرتی ہیں تو اُس وقت دوسری آرام کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی اُس اہم کام کو جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، باری باری سے انجام دیتی ہے۔

اس عہد کا اہم کام اصل میں مسلمانوں نے انجام دیا۔ کیسے کیسے جید حکما اس دور میں گذرے ہیں، ابن یونس، ابن الہیثم، الکرخی، البیرونی، ابن سینا، عمار، علی ابن علیسی، ابن حزم۔ یہی اقلیم علم کے بادشاہ تھے اور یہ سب کے سب مسلم تھے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر اور ہر زمانے کے بڑے شاعروں کا ہمسر، انسانی زندگی کا جلیل القدر مفسر فردوسی تھا۔

مسلمانوں کے بعد فلسفہ اور سائنس کے سب سے بڑے دو عالم یہودی ابن جابر الاندلسی اور ابن جناح تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ عربی زبان یہودیوں کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بعض مسیحیوں نے بھی مسلمانوں کے علمی کاموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ سب طبیب تھے۔ بغداد میں ابن الطیب، ابوسعید عبید اللہ اور ابن بطلان اور مصر میں ماسویہ المارد ینی۔

مسلم حکما میں سے دو یعنی ابن سینا اور البیرونی جو سب کے سرخیل تھے۔ ایران کے رہنے والے تھے۔ ابن طاہر، کوشیار ابن لبان، ابن الحسین (؟) ابوالجود اور النسوی بھی ایرانی تھے۔

فاطمیوں کی علم دوستی اور قدردانی کی بدولت قاہرہ اس عہد کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا تھا۔ ابن یونس، ابن الہیثم، عمار اور علی ابن رضوان کی جد و جہد کا مرکز یہی شہر تھا۔ بغداد بھی آل بویہ کے زیر حکومت علوم کی ترقی میں کافی حصہ لے رہا

تھا۔نصر ابن یعقوب، الباقلانی، ابن الحسین (؟) الکرخی، الکاشی، اور علی ابن عیسی عباسیوں کے دارالخلافہ کی رونق کو بڑھا رہے تھے۔اندلس میں بھی نبوامیہ کی سلطنت اور چھوٹی اسلامی حکومتوں کے سایہ عاطفت میں علمی اور ادبی ترقیاں ہو رہی تھیں مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اسلامی اندلس کے تین سب سے بڑے حکما میں سے دو، ابن جابر اور ابن جناح مسیحی تھے، اور صرف ایک ابن حزم مسلم تھا۔سموئیل یہودی تھا لیکن اور متوسط درجے کے حکما، الکرمانی، ابن السمح، ابن ابی الرجال، ابن الصفّار ابن الوافد، ابن الفراضی اور ابن حیان سب کے سب مسلم تھے

اسلامی دنیا کے مقابلے میں مسیحی دنیا کی علمی خدمات بادی النظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔کیونکہ یہ کتابیں بجائے خود ادنےٰ درجے کی ہوں لیکن انکے اثرات ونتائج بہت اہم تھے۔ہم امریکہ کی دریافت اور وہاں نوآبادی قائم کرنے سے قطع نظر کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک اتفاقی اور عارضی چیز تھی۔اور امریکہ کی آخری اور اصلی دریافت میں اس سے کوئی مدد نہیں ملی۔لیکن سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور اور یورپ کی موسیقی کی ترتیب وتنظیم بہت اہم واقعات ہیں۔یہ آغاز بالکل ادنے درجہ کا تھا، جیسا ہر آغاز ہوتا ہے۔لیکن سالیرنو کے مذہب کو اس طویل سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیئے، جو پاسچیور Pasteur پر آکر ختم ہوا۔اسی طرح حسابی موسیقی کی بے حقیقت ابتدا اس مخصوص مسیحی اور مغربی ارتقائے موسیقی کا پہلا قدم تھا جس سے آگے چل کر بیتھوون Beethroven کے روح افزا نغمے پیدا ہوئے۔

مغربی علمی جدوجہد کے اور پہلو مقابلۃً بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔لیکن اس بات کا مشاہدہ دلچسپ ہے کہ یورپ کی تدریجی بیداری کسی ایک مرکز تک محدود نہ تھی۔بلکہ بہت سے مقامات میں پھیلی ہوئی تھی۔نوٹکر سوٹرزلینڈ کا رہنے والا تھا، رگمبولڈ کولون کا تھیٹما۔میرسبرگ کا۔یہ سب جرمن تھے۔برینس پیرس کا تھا،

ایوان فلیوری کا۔ یہ فرانسیسی تھے۔ میمبری کا اولیورا اور ریمزے کا بائرٹ فرٹ انگریز تھے۔ اٹریشٹ کا اڈیولڈ اور لی اپچ کا راڈولف دلسندیزی تھے۔ ہر ملک میں متعدد علمی مرکز تھے۔ اصل میں ہر خانقاہ، ہر کلیسائی مدرسہ ایک مرکز علم تھا۔ لیکن کوئی مرکز اسلامی مرکزوں بغداد، غزنہ، قاہرہ، قرطبہ کی شان کا نہ تھا۔ سالیرنو کو آگے چل کر زیادہ اہمیت حاصل ہوئی لیکن ایک صدی بعد تک، جب قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، مسیحی ممالک میں یہی تنہا علمی مرکز تھا جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔

جاپان کے علمی نشوونما کے عارضی طور پر رک جانے کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ برخلاف اس کے چین میں سنگ خاندان کے بادشاہ چین کے ایک نئے زریں عہد کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے۔ ہم نے متعدد چینی علمار کا ذکر کیا ہو۔ سنگ خاندان کی شان و شوکت کا اثر جاپان میں کچھ دن کے بعد ظاہر ہوا اور وہاں بھی بڑی زبردست علمی جدوجہد شروع ہوئی۔

اگر مختلف علوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں سب سے زیادہ ترقی ریاضی علوم، ہندسہ، جبرو مقابلہ اور حساب کو ہوئی، جس کا سہرا تنہا مسلمانوں کے سر ہے۔ ہیئت میں ابن یونس کے مشاہدات، طبیعیات اور بصریات میں ابن الہیثم کی تحقیقات اور مسیحی ممالک میں حسابی موسیقی کا آغاز اہم ترین واقعات ہیں۔

اسی طرح صنعت میں چینی ٹائپ کی ایجاد، جغرافیے میں امریکہ کی دریافت طبقات الارض میں البیرونی اور ابن سینا کی تصانیف؛ طب میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور، عمار اور علی ابن عیسےٰ کے رسالے علاج العیون پر، اور ابن

سینا کا قانون۔ لسانیات میں عبرانی اور شامی صرف و نحو کی تکمیل اور چینی لغات۔ ان کے علاوہ تاریخ اور فلسفے پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کی علمی قدر کا معین کرنا مشکل ہے۔

یہ ہے گیارہویں صدی کے نصف اول یعنی' البیرونی، کے عہد کی علمی جدوجہد کا ماحصل۔

نوٹ:۔ یہ مضمون پہلے رسالہ "سائنس" جلد ۱ نمبر ۴ میں شائع ہوچکا ہے۔

افسانہ نویسی

مشہور تو یہ ہے کہ انسان حقیقت سے روپوش ہوکر افسانہ میں پناہ لیتا ہے، جیسے شترمرغ خطرہ دیکھ کر بالو میں اپنا سر چھپاتا ہے، افسانہ جھوٹ مانا گیا ہی، اس لئے کہ وہ حقیقت کو جھٹلاتا ہے، اور شاعری کی طرح افسانہ نویسی بھی ایک فن ہی جسکی خوبیاں یا فوائد مشکوک ہیں، اور برائیاں ایسی واضح کہ انکار کی گنجائش نہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد ترقی ہی ایک ایسی حالت ہی جب انسان میں غلط اور صحیح، سچ اور جھوٹ کا احساس کم یا کمزور ہو ایک فرضی ذہنی کیفیت کیطرف جو اُس کی قوت ادراک اور عمل اور حقیقت بینی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ افسانوں کی تصنیف اُن خامیوں میں شمار ہوتی ہی جن پر مہذب انسانوں کو شرمانا چاہئے، جیسے سن رسیدہ لوگ شرماتے ہیں جب اُن سے کوئی بچپنے کی حرکت سرزد ہو۔ لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ آرٹ، اور اُس کے ساتھ افسانہ نویسی بھی، انسان کو اپنی اصلیت سے جدا کرتی ہے، تو ہماری کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی، جس طبیعت میں ذرا بھی شک یا تلون ہو اُس کے لئے مذہبی اختلافات، عام اخلاقی تعلیم کی کوتاہیاں اور مذہبی رہنماؤں کی تنگ نظری اور تعصب میں گمراہی کا سامان موجود ہے، مذہبی، اخلاقی، اور تخیلی دنیا کو عظیم الشان شخصیتوں نے نئے نئے رنگ اور نئی نئی شکلیں دی ہیں، ہم کو اپنی راست بینی پر اتنا بھروسہ نہیں کہ شکل اور رنگ کے پردہ کو ہٹا کر اصلیت کا مشاہدہ کریں، اور یوں حقیقت کی ہر جستجو مخصوص صورت اختیار کرتے ہی خود ایک افسانہ بن گئی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہی کہ آرٹ کو بدنام کرنے والے خود اپنی نیک نامی نہیں ثابت کرسکتے۔

ہر تہذیب اپنی زندگی اور نشو و نما کے لئے اصول بناتی ہے جنہیں ہم مذہبی یا اخلاقی

تعلیم کہتے ہیں۔ یہ اصول اپنا مقصد پورا کرتے رہتے ہیں، مگر اس کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ بجائے انسانیت کے مرکب ہونے کے خود اُس پر بار نہ ہوجائیں، اور بجائے انسان کو نفس پرستی اور وہم سے آزاد کرنے کے خود اُس کی ہتکڑیاں نہ بن جائیں آرٹ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی نسبتہً تنگ اور انفرادی ذہنیت میں وسعت اور عالم گیری پیدا کرے۔ اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی تاثیر کا امتحان لیتا رہے۔ آرٹ سے امید رکھنا کہ وہ مذہب یا اخلاق کی قائم مقامی کرسکتا ہے بالکل غلط ہے، مذہب اور اخلاق سے یہ توقع رکھنا بھی عبث ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک انسان اور تہذیب کے محرک کا کام انجام دے سکتے ہیں اگر اُن میں آرٹ کا خمیر شامل نہ ہوتا رہے، مذہب اور آرٹ کے ادنے شیدائیوں میں ہمیشہ عداوت رہی ہے اور رہے گی، لیکن اُنکے اعلیٰ نمائندے اُنکے باہمی تعلق کے راز کو سمجھتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک حد سے گذر کر دونوں میں امتیاز کرنا ناممکن ہے۔

آرٹسٹ کو عموماً گمراہ اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا پابند نہیں رہ سکتا، اور وہ دوسروں کو بھی ترغیب دلاتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی جائے پناہ سے نکل کر دنیائے جذبات کی سیر کریں، اور اُس کے خطروں کا مقابلہ کریں۔ آرٹسٹ کے مشرب میں قطعی فیصلہ کی گنجائش نہیں، سچ اور جھوٹ، اچھے اور برے کا جو معیار مذہب اور اخلاق مقرر کرتے ہیں۔ اُسے وہ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ معیار مقرر کرنے کے لئے نظر کو محدود کرنا ہوتا ہے اور یہ اُسے کسی طرح سے منظور نہیں۔ اپنے اصول کی صحت وہ ہمارے سامنے ایسے محل اور موقعے پیش کرکے ثابت کرتا ہے جب ہم اپنے عقیدوں کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں قبول کرسکتے کہ ہم نے غلط کیا یا برا کیا۔ عالم جذبات میں انسان کے لئے مذہب وہی کام دیتا ہے جو زمین پر اُسکا گھر: دونوں کے بغیر اُس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی، ہم میں سے

ہرایک کو ایسے مرحلے نہیں طے کرنے ہوتے جہاں ایمان کی پختگی اور عقیدوں کی سچائی کا امتحان ہو، لیکن آرٹسٹ میں یہ قوت ہوتی کہ ہمیں اپنا امتحان لینے پر آمادہ کرے اور اکثر ہمیں اقرار بھی کرنا ہوتا ہے کہ جن عقیدوں میں ہم نے پناہ لی ہے، اس عالم بے پایاں میں جو اپنا گھر بنایا ہے اُس کے در و دیوار کمزور ہیں اور ہماری حفاظت نہیں کر سکتے۔

ضمیر کو بیدار، عقیدوں کو زندہ رکھنا آرٹ کا نصب العین ہے۔ اُس کے ہر شیدائی کا حوصلہ اس قدر بلند نہیں ہوتا لیکن آرٹ کے اعلیٰ اور ادنیٰ شیدائی میں فرق نہ کرنا گویا مذہبی معاملات میں پیغمبر اور مولوی کو ایک سا سمجھ لینا ہے، افسوس یہ ہے کہ آرٹ کے مخالفین ہمیشہ اسی بنا پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں کہ آرٹسٹ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے آرٹ کی طرف زیادہ توجہ کرنا اُسے اپنی زندگی میں اہمیت دینا مضر ہے، اگر کوئی مولوی تعویذ لکھے، کوئی پنڈت ٹونے ٹوٹکے کی رسمیں سکھائے، کوئی پادری گناہ معاف کرنے کا مدعی ہو تو کسی کو اندیشہ نہیں ہوتا کہ قوم کے مذہب یا اخلاق کو نقصان پہنچے گا، لیکن اگر کوئی مصور ایک ننگی عورت کی تصویر بنائے تو سب کو اُس میں تمدنی تباہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے بہت سے آرٹسٹ ہیں جو آرٹ کے نام سے لوگوں میں ہوس پرستی اور شہوت کا چرچا کرتے ہیں، وہ بیشک گمراہ ہیں۔ مگر اُن سے خفا ہو کر ہم کو آرٹ سے بے تعلق یا بدگمان نہ ہونا چاہیے، نہ مولوی پنڈت پادری کی وہم پرستی اور تنگ نظری سے بیزار ہو کر ملحد اور بے دین، ہماری دنیا، ہماری زندگی، ہم خود اعلیٰ اور ادنیٰ کا مجموعہ ہیں، جو اعلیٰ اور ادنیٰ میں امتیاز نہ کر سکے وہ انسانیت اور انسانی زندگی کے راز کو نہیں سمجھ سکتا۔

قصے کہانیاں سننا اور سنانا آرٹ کی دیرینہ شکلوں میں سے ہے۔ قدیم داستان گو عموماً اپنے سامعین کے اخلاقی رہنما بھی ہوا کرتے تھے، اور وہ اپنے قصہ اسی انداز

سے سناتے تھے کہ اُن سے عبرت حاصل کیجائے، ادبی اور تمدنی نشوونما کے ساتھ اخلاقی تعلیم کو اس پیرایہ میں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، داستانوں میں دلچسپی اور لطف کا عنصر بڑھ جاتا ہے، لوگ انہیں اس وجہ سے سُنتے ہیں کہ روزمرہ زندگی کی یکسانیت اور بے مزگی سے رہائی ملے۔ ایسی داستانوں کا کل سرمایہ عشق وعاشقی کے معاملات یا جواں مردی کے کارنامے ہیں، اور یہ منزل اسقدر دلفریب ہے کہ داستان گوئی کا قافلہ اکثر اس سے گذرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ایسی داستانوں سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور ان میں فن بھی دکھایا جا سکتا ہے، لیکن وہ افسانے اور فن افسانہ نویسی جو یہاں زیر بحث ہیں بالکل اور ہی چیز ہیں، اگرچہ آرٹ کی اسی شاخ میں اُنکا بھی شمار ہوتا ہے۔

افسانہ ہو یا داستان یا ناول، اُسکا سنانے یا لکھنے والا زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اُسکا ارادہ عبرت دلانا، ہنسانا اور خوش کرنا یا غور و فکر میں مبتلا کرنا ہے۔ مشرقی ادب میں اس وقت تک ایسی تصویریں زمانہ تہذیب اور معاصر حالات سے بے نیاز رہی ہیں۔ یہانتک کہ اکثر دنیا کا نقشہ بھی بدل گیا ہے اور مشرقی مذاق نے اس بے تکے پن پر اعتراض نہیں کیا ہے، کیونکہ اُسے صرف دلچسپی مقصود رہی ہے اور دلچسپی کے لئے داستان کی تاریخی اور جغرافی صحت شرط نہیں، ہمارے یہاں اگر کسی کو روحانی غذا کی حاجت ہوتی ہے، یا ایسے فلسفۂ زندگی کی جو اُسے مہیا کرتا رہے تو وہ داستان اور افسانہ کیا خود آرٹ سے منہ پھیر کر مذہب یا تصوف کی طرف رُخ کرتا ہے اُسے بالکل توقع نہیں ہوتی کہ شاعر یا افسانہ نویس اُس کے دل میں وہ سکون یا اطمینان پیدا کر سکتا ہے، یا دوسری دنیا میں اُس کے لئے وہ انتظام کر سکتا ہے جس کا دعوےٰ مولوی پنڈت ملفی اور صوفی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بجز فن تعمیر کے ہماری تہذیب میں آرٹ کی

ی شاخ نے وہ نشوونما نہیں پائی جو اُسے اپنے تمدنی مقاصد پورے کرنے کے لئے
یکار ہے۔ اور غالبًا اسی وجہ سے کہ یورپ میں مذہب کا شعلہ جلد ٹھنڈا ہوگیا ہم
ہاں فنون لطیفہ کو عروج پر دیکھتے ہیں، مغربی انسان اپنے مذہب سے بدگمان ہوگیا
س لئے کہ وہ اُسکا بنایا ہوا نہیں تھا، اور اُس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے دل سے
ن سوالوں کے جواب پوچھے گا جو دوسرے انسان اپنے مذہب سے پوچھتے رہے
یں، مغربی آرٹ، اطالیہ کے پونر جنم سے اسوقت تک، یہی جواب دینے کی کوشش ہے۔

یورپ کے ناولوں اور افسانوں نے اس کوشش میں پوری طرح سے
صہ لیا ہے۔ عشق کا عنصر حکایت کو لذیذ بنانے کے لئے اکثر ناولوں میں پایا جاتا ہے،
ت سے اوچھے اور بازاری قسم کے ناول لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں جن میں
ئی ادبی یا اخلاقی خوبی نہیں، مگر باوجود اس کے ناول یورپ میں ایک آئینہ کا کام
یتا ہے جس میں سوسائٹی ہر وقت اپنی کیفیت دیکھ کر اصلاح کی جدوجہد کرسکتی ہے
راد بھی دوسرے کے تجربے سے سبق حاصل کرسکتے ہیں اور افسانہ ہستی کے مختلف
نات سنکر اپنے انجام پر غور کرسکتے ہیں، جب تک افراد تلاش معاش میں مصروف
ہیں اور اُنہیں ایسے لوگوں سے سابقہ نہ پڑے جن کی زندگی نے دوسرا رنگ اختیار
یا ہے، اُنہیں دوسروں کی تکلیفوں اور جذباتی اور اخلاقی کشمکش کا بھی کوئی احساس
ہیں ہوسکتا۔ یورپ کے ناول، ڈراما اور افسانے ہر صاحب ادراک کو اُس کی
وسائٹی کی حالت سے آگاہ رکھتے ہیں، اُس کی طبیعت میں بیقراری اور آرزوئیں
س کی روحانی زندگی میں وہ ہیجان پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے بغیر صحیح معنول
ں وہ نہ سوسائٹی کا ایک جز دبن سکتا ہے نہ ذی حس اور ذی روح انسان، انگلستان
کے پہلے ناول نویس فیلڈنگ نے اپنی قوم کو اُس کے اسکولوں طالبعلموں اور
تادوں کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے بعد ناول نویسی کا جو سلسلہ شروع ہوا

اُس میں غریبوں کی مصیبتوں، امیروں کی بے پروائی اور ناانصافی، انسان کی اخلاقی و روحانی امنگوں کی کیفیتیں بیان کی گئیں۔ میدان بہت وسیع تھا، اس میں ہر حوصلہ مند نے اپنی صلاحیت کے مطابق مشق کی اور کارنامے دکھائے، اور ہر تعلیم یافتہ اور سنجیدہ شخص نے اس ادبی ذخیرہ سے لطف اٹھایا، عبرت حاصل کی، تخیل اور عقیدے تعمیر کیے۔

افسانہ ناول کی ادبی اولاد کہا جاتا ہے، زیادہ تر اس لحاظ سے کہ ناول لکھتے لکھتے لوگ افسانے لکھنے لگے، اور دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں جو انکے ظاہری رشتے کے منافی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور ضرورت تھی جس نے افسانہ کی ایجاد لازم کر دی جب مصور ایک وسیع لوح پر متعدد شکلیں اور صورتیں بنانے لگے تو وہ ہر شکل کیطرف کافی توجہ نہیں کر سکتا اور اگر کرے بھی تو دیکھنے والے کی نظر میں تصویر کا مجموعی اثر مختلف شکلوں کی انفرادی حیثیت پر غالب آجاتا ہے۔ ناول نویسوں نے روسی مصنف چیخوف کی رہبری میں یہ جدت کی زندگی کے عام نقشہ کو دھندلا کر دیا اور افراد اور انفرادیت کو بہت زیادہ شوخ اور نمایاں رکھا۔ روس میں انفرادیت کا بہت چرچا ہے روسی مصنفوں نے جو طرز اختیار کیا وہ انکے ملکی حالات کا تقاضا تھا ان سے یورپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ سوسائٹی اور اُس کے مسائل کے علاوہ فرد اور انفرادی کیفیات بھی قابل غور ہیں کیونکہ جماعت کی خوبیاں اور خرابیاں افراد ہی سے شروع ہوتی ہیں۔ مختصر ناول یا افسانہ کا منشا یہی ہے کہ افراد اور انفرادی جذبات جو بڑے ناولوں میں گم ہو جاتے ہیں یا مجموعی رنگ میں نہیں نکھر سکتے انھیں پوری اہمیت کے ساتھ دکھائے جائیں اسکا موضوع عموماً ایک انسان کی طبیعت، ایک جذبہ کا تحلیل ہوتا ہے۔ یا کسی واقعہ کا ایک شخص یا جماعت پر اثر۔ اگر ہم چیخوف کے معمول کو مستند قرار دیں، تو ہر افسانہ کو اپنے شخصی یا انفرادی زندگی کا سب سے پر معنی لمحہ ہونا چاہئے جس میں انکی ساری سرگذشت بغیر بتائے معلوم ہو جاتی ہے، یا ایک آدمی کی ہوئی بات جو دل کا سارا راز فاش

رہے۔

یوں افسانہ نویسی کا فن ناول نویسی سے ہرگز آسان نہیں، جو فطرت انسانی کا راز داں نہ ہو اُسے اس فن کے پاس نہ پھٹکنا چاہئے۔ ناولوں میں خیالات کا پرچار کیا جا سکتا ہے، اور یہ مقصد ایسے کیرکٹر ایجاد کر سکتا ہے جن میں مطلق تصنع نہ ہو۔ مگر وہ اپنی شخصیت انہیں خیالات کے بحث مباحثہ کے لئے وقف کر دیں جو مصنف کو پیش کرنا منظور ہوں۔ خیالات کا پرچار ناول کے مسلمہ مقاصد میں سے ہے اس طریقے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ جو خیالات کا پرچار نہ کرنا چاہے اور صرف زندگی کی دلکش تصویریں بنانا چاہے، اُسے بھی ناول میں آسانیاں ہیں۔ اگر وہ کیرکٹر کا اعلیٰ مصور نہیں تو دلچسپ یا عبرت انگیز واقعات بیان کرے، یا ایک داستان جس کے اشخاص کی انفرادی ہستی قصہ میں اسی طرح گم ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں، افسانہ کے لئے اختصار لازم ہے۔ افسانہ نویس اپنے قلم یا تصویر کو وہ آزادی نہیں دے سکتا جو ناول نویس کو ہوتی ہے۔ اُس کے لئے پہلی شرط ضبط ہے، اُسے ایک پوری زندگی کے تجربات و تاثرات کو ایک مختصر بیان میں مجتمع کرنا ہوتا ہے، جو کچھ وہ لکھتا ہے اپنی سرگذشت بنا کر لکھتا ہے۔ اُس کا دل ہزار ہا جذبات کی جولانگاہ بن جاتا ہے۔ اُس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے: اُسے اپنے فن میں کمال صرف کمال ایثار سے حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر افسانہ نویس اپنے لئے اتنا بلند معیار نہیں قائم کرتا، اور اسی وجہ سے اس فن میں ہر کس و ناکس کو ماہر یا کامل نہ سمجھ لینا چاہئے۔ یورپ میں ادبی شہرت کے حوصلہ مند اکثر افسانہ نویسی سے ابتدا کرتے ہیں اور یوں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں افسانوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن اس فن میں کامل صرف دو مانے گئے ہیں، فرانسیسی مصنف موپساں اور روسی چیخوف، ان دونوں میں بھی موپساں کی عام مقبولیت اُس کی زبان اور ادبی اسلوب کی بنا پر ہے، جس سے افسانہ

دلچسپ ضرور ہو جاتا ہے، لیکن اُن خوبیوں سے محروم رہتا ہے جو بلند پایہ تصانیف کے لئے لازم ہیں، موپساں کے اکثر پلاٹ حقیر ہیں، اُس کے تصور ہیں کافی پاکیزگی نہیں، کبھی کبھی ہمیں ایسے افسانے ملتے ہیں جو صریحاً فحش ہیں، اور مہذب لوگوں کے پڑھنے کے لائق نہیں، چیخوف پر اگر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اُس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں، جو انسانی جذبات کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے، یا بالکل فضول ہیں، لیکن اچھے مصنف بھی ہمیشہ وجد کی حالت میں نہیں رہتے اُنکی طبیعت بھی کبھی موزوں ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اور وہ فن کے احترام کے علاوہ اور فرائض کے بھی پابند ہوتے ہیں۔ چیخوف پر یہ الزام ضرور لگتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اُس کی نیت کسقدر پاک ہے، انسانی ہمدردی اُس کے دل میں کیسی موجیں مارتی ہے، اُس کی نگاہ کس قدر روشن اور تیز ہے۔ اگر ہم اُسے افسانہ نویسوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ اُس کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ ہمارے بلند سے بلند نصب العین اور مشکل سے مشکل معیار کے تمام شرائط پورے کرتا ہے۔

چیخوف نے جس ادبی ماحول میں تربیت پائی اُس نے چند اور خصوصیات پیدا کی تھیں جو یورپ میں ایک ذہنی انقلاب کا باعث ہوئیں۔ ان میں سب سے نمایاں واقعیت کا وہ پہلو ہے جو انسانی فطرت سے متعلق ہے۔ روس کے باہر اور روسی مصنفین سے پہلے بھی یورپین ادب میں واقعیت کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پرانا طرز چھوڑا جا رہا تھا جو "پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے" کی اجازت نہیں دیتا تھا، جس کا عقیدہ تھا کہ اوہام زندگی کی ذہنی بنیاد ہیں، اسلئے انہیں قائم رکھنا چاہئے، اور جو کوئی اُن کی اصلیت سے واقف ہو جائے اُسکا بھی فرض ہے کہ اپنے علم کو ایک بھید بنا کر دل میں چھپالے، کیونکہ یہ وہ علم ہے جو بنی نوع انسان کو راحت نہیں پہنچا سکتا۔ واقعیت کی

تحریک نے اوہام پرستوں کی چیخ پکار کے باوجود اوہام کا طلسم توڑ دیا۔ قومی اور انسانی زندگی، اخلاقی، تمدنی، روحانی، اپنے اصل رنگ و روپ میں نظر آنے لگی، اور جب لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں تو انہوں نے صرف اپنی ذہنیت کو اُن اوہام سے رہا نہیں کر لیا جو اُس پر ایک بار ہو گئے تھے بلکہ عام زندگی کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد شروع کی۔ لیکن اس تحریک میں ایک کمی تھی۔ خارجی حالات سے واقف ہونا حقیقت بینی کے لئے کافی نہیں۔ انسان کو اپنی طبیعت اور فطرت سے بھی بخوبی آگاہ ہونا چاہئے واقعیت کی یہ کمی روسی مصنفوں نے پوری کی، روسی طبیعت کچھ ایسی "پرخود پیچیدہ" اور مشاہدۂ نفس میں مشغول رہتی ہے کہ اُسے اپنے افعال کے اصل اسباب تلاش کرنے میں نہ دشواری ہوتی ہے اور نہ غلط فہمی، اور روسی مصنفوں نے خوش قسمتی سے فطرت اور جذبات کی مصوری میں وہ قدرتی استعداد پائی ہے کہ بہت جلد وہ گہری معلومات جو روسیوں نے اپنے غیر علمی طریقہ پر حاصل کی تھی تمام مہذب قوموں کی ملکیت بن گئی اور ہر طرف اس کی سچائی اور بصیرت افروزی کا اعتراف ہونے لگا۔ انسان حفاظت نفس کیلئے اکثر اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، بہت سی خواہشیں ہوتی ہیں اور بہت سے افعال جن کی اصل نیت کی تعبیر وہ اپنے فائدے کے مطابق کرتا ہے، اور سچ اور جھوٹ کا خیال نہیں کرتا، یہ ایک فطری خاصیت ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے، لیکن اسکا وجود ہم ایک دوسرے پر الزام لگا کر نہیں ثابت کر سکتے، اسی لئے طبیعت کے اندرونی معاملات کا راز داں خدا ہی کو مانا گیا ہے۔ انشائے راز اسی حالت میں ممکن ہے جب انسان خود اس کی ہمت کرے، اپنا دل دوسروں کے سامنے کھول کر رکھدے، اور انہیں اپنی پیروی کرنے کی ترغیب دلائے" ادسط"

؎۵ برنارڈ شا اپنے پیر و مرشد ابسن کی تقلید میں انہیں لوگوں کو idealists کہتا ہے

انسان عام نگاہوں کا مرکز بننے کی رسوائی برداشت نہیں کرسکتا لیکن نفس انسانی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ناگزیر ہے، روسی انسان یہ رسوائی برداشت کرگیا، اور اس کے ایثار سے فطرت انسانی کے جو راز معلوم ہوئے ہیں وہ ہمارے زمانہ کی واقعیت کی جان ہیں۔

روسی افسانوں اور ناولوں میں ہر طرف یہی بے باک پردہ دری نظر آتی ہے۔ یوں ممکن ہے یہ ہمیں ایک ادنےٰ سی بات معلوم ہو، لیکن جب ہم اس کے تمام نتائج پر غور کرتے ہیں تو اس کی پوری اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں ایک وہم تھا کہ انسان ہمیشہ منطق کے اصولوں پر چلتا ہے، اس سے اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو صرف اسوجہ سے کہ اُس کی منطق میں کوئی خامی رہ جاتی ہے، یعنی اگر انسان کو اسقدر تعلیم دیجائے کہ وہ اپنے دماغ کو عقل و دانش سے پوری طرح روشن کرسکے، تو عقل اُس کی کامل رہبری کرسکے گی اور وہ کبھی نہ ٹھوکر کھائے گا نہ گریگا۔ نفسیات کی سب سے جدید دریافت یہ ہے کہ انسان منطق کیا معمولی سمجھ سے بھی بہت کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے، عادات، جذبات فطری رجحان، ضد، یہ سب مل کر اس کے اختیار کو بالکل محدود کر دیتے ہیں اور اگر عقل نے کبھی دخل بھی دیا یا رہبر بننے کی آرزو کی تو انسان یا تو اپنی بے کسی پر ہنستا ہے، یا قوت ارادہ کے زور سے اپنے جذبات، عادات اور فطری رجحان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ نفسیات کی یہ جدید دریافت دستئفسکی اور چیخوف کی تصانیف میں ہو بہو پائی جاتی ہے بلکہ اکثر خیال ہوتا ہے کہ نفسیات کے عالموں نے اسے روسی مصنفوں کے یہاں پڑا پایا اور اُسے علمی جامہ پہنا کر اپنی چیز بنائی۔ مشرق میں ہم عقل اور دل، قال اور حال کے مناظرے صدیوں سے سن رہے ہیں، اور ہم نے دونو طرف کی دلیلوں میں دل اور حال کی دلائل زیادہ قوی مانی ہیں نفسیات کی یہ دریافت یا فطرت انسانی کی یہ راز عقدہ کشائی ہمکو نئی یا عجیب نہ معلوم ہوگی، لیکن انسان کو منطق یا حساب لگانے کی مشین سمجھنے کے علاوہ

ایک اور زبردست وہم ہے جس میں مشرق اور مغرب یکساں مبتلا ہیں، یہ وہم جنسی جذبات نے پیدا کیا ہے اور اسے عشق کہتے ہیں، یورپ میں اسکی اور شکل تھی، مشرق میں اور، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں شکلیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یورپ میں نوجوان مرد نوجوان عورتوں پر عاشق ہوتے تھے، اور عاشق ہونے کے بعد وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی جس طرح سے چاہے بنائیں اور بگاڑیں، اپنا حق وہ اس بنا پر تسلیم کراتے تھے کہ عشق کا جذبہ بہت بلند ہے، جس کسی میں یہ جذبہ جلوہ افروز ہو اُسے سوسائٹی میں ایک خاص امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے انکار کرنا انسانیت کے جوہر کی قیمت گرانا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ناولیں اور افسانے اس تخیل کی تبلیغ کرتے رہے، ہزار ہا عشق کی داستانیں سنائیں، عاشق نوجوانوں کے دلوں کی کیفیتیں سنگدل والدین اور بے رحم آسمان کی شکایتیں بیان کیں، انیسویں صدی کے وسط سے جب واقعیت کی تحریک شروع ہوئی تو عشق کا طلسم بھی کچھ کمزور پڑا۔ تجربے اور عام زندگی کے مشاہدہ نے بتایا کہ عاشق ہو جانا محض رئیسوں اور خوش حال لوگوں کی ایک دلچسپی ہے اور عشق کا جذبہ محض شہوت یا ڈھکوسلا، اس احساس نے عشق کی داستانوں کی وقعت تو بہت کم کر دی، مگر ناول اور افسانے پھر بھی اُسی بنیاد پر تعمیر ہوتے رہے، عشق کو افسانہ کی لوازمات میں سے خارج کرنے کی جرأت بھی سب سے پہلے روسی مصنفوں نے کی، بجائے ایک جذبہ کے جس کی کوئی اصلیت نہ تھی انہوں نے فطرت انسانی کے اور رنگ نمایاں کئے جنہیں عشق کی شوخی نے دبا دیا تھا، اس جدت نے انہیں ناول اور افسانہ کے بہت سے قدردانوں کی توجہ اور تعریف سے محروم رکھا لیکن اس کے عوض میں سنجیدہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو ناولوں اور افسانوں کو ادبی لغویات میں شمار کرتی تھی، اُن کی شیدائی بن گئی۔ ایک حد تک یہ تفرقہ ناگزیر بھی تھا، عشق کے عنصر کے بغیر ناول اور افسانوں میں داستان یا قصے کی خصوصیت نہیں رہتی اُنکے عام قدردان جنہیں انسانیت کے اعلیٰ

مسئلوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، جو صرف اپنے فرصت کے گھنٹوں میں ایک دلچسپ شغل یا بھونڈے مگر سچے الفاظ میں اپنے جنسی جذبات کے لئے گدگدی چاہتے ہیں، انہیں اس صورت میں کسی طرح سے نہیں پسند کر سکتے۔ پڑھنے والوں کی زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے، اور ناول اور افسانہ نویسوں کے لئے انکی سرپرستی سے بے نیاز ہوجانا بہت جرأت کا کام ہے۔ لیکن اگر ہم افسانوں میں واقعات کی دلچسپی پر زیادہ اصرار کریں تو انکی تہذیبی اور فلسفیانہ حیثیت بالکل مٹ جاتی ہے، اور ان میں کچھ یک رنگی سی آجاتی ہے جو ہماری زندگی کا صحیح عکس نہیں ہم میں صرف شاذ و نادر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی سرگذشت ایک داستان کی صورت اختیار کرتی ہے اگر ہم محض انکی زندگی کے واقعات پر نظر رکھیں عاشق بھی ہر شہر میں فقط دو چار ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف ارادوں سے، اور عشق جو کیفیت انکے دلوں میں پیدا کرتا ہے وہ اُس حالت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی جو شاعر اور پرانے طرز کے ناول اور افسانہ نویس تصور کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ذرا اپنی نظر پاک کریں، اور ذاتی لطف اٹھانیکی خود غرضانہ نیت کو چھوڑ کر انسانی ہمدردی کو اپنا محرک بنائیں تو معمولی سے معمولی شخص کی زندگی ہمارے لئے ایک پرکیف داستان ہوجائیگی واقعیت کی تحریک کا جوہر یہی ہے کہ وہ عام انسانی زندگی سے گریز کرنا، بے معنی اور خلاف واقعہ یا غیر معمولی داستانوں میں پناہ لینا صرف بدمذاقی نہیں بلکہ بزدلی اور کفر قرار دیتی ہے زندگی نام ہے زندہ دلی کا، زندہ دل وہی ہے جو حقیقت کے نظارہ کی آرزو اور جرأت رکھتا ہو، اور دوسروں کی نظر بھی صحیح مرکز کیطرف مائل کر سکے، وہم اور ادنٰے جذبات کا شکار بننے کی ہوس تو ان کے خمیر میں شامل ہے، رہبری کی شرط اسے آزاد اور بلند حوصلہ بناتا ہے۔

سلطان سلیمان اعظم قانونی[1]

سلیمان کی ولادت سنہ ۹۰۰ھ میں ہوئی تھی۔ اپنے باپ سلطان سلیم کی وفات کے وقت یہ مقام صارو خاں میں تھا۔ ۱۷ شوال سنہ ۹۲۶ھ کو قسطنطنیہ میں پہنچکر تخت پر بیٹھا۔ اس کے جلوس کے بعد ہی غزالی نے جو قانصوہ غوری کے امرا میں سے تھا اور جس کو سلطان سلیم نے شام کا والی مقرر کر دیا تھا بغاوت کر دی اور خیر بک والی مصر کو لکھا کہ ہم قسطنطنیہ سے بہت دور ہیں۔ سلطان کی دسترس یہاں تک مشکل سے ہو سکتی ہے اس لئے تم بھی میرا ساتھ دو۔ اس نے جواب دیا کہ تم اگر حلب فتح کر لوگے تو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔

سلطان نے فرہاد پاشا کو نظامیہ فوج کے ساتھ بھیجا۔ غزالی اس وقت حلب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ فرہاد پاشا نے اس کو شکست دی اور اسکا سر کاٹکر سلطان کے پاس بھیج دیا۔

فتوحات دولت علیہ کیطرف سے شاہ ہنگری کے پاس جزیہ کے مطالبہ کے لئے سفیر بھیجا گیا۔ اس نے سفیر کو قتل کر ڈالا۔ اس وجہ سے سلطان نے فوجیں لیکر چڑہائی کی۔ اور ۲۵ رمضان سنہ ۹۲۷ھ کو بلغراد فتح کر لیا۔

چونکہ سارے بلغاد میں یہی ایک ایسا قلعہ تھا جو عثمانیوں کے قبضہ سے باہر تھا اور جنگی اہمیت کے لحاظ سے نہایت وقیع تھا۔ اس لئے اس کی فتح کی خوشخبری تمام ممالک میں بھیجی گئی۔ بادشاہ روس اور رئیس جمہوریہ وینس نے سلطان کو اس کامیابی پہ تہنیت کے پیغامات بھیجے۔

---

[1] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہشتم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس وقت زیر تالیف ہے۔ — اسلم

رودوس یوحنا اور شلیمی کی جماعت جو بزور تیغ ارض مقدس سے نکالی گئی تھی رودس میں آکر مقیم ہوگئی تھی۔ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غارتگری کرتی تھی۔ سلاطین عثمانیہ مدت سے خواہشمند تھے کہ اس جزیرہ پر قبضہ کرلیں تاکہ انکا خطرہ مٹ جائے اور غنیم کے بیڑوں کو وہاں پناہ نہ مل سکے۔ فتح مصر کے بعد سے مصر کے ساتھ بحری سلسلہ مواصلات قائم کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔ سلطان نے وہاں کے صلیبی جنگ آور رہبانیوں کو لکھا کہ جزیرہ خالی کرکے چلے جاؤ تمہارے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن وہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ اس لئے بیڑہ لیکر سلطان نے چڑھائی کی۔ آخر میں مجبور ہوکر انہوں نے جزیرہ چھوڑنا منظور کیا۔ سلطان نے اپنی فوجیں قلعے کے دروازہ سے ایک میل دور ہٹالیں اور بارہ دن کی انکو مہلت دی کہ اپنا مال و اسباب لیکر چلے جائیں۔ شاہ شارلکان نے جزیرہ مالطہ انکے لئے خالی کردیا تھا۔ وہیں منتقل ہوگئے۔

کریمیا ۱۵۲۹ء میں کریمیا کے فرمانروا محمد کرائی خاں کو اس کے دونوں بیٹوں غازی اور بابا نے ملکر قتل کرڈالا جس کی وجہ سے وہاں فتنہ برپا ہوگیا۔ دولت علیہ نے جس کی سیادت اس پر برائے نام تھی اس موقع سے فائدہ اٹھاکر قبضہ کرلیا اور اس کو ایک عثمانی ولایت بنالیا۔

ہنگری اس زمانہ میں شارلکان یورپ میں سب سے بڑا بادشاہ تھا جو اسپین کیساتھ جرمنی اور ہالینڈ کا بھی مالک تھا اور اطالیہ کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ رکھتا تھا جمہوریہ فلارنس اور جنوا اس کی تابع تھیں اور جزائر سارڈینا اور سسلی بھی۔ فرانس کے بادشاہ فرنسیس اول نے اطالیہ کے صوبہ میلان کے لئے اس کے ساتھ جنگ کی اور شکست کھائی۔ باوجود اس کے کہ یورپ کے دربار میں فرانس سب سے اہم کیتھولک سلطنت تھی۔ جس نے یورپ میں اسلامی پیش قدمی کو روکنے کا حلف اٹھایا تھا لیکن اس موقع

مجبوراً فرنسیس کو دولت علیہ سے مدد مانگنی پڑی۔

چونکہ شار لکان عثمانیوں کا بھی دشمن تھا اس وجہ سے سلطان سلیمان نے فرنسیس کی امداد کی درخواست منظور کی اور ایک لاکھ فوج اور تین سو توپیں لیکر شار لکان کی طرف چلا۔ اس حملہ میں ہنگری کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔

ویانا کا محاصرہ

شار لکان نے اپنے بھائی فرڈیننڈ کو آسٹریا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ اس نے ہنگری پر فوج کشی کر کے جاپولائے کو جو سلطان کیطرف سے وہاں کا فرمانروا تھا شکست دیدی اور اس کے پایہ تخت بودین (بودابست) پر قابض ہو گیا سلطان نے خود ڈیڑھ لاکھ فوج لیکر چڑھائی کی۔ بودین کو واپس لیکر پھر جاپولائے کو وہاں کا والی بنایا اور آسٹریا میں بڑھکر ویانا کا محاصرہ کیا۔ لیکن شدت سرما کی وجہ سے اس کو فتح نہ کر سکا اور واپس چلا آیا۔ یہی سب سے آخری نقطہ تھا جس پر ترک یورپ میں پہنچ سکے۔

تبریز و بغداد

شاہ ایران طہماسپ پسر اسمٰعیل صفوی نے سلیمان کو یورپ کی جنگ میں مشغول پاکر شریف بک کو جو ترکی سرحد کا والی تھا اپنے ساتھ ملالیا اور عثمانی حدود میں دست درازی شروع کی سلیمان نے ۹۴۰ھ میں لشکر کشی کی اور وان اور ارجیش کے قلعے لیتا ہوا تبریز میں داخل ہو گیا پھر عراق عرب کو بھی فتح کر کے بغداد لے لیا اور وہاں کچھ دنوں رہکر نجف اشرف اور کربلا وغیرہ کی زیارتیں کیں، امام ابو حنیفہؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مزارات تعمیر کرائے۔

الجزائر

آستانہ میں واپس آنے پر باربروسہ[۱] خیرالدین پاشا نے جو الجزائر کے ایک حصہ پر قابض تھا تحفے اور ہدیے لاکر پیش کئے اور اپنے مقبوضہ کو سلطنت عثمانیہ میں

---

[۱] باربروسہ ترکوں کا سب سے نامور امیر البحر روم کے جزیرہ مدلی کا باشندہ تھا جس کا (باقی)

شامل کرنیکی درخواست کی۔ سلطان نے منظور فرمایا اور خیرالدین کو قبودان دریا کے نام سے عثمانی بیڑہ کا امیر بنا دیا۔

شارلکان نے اپنے مشہور امیرالبحر آندرہ دوریا کی ماتحتی میں ایک قوی بیڑہ بھیجا تھا جس نے تونس کو تاخت و تاراج کر کے وہاں کے مساجد و معابد کو منہدم کر ڈالا تھا۔ اس لئے سلطان نے باربروسہ کی قیادت میں عثمانی اسطول روانہ کیا جس نے اطالیہ کے ساحل پر پہنچکر اندرہ دوریا کے بیڑہ کو سخت شکست دی اور اترانتو اور اس کے حوالی سے بے شمار مال غنیمت لیکر واپس آیا۔

بحر ہند ۹۴۴ھ میں دلی کے بادشاہ نے مغلوں (ہمایوں) کے مقابلہ میں اعانت چاہی نیز بہادر شاہ گجراتی کیطرف سے بھی سلطان کے پاس سفیر پہنچے اور پرتگالیوں کے استیصال کے لئے جن کی غارت گریوں اور دراز دستیوں سے سواحل ہند کے اسلامی علاقے ویران ہو رہے تھے امداد کے طالب ہوئے۔ سلطان کے حکم سے سلیمان پاشا والی مصر، جنگی کشتیاں جن میں بیس ہزار سپاہی اور بڑی بڑی توپیں تھیں لیکر آیا۔ اس بیڑہ نے بحر احمر سے نکل کر عدن پر قبضہ جمایا پھر سواحل گجرات پر آکر پرتگالی قزاقوں کے قلعے منہدم کئے۔ آخر میں انکے سب سے بڑے مرکز ڈیو (دیپ) کا محاصرہ کیا۔ لیکن بعض وجوہ سے اس کو فتح کئے بغیر اموال غنیمت لیکر واپس چلا گیا۔

(بقیہ) پیشہ بحری قزاقی تھا۔ کچھ دنوں تونس میں رہنے کے باعث یہ اور آسکا بھائی اورج دونوں مسلمان ہوگئے۔ اس کے بعد رومی کشتیوں کو لوٹنے لگے۔ سلطان سلیم نے انکو دس کشتیاں دی تھیں انہوں نے اپنی قوت بڑھا کر الجزائر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اندلس میں جب عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہوگیا اور وہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے لگے اس وقت اس نے وہاں کے لاکھوں مصیبت زدہ مسلمانوں کو الجزائر میں لاکر پہنچا دیا۔

سلیمان پاشا نے عدن کے بعد رفتہ رفتہ پورے یمن پر قبضہ کرکے اس کو عثمانی املاک میں شامل کردیا۔

جزائر بحر روم

فرانس اور دولت علیہ میں فتح اطالیہ کے لئے باہم یہ معاہدہ ہوا کہ عثمانی بیڑہ نیپل، سسلی اور اسپین کیطرف سے حملہ آور ہوا اور فرانس شمالی سمت سے۔ اس کے مطابق سلطان ایک لاکھ فوج لیکر بلادارناؤط کیطرف آیا اور اپنے بیڑہ کو بھی روانہ کیا۔ لیکن جمہوریہ وینس نے اس مخالفت کی مخالفت کی۔ نیز عام مسیحی رائے بھی فرنسیس اول کے خلاف ہوگئی کہ اس نے اپنے ہم مذہبوں سے لڑنے کے لئے اسلامی سلطنت کو اپنا حلیف و مددگار بنایا۔ اس وجہ سے فرنسیس رک گیا اور جو منصوبہ تھا وہ پورا نہ ہوسکا۔ ورنہ سارا اطالیہ دولت علیہ کے قبضہ میں آگیا ہوتا۔

باربروسہ نے جزیرہ کارفو کا محاصرہ کر رکھا تھا مگر سفیر فرانس نے جس کو سلطان کے دربار میں بہت در خور حاصل تھا بیچ میں پڑکر انکی طرف سے حربی ضمانت دیدی اس لئے محاصرہ اٹھالیا گیا۔ واپسی میں باربروسہ نے کریٹ وغیرہ بحر روم کے اکثر جزیرے فتح کرلئے۔ آندرہ دوریا ۱۶۷ جہاز لیکر اس کے مقابلہ میں آیا مگر ہزیمت اٹھاکر واپس گیا۔

ان فتوحات سے اسپینی بیڑہ کا اقتدار جاتا رہا اور بحری سیادت ترکی بیڑہ نے لیلی جس کی شہرت اقطاع عالم میں پھیل گئی۔

سنہ ۹۴۲ھ میں فرانس کے ساتھ جدید عہدنامہ ہوا جس میں سلطان نے بوجہ حلیف ہونے کے فرنچ تاجروں کے لئے عثمانی قلمرو میں خاص مراعات منظور فرمائیں ٹھیک اسی زمانہ میں شاہ طہماسپ شارلکان کے ساتھ دوستی اور مخالفت کی کوشش کررہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا

فرانس کی مدد

سنہ ۹۵۰ھ میں فرنسیس اول اور شاہ شارلکان میں پھر جنگ شروع ہوئی اس وقت فرانس کیطرف سے موسیو بولان نامی سفیر سلطان کے پاس آکر امداد کا طالب ہوا۔ اس نے باربروسہ کو ایک بیڑہ کے ساتھ بھیجا جس نے پہنچکر نیس

کا محاصرہ کیا لیکن فرنچ اور ترکی فوجوں میں اختلاف ہو جانے کے باعث فتح نہ کر سکا۔ ادھر کلیا نے فرنسیس کو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد لینے پر مطعون کرنا شروع کیا جس سے عام عیسائیوں نے اس کو ملحد اور بے دین قرار دیا اس وجہ سے مجبور ہو کر اس نے عثمانی بیڑہ کو رخصت کر دیا۔ واپس آنے کے بعد ۹۵۳ھ میں باربروسہ قسطنطنیہ میں انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ پر طورغود پاشا عثمانی بیڑہ کا امیر مقرر ہوا۔

اسی سال شارلکان نے تحفے اور ہدیئے بھیجکر سلطان سے مصالحت کی درخواست کی۔ سلطان نے منظور کیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ پانچ سال تک جنگ نہ ہو گی بشرطیکہ آسٹریا کیطرف سے سالانہ تیس ہزار اشرفی خراج موصول ہوتا رہے۔

سنہ ۹۶۰ھ میں شاہ طہماسپ نے پھر تعدی اختیار کی۔ سلطان نے فوج کشی کی اور قرہ باغ کے متصل اس کو شکست دی۔ شاہ مذکور نے آخر میں قلعہ قرص دولت علیہ کے حوالہ کر کے صلح کر لی۔

طورغود پاشا نے اس درمیان میں جزیرۂ مالطہ کا محاصرہ کیا۔ اسی میں اس نے شہادت پائی جس کے بعد عثمانی بیڑہ بے نیل مرام واپس آ گیا۔

وفات

سنہ ۹۷۳ھ میں میکسیلمین پسر فرڈیننڈ شاہ آسٹریا نے ہنگری کے شہر توکاے پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے باوجود نقرس کی تکلیف کے خود فوج لیکر چڑھائی کی اور آسٹریا کے قلعہ سکتوار کا محاصرہ کیا۔ فتح سے چند روز پیشتر ۳۰ صفر ۹۷۴ھ میں انتقال کر گیا وفات کے وقت اس کی عمر ۷۴ سال کی تھی۔

سلطان سلیمان ۴۸ سال تک تخت خلافت و سلطنت پر متمکن رہا۔ اس کے زمانہ میں چونکہ حکومت کے قوانین نئے سرے سے وضع کئے گئے اور فوج کی تقسیم اور اس کے مناصب کی ترتیب ہوئی اس وجہ سے وہ قانونی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اس کا عہد دولت عثمانیہ کی تاریخ میں منتہائے اقبال اور کمال کا عہد تھا جس میں

مشرق اور مغرب میں فتوحات ہوئیں اور دولت علیہ کا نفوذ اور اس کے اقتدار کا غلبہ دور دور تک پہنچ گیا یہانتک کہ وہ اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری و بری طاقت بن گئی تین لاکھ جنگ آور فوجیں تھیں جن میں پچاس ہزار نظامی تھی اور تین سو جنگی کشتیاں تھیں جو اسوقت کے بڑے بڑے بیڑہ کو شکست دے چکی تھیں اور مشرق سے لیکر مغرب تک سمندروں پر انکی سطوت قائم ہو گئی تھی۔

سلیمان کے بعد سے سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا جو سلسلہ وار چلا آرہا ہے یہانتک کہ وہ اس حالت کو پہنچ گئی جس میں اب ہے۔ اس زوال کے مختلف اسباب ہوئے۔

(۱) رقبہ سلطنت اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ دولت اور ثروت کی زیادتی ہوئی جس کی وجہ سے سادگی اور سپہگری کے بجائے عیش پرستی اور آرام طلبی آگئی جسکا لازمی نتیجہ زوال ہوتا ہے۔

(۲) انکشاریہ کا سپہ سالار اعظم خود سلطان ہوتا تھا۔ اس لئے انکا دستور یہ تھا کہ وہ بلا سلطان کے لئے ہوئے جنگ کیلئے نہیں نکلتے تھے۔ سلیمان کے عہد سے یہ قانون بن گیا کہ وہ اپنے امرا کے ماتحت جنگ کے لئے جایا کریں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد میں اکثر سلاطین نے عیش پرستی کی وجہ سے جنگ و جہاد میں جانا چھوڑ دیا۔

علاوہ بریں انکشاریہ کو جو سلطنت کے عمود تھے شادیاں کرنے اور گھر بنا کر رہنے کی بھی اجازت دیدی گئی جس سے انکی جنگی حمیت میں فتور پڑ گیا۔

(۳) پہلے سلطنت کے تمام مہمات دیوان وزرا میں بریاست و مشورۂ سلطانی انجام پاتے تھے لیکن سلیمان نے اس دستور کو توڑ دیا اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ صدر اعظم کی ماتحتی میں جملہ امور طے ہوا کریں۔ اس وجہ سے خود سلطان اکثر معاملات کی حقیقت سے ناواقف رہنے لگا اور وزرا اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے حرم اور بیگمات سے بھی امداد لینے لگے۔ اس طرح پر سلطان کے گرد دسیسہ کاریوں کا ایک جال بچھگیا جس میں وہ اکثر شکار ہونے لگا۔

اور سلطنت کے کام بگڑنے لگے ۔ خاصکر اس وجہ سے اور بھی کہ وزراء قومیت میں بھی بالعموم مغائر ہوتے تھے ۔ کیونکہ اکثر نو مسلم نصاریٰ جو سلطان کے خادم یا مقرب ہوتے تھے وہی صدارت عظمیٰ کے منصب پر مقرر کر دیئے جاتے تھے ۔

(۴) سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ ترکوں کا حریف یورپ دورِ جہالت اور وحشت سے نکلکر علم اور تمدن کیطرف آرہا تھا ۔ بجائے انتشار اور طوائف الملوکی کے ان میں وحدت اور ملوکیت کا اقتدار پیدا ہو رہا تھا ۔ ملکی اور ملی مقاصد کے لئے بڑی بڑی قربانیاں اور مصائب برداشت کرنیکی قوت آرہی تھی ۔ اندلس کے مسلمانوں پر مکمل تسلط کر لینے کے بعد اس کے فاتحانہ جذبات بڑھ گئے تھے ۔ مطابع کی ایجاد علوم و فنون کی اشاعت اور آتشیں اسلحہ کی ساخت اور انکے استعمال سے نوجوان یورپ اسی قدر دن بدن آگے بڑھ رہا تھا جس قدر پرانا ترک پیچھے ہٹ رہا تھا ۔

سلطان سلیمان اعظم اپنی بے مثل شجاعت اور عالی حوصلگی اور بے نظیر تدبر اور فرزانگی کی بدولت دنیا کا نہایت ممتاز سلطان ہوتا اگر اس کی زندگی پر نسل اولاد کا بدنما دھبہ نہ پڑتا ۔ صورت یہ ہوئی کہ اس کی ایک روسی بیوی روکسلان (فرحانہ) نامی تھی جو بوجہ اپنے حسن و جمال کے شروع سے آخر تک اس کے قلب کی مالک رہی ۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہزادہ سلیم جو اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے ولیعہد ہو ۔ اسلئے اس نے اپنے داماد رستم پاشا کو صدر بنوایا اور اس کے ساتھ ملکر اس کے لئے کوشش شروع کی ۔ ان دونوں نے شاہزادہ مصطفےٰ کیطرف سے جو ولیعہد تھا سلطان کو بدظن کرانا شروع کیا ۔

ایران کے آخری حملہ کے موقع پر مقام ارکلی میں ایک دن رستم پاشا نے سلطان کو مطلع کیا کہ مصطفےٰ نے انکشاریہ کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے ۔ وہ موقع دیکھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی ہی میں اس کو تخت پر بٹھا دیں ۔ چونکہ مصطفےٰ بوجہ اپنی سپہگری اور شجاعت کے انکشاریہ میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھا ۔ اس وجہ سے سلطان کو یقین آگیا ۔ اس نے

کوئی تفتیش نہیں کی اور مصطفیٰ کو بلاکر حاجبوں سے قتل کرا دیا۔ انکشاریہ نے اس پر سخت شورش مچائی اور صدر اعظم کے قتل کے درپے ہوئے سلطان نے انکی تسکین خاطر کے لئے رستم پاشا کو معزول کر دیا۔ مصطفیٰ کے بھائی جہانگیر نے باپ کے سامنے جاکر اس قتل پر سخت جذبہ کا اظہار کیا سلطان نے اس کو توبیخ کی جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی۔ فرحانہ نے اپنے ایک خاص آدمی کو بھیجکر مصطفیٰ کے شیر خوار بچہ کو بھی مروا ڈالا۔ اور اس فکر میں پڑی کہ شاہزادہ بایزید جو باقی رہگیا ہے اسکا بھی خاتمہ کرا دے تاکہ اس کے بیٹے سلیم کے سوا اور کوئی تخت و تاج کا وارث نہ رہجائے مگر اسی اثنا میں وہ خود مرگئی۔ اس کے بعد لالہ مصطفیٰ نے جس کو وہ سلیم کا مربی بناگئی تھی اپنی پر فریب دراندازیوں سے سلیمان کو بایزید کا بھی مخالف بنا دیا۔ یہانتک کہ اس نے بایزید کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی۔ وہ مقابلہ میں شکست کھاکر بھاگا اور معہ اپنے چاروں بیٹوں کے والی ایران شاہ طہماسپ کے یہاں پناہگزیں ہوا۔ اس نے نہایت گرمجوشی سے لیکر اپنے پاس رکھا اور حمایت کا وعدہ کیا مگر درپردہ سلطان کو اطلاع دیدی اور جب اس کے آدمی آئے تو انکے حوالہ کر دیا۔ انہوں نے قزوین پہنچکر سلطان کے حکم سے بایزید کو معہ اسکے چاروں بیٹوں کے قتل کر ڈالا بروصہ میں اسکا ایک شیر خوار بچہ تھا اسکا بھی گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس طرح پر بجز سلیم کے سلطان نے خود اپنی ساری اولاد کا خاتمہ کرا دیا۔

ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی

کوئی دو سال ہوئے مشہور ترکی ادیب خالدہ خانم نے اپنے حالات زندگی لکھے تھے جو امریکہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ جس سے ترکی قوم پرستی کی تاریخ پر نہایت دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ میرے لئے اس قوم پرستی کے دریا میں جست کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ اور اس قوم پرستی نے جنگ بلقان کی ہزیمت کے بعد بڑی شدید شکل اختیار کر لی تھی۔ جو قومی رجحانات پہلے کچھ بے شکل اور غیر متعین سے تھے انہیں طرابلس کی معرکہ آرائی اور اسکی شجاعانہ روح سے تقویت پہونچی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر جنگ کے مصائب کے بعد پردیسیوں کے غیر منصفانہ برتاؤ سے ہمیں اتنا سخت دھکا نہ لگا ہوتا تو شاید ہم کبھی نہ چونکتے نہ اس درجہ جوشیلے قوم پرست بن سکتے۔

شروع شروع میں تو یوسف اکچورہ اور گیوک الپ ضیاء سے واقفیت نے مجھے اپنی نسلی ماضی سے قریب اور عثمانی ماضی سے دور کیا۔ مجھے ہمیشہ سے عوام کے قصہ کہانیوں اور عام ادب کے بسیط اور سادہ حسن سے لگاؤ تھا۔ اس لئے اپنی نسل کے قدیم ایام نے قوم کی ذکھی شاعری اور اس کے بے لکھے قصے کہانیوں کے ماخذ کی حیثیت سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تمدنی تجسس اور واقعات خارجی کا ظلم یہ دونوں چیزیں اکثر ذہین ترکوں کو اپنی نسل کے ابتدائی حالات کے گہرے مطالعہ پر مجبور کر رہی تھیں۔

ترکی میں قوم پرستی کے مختلف دور رہے ہیں۔ مختلف نام اور مختلف تعریفیں۔ پھر مجموعی حیثیت سے یہی جدید ترکی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کے فہم کی کنجی ہے اس لئے اس

تحریک کے مختلف دوروں کا ذکر ضروری ہے۔

ترکی قوم پرستی کی ابتدا غیر شعوری تمدنی حیثیت سے ۱۹۰۸ء سے پہلے ہوئی اور وہ زبان کو سادہ بنانے کی شکل میں لیکن یہ تحریک صاف طور پر عثمانی ترکوں کی تحریک تھی۔ رضا توفیق اور محمد امین نے پہلے پہل ترکی بحریں اور اناطولی ترکوں کی سادہ زبان استعمال کی اور انکی تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عثمانی اور دوسرے ترکوں کے فرق کو صاف صاف محسوس کرتے تھے قومی حیثیت سے دیکھئے تو عثمانی ترک بالکل ہی مختلف معلوم ہوتا ہے۔ وہ مشرق قریب اور یورپ میں آیا اور وہاں اس نے اپنے خون اپنی زبان، بلکہ اپنے نفس کے ہر ہر ذرہ میں کوئی نئی کوئی مخصوص چیز حاصل کر لی۔ اس کی نسل کی ابتدائی قوت اور ماہیت پر کتنی ہی گہری نظر ڈالنے کی کوشش کیجئے لیکن آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ اس کی روح اور اس کے جسم میں ایسی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جنہوں نے اسے اس وقت سے بہت مختلف بنا دیا ہے جب وہ پہلے پہل اس ملک میں آیا تھا جسے ترکی کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ عثمانی ترک ہے اور اس پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئے اور جاننا چاہئے کہ ہر وہ چیز جو لسانی و تمدنی اعتبار سے اس کی اس مخصوص حیثیت کے خلاف ہوگی لازماً زیادہ پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اس کی زبان کو پھر چغتائی ملک میں واپس بھیج دینے کیلئے مجبور کرنا ایسی ہی مصنوعی بات ہوگی جیسا اسے ایرانی یا فرانسیسی کے سانچے میں ڈھالنا، لہٰذا اسکی سادگی اور اسکی قوم پرستی خود اسکی قومی روح کے مطابق چلیگی دوسری طرح نہیں۔

گذشتہ پچیس سال میں عثمانی ترک برابر اپنی زبان پر نظر ثانی کرتا اور اسے زیادہ لطیف اور زیادہ وسیع بناتا رہا ہے اس میں ایک ترقی یافتہ زبان کی اصطلاحیں اور امکانات پیدا کرتا رہا ہے اور ایسی زبان بنانے میں کوشاں رہا ہے جس میں سائنس اور فلسفہ پیدا ہو سکے اور انکی تلقین و اشاعت ممکن ہو۔ شمس الدین سیمع بے اور پروفیسر ناجی نے ترکی لغت کو اسی سے بالارادہ سادہ بنایا تھا۔ ۱۹۱۰ء سے ترکی اہل قلم نے بھی پھر اسی قسم کی ایک بالارادہ کوشش شروع کی، انہوں نے علمی اصطلاحات کو مقرر کرنے کی کوشش کی، ترکی قواعد کو سادہ بنایا

اور اس سے عربی اور فارسی کو علیحدہ کیا۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات معلوم کرنے والوں میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا، نعیم اور رضا توفیق بے کے نام لینے چاہئیں اور حسین جاہد تے وہ جدید ترکی قواعد لکھی جواب نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک زبان کی تحقیق تھی۔ ایک قومی روح کا پیدا کرنا تھا اور عثمانی ترکوں کے تمدن کو سمجھنے کی کوشش تھی۔ . . . . . .

اتحاد تورانی اس قوم پرستی کی وسیع تر تعبیر و تعریف تھی جس کا اظہار گیوک الپ ضیا اور بعض مشہور روسی ترک اہل قلم مثلاً احمد آغایف اور یوسف اکچورا بے نے کیا۔ پہلے تو یہ خالص تمدنی چیز تھی لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے بعض رہنماؤں نے اسے ایک سیاسی سطح نظر بنا دیا خصوصاً اس زمانہ میں جب جنگ عظیم کے وقت ترکی افواج قدیم روس کے علاقہ میں پہنچ گئی تھیں لیکن سیاسی اعتبار سے اتحاد تورانی کی نہ کبھی کوئی متعین حدود تھیں، نہ اس کی کوئی تشریح تھی نہ کوئی واضح اظہار اس پر جب کبھی کوئی اعتراض کرتا تو طلعت پاشا خوش مذاقی سے مسکرا فرمایا کرتے "کیوں کیا ہے۔ ممکن ہو یہ ہمیں بحر اصفر تک پہنچا دے!" لیکن آخر اس اتحاد تورانی کی اصلی بنیاد کیا تھی؟ کیا یہ سب تورانیوں کا سیاسی اتحاد تھا؟ عثمانی ترک جس اتحاد تورانی کے خواہاں تھے کیا اس میں عیسائی ترک کے لئے بھی کوئی جگہ تھی؟ یا یہ صرف مسلمان ترکوں کے لئے تھا جو دراصل انور بے کے اتحاد اسلامی کی ایک شکل ہوتی جس میں اس اتحاد مذہب کے ساتھ اتحاد نسل کو بھی شامل کر دیا جاتا جس کے پیدا کرنے کا ایک دھندلا سا تخیل انور پاشا کے ذہن میں تھا لیکن جس کے قیام میں وہ ناکام رہے ——

میں ترکوں کو متحد کرنے کے سیاسی تخیل میں گیوک الپ ضیا کی مخالف تھی۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ ترکی میں قوم پرستی تمدنی اور جغرافی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہمیں اور روسی ترکوں کو اس طرح متحد کیا جا سکے جس طرح کہ اس وقت لوگ ممکن سمجھتے تھے۔ روسی ترک خود اپنی مخصوص قومی روش رکھتے ہیں اور ہم سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ وہ ہمارے ادب کے کتنے ہی دلدادہ ہوں لیکن عثمانی ترکوں کی مداخلت وہ کبھی گوارا نہ کریں گے۔ جو عناصر اور اثرات ان کے تمدن کی تعمیر میں صرف ہو رہے ہیں وہ بالکل روسی ہیں۔ عثمانی ترکوں کے عناصر تمام تر مغربی ہیں۔ مستقبل بعید میں

عثمانی ترکوں اور بحر کیسپین تک کے ترکوں میں زیادہ سے زیادہ جو سیاسی تعلق ممکن ہے اور جو واقعی سب سے پسندیدہ بھی ہے وہ یہ خود مختار ریاستوں کا اتحاد ہے جن میں دونوں عناصر کو پورا پورا آزادانہ موقع ہو کہ وہ اپنے مخصوص تمدن اور اپنی مخصوص ترقی کو پیش نظر رکھ سکیں لیکن اگر ایسا وقت کبھی آیا تو میں تو سمجھتی ہوں کہ اس وقت آرمینیا، جیارجیا، اور ایران بھی ترکی ریاستہائے متحدہ میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو چکے ہونگے تاکہ روس اور یورپ کے حملوں اور انکے تسلط سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔

کیوک الپ ضیا دراصل اتحادی عہد کا ایک بڑا صاحب فکر تھا یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ اتحاد تورانی کے تخیل کو پہلے کس نے سیاسی رنگ دیا، خود ضیا نے یا اس کی جماعت کے بڑے سیاست دانوں نے لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ضیا نے اسے شروع ایک خالص تمدنی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور انکے تورانی اجداد کے درمیان کی خلیج کو پر کر سکے اس نے بچوں کے لئے بہت سی مزیدار نظمیں اور بہت سے قصے لکھے۔ اس نے ترکوں کی اصل کے متعلق اپنے علم کو اور زندگی کے اس تصور کو ہر دلعزیز کرنے کی بہت کوشش کی جسے یہ خود عالم وجود میں لانا چاہتا تھا۔ اپنے بعض ابتدائی تصنیفوں میں وہ اس غرض سے نہایت قدیم ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن یہ بالکل مردہ اور بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے جلد ہی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اپنی آخری تصانیف میں یہ ملک کی معمولی ترکی زبان لکھنے لگا۔ . . . .

سنہ ۱۹۱۱ء کے اوائل میں ضیا سالونکا سے قسطنطنیہ آیا اور اپنے ساتھ اپنے ادبی و فلسفیانہ مشاغل بھی لایا۔ سالونکا میں اس نے ایک ذہنی تحریک کی ابتدا کی تھی۔ جس کا ایک رسالہ بھی تھا: "نوجوان قلم" اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی نہایت قابل جماعت تھی۔ . . . . یہ دیار بکر کے ایک مشہور خاندان سے تھا جس میں علماء اور شعراء پیدا ہو چکے تھے۔ شروع جوانی میں اس نے کردی زبان کی اصل اور اس کی قواعد پر کام کیا تھا اور اس وجہ سے بعض حلقوں میں اسے کردی قوم پرست سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ اعلی تعلیم کے لئے عبدالحمید کے زمانہ میں قسطنطنیہ آیا۔ جہاں وہ نہایت جوشیلا "نوجوان

ترک،، بنگیا اور طالبعلمی کے زمانہ میں متعدد بار اس وجہ سے گرفتار ہوا کہ نامق کمال کی تصانیف پڑھا کرتا تھا۔ جب انجمن اتحاد و ترقی تنظیم ہوئی ہے تو یہ سالونکا میں تھا اور اس سیاسی انجمن کا نہایت معزز رکن بنا۔

یہ ایک پستہ قد، موٹا سا، سیاہ فام آدمی تھا، پیشانی پر صلیب کا سا ایک عجیب نشان تھا جس پر ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ جب بیس برس کا تھا تو اس نے اپنے سر میں گولی ماری تھی، یہ نشان اسی گولی کا تھا۔ اس کے مزید اثر سے یہ جیسے تیسے بچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب سی تھیں اور ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ جو اشخاص اور جو چیزیں اس کے ارد گرد ہیں ان سے دور دیکھتی ہیں اسکا انداز اس اجنبی کا سا تھا جو ایک غیر مانوس ماحول کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا ہو۔ لیکن پھر بھی یہ جلد متاثر ہو جاتا تھا۔ اور بات چیت یا مطالعہ سے اپنے خیالات ان لوگوں کی نسبت آسانی سے بدل دیتا تھا جو بظاہر اپنے ماحول میں بالکل منہمک نظر آتے ہیں۔ اسے فلسفہ اور اجتماعیات سے خاص دلچسپی تھی۔

یہ ترکوں کی جماعتی اصلاح کی رہنمائی کو سیاسی اصلاح سے زیادہ اپنا مقصد زندگی جانتا تھا جماعتی اصلاح اس مواد کی بنا پر کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے قبل اسلام سیاسی و جماعتی اداروں کے متعلق جمع کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہم اپنے عہد "جہالت" کیطرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ پروٹسٹنٹ اصلاح مذہب کا بڑا مداح تھا کہ اسی سے یورپ میں صحیح قوم پرستی شروع ہوئی۔ یہ ایک رسالہ "اسلامک ریویو" شائع کرتا تھا جس میں قرآن کا نہایت اچھا ترکی ترجمہ نکلتا رہا۔ اس کے مذہبی خیالات پر کازان کے مشہور تاتار مسلم مصلح موسے بکییف کا بڑا اثر تھا۔

اس زمانہ میں اسکا سب سے دلچسپ کام ایک رسالہ تھا "بچوں کی دنیا" جو یہ ترکی بچوں کے لئے نکالتا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی سیدھی سادی کوشش تھی۔ اس میں کامیابی کے ساتھ انگریزی سے جانوروں اور پریوں کے قصے ترجمہ ہوئے۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی سادہ

ترکی کہانیاں بھی شائع کیں جو قوم کی غیر نوشتہ روایات سے ماخوذ تھیں اور جنہیں اس نے بہت دلپسند ترکی نظم کا لباس دیدیا تھا۔

میں جب اس وقت کو یاد کرتی ہوں کہ وہ میرے ہرے لمپ کی روشنی میں بیٹھا یوسف اکخورہ کی کٹیلی اور طعن آمیز باتوں پر نرمی اور مہربانی سے مسکرا رہا ہے، اور مذہب، ادب، اخلاق، ترکی عورتوں اور ترک بچوں کے لئے ایک بہتر حالت کا خواب دیکھ رہا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ اسی شخص نے جنگ عظیم کے آخر سالوں میں اتحاد و ترقی کو مادی فلسفہ کو مانا بلکہ اس کے نشوونما میں مدد تک دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس پر جرمن فلسفہ کا بہت اثر تھا خصوصاً در کھائیم کا۔ لیکن اس کا آخری پیغمبر برگسان تھا البتہ ایک بات میں اسکا خیال ہمیشہ ایک تھا یعنی ترکوں کی ترقی کی سمت کیا ہو۔ اس کا یقین تھا کہ ترکوں میں کسی نہ کسی طرح مغربیت پیدا کرنی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا قول ہے:

"میں نسل سے ترک ہوں، مذہب میں مسلمان ہوں، تہذیب و تمدن میں مغربی" اس کی کتاب "ترکیت، اسلامیت، مغربیت" میں اس کے فلسفیانہ اور جماعتی خیالات ہیں۔

کیوک الپ ضیا کے اتحاد تورانی کے ساتھ ساتھ انور پاشا اور انکے ساتھیوں کا اتحاد اسلامی تھا۔ جنگ کے آخری زمانہ میں اگر یہ لوگ بھی اتحاد تورانی کے حامی معلوم ہوتے تھے تو اس لئے کہ یہ تورانیوں کو ترکی سے متحد کرنا چاہتے تھے وہ مسلمان تھے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے انکے اتحاد اسلامی کا بھی اتنا ہی خفیف اثر تھا جتنا اتحاد تورانی کا۔ مسلمان عربوں اور مسلمان البانیوں کیطرف سے علیحدگی کی کوششوں نے اس اتحاد اسلامی کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ علاوہ ازیں نوجوان اصلاحی عناصر، قدامت پسندی اور جنون مذہبی جانکر اس سے خائف تھے۔ اگر مسلمان اقلیتوں کے مقاصد اور انکی ضرورتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہوتی تو شاید انور پاشا کے اتحاد اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے میں مدد ملتی۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ اس میں دلچسپی بس ترکی کے باہر والے مسلمانوں ہی نے لی۔ اتحاد اسلامی کی نسبت دوسروں اتحادی کا خوف بالکل بے بنیاد تھا اور اپنی

رعایا میں حقوق طلبی کی تمام تحریکوں کو ترکی اثر کا نتیجہ سمجھنا بالکل بے اصل تھا اور ہے۔ مجھے تو بڑی تفریح ہوئی جب میں نے لندن ٹائمس میں پڑھا کہ حجاز میں ابن سعود کی تحریک کو انگورا سے مدد مل رہی ہے! انور کی روح کو تو اس خبر سے یقیناً خوشی ہوگی لیکن موجودہ لا مذہب ترکی حکومت کے لئے تو یہ طعن سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی۔

قوم پرستی کی پہلی خارجی تنظیم "ترک یوردو" میں ہوئی جو جنیوا کے ترک طلبہ نے بطور ایک ادبی و تمدنی کلب کے ۱۹۱۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں چونکہ چند نہایت اچھے روسی ترک طالب علم شامل تھے اس لئے اس کی ذہنیت کم از کم تمدنی لحاظ سے تورانی تھی۔ اس کی طرف سے غیر موقت رسالے شائع ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں جن میں سے بعض میں نہایت عمدہ ادبی مضامین اور ترکیات پر نئی تحقیق شائع ہوتی ہے۔ اس کلب نے ایک تجویز منظور کی جس میں مجھے "ام الاتراک" کا لقب دیا گیا تھا یہ ترک نوجوانوں کی طرف سے ایسی تحسین تھی جس نے میرے دل پر صرف اثر ہی نہیں کیا بلکہ مجھ میں اپنی قوم کی ماں ہونے کے فرائض کا احساس بھی پیدا کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج میں اس نام کے دینے والوں کا پتہ دے رہی ہوں جو ترکی دنیا میں عام طور پر میرے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔ یہی وہ بڑے سے بڑا معاوضہ ہے اور جو اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں اپنی حقیر قومی خدمات کے لئے طلب کر سکتی۔

سال بھر بعد ذرا بڑی عمر کے محقق طلبہ نے ایک اور ترک یوردو قائم کیا جس میں مشہور مقنن و مدبر یوسف کمال بھی شریک تھے۔ دار السلطنت نے بھی تقلید کی۔ استنبول میں ترک یوردو کا قیام منجملہ ان بہت سے ذہنی کاموں کے تھا جو انجمن اتحاد و ترقی نے شروع کئے تھے لیکن جو لوگ انجمن میں تھے وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے اس کی مالی مدد کی لیکن اسے کبھی اپنا سیاسی آلہ کار نہیں بنایا۔ اس کلب کی طرف سے ایک ہفتہ وار پرچہ شائع ہوتا تھا جو اب بھی نکلتا ہے اس کا مدیر یوسف اکچورا تھا جو بالاعلان اتحاد و ترقی کا مخالف تھا اگرچہ بڑا پکا تورانی تھا۔ اس نے اس پرچہ کو بہت کامیاب بنایا اور غالباً ترکی سے زیادہ اس کے پڑھنے والے روسی ترکوں میں تھے۔ اکچورا عثمانی

ترکوں کے مقابلہ میں روسی ترک کی فضیلت کا قائل تھا اور اس لئے دونوں کے اتحاد کا بڑا حامی۔ اس نے اس موضوع پر بڑے دلچسپ مضامین لکھے اور بڑا لطیفہ ہے کہ جو ترکی زبان استعمال کرتا تھا وہ قدیم زمانہ کے عثمانیوں کی زبان تھی نہ کہ جدید قوم پرست ترکوں کی۔ اس پرچہ میں کیوک الپ ضیا، محمد امین، احمد حکمت، رضا توفیق اور دوسرے نوجوان قوم پرست مضامین لکھتے تھے۔

قوم پرستی کے خارجی مظاہر ایک درجہ اور گہرے ہوئے اور نئی نسل میں خصوصاً طلبہ میں پھیلے پہلے یہ چیز طبی طلبہ میں شروع ہوئی۔ شعبہ طب کو تقریباً ہر جدید تحریک کے آغاز کا فخر حاصل ہے خصوصاً جب یہ تحریک استبداد شخصی یا استبداد جہل و قدامت پرستی کے خلاف ہو۔ عبدالحمید کے ظلم کو یہیں سے سب زیادہ شکار ملے۔ لیکن اس ضمن میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ترک طالب علم اپنے کو سلطنت کے دوسرے عثمانی طلبہ سے مختلف اور علیحدہ کیوں سمجھتے تھے۔

۱۹۰۸ء کے بعد سے ترکی کے تمام غیر ترکی عناصر نے عیسائی ہوں یا مسلم اپنے اپنے قومی اور سیاسی کلب قائم کرلئے تھے۔ جب ترک طلبہ نے دیکھا کہ ہمارے ساتھی جنہیں ہم اب تک بالکل اپنا سمجھتے تھے علیحدہ علیحدہ نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نام جدا جدا جن کے مقاصد علیحدہ علیحدہ ہیں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ غیر ترکی نوجوانوں میں اپنے قومی معاملات کے متعلق بڑی سرگرمیاں تھیں اور وہ انہیں ترکوں کے معاملات سے جدا سمجھتے تھے۔

عثمانی ترک اب تک ایک مجموعی ہستی تھا۔ بس اوروں کی طرح عثمانی رعایا۔ اس کے بہترین مصنف سلطنت کے سب تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے لکھتے تھے۔ اس کے قصے کہانیاں اس کا عام ادب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ اسے لکھتے نہ تھے لیکن یہ تمام سادے ترکی بولنے والے عثمانیوں کے ذہن اور حافظہ میں بڑی قوت رکھتا تھا اب پہلی مرتبہ عثمانی ترک اپنے عنصر میں آیا اور ترکی میں نسلوں کے مجموعہ سے علیحدہ ہوا اور اس نے اس امکان کو دھندلے طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے کو دوسرے سے مختلف حیثیت سے تلاش کرے، اور پائے۔ وہ اوروں سے مختلف کس طرح تھا؟ دوسروں کی آرزوؤں اور مقاصد کے انبوہ میں وہ کدھر چلا جا رہا تھا؟ خود اس نے

اپنے ملک میں تنہا اور بے مونس نکر یہی نہیں دیکھا کہ وہ اوروں سے مختلف ہے بلکہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ اس اختلاف کی نوعیت کا پتہ چلائے۔

اس معنی میں ترک نوجوانوں کی پہلی تنظیم "ترک اوجک" میں ہوئی۔ یعنی پہلا قومی کلب ۱۹۱۱ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی چند طبی طلبہ تھے جنہوں نے اپنے نام ظاہر نہیں کئے۔ مساوات و اخوت کی روح "اوجک" میں مسلمہ روایت بن گئی۔ کوئی رکن دوسرے پر فوقیت نہ رکھتا تھا۔ اس کلب کی مدد بعض مشہور اہل قلم اور نامور ڈاکٹروں نے کی اور انجمن اتحاد و ترقی نے بھی۔

اس کے دستور کے دو اہم دفعات جنہیں عام کانگریس نے بھی کبھی نہ بدلا اور جن سے "اوجک" کی ذہنیت اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے یہ تھے:- (۱) اوجک ترکوں کی تمدنی ترقی میں مدد دیگا (۲) اوجک کوئی سیاسی ادارہ نہیں ان دونوں دفعات پر اوجک کے پرانے رکن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک بڑی سختی سے قائم رہے۔ اتحاد و ترقی کے تسلط کے زمانہ میں نہ انتہا پسند اتحادی ان دفعات کو بدلوا سکے اور نہ ۱۹۱۸ء میں انکے تسلط کے مٹ جانے کے بعد انکے مخالف اسے فرقہ وارانہ سیاست میں گھسیٹ سکے۔

اوجک کا سب سے کارآمد زمانہ اس وقت شروع ہوا جب حمد اللہ صبحی بے اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اپنی بے مثل خطابت سے انہوں نے نوجوانوں پر بہت گہرا اثر قائم کر لیا اور انکے استقلال اور ہوشیاری نے تمام بڑے آدمیوں اور سب حکومتوں کو اس پر آمادہ کر دیا کہ اوجک کی مدد کریں، روپیہ سے یا اور کسی طرح۔ نوجوان طلبہ کے علاوہ ترکی اہل قلم اور اکابر کی بڑی تعداد اس میں شامل ہو گئی اور قابل تعریف شغف کے ساتھ ترکوں کی تمدنی ترقی میں کوشاں رہی۔ بڑے بڑے آدمی بلا معاوضہ عوام کے لئے لکچر اور سبق دیتے تھے جن میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا قابل ذکر ہیں۔ ہر سیاسی مذہب کا آدمی اور مختلف مقاصد رکھنے والے سب اس کی چھت تلے خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔

یہ کلب ان طلبہ کی مدد کرتے تھے جو ساری ترکی دنیا سے تعلیم پانے کیلئے استنبول آتے

ہیں۔ اوجک میں تمدنی لحاظ سے اتحاد تورانی کا رجحان تھا اور یہ اتحاد اسلامی کے مخالف تھے کچھ سال بعد اتحاد تورانی کا خیال بھی مٹ گیا اور جغرافی قوم پرستی شروع ہوگئی جسکا حلقہ ترکی خاص اور اس کے باشندوں تک محدود ہے۔

میں پہلی عورت تھی جسے ۱۹۱۲ء میں اُنکی عام کانگریس نے اپنا رکن منتخب کیا۔ ۱۹۱۸ء میں عام کانگریس نے ۱۱ اشخاص کی ایک کمیٹی دستور اساسی کی ترمیم کے لئے مقرر کی۔ میں بھی اس کمیٹی میں تھی اور ہم نے دستور میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ اس دفعہ کا اضافہ بھی کیا کہ عورتیں رکن ہوسکتی ہیں۔ اس زمانہ میں متعدد اوجک تمام ملک میں قائم ہوگئے ہیں۔ آج کل خصوصاً ۱۹۲۴ء میں انگورا میں جو تغیر دستور ہوا اس کے بعد سے ان اوجکوں کی حالت پر علیحدہ بحث کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں کے پیش نظر کل انسانیت کی فلاح ہے اور جو اس کے ذریعہ بین الاقوامیت پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں قوم پرستی ایک تنگ مطمح نظر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے میرے بین الاقوامی دوست اکثر اس پر ملامت کرتے ہیں اور چونکہ میں نے اپنے بنی نوع کی خوشی کے لئے سعی کرنا چھوڑا نہیں ہے خصوصاً انکے لئے جو مجھ سے قریب تر ہیں اس لئے میں نے دیانت داری سے کوشش کی ہے کہ اپنی قوم پرستی کے حقیقی معنی کی جانچ کروں۔ آیا اس سے دوسروں کو جو ترک نہیں نقصان پہنچا ہے اور آیا اس سے آگے چلکر قوموں کے اس خاندان کو نقصان پہنچا ہے جس میں ترکی بھی شامل ہے۔

ہر فرد یا قوم اگر وہ اپنے بنی نوع یا دوسری قوموں کو سمجھنا چاہئے، اپنی انفرادی یا اجتماعی شخصیت کا اظہار کرنا چاہے، حسن و جمال کی تخلیق کی آرزومند ہو، تو اسے اپنے وجود کی جڑوں تک پہنچنا اور اپنے کو خلوص کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ مطالعہ ذات پر عمیق عمل اور اس کے نتائج بس یہی قوم پرستی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس قسم کا قومی مطالعہ ذات اور اس کے نتائج کا تبادلہ بین الاقوامی مفاہمت و محبت کا پہلا اور صحیح قدم ہے۔ جب میں اپنی قوم سے محبت کرلوں اور انکی خوبیوں اور خامیوں کو کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کرلوں تب کہیں میں دوسروں کی خوشیوں اور تکلیفوں کو اور انکی قومی زندگی میں انکی قومی شخصیت کے مظاہر کو سمجھ سکتی ہوں۔

خاں صاحب

ہمارے محلہ میں ایک خانصاحب رہتے تھے۔ میں نے جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو اُن کی عمر قریب پینتالیس سال کے تھی، مگر روایات سے معلوم ہوا کہ اُنکے بال ہمیشہ سے ایسے ہی سیاہ و سپید کی آمیزش رہے ہیں، آنکھیں ایسی ہی خونی، مزاج ترش اور ٹوپی میلی۔ بواسیر کی شکایت بھی اُن کی ہستی سے وابستہ تھی، مدتوں سے وہ شہر کے تمام طبیبوں اور ہندوستان کی تمام درسگاہوں کی برائی کرتے چلے آئے تھے۔ ہمارے محلہ میں کسی کو بھی وہ دن یاد نہ تھے جب خانصاحب کی کریہہ اور دل لرزانے والی آواز گلی کوچہ میں نہیں گونجتی تھی۔ یا اُنکا سیاہ چہرہ قوی ہیکل جسم اور لمبا لٹھ خوف اور نفرت سے لوگوں کی نگاہیں نیچی نہیں کر دیتے تھے۔ خانصاحب کے پیشہ کا کسی کو علم نہ تھا، سوا اُن کمبختوں کے جنہیں کسی ناگہانی مصیبت میں روپیہ کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے خانصاحب سے مدد مانگی۔ مگر انکی کیا مجال تھی کہ گالیاں سن کر اور سود در سود ادا کر کے بھی خانصاحب کے پیشہ کا کسی سے ذکر کریں۔ خاں صاحب سویرے جا کر مؤذن کو جگاتے تھے۔ مسجد کا امام اُن کے ڈر سے نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتا تھا۔ دیر تک دعا مانگتا۔ اور دعا مانگتے مانگتے کثرت گناہ کا احساس اُسے اکثر رلا بھی دیتا تھا۔ خانصاحب کی ذات نے اس مسجد کو جو علاوہ جمعہ کے ویران پڑی رہتی تھی اجتماع مسلمین کا مرکز بنا دیا تھا، جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوا کرتی تھی۔ خانصاحب کی داڑھی دیکھ کر شریفوں کیا گنڈوں میں بھی داڑھی مونڈنے کی ہمت نہ رہی۔ خانصاحب کا چہرہ سیاہ اور آنکھیں خونی تھیں تو کیا انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کی صورتیں منور کر دی تھیں، اُنکا مزاج ترش تھا تو کونسی شکایت کی بات، جب اس کی وجہ سے اتنے گمراہ بندے اپنے خدا کے قہر سے پناہ مانگنے لگے۔

ہمارے محلہ کے بنیے تو مستقل اختلاج کے مریض ہو گئے تھے۔ مگر بنیوں کا کیا۔ ان کا تو پیشہ یہی ہے۔ اگر دھوتی میل سے کالی اور قلب میں اختلاج نہ ہو تو وہ سود کا نرخ کیسے

بڑھ ہیں۔ خانصاحب شریعت کے ایسے عالم تھے کہ بغیر کفر کا الزام اپنے سر لئے دنیا دی معاملات میں بھی کوئی اُن کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا منطقی ایسے کہ جوش گفتار سے دوسرے کا دماغ پھرا دیں، اور فلسفی اس پایہ کے کہ جب بیان شروع کریں تو کسی سے بغیر ہاں میں ہاں ملائے نہ بن پڑے۔ خانصاحب نہایت فصاحت و بلاغت سے دین اسلام کی خوبیاں اپنے پست اندیشہ ہمجنسوں پر روشن کرتے تنگ نظروں کو خدا کی مصلحت سمجھاتے، اور مناظر کائنات کی تعریف میں سرد آہیں بھرتے تھے۔ ہمارا محلہ غریبوں کا تھا۔ کسی بچارے کو اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ شریعت، فلسفہ، منطق اور جمالیات میں یہ امتیاز حاصل کرے۔ خانصاحب نے اپنی عقل و دانش اور مہیب شخصیت کے اثر سے محلہ والوں کے دل و دماغ اور قوت ارادہ کو معطل کر دیا تھا، اور محلے والے غلامی کے ایسی عادی ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی آزادی کے دن یاد تک نہ رہے۔

خانصاحب جب ہمارے محلہ میں آکر بسے تو اپنی بیوی کو ساتھ لائے تھے۔ مدتوں تک نہ کسی نے اُنکی بیوی کی صورت دیکھی نہ کسی کو اُنکے گھر کا حال معلوم ہوا۔ بہت دن ہوئے ایک بچہ اُنکے دروازے کے سامنے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سال دو سال بعد ایک بچی بھی اُس کے ساتھ کھیل میں شریک ہونے لگی مگر لوگ خانصاحب کے مکان کیطرف سے بغیر کسی ضرورت کے گذرنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب بچہ کسی بیماری میں مرگیا تو لوگ بھول گئے کہ خانصاحب کے ایک لڑکی بھی ہے۔ میری خالہ کو یہ معلوم تھا، اس لئے کہ وہ بچہ کی تعزیت میں ہمت کرکے خاں صاحب کے یہاں جا پہونچی تھیں وہاں سے واپس آنیکے بعد وہ مہینہ بھر تک بخار میں مبتلا رہیں۔ مزاج پرسی کے سلسلہ میں خانصاحب کی بیوی کا بھی میری خالہ کے یہاں کئی دفعہ آنا ہوا، اور یوں دونوں بیویوں کے تعلقات بڑھ گئے مگر خانصاحب کی بیوی کی کیا مجال تھی کہ انسانیت کے فرائض ادا کریں اور میری خالہ کے گھر میں قدم رکھیں۔ اگر میری خالہ کو اُنکی سخاوت، دینداری اور غریب پروری نے محلہ کیا تمام شہر میں مشہور نہ کر دیا ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا۔ اس صدمہ نے دنیا سے اُنکی طبیعت ایسی ہٹا دی کہ انہوں نے اپنی عمر عبادت کے لئے وقف کر دی، اور

جائداکی ساری آمدنی غریب بچوں کی تربیت اور حاجت مندوں کی امداد میں صرف کرتی تھیں، ہر مولوی، ملا، امام، حافظ، عالم کو اُنکے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا جن لوگوں کو خانصاحب سود پر روپیہ دیتے تھے وہ انکے یہاں اکثر آچکے تھے اور خانصاحب۔ کہتے تھے اسوجہ سے جڑھے کہ مستقل وظیفوں میں میری خالہ کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور وہ خود کبھی کبھی فاقہ سے رہتی تھیں۔ خانصاحب نے شریعت کی پابندی اور سکّے کے زور سے جو اقتدار حاصل کیا تھا وہ میری خالہ کے اثر سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، اسی وجہ سے جب کبھی اُنکی بیوی میری خالہ سے ملنے آتیں تو وہ اپنا سلام بھی کہلا بھیجتے۔ میری خالہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ خانصاحب کو ڈولی کا کرایہ دینا ناگوار گذرتا ہے، اور انہوں نے خانصاحب کی بیوی کو پیشگی کرایہ بھیجنے کا قاعدہ بنالیا۔ اس پر بھی خادمہ کو سخت تاکید تھی کہ خانصاحب اُسے دیکھ نہ پائیں ورنہ وہ کرایہ وصول کر لیتے، اور کہلا بھیجتے کہ بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔

خانصاحب کی بیوی کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ادھیڑ عمر کی تھیں۔ مگر اس سن پر بھی انہیں جوانی کے حسن کی جھلک نظر آتی تھی جسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ وہ خانصاحب کے پنجہ میں کیسے پھنسیں اونچا قد، سڈول جسم، بڑی بڑی پراسرار آنکھیں، لہجہ میں متانت، ہر شخص امیر ہو یا غریب جوان ہو یا بوڑھا، انہیں دیکھتے ہی اپنے دل میں اُنکی عزت کرنے لگتا۔ برتاؤ میں ایسی ہمدردی، ایسا خلوص کہ دل سے ہزار پریشانیوں کی کدورت دور کردے۔ طبیعت کی شریف ہونے کے علاوہ وہ اتنی تعلیم یافتہ اور مہذب تھیں کہ میری خالہ کو یقین ہوگیا کہ خانصاحب کے ساتھ اُنکی شادی سوچ سمجھ کر نہیں کی گئی۔ غالباً اُنکے ماں باپ پر کوئی ایسی مصیبت آئی کہ اُن بیچاروں کو ایسی لڑکی ایسے آدمی کے سپرد کر دینا بھی غنیمت معلوم ہوا۔ اصل واقعہ میری خالہ باوجود کثرت ملاقات کے دریافت نہ کرسکیں ایک دو بار انہوں نے پوچھا تو ضرور لیکن خانصاحب کی بیوی نے سرد آہیں بھر کر ٹال دیا اور اُن کا تکلف دیکھ کر میری خالہ نے پوچھنا چھوڑ دیا، اس ناواقفیت سے ان دونوں کی گہری دوستی اور سچی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور جب خانصاحب کی بیوی نے ایکدن میری خالہ سے درخواست

کی کہ ان کی بچی کی پرورش وہ اپنے ذمہ لے لیں تو ان کی محبت اور پختہ ہو گئی۔

خانصاحب کی بچی سکینہ اس زمانہ میں دس بارہ برس کی تھی۔ میری خالہ کی بہت پہلے سے خواہش تھی کہ اُسے اپنے ساتھ رکھیں۔ لیکن ایک ستم زدہ ماں سے اُس کی اکلوتی بچی مانگنا انہیں کسی صورت سے گوارا نہ ہوا۔ خانصاحب کی بیوی نے شریفوں کے یہاں تربیت پائی تھی اور گو انہیں یقین تھا کہ میری خالہ کو ان کی بچی سے بہت محبت ہے مگر انہوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ سکینہ جب میری خالہ کے یہاں آتی تو بہت خوش ہوتی کھیلتی کودتی، خالہ کی خدمت بھی کرتی۔ جب جاتی تو ہمیشہ آنکھوں میں آنسو لیکر جاتی، اور خالہ سے وعدہ لیکر کہ وہ اسے پھر جلد یاد کریں گی۔ مگر دونوں بیویوں کے تکلف میں پانچ چھ سال گذر گئے۔ خالہ کے یہاں وہ مستقل طور پر یوں آ گئی کہ وہ بڑی ہو گئی تھی، کہاروں نے اُسے ماں کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا، خانصاحب نے اعلان کیا کہ اگر انہوں نے کبھی اسے رستہ میں چلتے دیکھا تو اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ خالہ پر کہاروں کا کرایہ ویسے بھی چڑھ گیا تھا۔ ایک اور ڈولی کی درخواست اُن سے کیسے کیجاتی۔ پھر بھی یہ انتظام زیادہ تر سکینہ کی تحریک سے ہوا۔ وہ ابھی اپنی ماں کی مجبوریاں اور باپ کی فطرت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے ایک دن کہا کہ وہ خالہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، اور ماں نے خود ہمت کر کے اپنی طرف سے یہ درخواست کر دی اس خوف سے کہ وہ کہیں واقعی کہہ نہ دے۔ اور میری خالہ کو گمان ہو کہ وہ براہ راست نہیں کہنا چاہتی تھیں اس لئے لڑکی سے کہلوایا۔ جب سکینہ کا میری خالہ کے ساتھ رہنا طے ہو گیا تو انہیں اور بھی مصلحتیں سوجھیں۔ خانصاحب سکینہ کو میلے چیتھڑوں میں رکھتے تھے اب وہ ایسی بچی نہیں رہی تھی کہ میلے ہونے کا الزام اُسی پر لگا دیا جائے۔ مگر وہ خانصاحب کو اپنی گرہ سے کچھ خرچ کرنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ خانصاحب سے یہ امید کرنا بھی فضول تھا کہ وہ اس کی آئندہ زندگی کے لئے سامان کریں گے۔ میری خالہ کے جو تعلقات تھے انہیں دیکھتے ہوئے سکینہ کے لئے ایک ہونہار شریف زادہ تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

یہ سب تدبیریں تھیں۔ پھر یکایک تقدیر نے اپنی صورت دکھائی۔ جب سکینہ میری خالہ

کے پاس ایک مہینہ کے قریب رہ چکی تھی تو خانصاحب نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"کیوں ری، سکینہ کی تنخواہ تونے کاہے میں خرچ کر ڈالی؟"

خانصاحب کی بیوی سہم گئیں۔

"کیسی تنخواہ؟"

"ہونہہ! کیا کوئی اپنی پلی پلائی لڑکی کسی کو مفت میں دیتا ہے؟"

خانصاحب کی بیوی نے بجائے جواب دینے کے اپنا منہ چادر میں لپیٹ لیا اور روتے روتے سوگئیں۔ اپنے شوہر کی بے حیائی پر انہیں ہر دوسرے تیسرے روز شرمندہ ہونا پڑتا تھا اس کی وہ عادی ہوگئی تھیں، لیکن اب تو انہیں خود بھی ذلیل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ اگر بچنے کی کوئی امید ہوتی تو وہ اُس کی فکر کرتیں۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ خانصاحب بغیر اپنے ٹکے وصول کئے نہ مانیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ بات کیسے بنائی جائے کہ ایک روز جب وہ میری خالہ کی ڈیوڑھی میں ڈولی پر سے اتریں تو خانصاحب نکلتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندر پہنچیں تو خالہ کو بہت برہم پایا، اور وہ بیچاری اپنا سا منہ لیکر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ خالہ کو سلام کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ جب مغرب کے بعد سکینہ کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ خالہ کا غصہ اتر گیا ہے تو روتی ہوئی انکے سامنے آئیں۔ خالہ نے انہیں گلے لگایا۔ ہمدردی کے کچھ آنسو ٹپکائے۔ مگر بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں، کہتیں تو کیا کہتیں؟ خانصاحب نے اپنے افلاس کا دکھڑا رویا تھا۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ نوٹس دے گئے تھے کہ میری لڑکی مجھے واپس ملجائے یا میری بھی پرورش ہو "ماں بوڑھی ہے، اُس سے کچھ کام کاج ہوتا ہواتا نہیں، اُسے خود سہارے کی ضرورت ہے میں جو کچھ کر سکتا ہوں کرتا ہوں، لیکن میں روٹی تو نہیں پکا سکتا! اتنی میری حیثیت نہیں کہ کسی کو نوکر رکھوں۔ اب حضور خود ہی سمجھ لیں۔ آدمی اولاد کی پرورش اسی لئے کرتا ہے کہ بڑھاپے میں آرام ملے"۔ میری خالہ سمجھ گئیں۔ اگر ہو سکتا تو وہ کچھ نقدی خانصاحب کے حوالے کرتیں، مگر انہیں خود اُن دنوں روپیہ کی بہت سخت ضرورت تھی۔ زیادہ غصہ انہیں اپنی بے بسی پر آیا۔ مگر جس طرح سے خانصاحب

نے اپنی بیوی کے ضعف پیری اور آنکی حاجتوں کو گفتگو میں پیش پیش رکھا وہ بھی انہیں بہت ناگوار گذرا۔ خانصاحب کی بیوی نہ بوڑھی تھیں نہ ضعیف، گھر کا کام کر کے وہ اکثر میری خالہ کے یہاں پکانے میں مدد کرتی تھیں۔ خانصاحب جس کفایت شعاری سے رہتے تھے اس کے لحاظ سے امورِ خانہ داری کوئی بار نہیں ہو سکتے تھے، نہ کسی کا قرض، نہ کہیں سے تقاضا، نہ کوئی بحث مباحثہ، اور پیٹ بھی کتنے بھرنے تھے۔ جب سے سکینہ چلی گئی تو چار روٹی، ذرا سی بھاجی، ہفتہ عشرہ دو چار بوٹی گوشت، اور جب وہ تھی تو بھی ماں اپنے حصہ میں سے اُسے کھلاتی تھی، خاں صاحب کو کبھی یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اولاد کی پرورش کر رہے ہیں۔

یہ سب ماجرا خانصاحب کی بیوی نے میری خالہ کو سنایا، مگر اس متانت اور ضبط سے کہ خاں صاحب پر کسی طرح کا صریحی الزام نہ آئے۔

"یہ تو سب کچھ ہے، مگر بیوی میں شکایت کس منہ سے کروں۔ خانصاحب ایسے متقی پرہیز گار روزہ نماز کے پابند ہیں جس کسی سے بھی پوچھو وہ بتا دے گا کہ اُنکی ذات سے کتنوں کو فائدہ پہونچا کتنے مسلمان اپنے فرائض سے آگاہ ہوے، مسجد ویران پڑی رہتی تھی، اب وہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے، ہزاروں کے لبوں پر اللہ کا نام ہے، سیکڑوں اُن کی دلیلوں سے قائل ہو کر شریعت کے احکام پورے کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں بہن، اس میں تو کوئی کلام نہیں۔"

"اور پھر بیوی وہ معاملہ کے ایسے صاف سچے ہیں، جھوٹے وعدے سے زیادہ انہیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی، مجھ سے خود ہی کہہ رہے تھے کہ سکینہ کو اس طرح آپ کے متھے تھوپ دینا بیجا ہے۔"

"تم بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو . . . . سکینہ کو تو میں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔"

"یہ تو بیوی میں جانتی ہوں، میرا دل جانتا ہے . . . . مگر ہم لوگ غریب ہیں، آپ کو چاہے جتنی محبت ہو، خانصاحب کو تو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اُس کا دماغ نہ پھر جائے . . .

اُسے آخر غریبوں ہی کے گھر میں زندگی بسر کرنا ہے"

"واہ بہن، تم نے بیٹھے بیٹھے مجھے بس خوب بنا دیا۔ میں بھلا اس کی کون سی خاطر کر سکتی ہوں کہ اُسکا دماغ پھر جائے۔ تم خود ہی روز دیکھتی ہو کہ میں کیسے رہتی ہوں اور وہ کیسے رہتی ہے"

"بیوی آپ کو تو سخاوت اور دینداری نے غریب کر دیا ہے، ہماری نظروں میں تو آپ رئیس ہی ہیں۔"

"اچھا بہن، اگر ایسا ہی ہے تو اپنی لڑکی لیجاؤ۔ میں کوئی اور سہارا ڈھونڈھ لوں گی۔ تمہاری بیٹی کی عادتیں تو نہ بگڑنے پائیں" میری خالہ نے ٹھنڈی سانس لی اور منہ پھیر لیا۔

خانصاحب کی بیوی چوکنی ہو گئیں۔ وہ خانصاحب کی صفائی تو ضرور کرنا چاہتی تھیں لیکن سکینہ کو اپنے گھر واپس لا لینا بھی انہیں کسی صورت سے منظور نہ تھا۔

"بیوی آپ خفا نہ ہوں، خانصاحب تو بات کے دھنی ہیں، جو بات جی میں ٹھان لیتے ہیں اُسے چاہتے ہیں کہ فوراً کر بھی دکھائیں۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ ابھی آپ کے پاس نہ حاضر ہوں، مجھے پہلے آپ کو سارا ماجرا سنا لینے دیں۔ سکینہ آپ کی لونڈی ہے۔ بھلا ہمیں کب یہ گوارا ہوگا کہ اُس کی وجہ سے آپ کو کسی طرح کی تکلیف پہونچے۔ اُس کی پرورش منظور ہے تو بڑی خوشی سے اپنے پاس رکھئے۔ وہ بھی سدھر جائے گی، ہم بھی آپ کو دعا دیں گے۔ آپ جیسا سرپرست اس دنیا میں اُسے کہاں ملے گا۔۔۔"

"مگر بہن" خالہ نے بات کاٹ کر کہا "میں اُسے تنخواہ تو نہیں دے سکتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے اُس کا حساب کتاب تم خود جانتی ہو۔"

بیوی خدا کا شکر ہے اُس نے ہم کو کھانے کو دیا ہے۔ خانصاحب کا تو یہ منشا بھی نہیں تھا کہ اُس کے نام سے ہماری پرورش کریں۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سکینہ اپنی حیثیت نہ بھول جائے، وہ آپ کی لونڈی ہے کبھی اپنے آپ کو بیٹی نہ سمجھنے لگے۔ یہی انہیں اندیشہ تھا۔ مگر وہ بات کہنا نہیں جانتے، خدا جانے آپ سے کیا کہہ بیٹھے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں انہیں سمجھا لوں گی۔"

"ہاں بہن تم انہیں سمجھا دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ تنخواہ دینا میرے بس کی بات نہیں"

خانصاحب کی بیوی کچھ ادہر اُدہر کی باتیں کرکے گھر چلی گئیں، وہاں پہنچکر میاں بیوی میں کچھ جھگڑا ہوا، مگر روپیٹ کر بھی خانصاحب کو انکی بیوی اس پر آمادہ نہ کرسکیں کہ وہ تنخواہ سے دست بردار ہوں۔ خالہ سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے سنکر انہیں ایک اور قوی دلیل مل گئی

"ہم غریب آدمی ہیں" انہوں نے اپنی بیوی سے کہا "اگر سکینہ کے سامنے ہر مہینہ اُسکی تنخواہ وصول نہ کی گئی تو وہ خود کو رئیس زادی سمجھنے لگے گی، ہماری صورتیں دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے گی"

"ارے واہ" خانصاحب کی بیوی نے بگڑ کر کہا "تم میری لڑکی کو سمجھے کیا ہو۔ ایسی شریف طبعیت کی لڑکی شہر شہر تلاش کرو تو نہ ملے۔ تم اپنے ٹکے وصول کرنے کے لئے جا ہے جو کچھ کہدو۔ ۔ ۔ ۔"

خانصاحب نے اپنی بیوی کو گھور کر دیکھا۔ اُنکی آواز معمول سے زیادہ بلند ہوگئی تھی، اور خانصاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی محلہ والا انکی باتیں نہ سن لے۔ خانصاحب کی بیوی نے جب خالہ کے سامنے بھی اپنے شوہر کی رسوائی منظور نہیں کی تھی تو اب کیسے بے لگام ہوجاتیں۔ برسوں نباہا تھا، ایک بار اور ضبط کر گئیں۔

"خیر کچھ بھی ہو" انہوں نے دبی آواز سے کہا "میں سکینہ کی تنخواہ نہ مانگونگی نہ تمہیں مانگنے دوں گی"

"تو میری لڑکی واپس کردو"

"واپس بلالو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ مگر روٹی کپڑا نہ ملا تو گھر گھر وکھڑا روتی پھروں گی"

اس دھمکی کا خانصاحب پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ لیکن چاہے جتنی کفایت کیجائے، کچھ نہ کچھ تو سکینہ کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ خرچ کا نام سنکر انکے کان کھڑے ہوگئے۔

"اچھا ری، اگر تنخواہ نہیں لیتی تو کچھ غلہ، روٹی، کپڑا تو مانگ لایا کرو"

خانصاحب کی بیوی چپ ہوگئیں۔ خانصاحب سمجھے کہ وہ راضی ہیں۔

یہ گفتگو رات کے وقت مکان کے چھوٹے سے صحن میں ہوئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا، خانصاحب شام ہی سے دو پلنگڑیاں صحن میں بچھوا لیتے تھے۔ مغرب کی نماز سے واپس آتے ہی وہ ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ جاتے، اللہ ہو اللہ ہو کرتے یا حمد و نعت کی سنی سنائی غلط سلط نظمیں اپنے کریہہ لہجے میں گاتے۔ یہ عبادت کا سلسلہ کھانے تک جاری رہتا، اگر کھانے کے بعد نیند فوراً نہ آئی تو پھر اسے شروع کر دیتے، یا بیوی کو اپنا فلسفہ سناتے اس روز کے بحث و مباحثہ کے غبار سے اپنی اور اپنی بیوی کی طبیعت صاف کرنے کے لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ کچھ بیان کیا جائے۔ انکی بیوی کئی بار پلنگ سے اُٹھ کر اندر چلی گئیں، یا چادر میں منہ لپیٹ لیا اور کہا کہ انکو نیند لگی ہے۔ لیکن خانصاحب کی تقریر کی طوالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اطاعت اور تابعداری کی خو بیان کر رہے تھے، اور یہ باب لا انتہا ہے۔

خانصاحب نے سوچا تھا کہ انکی بیوی تنخواہ کی بجائے روٹی دال چاول مانگ لائیں گی اور اولاد کی "پرورش" پر انکا جو خرچ ہوتا تھا اُس کی یوں تلافی ہو جائیگی۔ مگر انکی بیوی نے کچھ بھی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑے دن خانصاحب نے انتظار کیا، اور جب انکو یقین ہوگیا کہ بیوی کے ذریعہ سے ایک دانہ چاول تک نہ ملیگا، تو انہوں نے دوسری ترکیبیں اختیار کیں۔ کبھی بے بلائے خالہ کے یہاں مہمان ہو جاتے، کبھی کہتے کہ بازار میں بہت اچھا کپڑا دیکھ آیا ہوں اگر اجازت ہو تو سکینہ کے لئے دو چار گز خرید لاؤں، اور معمولی کپڑا خرید کر کچھ بڑھا کے دام وصول کرتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن خالہ سے ایک مختار رکھنے کی درخواست کرتے، اور وہ دقتیں بیان کرتے جو ایک مختار کے نہ ہونے سے پیش آ سکتی تھیں۔ میری خالہ سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کی تنخواہ منظور نہ کرنے کی سزا ہے۔ اور ممکن ہے وہ تنگ آ کر سکینہ کو اُس کے گھر واپس روانہ کر دیتیں۔ اس مصیبت سے سکینہ کو اُس کی ماں نے بچایا۔ وہ بیچاری ہر طرح سے خالہ کو

خوش رکھنے کی تدبیریں سوچتی رہتیں۔ جس دن خانصاحب خالہ کے یہاں مہمان ہوتے وہ آکر کھانا بکا جاتیں۔ اگر کبھی موقعہ ملتا تو خانصاحب کی آنکھ بچا کر خیرات کے لئے کچھ نہ کچھ خالہ کے پاس لے آتیں۔ خالہ اگر ان سے کسی بات پر خوش ہوتیں تو وہ یہ کوشش کرتیں کہ خانصاحب کے بارے میں انہیں جو بدگمانی ہے وہ کم ہوجائے۔ یا کوئی عملی صورت نہ اختیار کرے۔ خالہ کو خانصاحب کی سیرت پسند تو کبھی بھی نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کے ایثار اور جانفشانی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ خانصاحب کی بے تمیزیوں اور کمینی حرکتوں سے درگذر کرتی رہیں۔

یوں ہی دو سال گزر گئے۔ خانصاحب کی بیوی نے جس امید میں پچھلے دو تین سال کاٹے تھے اس کے پورے ہونے کا وقت آگیا۔ سکینہ جوان ہوگئی تھی۔ اور خالہ یہ دیکھکر اس کے لئے شوہر تلاش کرنے لگیں۔ اسی سلسلہ میں انہیں میرے بچپن کا ایک ساتھی یاد آیا جو صورت اور سیرت کے لحاظ سے خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا۔ لیکن ابھی تک افلاس کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہوسکی تھی۔ خالہ نے اسے اپنے یہاں بلوایا۔ بڑی جدوجہد سے اُسے کسی دفتر میں نوکر رکھایا اور شادی کے لئے سامان جمع کرنے لگیں۔ انہوں نے ابھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن سکینہ کو وہ اس نوجوان سے پردہ کراتی تھیں۔ اور کوئی رشتہ کی لڑکی نہیں تھی جس کی شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری تھا اور یوں خانصاحب کی بیوی سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کے لئے ہورہا ہے۔ لڑکا بھی انہیں بہت پسند تھا، اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگیں کہ اب انکی تقدیر پلٹی ہے اور برسوں کی جفاکشی کا اب کچھ اجر ملیگا۔

خالہ نے اُن سے ابھی تک شادی کے معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ لڑکے کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہوجائے اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو جہیز کی فکر میں پڑ گئیں۔ اسی وجہ سے خانصاحب کی بیوی نے خانصاحب سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن خانصاحب کی نظر بہت تیز تھی۔ ایک مرتبہ رات کو جب انکی بیوی بیٹی محبت کے خواب دیکھ رہی تھیں اُنہوں نے کہا:-

"کیوں ری، یہ بی بی کہیں اس لڑکے سے سکینہ کی شادی تو نہ کر بیٹھیں گی؟"

خانصاحب کی بیوی چونک پڑیں۔

"کیوں؟"

"میں تو اپنی لڑکی ایسی سستی دینے والا نہیں ... اُس کنگال کے پاس ہے کیا"

"سکینہ کے پاس کیا ہے"

"سکینہ کے پاس کچھ نہ سہی، ہمیں تو حوصلہ ہے"

"کاہے کا حوصلہ؟"

"وہ حوصلہ جو ہر ماں باپ کو ہوتا ہے، کچھ نقد سے، کچھ جہیز سے، ہمارے پاس بھی بڑھاپا کاٹنے کے لئے کچھ روپیہ ہو، لڑکی کا کیا، وہ اپنے گھر جاکر بیٹھ رہے گی، ہم کو پوچھے گی بھی نہیں، اُس کی شادی کرکے کیا ہم فاقے کریں گے؟"

خانصاحب نے اپنی بیوی کو عمر بھر یہ بتایا یا تھا کہ اُنکی گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے، خرچ کے لئے روز کے روز اپنی گرہ سے نکال کر کچھ دیدیتے، یا بازار سے خود خرید لاتے، اس لئے جب وہ فاقہ کی دھمکی سناتے تو انکی بیوی کچھ جواب نہ دے سکتیں۔ اب بھی وہ خاموش ہوگئیں، اور دیکھا تو دل کو بھی امیدوں سے خالی پایا۔

انہیں یقین تھا کہ خانصاحب نے اپنے حوصلے پورے کرنے چاہے تو سکینہ کی زندگی برباد ہوگی، اور اسے بچانے کی یہی صورت تھی کہ خانصاحب کا منہ روپیہ سے بند کیا جائے۔ روپیہ نہ اُنکے پاس تھا نہ میری خالہ کے پاس اور خانصاحب سے جھوٹے وعدے کرنا خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی، مگر جو ڈوب رہا ہو وہ تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے۔ انہوں نے دوسرے دن میری خالہ سے آکر کہا:-

"بیوی سکینہ اب ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہے۔ آپ ہی کی عنایت سے اُس نے پرورش پائی، اب خدا کا نام لیکر ایک اور احسان بھی اُس پر کر دیجئے۔"

میری خالہ سمجھ گئیں۔

"بہن میں اسی فکر میں مبتلا ہوں۔ لڑکا ڈھونڈھا ہے، اُسے نوکری دلوائی ہے۔ اب جہیز کی فکر میں ہوں۔ دیکھو کب تک شادی کی نوبت آتی ہے"

"ہاں بی بی لڑکا تو آپنے بہت اچھا پسند کیا ہے۔ خانصاحب نے اُسے اس نظر سے تو نہیں دیکھا، مگر تعریف بہت کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا تھا کہ سکینہ کی اس سے نسبت ٹھہر جائے تو بہت اچھا ہوگا" پھر سوچ کر، "مگر بی بی نوکری کتنے کی ہے"

"ابھی تو تیس روپیہ ملیں گے، سال دو سال بعد شاید کچھ ترقی ہو جائے"

"بی بی میں تو دل و جان سے آپ کی شکر گذار ہوں . . . . ."

"بہن میرے بس کی کیا بات تھی، یہ تو سب خدا کی دین ہے"

"ہاں بی بی یہ سب ٹھیک ہے جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے"

میری خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری،

"مگر بی بی اب ہم بھی بوڑھے ہو چلے ہیں، ہمارے پاس کوئی اور سہارا نہیں . . . خانصاحب تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہے تو ہم کو کہیں نہ کہیں سے کھانے کو ملتا رہے گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس روپیہ میں ہمارا گذر کیسے ہوگا"

"اچھا بہن" میری خالہ نے کچھ طنز سے کہا "تم نے ابھی سے پورا حساب بھی لگا لیا"

"بی بی حاجت ہوتی ہے تو آدمی ہر وقت اپنے ٹکے گنتا رہتا ہے"

میری خالہ سے خانصاحب کی بیوی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں، انہیں یہ تو کسی علوت سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ خانصاحب کی بیوی اپنے شوہر کی بے حیائی چھپانے کے لئے آئندہ کے اخلاقی جرموں کا الزام ابھی سے اپنے سر لے رہی ہیں، اور وہ بہت خفا ہوئیں۔

"سنو بہن میرے بس کا جو کچھ ہے وہ میں کر رہی ہوں۔ اگر تمہاری ہوس اسے کم سمجھتی ہے تو جو جی چاہے کرو، میں اس سے دست بردار ہوتی ہوں"

خانصاحب کی بیوی تھوڑی دیر تک روتی رہیں اُس کے بعد اٹھ کر چلی گئیں - رات کو آنہوں نے خانصاحب سے کہا :-

"بی بی سو روپیہ نقد دیئے اور ایکہزار کا مہر باندھنے پر تیار ہیں۔ مگر نکاح کے بعد

خانصاحب نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"شادی پر سو روپیہ دے تو کیا دے - اور ہزار کا مہر کون شریف زادی قبول کرے گی؟"

خانصاحب کی بیوی نے ہمت کر کے جھوٹ بولا تھا، سو وہ بھی بے سود رہا - اب وہ چادر میں منہ لپیٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے سو گئیں -

دوسرے دن انہوں نے میری خالہ سے جا کر کہا کہ خانصاحب نے انہیں قائل کر دیا ہے اور جو خالہ مناسب سمجھیں وہی کریں - میری خالہ کو بہت تعجب ہوا کہ خانصاحب ایکبارگی اس قدر راضی برضا ہو گئے اور بیوی ہوس کے پھیر میں پڑ گئیں - لیکن انہوں نے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا، خالہ سے گفتگو میں خانصاحب کی بیوی نے بہت دنوں تک سکینہ کی شادی کا تذکرہ نہیں چھیڑا، مگر خانصاحب سے انکی روزمرہ لڑائی ہوتی رہی - خانصاحب خوشی سے تو کبھی اپنی لڑکی تیس روپیہ کے نوکر سے نہ بیاہتے - لیکن یہ ممکن تھا کہ انکی ہاتھ بندھ جائیں اور عین موقعہ پر وہ کچھ نہ کر سکیں - اسی کی خانصاحب کی بیوی کوشش کر رہی تھیں، ایک دن انہوں نے خانصاحب سے کہہ دیا کہ وہ سب کچھ طے کر چکی ہیں اور عنقریب شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے - اب اگر خانصاحب نے دخل دیا تو بڑا فضیحتا ہو گی - خانصاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا - وہ بھی غافل نہیں بیٹھے رہے تھے - انہیں ایک نواب کی خبر ملی تھی جو عیاشی کرتے تھے اور قرض بھی لیتے تھے خانصاحب اُنکے مصاحب بن گئے - موقعہ پا کر بہت اچھے نرخ پر کچھ قرض بھی دیدیا - جب بیوی سے یہ اطلاع ملی کہ سکینہ کی شادی ہونیوالی ہے تو اُس بیچاری کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا - ایک روز شام کو جب انکی بیوی گھر پر مصروف تھیں تو وہ میری خالہ کے یہاں پہونچے، سکینہ کو رات بھر کے لئے گھر لیجانے کی اجازت چاہی اور اُسے یکہ پر بٹھا کر لے گئے -

رات کو وہ اکیلے گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر ہوگئی تھی، بیوی نے انہیں دیکھتے ہی جلدی جلدی کھانا نکالنا شروع کیا، مگر بجائے کھانے کے لئے بیٹھنے کے وہ دیا اندر اٹھالے گئے، اور گرہ سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ جب گن چکے تو بیوی سے کہا۔

"دیکھو تو کہہ رہی تھی کہ سکینہ کی شادی سے ہم کو کیا مل سکتا ہے۔ پانسو روپیہ نقد اور دس ہزار کا مہر لکھوالایا ہوں۔ اور کسی کی کیا مجال ہے کہ کچھ کہے۔ اپنے سامنے نکاح کرایا، اور چار گواہوں کے دستخط ہیں "

بیوی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا۔ انکا سر چکر کھانے لگا، اور وہ وہیں تپلیوں کے بیچ میں لیٹ گئیں۔ خانصاحب نے نہایت اطمینان سے کھانا نکالا، کھایا اور حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ گئے اور حمد و نعت کی نظمیں پڑھنے لگے۔ آج وہ معمول سے زیادہ مطمئن تھے۔ خدا کی نعمتوں کا بہت شکریہ ادا کیا، کائنات کی گل کاریوں کی بہت تعریف کی، اور جب نیند نے انکی آنکھیں بند کیں تو ان کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

مرا نام خاکی گنہگار رہے   ترا نام قہار جبار رہے

مجھے یہ نہیں معلوم کہ انکی بیوی کا اس کے بعد کیا انجام ہوا۔ میری خالہ کو انہوں نے پھر کبھی اپنی صورت نہیں دکھائی، اور اس کے تھوڑے دن بعد ہی میری خالہ کا انتقال بھی ہوگیا۔ مگر خانصاحب اسی طرح سے محلہ پر حاوی رہے۔ انکے آخری کارنامے نے انکے وقار کو بہت بڑھادیا تھا، لوگ انہیں زیادہ جھک کر سلام کرتے تھے مسجد میں اور زیادہ پابندی سے نماز ہوتی تھی۔

اقتباسات

جرمن مستشرقین کی ایک کانفرنس ہر دو سال بعد اپنا اجلاس کرتی ہے۔ چنانچہ پانچواں اجلاس گذشتہ سال اواخر اگست میں شہر بان میں منعقد ہوا جس کی کارروائی کی مفصل رپورٹ انجمن مستشرقین المانی کے رسالہ (Z.D.M.G.) کے نمبر ۳ و ۴ جلد ۸ میں شائع ہوئی ہے۔

شہر بان مشہور جرمن ماہر موسیقی بے تھوون کا مولد ہے۔ اسی رعایت سے کانفرنس کا اجلاس بے تھوون کی موسیقی سے کیا گیا۔ ہز ایکسلنسی فریڈرش روزن نے صدارتی تقریر فرمائی اور بان یونیورسٹی کے شیخ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ پردیسی علماء میں سے پروفیسر مارگن اسٹرن (سنسناٹی) پروفیسر لان من (ہارورڈ یونیورسٹی) اور پروفیسر ادنیک موجود تھے۔ انگلستان کی طرف سے گلاسگو کے پروفیسر اسٹی ونسن نے تقریر کی۔ اس روز خاص مقالہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر لوڈرس نے پڑھا جو حال میں ہندوستان کا دورہ کرکے واپس گئے ہیں۔ انکا موضوع تھا "ہندوستان میں لسانیات، تاریخ اور اثریات"

دوسرے روز بلدیہ بان نے مستشرقین کی دعوت کی اور اپنے شہریوں کی طرف سے خیر مقدم کیا۔ اسی دن جرمن فلسطینی انجمن نے اپنے ۵۰ سال ختم کرنے کی تقریب میں ایک جلسہ کیا جس میں پروفیسر آلٹ نے "فلسطین کے متعلق تحقیقات کی موجودہ حالت اور اس کے حل طلب مسائل" پر نہایت محققانہ مضمون سنایا۔ اسی سلسلہ میں دوسرے دلچسپ مضامین بھی سنائے گئے۔

تیسرے روز مسٹر ہرتس فلڈ (طہران) نے جدید ایرانی تحقیقات، پر ایک عالمانہ مقالہ سنایا! رات میں پروفیسر شیفر نے "مصری فن لطیف" پر ایک مضمون پڑھا۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر راٹ ہنس (ہامبرگ) نے پہلی مرتبہ وہ دو فلم دکھائے جو انہوں نے عرب کے متعلق تیار کئے ہیں۔ ایک کا نام ہے "مقدس عرب" جس میں حج کے مراسم دکھائے گئے ہیں اور دوسری کا نام ہے

جنگ آزاعب، اس میں یمن اور سفر صنعار کی تصویریں ہیں -

اس موقع پر یونیورسٹی کیطرف سے شعبہ مشرقیات نے تین نمائشیں کی تھیں۔ ایک تو مشرقی مسیحی کلیساؤں کی دعاؤں کی اور دوسری مذہبی کتابوں کی نمائش تھی جس میں بڑا حصہ پروفیسر گوسین آنجہانی کے نادر مجموعہ کتب سے حاصل کیا گیا تھا۔ دوسری نمائش نہایت قدیم عبرانی کتابوں کی تصاویر عکسی پر مشتمل تھی -

تیسری نمائش میں مصر، چین، جاوا، ترکی اور شمالی افریقہ کی پرچھائیں کی تصویریں دکھائی گئی تھیں جن میں علاوہ علمار کے دوسرے لوگوں نے بھی بہت دلچسپی لی -

کانفرنس کے مختلف شعبوں نے اس سال کے اجلاس میں کل چار قراردادیں منظور کیں جنہیں پھر کل کانفرنس نے بھی منظور کرلیا۔ ان تجاویز میں سے دو ہندی۔ ایرانی شعبہ نے پیش کی تھیں یعنی یہ کہ جرمن یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں خصوصًا غیر آری زبانوں کی تعلیم اپنی علمی حیثیت نیز عملی وجوہ سے بہت ضروری ہے چنانچہ کانفرنس توقع کرتی ہے کہ مختلف علاقوں کی حکومتیں اپنی اعلی تعلیم گاہوں میں انکی تعلیم و تحقیق کا انتظام کریں گی۔ دوسری یہ کہ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی اور اس سے وابستہ دوسری تہذیبوں کو سمجھنے کے لئے بدھمت کا سمجھنا بہت ضروری ہے اس لئے اس کے مطالعہ کے لئے ایک تحقیقی ادارہ کا قیام ضروری ہے۔

تیسری تجویز ترکی۔ اسلامی شعبہ کی طرف سے تھی یعنی یہ کہ فریڈرک بول کی مشہور کتاب "سیرت محمدی" کا ترجمہ جسے عرصہ ہوا ڈاکٹر شیڈر نے تیار کیا تھا جلد سے جلد طبع کرا دیا جائے چوتھی تجویز جار جیا کے متعلق تحقیقات کی ضرورت اور اہمیت پر تھی یہ چار قراردادیں اس کانفرنس نے منظور کیں جس کے مختلف شعبوں میں ۸۰ علمار نے تحقیقاتی مضامین پڑھے!

ترکی اسلامی شعبہ میں بھی بہت سے دلچسپ اور مفید مضامین پڑھے گئے۔ جن میں سے بعض غالبًا انجمن کے رسالہ کی آئندہ اشاعتوں میں طبع ہو جائیں گے بعض کے خلاصے اسی پرچہ میں درج کر دئے گئے ہیں۔ بعض عنوانات درج ذیل ہیں -

۱۔ بآرم اسنارک : پیغمبر اسلام اور عیسائیت۔
۲۔ برتھولڈ : مصر میں بازنطینی۔ عربی معیشت اور انتظام ملکی۔
۳۔ فشر : اسم محمد
۴۔ گوتیس : ہندی، اسلامی تاریخ تمدن کے لئے نیا مواد۔
۵۔ مٹ وو خ : جنوبی عرب کے نئے کتبے
۶۔ رسکا : جابر کے متعلق تحقیقات کی تاریخ

گوتیس کا مضمون بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہندوستانی تصویروں کی تشریح و توضیح کر کے مسلمانوں کے زمانہ کے ہندوستانی تمدن کے متعلق مفید باتیں معلوم کی ہیں۔

جرمن مستشرقین کا آئندہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں شہر ویَن (آسٹریا) میں منعقد ہوگا۔

انگلستان میں ۱۹۲۳ء کے اندر جو کتابیں شائع ہوئیں انکی مضمون وار تقسیم سے پڑھنے والوں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے اس سال کے اعداد بھی گذشتہ اعداد کی تصدیق کرتے ہیں۔ قصے اور ناول سب سے زیادہ طبع ہوئے یعنی کل ۳۵۲۹ کتابیں۔ اس مضمون میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۶۱ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ دوسرا نمبر بچوں کی کتابوں کا ہے۔ اس میں ۹۳۴۱ یعنی گذشتہ سال ۴۷ کتابیں زیادہ شائع ہوئیں، مذہب پر ۱۰۸۹ یعنی گذشتہ سال سے ۹۱ کتابیں کم شائع ہوئیں، اسکا نمبر تیسرا ہے۔ اس کے بعد سوانح عمریاں آتی ہیں جن کی تعداد ۶۶۷ ہے، پھر سفرنامے ۶۱۸ ؛ اس کے بعد فلسفہ ۳۱۷ پھر کھیل پر کتابیں ۲۱۷۔ پچھلے ۲ سال میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انکی تعداد کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے:۔

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
۱۹۲۲ء	۸۷۵۴	۲۰۸۸	۱۰۸۴۲
۱۹۲۳ء	۹۲۴۶	۳۰۲۹	۱۲۲۷۴

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
۱۹۲۴ء	۹۰۱۳	۳۱۹۳	۱۲۷۰۶
۱۹۲۵ء	۹۹۷۷	۳۲۲۵	۱۳۲۰۲
۱۹۲۶ء	۹۹۸۹	۲۸۱۰	۱۲۷۹۹
۱۹۲۷ء	۱۰۳۳۴	۳۴۷۶	۱۳۸۱۰
۱۹۲۸ء	۱۰۶۱۲	۳۷۸۷	۱۴۳۹۹

پچھلے دنوں تعلیمی انجمنوں کی ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے صدر لارڈ لٹن تھے۔ لارڈ لٹن نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندوستان میں تعلیم کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ آپنے فرمایا کہ "میرا ہندوستانی تجربہ صرف ایک صوبہ یعنی بنگال تک محدود ہے کیونکہ میں اسی صوبہ میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک گورنر رہا۔ اس لئے قبل اس کے کہ میرے ملاحظات تمام ہندوستان پر عائد کئے جائیں ان میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کا مقصد جس معنی میں میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہوں یہ ہے کہ آدمی زندگی کو سمجھے، اس کو پہچانے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ مختصراً اس کا مقصد ہے فرد کی مکمل نشوونما ہندوستانی تعلیم کے متعلق سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف توجہ کو جذب کرتی ہے وہ مسئلہ کی وسعت ہے اور اس میدان کی بے پایانی جس میں ابھی کام کرنا باقی ہے۔ عام تعلیم یعنی مدارس میں سب کی لازمی تعلیم تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ ۳۵ کروڑ کی آبادی میں صرف ۲ فیصدی ادبی تعلیم کے اس معیار کو پہنچے ہیں جہاں لکھنا پڑھنا ممکن ہو۔ ہندوستان میں مدارس کی تعلیم ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کا صرف برداشت کرنے کے لائق ہیں۔ مزید ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک لوگ مزید ٹکس دینے پر آمادہ نہ ہوں جس سے غریبوں کے مدرسہ کھولے جاسکیں"۔

آپنے آگے چلکر فرمایا کہ "ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کیطرف سے کامل غفلت برتی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مردوں کی تعلیم نے جماعتی زندگی، رسم و رواج اور ملک کے عام خیالات پر اس کم اثر

کیا ہے۔ ہندوستانی اب کوئی دو تین نسل سے ہماری تعلیم گاہوں میں پڑھنے آ رہے ہیں، باقی ہندوستان میں کچھ نہ کچھ تعلیم پاتے ہی ہیں، اس کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے تھا لیکن کیا ہوا؟ آپ میں سے اکثر نے مس میو کی کتاب "مادر ہند" پڑھی ہوگی جس سے مغربی پڑھنے والے رنجیدہ ہوئے اور ہندوستانی غضبناک۔ اس کتاب میں بہت سی اختلافی باتیں ہیں اور میں انپر بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات اس میں ہے جس سے ہندوستان کا ہر جاننے والا اتفاق کرے گا اور وہ بات یہ ہے کہ جن واقعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، چاہے اچھی طرح یا بری طرح، صحت کے ساتھ یا غلط طریق پر، وہ واقعات عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کی نہایت قوی شہادت ہیں" آگے چلکر آپنے فرمایا! "اگر شمالی ہند کی آبادی میں پردہ لازمی چیز ہے اور جہاں یہ موجود ہے وہاں اسے قائم رکھنا ہے تو قدامت پسند جماعت کا فرض ہے کہ پس پردہ تعلیم دینے کے موثر ذرائع نکالے ..... ہندوستانی گھروں میں عورت کا اثر بیحد ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتوں کا۔ یہ اثر ہندوستان کے بچوں ہی تک محدود نہیں، گھروں میں مردوں پر بھی انکا بہت اثر ہے۔ ہم لوگ اکثر ہندوستان کے متعلق ان لوگوں سے ملکر رائے قائم کرتے ہیں جو ہمارے ملک میں آتے ہیں، جن سے ہم طالب علم، عہدہ دار، یا مہمان کی حیثیت سے ملتے ہیں اور جن کی واپسی کے بعد انکی تقریریں اخباروں میں شائع ہوتی ہیں لیکن جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے گھروں پر بہت ہی کم اثر ڈالا ہے اور اس سے بھی کم اپنے ملک کے رسم و رواج اور جماعتی زندگی پر۔ یہ چیزیں ابھی اس حال میں ہیں جس میں عورتیں انہیں رکھنا چاہتی ہیں۔ جسم جماعتی میں عورتوں کا اثر ایسا ہی ہے جیسا جسم انسانی میں خون کا۔ یہ دکھائی نہیں دیتا، لیکن جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو، اس کا کوئی عمل اس کے اثر سے باہر نہیں۔ کل جسم کی صحت کا مدار اسی پر ہے۔ یہی حال ہندوستانی گھروں میں عورتوں کے اثر کا ہے۔"

گذشتہ مہینہ کے "جامعہ" میں ہم نے ہندوستان کے بعض تعلیمی اعداد شائع کئے تھے۔ ان

سے معلوم ہوتا تھا کہ دیہی تعلیم کے باب میں پنجاب دوسرے صوبوں سے کتنا آگے ہے۔ پنجاب نے اپنے دیہاتی علاقوں میں تعلیمی جدوجہد کی اسکیم بنانے کے لئے دو ماہرین تعلیم کو مقرر کیا تھا۔ اس اسکیم کی تیاری سے قبل یہ دونوں تعلیمی عہدہ دار انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں دیہی تعلیم کے نظام کا مطالعہ کریں۔ وہاں انہوں نے مشہور تعلیمی ماہر سر میکائیل سیڈلر سے مشورہ کیا۔ سر میکائیل نے ان سے کہا کہ انگلستان کی دیہی تعلیم میں عورتوں کے کلب سب سے اہم چیز ہیں، ان دونوں عہدہ داروں نے معائنہ کے بعد جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ برطانیہ میں اس صدی کی سب سے اہم جماعتی اور تعلیمی تحریک ہے!

ایک بنگالی خاتون مسز سروج نلینی دت آنجہانی نے آج سے کوئی ۱۶ سال قبل بنگال میں اس قسم کے کلب قائم کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے بھی انگلستان کے نسائی کلب دیکھے تھے اور انکا خیال تھا کہ باوجود اہم جماعتی اختلافات کے اس طریقہ سے ہندوستان کے دیہاتوں میں بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ انکا عقیدہ تھا کہ انکی جاہل ہم وطن عورتوں کو ابھارنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ خود ان عورتوں کو منظم کیا جائے چنانچہ انہوں نے محل سمیتیوں کے قیام کی کوشش کی۔ آج ۴ سال کی کوشش سے بنگال کے دیہاتوں اور قصبوں میں ۲۵۰ کے قریب سمیتیاں قائم ہو چکی ہیں۔ جس میں ہر طبقہ، مذہب اور ذات کی عورتیں شامل ہیں۔

اس کی مرکزی جماعت نئی سمیتیوں کے قیام کے لئے کوشش کرتی ہے۔ انکے کام میں ربط و تعلق پیدا کرتی ہے، گھر میں صنعتیں سکھانے کے لئے استانیاں بھیجتی ہے، ایک ماہوار رسالہ شائع کرتی ہے، کلکتہ میں ایک مرکزی صنعتی اسکول چلاتی ہے، اور عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں تقریروں کا انتظام کرتی ہے۔ سمیتیوں کی خاص غرض یہ ہے کہ اراکین میں باہمی ربط پیدا کریں، اور امداد باہمی کے جذبہ کو تقویت پہنچائیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کیجاتی ہیں جیسا کہ گذشتہ سال کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً عوام کی درستی کے لئے بہت کچھ کام کیا گیا۔ بچوں اور زچوں کے لئے علیحدہ شفاخانہ کھولے گئے۔ دائیاں تیار

کی گئیں، تقریروں تعلیمی حلقوں اور عام تبلیغ کے ذریعہ صفائی اور صحت کے متعلق معلومات کی اشاعت کی گئی۔ بیوہ اور غریب عورتوں کی مدد کے لئے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا گیا اور ان صنعتوں کو امداد باہمی کے اصول پر چلایا گیا۔ اس رپورٹ کا مطالعہ تعلیمی کام کرنے والوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلوص اور محنت دشوار کاموں کو کس طرح آسان کر دیتے ہیں۔

لندن ٹائمس تعلیمی ضمیمہ

تنقید و تبصرہ

کتب :۔

الصلوۃ للہ والصیام للرحمن ۔ مقابلہ اسلام ویورپ

الصلوۃ للہ والصیام للرحمن یہ کتاب مولوی سید محمد رفیع الدین صاحب نے مقام کالا باغ ضلع میانوالی سے ہمارے پاس رائے زنی کے لئے ارسال کی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خیال کے مطابق قرآنی نماز و روزہ کی تشریح فرمائی ہے اور اپنا مذہبی نام "مسلم اہل البیت" لکھا ہے جس کے متعلق ہم کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بوجہ سید ہونے کے اختیار کیا گیا ہے۔ یا جملہ مسلمانوں کو اہل بیت رسول سمجھکر۔

غالباً یہ مسلم اہل البیت اہل قرآن کی چوتھی قسم ہے۔ پہلا فرقہ "اہل قرآن" مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی والا لاہور میں تھا جس میں کچھ شائبہ حدیث کا بھی تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب مذکور ایک مدت تک اہل حدیث رہ چکے تھے۔ دوسرا فرقہ گوجرانوالہ کا "اہل الذکر" نامی ہے۔ تیسرا امرتسر کا "امت مسلمہ"، لیکن یہ چوتھا فرقہ سب پر فوقیت رکھتا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی قرآن فہمی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ بلا مبالغہ جس آیت سے جو مطلب چاہتا ہے سمجھ لیتا ہے۔

ابھی فرقہائے اہل قرآن میں یہی بحث تھی کہ نماز پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی۔ مسلم اہل البیت کہتا ہے کہ نہ تین نہ پانچ بلکہ متوسطاً چار وقت کی فرض ہے جس میں تہجد بھی داخل ہے۔ ان چاروں میں سے تہجد اور فجر کے لئے قبلہ مشرق ہے اور ظہر اور غسق اللیل کے لئے مغرب یعنی سمت قبلہ کے واسطے سورج کے رخ کا زیادہ لحاظ ہے۔

ہر نماز کے لئے رکعتوں کی تعداد دو ہی دو رکھی ہے۔ رکعت کا نام بھی بدلکر قصرا ولی اور قصرا خرے کر دیا ہے۔ اور آیت " سبعًا من المثانی " سے دونوں رکعتوں یعنی قصروں کے لئے سات سات ارکان نکالے ہیں۔ انکی ادائیگی کے جو طریقے لکھے ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہر ہر قصر میں دو دو قیام ہیں اور دو دو قعدے، جن کے نام الگ الگ ہیں۔

روزوں کی فرضیت بخلاف اپنے ہمنام عرف خالو دہلی کے مشہور اہل قران کے جو " ایامًا معدودات " سے صرف تین دن مانتے ہیں تیس دن کی رکھی ہے۔ مگر قمری مہینہ کے قائل نہیں۔ شمسی حساب سے ہر سال ۲۲ اکتوبر سے ۲۰ نومبر تک رمضان قرار دیتے ہیں۔

اس نماز اور روزے کے بیان میں جابجا جزئیات کی تفصیل کے لئے قرانی آیات سے جو دلیلیں پیش کی ہیں انکے متعلق وہی کہا جا سکتا ہے جو جنت کے وصف میں کہا گیا ہے " مالاعین رأت ۔ ولا اُذنٌ سَمِعَتْ ولا خطر علیٰ قلب بشر "

آخر میں مجھے نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اہل قرآن نے جو اپنا کل دینی سرمایہ اور راس المال صرف قرآن ہی کو گردانتے ہیں آجتک اس کی کوئی صحیح خدمت نہیں کی۔ بلکہ بیشتر اس کی روشن آیات کو اپنی جدت طرازی اور تاریک نظری سے چیستان کی طرح حل کر کرکے دین الٰہی کو ملعبہ اور اپنے آپ کو مستوجب عقاب اور اضحوکۂ دہر ہی بناتے رہے۔ حافظ محب الحق عظیم آبادی نے شرعۃ الحق اور منہاج الحق لکھکر پھر بھی ایک کام کیا۔ لیکن اس جماعت نے اپنے علم۔ دین۔ دماغ اور عقل اور قرآن فہمی اور مسلمانوں کی دینی رہبری کے ادعا کا ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا۔

مقابلۂ اسلام و یورپ۔ اسلام و یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ۔ (مرتبہ ظفر تاباں ایچ پی) جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مؤلف نے اس میں اسلام اور یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے آج کل یہ موضوع اس قدر مرغوب ہو گیا ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے بلا پس و پیش اس پر خامہ فرسائی کرنے لگتا ہے۔ عباسیوں کے کچھ علمی کارنامے۔ اندلس کی تہذیب کے دو چار مرقعے۔ یورپ کے عہد ظلمہ کی جہالت کے دو ایک واقعات لکھدئے گئے اور تاریخی موازنہ مکمل ہو گیا، اسلامی تہذیب کی برتری ثابت ہو گئی یورپ کی بہیمیت اور بربریت مسلم ہو گئی اور مؤلف نے اسلام اور علم کی وہ خدمت کر دی جس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ کاش حضرات مؤلفین علمی مباحث پر اس قدر غیر ذمہ داری سے قلم نہ اٹھاتے۔ اس رسالے کے مؤلف نے معلوم ہوتا ہے کہ محنت بہت کی ہے لیکن ہم کسی طرح اس کوشش کو کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ مباحث ایک دوسرے سے اس قدر دست و گریباں ہیں کہ انکو الگ کرنا ناممکن نہیں تو از حد دشوار ضرور ہے، انداز بیان تاریخی نہیں بلکہ بیشتر تبلیغی ہے۔ زبان میں بھی الجھاؤ بہت ہے۔ نادر ترکیبوں کے استعمال کا شوق بہت غالب نظر آتا ہے۔ زبان کی غلطیاں بھی شاذ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں:-

صفحہ ۱ (پہلا جملہ) "مذہب اس تجلی روحانی کا نام ہے جو اپنی تنویر نوازیوں سے انسانی قلب کو شمع زار بنا دے"

صفحہ ۳ (سطر ۱) "ان کا دار و مدار محض وہم پرستی پر موقوف تھا"

صفحہ ۱۱ (سطر ۶) اول اول قرآن ادب و انتشار حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا۔ آنحضرت نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کر کے اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت کو اپنی ماموریت من اللہی کے ثبوت میں پیش کیا" کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

صفحہ ۲۰ (سطر ۱۹) "یورپ کی فضا پر جہالت کی تاریکیاں ظلمت بار تھیں اور شاید اس کا انتظا

تھا کہ افق مشرق سے ایک نور برساتا ہوا آفتاب طلوع ہو "

صفحہ ۳۹ (سطر ۹) "عیسائیت کو تعلیم مسیح نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا "

صفحہ ۶۰ (سطر ۱۶) " اسپین میں مسلمانوں کے خانگی طریقے " غالباً طرز بود و باش مراد ہے۔

صفحہ ۷۰ (سطر ۱۹) "معتصم ایک جانسوز جوش میں ڈوب گیا "

صفحہ ۷۶ (سطر ۷) ایک عالمگیر ہنگامہ زاری میں حق کی سچی صدا نے عرب کے کھنڈرات میں جب سامعہ نوازی کی تو کسی کو کیا خبر تھی کہ یہی دھیمی صدا دشکدہ عالم پر محیط ہو جائیگی"

یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے ورنہ کتاب کے ہر صفحہ میں دو چار ایسے سامحات ضرور ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلومات میں کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن ترتیب و استدلال کا جہانتک تعلق ہے وہ سرے سے ناپید ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام طور پر یہ کتاب مقبول ہو اس لئے کہ یورپ اور اس کے تمدن کو جا و بیجا خوب گالیاں دی گئی ہیں لیکن اسے کسی طرح موازنہ نہیں کہہ سکتے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی برتری معلوم یورپ کا اندلس سے کسب کمال مسلم لیکن اسے جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ علمی شان کے منافی ہے۔

بہر حال مولف کی کوشش اور انکے جذبے کی داد ضرور دینی چاہئے۔ حجم اس رسالہ کا ۱۰۴ صفحہ ہے اور قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ غالباً بزم اخلاق پھلی والان دہلی ہے۔

شذرات

ہمارے رسالے کا یہ نمبر مقررہ وقت کے بہت بعد شائع ہو رہا ہے۔ اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ ایک مدیر طویل رخصت پر گیا ہوا تھا۔ اب وہ واپس آگیا ہے۔ اس لئے انشاءاللہ دو تین مہینے میں رفتہ رفتہ اشاعت وقت پر آجائے گی۔

رسالے کی ادارت غور کر رہی ہے کہ اسے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیجائیں۔ اس معاملے میں قارئین کرام کا مشورہ بہت ضروری ہے۔ مشورہ میں اسکا لحاظ رکھنا مناسب ہے کہ رسالے کا علمی معیار کسی طرح کم نہ ہونے پائے بلکہ جہانتک ممکن ہو اور بڑھے۔

اکادمی کیطرف سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں اُنکے بارے میں بھی یہ کوشش ہے کہ اب کی سال گذشتہ سال سے بہتر کتابیں قارئین کرام کی خدمت میں بھیجی جاسکیں۔

علمی پودوں کا سرسبز ہونا یوں بھی مدتوں کا کام ہے اور ہمارے ملک میں تو اب تک آب و ہوا اس قدر ناموافق ہے کہ نمو کی رفتار اور بھی کم ہے۔ پھر بھی محنت اور استقلال شرط ہے۔ جو بیج بویا جاچکا ہے اور بونے والے جفاکشی اور عرقریزی سے کام لے کر اس کی آبیاری کرتے رہتے ہیں وہ کسی دن ضرور پَیل کر اور بڑھ کر مضبوط درخت بنے گا اور پھول پھل سے مالا مال ہوجائے گا۔

یہ سال جامعہ ملیہ کے کارکنوں کے لئے بڑی آزمائش اور ابتلاء کا سال تھا۔ اس کے آغاز میں انہیں پریشانی اور مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ اگر اُنکے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو جس بوجھ کو برسوں سے اُٹھائے ہوئے تھے وہ سر سے گر جاتا اور پھر شاید اٹھائے نہ اٹھتا۔ مگر خدا نے انہیں اتنی توفیق دی کہ انکے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی اور وہ ساری کڑیاں جھیل لے گئے۔ ملت اسلامی کے چند سچے حامیوں نے فیاضی سے کام لیکر اس کی فوری مشکلات کو دور کردیا اور آئندہ کے لئے بھی بہت کچھ اطمینان دلا دیا۔ اب وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انشاء اللہ چند سال میں جامعہ اپنی مالی ضروریات کی طرف سے، جن کے لئے اسے فی الحال مقابلتاً تھوڑی رقم درکار رہے، مطمئن ہو جائے گی اور زیادہ یکسوئی سے مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی خدمت انجام دے سکے گی۔

آجکل مسلمانوں کا سیاسی انتشار انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے اثر سے ساری قومی زندگی منتشر ہوگئی ہے۔ شاید ہی کوئی دو آدمی ایسے ہوں جو اصولاً متفق ہوں اور عملاً مل کر کام بھی کر سکتے ہوں۔ اُس پر طرہ یہ ہے کہ باہمی اختلاف اکثر مخالفت بلکہ عداوت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ذاتی مناقشات کے مقابلے میں ہمارے ذمہ دار افراد قومی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

آخر اس بدبختی کا سبب کیا ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خود پرستی میں مبتلا ہیں، اور اُنکے دل مذہب و ملت اور ملک و قوم کی محبت سے خالی ہیں لیکن غور کیجئے تو یہ خیال صحیح نہیں ٹھہرتا۔ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے مسلمانوں نے انہیں چند سال کے عرصہ میں مذہب کے نام پر جان و مال کی قربانی کی، ملک کی

آزادی کے لئے دولت اور ثروت سے منہ نہ موڑا اور قید فرنگ کی سختیاں جھیلیں پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انکے دل میں اسلام کا اور ہندوستان کا درد نہیں۔

بات یہ ہے کہ صرف جوش اور محبت کسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں۔ جوش ناپائدار چیز ہے اور محبت اندھی ہوتی ہے۔ جوش کی تکمیل کے لئے استقلال ضروری ہے اور محبت کی پختگی کے لئے علم و بصیرت ناگزیر ہے۔

ہمارے سامنے جو نصب العین ہے وہ بدقسمتی سے تاروں کی طرح روشن نہیں ہے بلکہ شہاب ثاقب کی طرح ایک چمک دکھا کر چھپ جاتا ہے۔ ہمیں ایسی شمع ہدایت چاہیئے جو ہر قدم پر ہمیں راستہ دکھائے اور ہمیشہ منزل کو ہمارے پیش نظر رکھے۔ یہ چیز سوائے علم، مطالعے، تجربے، غور و فکر کے اور کچھ نہیں۔ جب تک ہم اپنے ماضی کے محرم نہ ہوں گے اپنے عہد کے حالات سے آشنا نہ ہوں گے اور آنے والے زمانے کو دور سے دیکھنے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں گے، ہمیشہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

ہمارے دل میں جو درد ہے اس میں کبھی کبھی ٹیس اٹھتی ہے اور ہمیں تڑپا دیتی ہے مگر پھر بے حسی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق درد کے لئے بھی تربیت کی ضرورت ہے، جوش جنوں بھی پرداخت کا محتاج ہے، قومی خدمت کے لئے قومی جذبے کو اس طرح نشو و نما دینا ضروری ہے کہ وہ ہماری سیرت کا جزو ہو جائے۔ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اعلیٰ اور بلند تعلیم، گہری اور راسخ تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر

ن دونوں چیزوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جس کی اہمیت ہمیں نظر انداز نہ کرنا
اہیئے۔ مالی فراغت اور خوش حالی جس سے ہم من حیث القوم محروم ہیں، بام ترقی
پہنچنے کے لئے پہلا زینہ ہے۔ مسلمانوں کی پچھلی نصف صدی کی ساری اصلاحی کوششیں
ی لئے ناکام رہیں کہ انہوں نے اقتصادی مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کیا
فلاس کے سبب سے جو مایوسی اور افسردگی پیدا ہوتی ہے وہ قوت عمل اور قوت
لمر کو بیکار کر دیتی ہے بلکہ اخلاق کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔

افلاس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم کسب معاش کو کوئی ضروری فرض نہیں سمجھتے اور
س کے ذرائع تلاش کرنے میں کما حقہ کوشش نہیں کرتے۔ ہم میں صاحبان ثروت
بھی ہیں مگر بہت تھوڑے۔ ہمارے اکثر افراد دوسروں کے دست نگر ہیں اور اسے
قابل شرم نہیں سمجھتے۔ البتہ مزدوری، دستکاری کرنا انکے خیال میں بڑی ذلت کی
بات ہے۔ ہماری ترقی بلکہ ہماری زندگی کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ یہ خیال ہمارے دل
سے نکلے ہم سرکاری نوکری، وکالت اور گداگری کے تنگ دائرے سے نکل کر
کسب معاش کے کھلے میدان میں ہاتھ پیر ماریں اور مجموعی حیثیت سے اپنی مالی حالت کو
درست کریں۔

صحیح تعلیم، صحیح تربیت اور کسب معاش کیلئے نئے راستے تلاش کرنا۔ یہی مقاصد
جامعہ ملیہ کے پیش نظر ہیں۔ حیات قومی کی شیرازہ بندی اور استحکام کی یہی ایک
صورت نظر آتی ہے کہ یہ درسگاہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور دوسرے مدارس
کے لئے ایک نمونہ بنے۔ ہماری قوم کے اکثر سربرآوردہ افراد اس وقت سیاست
حاضرہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور غالباً کبھی اس سے نکل نہ سکیں گے لیکن

کیا ہم میں معدودے چند افراد بھی ایسے نہیں جو ذرا دوربین نظر رکھتے ہوں اور موجودہ سیاست کے موہوم فوائد پر ملت اسلامی کی اندرونی تعمیر و تہذیب کو ترجیح دیں اور اسے اپنی توجہ کا مرکز بنائیں؟

ہم نے اس مسئلے کو خاص کر کے چھیڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین مسلمانوں کے موجودہ جمود و انتشار اور اس کے دور کرنے کی تدابیر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں، بیشک یہ بحث محض کاغذی ہوگی لیکن اسے بیکار سمجھنا بڑی غلطی ہے صحیح عمل کے لئے صحیح رائے کی ضرورت ہے اور صحیح رائے قائم کرنے کا عمدہ ذریعہ تبادلۂ خیالات ہے۔

البتہ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس بحث میں حتی الامکان افراد یا جماعتوں پر بیجا حملے کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ نکتہ چینی بہت مفید چیز ہے۔ لیکن اس میں اگر سلامت روی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر سوقیانہ گالی گلوج تک نوبت پہنچتی ہے جس میں اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ جانبین کی بدنامی سے دوسروں کی نظر میں ملت اسلامیہ کی سبکی ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری | ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲ | ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

سیرتِ نبوی اور مستشرقین

مقدمہ

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ کتاب جسکا یہ مقدمہ ہے مشہور مستشرق ولہا دزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی طبع نہم میں محمڈزم کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں سے بھی صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلعم سے متعلق ہے۔ مستشرقین نے اسلام اور بانی اسلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اُردو داں طبقہ اور خصوصًا علمائے کرام بہت کم واقف ہیں۔ یہ زہر انگریزی کے ذریعہ سے جدید تعلیمیافتہ جماعت میں پھیلتا جاتا ہے اور جن لوگوں پر دینی ہدایت کی ذمہ داری ہے ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کے صحیح خیالات سے اور انکی حقیقت سے لوگ واقف ہوجائیں تاکہ ایک طرف تو علماء کو ان کی اہمیت کا احساس ہو اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے مضامین پڑھتے ہیں انہیں حقیقت حال کا علم ہو جائے۔ بعض حضرات کا ممکن ہے یہ خیال ہو کہ مستشرقین کے اعتراضات ابتک اردو داں طبقہ تک نہیں پہنچے ہیں اور ان اعتراضات کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اسمیں تو شک نہیں کہ ابتک اس قسم کے خیالات کا مرکز صرف انگریزی داں طبقہ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید ماحول کے اثر سے یہ زہر تجاوز کرکے نیم انگریزی داں طبقہ تک پہنچ گیا ہے اور یہاں پہنچکر اس کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اعتراضات کی حقیقت سے واقف

نہیں ہوتے بلکہ سنی سنائی باتوں سے انکی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرے اگر شاذ و نادر کبھی انگریزی میں ان اعتراضات کے رد کرنیکی کوشش بھی کیجاتی ہے تو یہ لوگ اس سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے اور خصوصاً علمائے کرام کے لئے جن میں سے بیشتر السنہ مغربیہ سے نابلد ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اردو زبان میں پہلے ان اعتراضات کو صحیح طور پر بلا کسی مبالغے کے پیش کیا جائے اور پھر انکی حقیقت بے نقاب کیجائے اس طرح ممکن ہے ہمارے علما محسوس کریں کہ وقت کی ضرورت اب کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طہارت کے طویل الذیل مسائل اور آمین و رفع یدین پر مناظرہ، دینی خدمت تسلیم کیا جائے بلکہ آجکل تو اصول اسلام اور خود شارع اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہو رہی ہے اور اہل نظر کا فرض اور شدید ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے سامنے پھر اسی رنگ میں پیش کریں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور حواشی میں اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مترجم کو اپنی خامیوں کا کامل احساس ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جواب کا پورا حق ادا نہ ہو سکا لیکن اسکا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ ہر مسئلے پر آخری فیصلہ صادر کر دے۔ اس تالیف کی غرض تو یہ تھی کہ اعتراضات بہ تمام و کمال سامنے آجائیں اور جو لوگ جواب دینے کے اہل ہیں لیکن خواب غفلت میں یا کسی غیر ضروری کام میں پڑے ہوئے ہیں ذرا چونکیں۔ اگر یہ تالیف علمائے کرام کے جمود کو توڑ سکے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جن کے قلوب تشکیک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں غور و فکر کے لئے کچھ مسالہ فراہم کر سکے تو اسکا مقصد حاصل ہو گیا۔ ولہاوزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ کے بعد شاید ہی کوئی اعتراض چھوٹ جائے۔ ایسا مضمون کوئی اور نظر سے نہیں گذرا جس میں مستشرقین کے تمام نظریات بیک وقت موجود ہوں۔ انکے خیالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ ولہاوزن کا شمار مستشرقین کے طبقہ اولی میں ہوتا ہے

اور اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے یورپ کے اہل علم بہت مستند اور قابل وثوق سمجھتے ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لئے خاص طور پر اس سے یہ مضمون لکھوایا گیا تھا اور غالباً جرمن سے ترجمہ کرا کے اس میں شائع کیا گیا۔

مستشرقین کے اعتراضات سے بحث کرنے سے پہلے اگر ہم ایک سرسری نظر ان خیالات پر ڈالیں جو اہل یورپ کے رسول اللہ صلعم سے متعلق ابتدائے اسلام سے لیکر عہد حاضر تک رہے ہیں تو ہمیں اسکا اندازہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ انکے خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ لوگ رسول اللہ صلعم کی ذات اور اصول اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب "محمڈ اینڈ محمڈنزم" میں جو پہلی دفعہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی ایک خاکہ اس وقت تک کے خیالات کا کھینچا ہے۔ اسکا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے لفظی ترجمہ طوالت کے خیال سے نہیں کیا گیا۔ اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا "اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں دنیائے عیسائیت کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ تنقید یا توضیح کرسکتی اس کا کام تو صرف لرزنا اور اطاعت کرنا تھا لیکن جب وسط فرانس میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا قدم رکا تو ان قوموں نے جو بھاگ رہی تھیں مڑ کر دیکھا۔ اب بھی اگرچہ انکی ہمت جنگ کرنیکی نہ تھی لیکن وہ پیچھے ہٹنے والے دشمن کو گالیاں تو دے سکتی تھیں۔ رین کے رومانس میں محمد (صلعم) کو جو بت پرستی کے شدید ترین مخالف تھے، خود ایک سونے کا بت کہا گیا ہے جس کی پرستش کاڈز میں ہوتی تھی اور جس کا نام مہامٹ تھا۔ رولاں کے گیت میں جو فرانس کا قومی رزمیہ گیت ہے دکھایا گیا ہے کہ قرطبہ کا خلیفہ مارسل اسی بت کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرغوب قسم یہ ہے "عطارد کی قسم، محمد (صلعم) کی قسم اور اپولو کی قسم[1]"۔ عجیب قلب ماہیت اور عجیب افترا! اس بت کے سامنے انسانی قربانیاں کیجاتی ہیں اگر اور کہیں نہیں تو کم از کم دسویں

---

[1] رولاں کے گیت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹ جس میں یوسف حسین خاں صاحب کا ایک مضمون "عہد وسطیٰ کے فرانسیسی ادبیات میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اور گیارہویں صدی کے مصنفین کے تخیل ہی میں ہی اور اسکا نام کبھی بافوم ہوتا ہے اور کبھی مافومٹ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں اب تک عام غلط فہمی کی حامل ہیں فرانسیسی میں لفظ Mahomerie اور انگریزی میں Mummery اب تک لغو اور مہمل رسوم کے لئے استعمال ہوتا ہے بارہویں صدی میں بجائے معبود کے محمد (صلعم) کو ایک مرتد اور بے دین کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے دانتے نے انہیں جہنم کے نویں حلقے میں ان لوگوں کے ساتھ رکھا ہے جو مذہبی تفرقے کے بانی ہیں۔ بانیان اصلاح (Reformation) نے بھی محمد (صلعم) کی طرف جو سب سے بڑے مصلح تھے کوئی توجہ نہ کی اور انکی نفرت بھی انکے علم کی مقدار کے ساتھ ساتھ قائم رہی مصلحین غالبًا یہ نہ سمجھے تھے کہ پاپائی جماعت دونوں کو عیسائیت کا دشمن ٹھہرائے گی اس لئے کہ پادریت اور رسوم پرستی کی مخالفت میں اسلام اور پروٹسٹنٹزم دونوں مشترک ہیں۔ اسی زمانے میں یہ حکایت بھی ایجاد ہوئی کہ ایک کبوتر کو محمد (صلعم) نے سکھایا تھا کہ انکے کان میں سے دانے چنے اس سے موجدین کے خبث سے زیادہ ان کی حماقت کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ روایت بھی عام طور پر صحیح تسلیم کی جاتی تھی۔ اس وقت بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی جب یہ محسوس کیا گیا کہ رائے قائم کرنے سے قبل جہاں تک ممکن ہو سرچشمے کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں اور دوسرا ۱۶۹۸ء میں ہوا اسی کے بعد ایک شخص الکزنڈر راس نے فرانسیسی سے انگریزی میں اسکا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ساتھ جو مقدمے درج تھے ان میں طرح طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے اس کا بھی کوئی اچھا اثر نہ پڑا پھر بھی باوجود ان غلط فہمیوں کے جو اب تک عوام میں رائج ہیں انگلستان اور فرانس ہی کے سر عربی ادب اور عربی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کی ابتدا کا سہرا ہے اور اسی ابتدا کی وجہ سے گبن اور میور، کاسین دی پرسیوال اور سینٹ ہلیر، وائل اور اشپرنگر کے ہاتھوں اب ایسا مسالہ فراہم ہو گیا ہے کہ ہر شخص معقول اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس تحریک کا بانی گیگنیر ہے جو پیدائش کے لحاظ سے تو فرانسیسی تھا لیکن انگلستان کو اس نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر ہونے کے بعد اس نے محمد (صلعم) کی تاریخ لکھنی شروع کی جس کی

تیا دابوالفدا کی تصنیف پر تھی۔ اسکے بعد ہی سیل اور سیوآرے نے دو مختلف یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ انہی تصانیف سے اور خصوصاً سیل کے "تمہیدی مباحث" سے گبن کو جو خود عربی نہ جانتا تھا وہ مسالہ ملا جس سے اس نے وہ باب محمد کی زندگی پر باندھا جس کا جواب سیرت نگاری میں نہیں ملتا۔ لیکن انگریزوں کے خیالات میں جو کچھ بھی تبدیلی ہوئی وہ گبن کی وجہ سے نہیں بلکہ کارلائل کی وجہ سے۔ ہم میں سے کتنے اس تعجب انگیز اور علمی و مذہبی زندگی کے اس یادگار واقعے کو بھول سکتے ہیں کہ کارلائل نے "بطل بصورت رسول" کے لئے نہ موسے کا انتخاب کیا نہ ایلیا کیا اور نہ عیسیٰ کا بلکہ محمد (صلعم) کو لیا جنہیں عام طور پر لوگ فریبی سمجھتے تھے"

یہ تھا باسورتھ اسمتھ کی تحریر کا خلاصہ جس سے اس زمانے تک کے خیالات کا ایک دھندلا سا خاکہ دماغ میں قائم ہو سکتا ہے اس میں بہت سے خیالات ایسے ہیں جنہیں نقل کرتے وقت ایک مسلمان کا قلم کانپ اٹھتا ہے مگر تسکین اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" اس کے بعد مستشرقین کا دور شروع ہوتا ہے جن کا ایک نمائندہ ہمارا مضمون نگار ولیم واٹ ہے اور جس کے خیالات اگلے صفحات میں مرقوم ہیں۔ مستشرقین نے بھی باوجود کوشش کے رسول صلعم کی شخصیت اور انکی تعلیمات کو کما حقہ نہیں سمجھا، یا اگر سمجھا تو اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس مقدمہ میں بعض ان اصولی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کے سمجھنے کے بعد اعتراضات کی حقیقت کھل جائیگی اور جنہیں یا تو مستشرقین سمجھے نہیں ہیں یا دیدہ و دانستہ ان سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ وحی کا ہے۔ مستشرقین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلعم حامل وحی تھے اور نذیر تھے اور خود رسول اللہ صلعم نے صاحب وحی ہونیکا جو دعوے کیا ہے اس کی طرح طرح سے تاویل کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ سراسر فریب ہے اور انہیں خود بھی یہ یقین نہ تھا کہ ان پر نزول وحی ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں صرع کی قسم کا ایک دماغی دورہ ہوتا تھا اور اس دورے کی حالت میں جو خیالات انکے ذہن میں آتے تھے انہی کو وہ منزل من اللہ سمجھ لیتے تھے۔ پھر ان میں بھی دو طبقے ہیں ایک کا خیال ہے کہ وہ آخری وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہے

اور دوسرا کہتا ہے کہ مکی زندگی میں تو واقعی انہیں اپنی نبوت کا خود یقین تھا لیکن مدینہ پہنچکر وہ صرف اپنی کامیابی کے لئے ایسا ظاہر کرتے تھے دراصل اب یقین انہیں بھی نہ تھا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تمام علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا اس لئے کہ وہ تو اُمّی تھے۔ اس کے جواب میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر حد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔ اسی سوال کے جواب کے لئے بحیرا راہب کے قصے کو اسقدر شہرت دی گئی اور ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا کر پیش کیا گیا۔ اسکے علاوہ جیسا خود ولہاوزن نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا کہ یہودیوں سے شروع شروع میں رسول اللہ صلعم کے تعلقات اچھے تھے اور انہیں یہ سب علم انہی سے حاصل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اسلام کے نام سے من چلوں نے ضخیم رسالے لکھ ڈالے اور کس لئے محض اس نظریہ کے ثبوت کے لئے کہ رسول اللہ صاحب وحی نہیں تھے حالانکہ کوئی قطعی ثبوت اب تک یہ لوگ پیش نہ کر سکے محض یہ ثابت کر دینے سے کہ اسلام کا فلاں رکن فلاں مذہب سے ماخوذ ہے یا اس کے مطابق ہے وحی کا انکار لازم نہیں آتا اس لئے کہ اسلام نے کبھی جدت کا دعوی نہیں کیا۔ قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب ہے۔ یہ وہی اصل الاصول ہے جسے تمام مذاہب نے اپنا سنگ بنیاد قرار دیا ہے البتہ زمانے کے لحاظ سے ہر مذہب کچھ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور اسی وجہ سے فروعات میں تمام مذاہب مختلف ہیں۔ ثابت تو یہ کرنا چاہئے کہ رسول اللہ صلعم نے جس دین کی تبلیغ کی اسے انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور اسی کو مستشرقین باوجود کوشش کے ثابت نہ کر سکے۔ انہوں نے دور از کار قیاسات اور غلط استنباطات کو تحقیق علمی کی صورت میں پیش کیا حالانکہ اہل نظر پر انکی مضحکہ انگیزی بالکل عیاں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے صاحب وحی ہونے سے جو لوگ انکار کرتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں ایک تو عیسائی مشنری یا دوسرے مذاہب کے مبلغین ہیں جو اپنے نبی یا پیغمبر کو تو صاحب وحی سمجھتے ہیں مگر رسول اللہ صلعم سے متعلق اسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ انکے لئے تو تمام دلائل بیکار ہیں اس لئے کہ ان کی رائے کا انحصار دلائل پر نہیں بلکہ جذبات پر ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ دوسرا

طبقہ وہ ہے جو وحی کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسکے لئے تمام انبیاء اور تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً ایسا ہونا ناممکن ہی نہیں۔ دلائل کی ضرورت اس طبقہ کے لئے ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحی کا مسئلہ مابعد الطبیعیات کے تمام مسائل کی طرح ظنی ہے۔ اس کے ثبوت میں کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی جیسی طبعی علوم سے متعلق کہ مخالف کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ طبعی علوم میں بھی چند ہی ایسے مسئلے ہونگے جسے بلا استثناء تمام علماء تسلیم کرتے ہوں اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نزول وحی کو اس طرح ثابت کر دیا جائے جس طرح ریاضی کا یہ مسئلہ کہ دو دو دو چار ہوتے ہیں۔ منکرین وحی کے پاس انکار کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں کہ سائنس یا عقل کی روسے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری نمایاں ہوجاتی ہے۔ علوم وفنون میں آئے دن جو ترقی اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہو رہا ہے اس سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہوتی جاتی ہے کہ عقل انسانی نہایت درجہ ناقص ہے اور انسانی معلومات یکسر محدود ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک چیز ایسی دریافت ہوتی رہتی ہے جس سے نظریات کی پرانی دیوار مسمار ہوجاتی ہے اور نئی دیوار تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی ذی فہم انسان کسی نظریے کی بابت یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قطعی ہے اور نہ یہ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جب طبعی علوم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس کی انتہا تک انسان کا قدم پہنچ چکا ہو تو مابعد الطبیعیات میں اس کا قطعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہے آج سے پچاس برس پہلے کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوتا کہ نباتات میں بھی احساس رنج وغم موجود ہے اور وہ بھی حیوانات کی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن سرجگدیش چندر بوس کی تحقیقات سے آج یہ تقریباً یقینی ہو گیا ہے پھر ہمارے لئے کیا ایسی مجبوری ہے کہ ہم حواس انسانی کو محض پانچ تک محدود سمجھ لیں اور قطعی حکم لگا دیں کہ اس کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ نزول وحی پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام میں عام انسانوں کے خلاف یا ان سے بڑھ کر ایک طاقت یا حاسہ موجود ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ایسی چیزیں دیکھتے تھے جو عام انسان نہیں دیکھتے یا ایسی باتیں سنتے تھے جو عوام الناس نہیں سنتے

انسانی حواس اور قویٰ میں اس قدر فرق اور تدریج نظر آتی ہے کہ اس کا تو منطقی نتیجہ ہی یہی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو جس کے حواس اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گئے ہوں یا جس میں فطری طور پر کوئی ایسا حاسہ موجود ہو جو عوام الناس میں موجود نہیں ہوتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب ہم روز دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس میں حواس خمسہ میں سے کوئی حاسہ بہت کم یا یکسر ناپید ہے۔ ہمیں اس وقت تو تعجب نہیں ہوتا جب ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح دیکھ نہیں سکتا یا سن نہیں سکتا لیکن اس وقت تعجب ہوتا ہے اور ہم اسے ناممکن بھی کہنے لگتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان نے وہ دیکھا جو ہمیں نظر نہیں آتا یا سنا جو ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ تعجب یا شک تو ہو سکتا ہے اس لئے کہ پہلی صورت عامۃ الورود ہے اور دوسری صورت بالکل نادر لیکن اس کے کیا معنی ہیں کہ ہم اسے ناممکن قرار دیں اور قابل التفات ہی نہ سمجھیں مناسب طریقہ تو یہ ہے جہاں تک ممکن ہو صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد نئی صورت حالات پر غور کریں اور ضرورت ہو تو اپنے پرانے نظریہ میں تبدیلی کریں۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی کے حالات، انکی صداقت و راست بازی، پھر وہ کیفیات جو پہلے پہلے نزول وحی کے سلسلے میں ان پر طاری ہوئیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور آخر میں وہ نتائج جو نزول وحی سے مترتب ہوئے ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وحی کے امکان کو تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ وحی کے تمام دلائل پیش کئے جائیں اور اس کی تمام صورتوں سے بحث کیجائے اس لئے صرف اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عربی کی بہت سی تصانیف میں مفصل بحث موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کافی کتابیں ملتی ہیں اور اردو میں بھی باوجود قلت کے اتنا مسالہ مل سکتا ہے کہ طلب صادق رکھنے والے کو تسکین قلب کا سامان فراہم ہو سکے۔[۵۱]

۵۱۔ (نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ اصل کتاب کا)

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی معنویت فنا ہو گئی اور اس میں سیاسی رنگ زیادہ غالب نظر آنے لگا اور شروع شروع میں لوگوں پر جو اثر پڑا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو کارروائیاں کیں وہ دراصل سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے کی غرض سے تھیں۔ ولہاوزن نے رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد رسول نے مذہبی اثر سے فائدہ اٹھا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے انہیں تلوار اٹھانی پڑی اور خفیہ قتل کا موجب ہونا پڑا۔

غائر نظر سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ تعصب کے جس کی ہر جگہ کارفرمائی نظر آتی ہے اس قسم کے اعتراض کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مذہب کا وہ ناقص تخیل ہے جو معترضین کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ عیسائی معترضین اسلام کو بھی عیسائیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین کو سیاسی یا معاشی مسائل سے کیا سروکار ہے۔ انکا خیال ہے کہ اس میں صرف عبادات اور عقائد سے بحث ہونی چاہئے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے اسے بے تعلق رہنا چاہئے۔ خیر اگر عیسائی یہ اعتراض کریں تو سمجھ میں آنیکی بات ہے اس لئے کہ انکا مذہب دنیا سے قطع تعلق اور سیاست اور حکومت سے بے پروائی کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہمارا مضمون نگار جو خود یہودی ہے کس طرح یہ اعتراض کر سکتا ہے۔ یہود کے مذہب میں تو سراسر حکومت اور سیاست سے متعلق احکام ہیں اور حضرت موسیٰ کا تو مقصد ہی جہانتک انکی تعلیمات اور ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ

رد کی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو:-

۱۔ کتاب دین و دانش ۔ مولوی محمود علی
۲۔ الکلام ۔ مولنا شبلی نعمانی
۳۔ سیرۃ النبی جلد سوم ۔ مولنا سید سلیمان ندوی
۴۔ اسرار شریعت جلد سوم ۔ مولوی محمد فضل خاں

ان کی تعلیمات میں بھی عبادات اور عقائد کا کافی ذکر ہے لیکن یہودیت کا اصل الاصول تو قواعد و احکام دنیوی ہی ہیں۔

اسلام کے علاوہ تاریخ سے جتنے مذاہب کا پتہ چلتا ہے انکی دو قسمیں ہوسکتی ہیں ایک کو ہم قومی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو نزوانی۔ قومی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن میں یا تو زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام ہیں یوں تو کوئی مذہب بھی ایسا نہ ہوگا جس میں عقائد اور عبادات کا ذکر نہ ہو لیکن مذاہب کی تقسیم یہاں انکے غالب رنگ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں عہد عتیق کے تمام مذاہب۔ یہودیت اور زرتشتی مذہب داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ دوسری قسم یعنی نزوانی مذاہب سے وہ مذاہب مراد ہیں جن میں سراسر ترک دنیا اور تعبد و تقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت داخل ہیں۔ جن لوگوں نے ان مذاہب کی تعلیم کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انکا غالب عنصر ترک لذات، قطع تعلقات دنیوی، فلسفیانہ غور و فکر اور عبادت و رہبانیت میں انہماک ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد اور مخصوص حالات کے لئے بہترین مذاہب تھے لیکن نظر غائر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی کامل مذہب نہیں ہے انسانیت کے ابتدائی دور میں اس میں شخصیت پیدا کرنے کے لئے اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مذاہب کی ضرورت تھی جن میں زیادہ زور انہی عناصر پر دیا گیا ہو، لیکن انسان تو عجیب قسم کی مخلوق ہے وہ جس طرف جھکتا ہے ادھر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ دوسرے رخ کو بالکل بھول ہی جاتا ہے چنانچہ ان تعلقات کی دیکھ بھال میں اس میں اتنی خود غرضی پیدا ہو گئی اور دنیاوی معاملات سے اس قدر شغف اسے ہو گیا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہونے لگا۔ اب ایسے مذاہب کی ضرورت پیش آئی جن میں زیادہ زور ان تعلقات کے قطع کرنے اپنی ہستی کو گم کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر دیا گیا ہو۔ اس

سے رد عمل ہوا۔ اور انسان نے روحانیت کیطرف توجہ کی لیکن ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں بھی وہی یک طرفہ شدت پیدا ہوگئی اور جائز دنیاوی تعلقات سے بے نیازی کے باعث پھر شیرازہ عالم درہم برہم ہونے لگا۔ اب زندگی کے دونوں پہلو انسان کے سامنے تھے لیکن علٰحدہ علیحدہ ایک طرف کچھ لوگ تھے جو سراسر دنیا میں محو تھے اور روحانیت سے بے نیاز. دوسری طرف ایک طبقہ تھا جو دنیا کی طرف رخ کرنا بھی حرام سمجھتا تھا اور یکسر تقشف و رہبانیت کی زندگی کو مقصد حیات سمجھتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تخلیق نہ اس کے لئے ہوئی تھی اور نہ اُس کے لئے۔ اس وقت ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہوئی جو دونوں عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور انسان کے لئے ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے جس کی پابندی سے اسکی تخلیق کا مقصد حاصل ہو۔ اسلام اسی طاقت کا نام ہے۔ اور ان الدین عند اللہ الاسلام سے یہی مراد ہے۔ تمام دوسرے مذاہب نے اسی دین کے لئے زمین تیار کی تھی اور یہی اصل الاصول تھا جس کے لئے انسانی دماغ کی پرداخت کیجا رہی تھی۔ اسلام نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ نہ صرف دنیا سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف دین سے بلکہ دین و دنیا باہم آمیز کہ اکسیر شود۔ اور جبتک مسلمان اس اصل الاصول کو نہیں بھولے وہ خود بھی کامیاب رہے اور تمام دنیا کو ان سے فائدہ بھی پہنچا۔ اور جیسے ہی انہوں نے اس مرکزی حقیقت کو فراموش کیا اُنکی ترقی تنزل سے بدل گئی۔ اور اب اُنکا وجود صفحہ عالم پر حرف غلط کی طرح رہ گیا ہے۔ اگر معترضین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی تائید کی ہے۔ اگر ایک طرف اس نے جائز دنیوی تعلقات کے قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ایسے اصول بتائے ہیں جن کی پیروی سے انسان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف اتنے ہی زور سے روحانی زندگی کو قائم رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے اور ایسے سامان فراہم کئے ہیں جن سے انسان کی روحانی احتیاج پوری ہو اور اسے ابدی مسرت اور دائمی خوشی حاصل ہو۔ قرآن کا ہر صفحہ اس دعوے کی دلیل ہے اور رسول کی زندگی کا ہر واقعہ اس حقیقت کا شاہد

دلائل و شواہد کی یہ کثرت ہے کہ انکار کی گنجایش باقی ہی نہیں رہتی۔

حیرت کا مقام ہے کہ معترضین کو رسول اللہ صلعم کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی ربط نہیں نظر آتا اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ان کی زندگی میں کوئی تغیر رونما ہوگیا تھا۔ مکے کا کام دراصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا جس پر مدنی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوم کو جو ضلالت و گمراہی کے عمیق ترین غار میں گری ہوئی ہو صحیح راستے پر لگا دیا جائے اس میں دینی احساس پیدا کیا جائے۔ اسے سمجھایا جائے کہ ایک اس سے بالا ہستی بھی ہے جس کے سامنے اسے جواب دینا پڑے گا۔ جب یہ حقیقت ایک گروہ کے ذہن نشین ہوگئی تو انہیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام مسائل کی تعلیم دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ انسان کو دنیا میں کس طرح بسر کرنا چاہیے۔ اگر رسول اللہ صرف عقائد و عبادات کی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے اور بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل نہ تیار فرماتے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو عیسائیت کا ہوا تھا۔ سیاست و معاشرت کو دین سے علٰحدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے جذبات و عواطف کی ہدایت کے لئے کوئی شمع نہ روشن کیجائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاملات اور باہمی تعلقات میں انسان انتہائی خود غرضی اور بے رحمی سے کام لے گا اور صورت حالات وہ پیدا ہوگی جو آج کل یورپ میں ہے۔ عیسائیت کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر کوئی تمہیں ایک طمانچہ مارے تو دوسرے کے لئے بھی اپنے رخسار پیش کر دو اور اگر کوئی تمہاری چادر چھینے تو تم اسے اپنا کرتا بھی اتار کر دیدو لیکن آج عیسائی اقوام کا طرز عمل کیا ہے۔ بالکل اس کے خلاف۔ اگر انکا حق ایک گز زمین پر ہوتا ہے تو وہ اس وقت تک قانع نہیں ہوتیں جبتک ایک میل زمین حاصل نہ کرلیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انکے نزدیک دین کو سیاست یا معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو اپنے تمام معاملات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی دین کی روشنی میں دیکھتی تھی اور جس کے باہمی تعلقات میں مساوات و اخوت کا ایسا خوشنا رنگ جھلکتا

تھا جو اب تک صفحات تاریخ کی زیب و زینت ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں اور کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو تاریک رہ گیا ہو۔ کامل دین وہی ہے جو انسان کی ہر دشواری میں خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ کام آئے۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ ماحول کتنا ہی بدل جائے لیکن انسان کے پاس ایسے اصل الاصول موجود ہوں جن سے سیدھا راستہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسلام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ وہ ایسی شاہ راہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ باوجود تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے کہیں انسانی فکر کو پابند اور محدود نہیں کرتا۔ ہر جگہ انسان کو مناسب آزادی عطا کرتا ہے اور اسے اختیار دیتا ہے کہ مخصوص حالات اور واقعات کی مناسبت سے فروع میں تغیر و تبدل کر سکے اور ظاہر ہے کہ اصول کے تغیر کی تو کوئی دین اجازت دے ہی نہیں سکتا۔

ان سطور کے ملاحظہ سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں اتنی معنویت موجود ہے جتنی انسان کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کی تعلیمات عین منشائے تخلیق انسانیت کے موافق ہیں اور معترضین کے اعتراضات مذہب کے ناقص تخیل پر مبنی ہیں۔

تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ اور یہود کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی ذمہ داری رسول پر ہے اور ہمیشہ پیش قدمی انہیں کی طرف سے ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ الزام بھی ہے کہ بعض یہودیوں کو رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ ان اعتراضات میں حقیقت کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل سطور کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلعم کو مجبوراً اپنی حفاظت اور تبلیغ دین کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانا پڑا تھا۔

آیت جہاد جس میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اس قدر واضح ہے کہ شک اور شبہے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی :-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ	انہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی گئی اس لئے کہ ان پر

نصرهم لقدير الذين اخرجوا من ديارهم
بغير حق الا ان يقولوا ربنا الله ولولا
دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت
صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر
فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من
ينصره ان الله لقوی عزیز

سورۃ الحج (۲۲) آیت ۴۰ و ۴۱

ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعے نہ روکتا تو صومعے، گرجا، عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مسمار ہو چکی ہوتیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

ان آیات کے پڑھنے کے بعد کیا یہ صاف نہیں ہو جاتا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اس وجہ سے دی گئی تھی کہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تھے، ناحق انہیں گھروں سے نکال دیا گیا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ ان سے جنگ بھی کیجاتی تھی اور اگر اس کی اجازت نہ ملتی تو اللہ کے نام لیوا دنیا سے مٹ جاتے۔ یہانتک تو اجازت جنگ کی وجہ بتائی گئی تھی اب اسکا مقصد ملاحظہ ہو:-

وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين
لله فان انتهوا فلا عدوان الا على الظالمين

البقرہ۔ ۲۵۔ آیت ۱۸۹

اور ان سے لڑو یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ اور اگر وہ رک جائیں تو زیادتی ظالموں کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتی۔

اس سے ایک طرف تو یہ صاف ہو گیا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ دور ہو جائے اور دین میں سوا اللہ کے خیال کے دوسرے کا خوف یا ڈر باقی نہ رہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو گیا کہ فساد کرنے والے اگر باز آ جائیں تو پھر جنگ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو لڑائی جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کن لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے:-

وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا
تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين

(۲-۱۸۶)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہجاتا ہے کہ صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور دفاع سے سرمو
تجاوز کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں اسی خیال کی تکرار ہے اور
اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں نہ تو خود مسلمانوں کو جبر واکراہ سے کام لینا چاہئے
اور نہ جبر واکراہ برداشت کرنا چاہئے۔ جنگ کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دی گئی ہے
جب دنیا سے اللہ کے نام لیواؤں کے مٹنے کا خوف ہو۔ جب خدا کے دین کی تبلیغ میں طرح طرح کی
رکاوٹیں ڈالی جاتی ہوں تو خدا کے رسول کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ کمر ہمت باندھ کر کھڑا
ہو جائے اور راہ حق سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنیکی کوشش کرے۔ ہاں اگر اس مقصد کے
حاصل ہو جانیکے بعد محض حصول اقتدار یا جلب منفعت کی خاطر رسول لوگوں سے جنگ کرے تو البتہ
وہ مورد الزام ہو سکتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیا۔ یا کوئی اس سے انکار
کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بالکل آخری تدبیر کی صورت میں ہتھیار اٹھایا۔ مکے میں ان پر اور
انکے متبعین پر کیا کیا تکلیفوں کے پہاڑ نہ گرائے گئے۔ کونسا ایسا ظلم باقی رہگیا جو دین حق کے ماننے
والوں پر نہ ڈھایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب بے خانماں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس
میں جا بسے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ مدینے کے قرب و جوار میں برابر نیز چھوٹے
چھوٹے حملے ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے حملے کی تیاری بھی جاری رہی۔ حواشی میں
تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ جنگ بدر کے کیا اسباب تھے اور یہ کیسا بے بنیاد الزام ہے کہ رسول
اللہ صلعم اور انکے ساتھی قافلے کو لوٹنے کی غرض سے نکلے تھے یہیں سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع
ہوتا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ احزاب کہاں ہوئی تھی۔ کیا اسمیں بھی رسول نے ہی پیش قدمی
کی تھی کیا بار بار قریش مکہ اور انکے حلفا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ نہیں کیا اور کیا
مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا۔ اگر خدا کی مدد مسلمانوں
کے شامل حال نہ ہوتی تو انکا نام دنیا سے خارج ہو گیا ہوتا اور اللہ کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہتا
حواشی میں ہر واقعے کے ضمن میں یہ بھی اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی کوئی جنگ جارحانہ

نہیں تھی۔ ابتدا میں تو انپر پے در پے حملے ہوتے رہے اور انہیں دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ انہیں دشمنوں کی تیاریوں کی خبر پہلے سے ملجاتی تھی اور وہ بسلسلہ تقدم بالحفظ انکو جڑ ہی سے کاٹ دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ یہ جنگوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک سے دوسرے کا سامان پیدا ہوتا تھا اور ہر جنگ کو علیحدہ علیحدہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کفار قریش نے جبتک ان میں کچھ بھی دم باقی رہا اپنی تمام کوششیں رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں صرف کر دیں۔ تو کیا رسول اللہ صلعم کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی تدابیر کا توڑ کرتے اور اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور اس دین کی تبلیغ کی آزادی کے لئے جس کے وہ حامل تھے کوئی صورت پیدا کرتے۔ یہ ہے حقیقت اس اعتراض کی کہ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس میں کہانتک صحت کو دخل ہے رہا بعض اکابر یہود کے خفیہ قتل کا سوال جسکا الزام رسول اللہ صلعم پر لگایا جاتا ہے۔ اسکی حقیقت بھی ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔ حواشی میں ہر اس واقعے کے سلسلے میں جہاں یہ الزام لگایا جاتا ہے الگ الگ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور سب کے مطالعے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ اس اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔

چوتھا اور آخری اعتراض جس سے یہاں بحث کرنی منظور ہے یورپ کی نگاہ میں سب سے بڑا اعتراض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور لذات کے ترک کر دینے کے رسول اللہ صلعم میں ایک کمزوری باقی رہگئی تھی جس کا اظہار یوں ہوا کہ عام مسلمانوں کو انہوں نے صرف چار بیبیوں کی اجازت دی لیکن اپنی ذات کو اس کلیے سے مستثنیٰ کرلیا۔ معترضین کو اس میں خواہشات نفسانی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اعتراضات کی طرح اسکا انحصار بھی تعصب پر ہے اور کسی معترض نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنیکی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر ازواج رسول اللہ صلعم کی فہرست پر ہم نظر کریں تو یہ اعتراض حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بجز حضرت عائشہ رض کے تمام ازواج پہلے کسی نہ کسی کے عقد میں رہ چکی تھیں اور جب رسول اللہ صلعم نے ان

سے نکاح کیا تو ان کی عمریں شباب سے متجاوز ہو چکی تھیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ کی
عمر عقد کے وقت اتنی کم تھی کہ ایک عرصے تک وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر
نہ ہو سکیں اگر رسول اللہ صلعم واقعی نفسانی جذبے سے متاثر ہوتے تو ان کو جوان اور حسین
خاتونیں عقد کے لئے نہ مل سکتی تھیں؟ عرب میں اس وقت کونسی عورت اس شرف سے
انکار کر سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف بیوہ اور سن عورتوں سے شادی کی۔
اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات پر نگاہ کریں جو رسول اللہ صلعم کے ازواج کے ساتھ تھے
تو یہ مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس پرست انسان
آزادی فکر اور آزادی عمل کھو بیٹھتا ہے اور عورتوں کی خواہشات کا پابند ہو جاتا ہے
وہ جو کچھ حکم دیتی ہیں اس کی تعمیل اسے اپنی فطری کمزوری کی بنا پر لازمی طور پر کرنی پڑتی
ہے۔ برخلاف اس کے رسول اللہ صلعم کی شخصیت کا اثر ان کی ازواج پر بہت زیادہ
نمایاں نظر آتا ہے۔ ان خاتونوں کو جن میں سے اکثر ناز و نعم کی خوگر تھیں آپ نے سادہ
اور بے لذت زندگی کا عادی بنایا اور جب انہیں سے بعض نے زیادہ آرام سے زندگی بسر
کرنے کی خواہش کی تو آپ نے ان سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ کیا وہ انسان بھی جو
اپنے جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کبھی ایسا کر سکتا ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اتنی تعداد میں عقد کیوں کئے۔ یہ
بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ عرب میں تعدد ازدواج عام طور پر رائج تھا اور اسے
بالکل معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی تعلقات کی توسیع اور حلفا پیدا کرنے کا بہترین طریقہ
یہی تھا کہ دوسرے خاندان میں شادی کیجائے۔ بعض اوقات اگر کسی بیوہ کی کفالت
منظور ہوتی تھی تو اس سے عقد کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے جو عقد کئے ان میں یہی
مصالح پیش نظر تھے اور آپ کی اکثر ازواج ایسی خاتونیں تھیں جو اپنے سابق شوہروں
کے انتقال کے بعد کفالت کی مستحق تھیں اور ان کی دلجوئی کی بہترین صورت یہی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خود اپنے عقد میں لے لیں۔ کبھی مغلوب قبیلے کا درجہ
بلند کرنے کے لئے بھی رسول اللہ نے اس قبیلے میں عقد کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین
جویریہ سے اسی مصلحت سے عقد کیا تھا اور اس کا نتیجہ ہوا کہ انکا تمام خاندان آزاد ہو گ
اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعثت کے بعد جتنے نکاح کئے
ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مصلحت ضرور تھی اور ان کا محرک ہرگز کوئی ادنے جذ
نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ جب تحدید تعداد کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلعم اس سے مستثنی
کیوں ٹھیرے اس میں بھی بے شمار مصالح ہیں اور ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ
اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے کہ اگر ایک طرف آپ کے لئے یہ رخصت ت
کہ چار سے زائد بیبیوں کو علحدہ نہ کریں تو دوسری طرف یہ سخت قید تھی کہ آپ کسی حا
میں اس کے بعد کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام مسلمانوں کو تو یہ اجازت
کہ اگر چار کی تعداد میں کمی ہو اور وہ چاہیں تو شرائط کی پابندی کے ساتھ اس تعداد کو پ
کر سکتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کسی حالت میں بھی کوئی عقد نہ کر سکتے تھے خواہ تعداد
کتنی ہی کمی نہ واقع ہو۔ جدید عقد کی اجازت ختم ہو جانے کی تو یہ وجہ معلوم ہوتی ہے
جن مصالح کی بنا پر آپ عقد کرتے تھے وہ اب مکمل ہو چکے تھے یعنی اسلامی جماعت
بنیاد خدا کے فضل و کرم سے بہت مستحکم ہو گئی تھی اور مصاہرت کے ذریعے سے ک
نئے قبیلے کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت نہ رہی تھی اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ا
ازواج کو علحدہ نہ کرنے میں بھی کوئی اعلےٰ مصلحت ہو گی اور اس میں ذاتی جذ
کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس موقعے پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسی زمان
یہ حکم نازل ہوا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے کوئی ا
عقد نہیں کر سکتا تھا اور انہیں امہات المومنین کا درجہ دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے

اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم بھی رسول اللہ کے کسی ذاتی جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے اخلاق عادات اور انکی تعلیمات کی حامل اور انکا صحیح نمونہ تھیں۔ پھر آپ کے بعد ان کو کسی دوسری ہستی کا پابند نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ آزاد رہکر اس فیض کو جو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا عامۃ المسلمین تک پہنچانا چاہیئے تھا اور اسی لئے ان کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس حکم کی موجودگی میں اگر رسول اللہ صلعم علاوہ چار کے باقی ازواج کو علیحدہ کر دیتے تو ان کی کسقدر حق تلفی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت سے محرومی ان کے لئے کس قدر باعث تکلیف ہوتی۔ یہ تھی مصلحت اس استثنا کی ورنہ حقیقۃً معترضین کے باطل توہمات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بھلا وہ انسان جو ترک لذات دنیوی کی بہترین مثال ہو اور جسے خلق خدا کی ہدایت تفویض ہوئی ہو کبھی ایسے جذبات سے مغلوب ہوسکتا ہے جو تمام انسانی خوبیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی ہیں۔

یہ چار بڑے اعتراضات تھے جو مستشرقین عام طور پر سیرۃ رسول اللہ صلعم پر وارد کرتے ہیں اور انہی سے اس مقدمے میں مختصر طور پر بحث کی گئی ہے۔ ارادتاً تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے کہ مقدمے کے از حد طویل ہوجانے کا خطرہ تھا۔ ہر بحث میں اصولی مسائل کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مقدمہ نگار کو اپنی خامیوں کا کماحقہ علم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمے، مقدمے اور حواشی میں بہت سے نقائص ہوں گے۔ اہل نظر سے امید ہے کہ وہ ان سے ہرگز چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ ان کو ظاہر کر دیں گے اس لئے کہ اس طرح قارئین بھی غلط فہمیوں سے محفوظ رہیں گے اور خود مولف کو بھی اپنی غلطیوں کا علم ہوجائے گا۔ صحیح تنقید علم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یہاں پر میں اپنے مکرم استاذ مولنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ تھوڑا سا علم عربی ادب اور اسلامیات کا حاصل ہوا ہے وہ انہیں کے فیض سے حاصل ہوا ہے اور یہ تالیف بھی اگر وہ پوری مدون نہ کرتے تو کبھی تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی ہدایتوں اور مشوروں سے مجھے سرفراز فرمایا۔

عبدالعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۴ / اپریل ۱۹۲۹ء

رائنر ماریا رِلکے[1]

رائنر ماریا رِلکے ایک سال سے اوپر ہوئے آیا دنیا سے اُٹھ گیا۔ ہندوستان میں اس نام سے آج کون واقف ہے؟ کوئی نہیں۔ لیکن رِلکے جرمنی کے غنائی شعراء کا بادشاہ تھا اور گو آجکل کے نقادانِ سخن میں سے اکثر شتفان گیارگے کو شوکت کلام اور پختگی سخن کی بنا پر رِلکے سے بہتر جانتے ہیں لیکن وہ زمانہ آئے گا اور ضرور آئے گا جبکہ ذوق و غالب کی طرح ان دونو کے مراتب بھی اپنی صحیح روشنی میں نمایاں ہونگے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ گیارگے حقیقی معنوں میں جرمن شاعر ہے اور گوئٹے کا وارث اگر کوئی قرار پا سکتا ہے تو وہ گیارگے ہے۔ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ گزشتہ سال گیارگے کو جرمنی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایک کثیر رقم نذر کی گئی۔ رِلکے کا کلام قومی طرز ادا سے الگ اور بالاتر ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رِلکے یورپ کا پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے راز کو سمجھا ہے اور اس طرح پر نہیں کہ اس پر فارسی یا عام طور پر مشرقی شاعری کا اثر ہوا ہو یا زمانہ متوسطہ کی شاعری میں جو کوششیں اکثر نصرانی شعراء نے تصوف کے میدان میں کی ہیں اُن کا اِس پر کوئی صریحی اثر پڑا ہو۔ مادیت کے آخری زینوں پر پہنچکر انسان کی روح اپنی خودشکستی و خود فراموشی سے پراگندہ و پریشان ہو جاتی ہے اور بے قرار ہوکر رِلکے کے قلم و زبان سے آشکار ہوتی ہے۔ اور یہی راز ہے رِلکے کی روحانی شاعری کی کامیابی کا۔ انسان غلامانہ تقلید سے کوئی بڑی چیز کبھی حاصل نہیں کر سکتا آدھی صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود ہندوستان کی کسی زبان نے ایک ناول بھی

---

[1] Rainer Maria Rilke

[2] Stefan George

ایسا پیدا نہیں کیا جس پر کوئی سخن سنج فخر کر سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول نویسی ہندوستان کے ادبیات کے ارتقا کا ہنوز تقاضا نہیں اور انگریز ناول نویسوں کے غیر آہنگ تتبع سے ایک ایسی دوغلی چیز پیدا ہوئی ہے جس کو نہ ناول کہہ سکتے ہیں نہ فسانہ اور نہ جس کی ان دونوں حیثیتوں سے جداگانہ طور پر بھی بین الاقوامی معیار نظر سے کوئی وقعت ہو سکتی ہے محض ارتقائے فطری سے جو شے دستیاب ہوتی ہے وہ ایک واقعی اَوَّلِیْ حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ گوئٹے کے دیوانِ مغربی[1] نے جو اُس نے فارسی دواوین کے تتبع میں نظم کیا ہے بہت کچھ شہرت حاصل کی۔ گو ہم اُس کو ادبی تجربہ کی حیثیت سے ایک دلچسپ چیز مان لیں لیکن نہ تو اس میں سعدیؔ و حافظؔ کے تغزل کا پتہ ہے نہ اُن کے تصوف کی شان اور ان کی چاشنیٔ کلام سے اس کو کوئی واسطہ۔ ہائینے[2] اکثر ہندوستان کے جذبہ فروش[3] طبائع کو بہت بھاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہائینے کے یہاں ہم کو مشرقی تغزل کی بہت کچھ جھلک نظر آتی ہے لیکن اس بنا پر کہ انسان اس طرز تغزل کا مقابلہ فارسی تغزل سے کئے بغیر نہیں رہتا ہائینے کا کلام اُس شخص کی نظروں میں بہت کم جچتا ہے جو فارسی تغزل کی نیرنگیوں سے آشنا ہے۔ برخلاف انکے رلکے کی شاعری اور شعریت کو فارسی اثرات سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا طرز ادا فارسی اور اُردو کے شعراء سے اس قدر جداگانہ ہے کہ موازنہ کا اصلا خیال نہیں گزرتا۔ لیکن باوجود طرز ادا میں انتہائی اختلاف کے ہم رلکے کے یہاں میرؔ کا درد پائینگے، تو دردؔ کا تصوف، انیسؔ کے نوحے کی شان تو غالبؔ کا علو خیال۔ اور جہاں تک شیرینیٔ زبان کا تعلق ہے حافظؔ شیرازی کے سوا اس کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ نبات ہے لیکن اس کے لفظوں میں

---

[1] West-Östlicher Diwan

[2] Heine

[3] جذبہ فروش سے میری مراد Sentimental ہے۔

نبات کی سی ارزانی نہیں ۔ اِس کا علوِ خیال اِس کے الفاظ کی شیرینی کو بے وقار ہونے نہیں دیتا اور اس کو ارزانی احساسات سے محفوظ رکھتا ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کلام کا ترجمہ اردو میں اُسی قدر ناممکن ہے جس قدر حافظ یا سعدی کا ترجمہ جرمن یا انگریزی میں ۔ لیکن میں حتی الامکان اس کے کلام کی ایک تھوڑی سی جھلک دکھانے کی خاطر اس کی دو مختصر نظموں کا ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں ۔ کوشش میری یہ رہی ہے کہ اس کے الفاظ کا اگر کہیں ترجمہ ممکن نہ ہو تو نہ سہی لیکن اس کے خیال اور طرزِ ادا کی ترجمانی ہو جائے اور اس کی نظم کی نوعیت میں حتی الوسع فرق نہ آنے پائے ۔ اُمید ہے کہ ناظرین پر ترجمہ کا طرز اگر گراں گزرے تو میری ناداری سمجھیں اور شاعر کے کلام کی پستی پر محمول نہ کریں ۔

اِن ترجموں کو پیش کرنے سے بیشتر رِلکے کے متعلق چند ایسی باتیں بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں جن سے کلام کو پوری طرح سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں آسانی ہو ۔ رِلکے صریحاً یورپ کے دورِ جدید کا شاعر ہے اور نیچر پرستی[1] کے خلاف جو ردِ عمل اواخر اُنیسویں صدی عیسوی سے وہاں کے فنونِ لطیفہ میں اکسپرشنزم[2] کی تحریک کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اُسکا اس پر نہایت درجہ اثر ہوا ہے ، گو ہم اس کو مخصوص طور پر اکسپرشنی شاعر نہیں کہہ سکتے ۔ وہ ذرّے ذرّے اور قطرے قطرے میں انسان کی روح کا متلاشی ہے اور خود انسان کی روح کا اظہار ہمیشہ سلجھے ہوئے جملوں اور صاف الفاظ میں نہیں کرتا بلکہ اکثر اپنی کج مج زبانی سے وہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو الفاظ ناطق و صریح سے ممکن نہیں ۔ رِلکے روحِ انسان کے رنگ و روپ کو حتی الامکان بے نقاب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ عام فہم الفاظ میں ایک بات کہتے کہتے کچھ کھو سا جاتا ہے اور دماغ بلا ارادہ جہاں اس کو لے جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن

---

[1] Naturalism

[2] Expressionism

حسن کلام کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اکثر نظموں میں وہ ایک شخص خاص کی ایک وقت خاص میں
پوری پوری دماغی کیفیت کا خاکہ کھینچتا ہے جو اس طور پر ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر اُس کے جذ
مرکزی اور خیالات ارادی کو نظم کر دے۔ کچھ تو وہ جان بوجھ کر کرتا ہے اور کچھ بے خبری کے
عالم میں اور دورانِ کیف میں جو اکثر متعلق و غیر متعلق احساسات و ائتلافات[لہ] دماغ میں گزرے
ہیں اُن کو بھی قلمبند کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہی اس امر کا باعث
ہیں کہ وہ غالب کی طرح مقبول عام ہونے سے قاصر ہے اور رہیگا گو جہاں تک زبان کا تعلق
ہے رلکے کا کلام نہایت سادہ اور سہل ہے۔ ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ رلکے کی شاعری
نہایت درجہ انفرادی ہے۔ اس کا "ترانۂ گدا" ہر گداگر کی فریاد نہیں بلکہ اسکے "گدا" میں
خود اسی کا سراپا نظر آتا ہے یعنی اگر رلکے خود محتاج ہو کر در در بھیک مانگتا تو اُس کے احساسات وہ
ہوتے جو اُس نے اِس ترانے میں نظم کئے ہیں۔ اسی طرح اس کی "فریاد" ہر نا اُمید کی
فریاد نہیں بلکہ خود اُس کی نا اُمیدی کی فریاد ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہو گا کہ اس کے چشموں میں
اس کے تالابوں میں، اس کے پرندوں میں، اس کے پردہ ہائے ساز میں، اس کے
میں، اِس کی ام المسیح میں، اس کے ہر ہر ذرہ اور ہر ہر آفتاب میں ہم اسی کی روح
پائیں گے۔

کس قدر انوکھی معلوم ہوگی یہ شخصیت ہندوستان کے رہنے والوں کو جو سالہا سال سے
ورڈس ورتھ، ٹے نی سن، اور انگلستان کے اور بے شمار شاعروں کی فطرت پرست ہستیو
سے دو چار رہے ہیں اور اُن کے اتباع میں کوشاں ہیں۔

بڑی چیز تھا رلکے۔ افسوس دنیا سے چل بسا گو ابھی اُس کے مرنے کے دن نہ
یورپ کے باشندوں کے لئے پچاس برس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ خدا مغفرت کر

Associations لہ

ترانۂ گدا[1]

دروازے دروازے پھرنا۔
صدائیں دینا۔
آندھی میں، پانی میں، چلچلاتی دھوپ میں۔
اکبارگی تھک کر کہیں بیٹھ جانا۔
کسی کونے میں، کسی چوکھٹ پر۔
اپنا داہنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا، اور چلّانا۔
چلّانا، چلّانا، چلّانا۔

اور پھر۔
مجھکو خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے۔
پھر مجھکو نہیں معلوم ہوتا کہ یاالٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّاتا ہے۔
میں یا کوئی اور۔

---

[1] Das Lied des Bettlers کا ترجمہ "فقیر کی صدا" یا "سائیں کی صدا" میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اوّل تو یورپ میں صدا دیکر بھیک مانگنے کا طریقہ نہیں دوسرے شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا گدا گر اپنے ان شاعرانہ خیالات کو چند فلوس سیاہ کے بدلے در در فروخت کرتا پھرتا ہے بلکہ جب وہ تھک کر کسی کونے میں کسی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور چلاتے چلاتے اپنی بے خودی فریاد سے ذرا بیدار ہوتا ہے تو اُس کے خیالات و احساسات وہ کچھ ہوتے ہیں جو اس ترانے میں ادا کئے گئے ہیں۔

ماخوذ از "دس بوخ در بلدر" (تصویروں کی کتاب)۔ ان نظموں کو نثر منظوم (Prose poem) کے قبیل سے سمجھنا چاہئے اور بلینک ورس کی طرح پڑھنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔

مَیں چلاتا ہوں تو ایک ذرا سی چیز کے لئے۔
لیکن شاعر۔
ایک جلوۂ عالم خیال کی خاطر۔
اور، آخر کار۔
میں اپنا چہرہ اپنی دونو آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں۔
اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں۔
جس میں اُسکی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔
ہاں!
یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے۔
کہ مجھ آذت نصیب کے سر کو۔
تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز دور اور بے بود سی ہے۔
اور مدت کی گزری ہوئی سی ——
شاید وہ ستارہ
جس پر میرے کسب نور کا انحصار ہے
ہزار ہا سال ہوئے مر چکا ہے ——
شاید اس کشتی میں
جو ابھی اِدھر سے گزری
کسی نے کسی سے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی ——

گھر میں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی ......
کس گھر میں ؟......
الہٰی توبہ !
جی چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکلکر کہیں بھاگ جاتا
فضائے آسمان میں قرار لیتا ۔
جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا ۔
اور !
ستاروں میں سے ایک
شاید اب تک برقرار ہو'
جی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے
(ان میں سے) کون، یکہ و تنہا،
ہنوز آشنائے حیات ہے،
کون ایک شہر نور کی طرح
شعاعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے۔

اقبال کا شعر ہے ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

یہاں ہم ایک آشنائے سجود کی جبین سجدہ خو کو شوق شہود میں مبتلا پاتے ہیں۔ رلکے کی اس نظم میں جس کا ترجمے نے صریحاً خون کر دیا ہے ہم کو ایک مغربی شاعر جسے معشوق ازلی کی بے نیازیہائے بیجا کا دماغ نہیں، نشۂ الست سے لاچار، تلاش حق میں آلام نفسی سے مجبور، اپنے مادی ماحول سے پراگندہ و پریشان ہو کر انتہائی اضطراب اور اضطرار کے

ساتھ یک بیک شوق سجود سے مغلوب نظر آتا ہے۔
"جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا"
اب خدا جانے اس پردۂ زنگار کے پیچھے "نہیں" کے سوا اگر کوئی ہے تو اس کو ان دونو چیزوں میں سے کون سی زیادہ بھاتی ہے، جبینِ سجدہ خو یا جبینِ سجدہ جو۔

شخصیت اور تاریخ

پروفیسر فریڈرش مائینکے آج کل جرمنی میں تاریخ اور فلسفۂ سیاسیات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مضمون اُن کے ایک مشہور خطبے سے ماخوذ ہے جس کا محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل میں یہ خطبہ پروفیسر مائینکے نے مرکزی ادارہ تعلیمات برلن کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اُس کے بعد یہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا۔

جب میں نے آج کے خطبے کے لئے یہ مضمون منتخب کیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسے فن تعلیم کے عملی مسائل پر منطبق کرنے میں، جو اس کا اصلی مقصد سمجھا جاتا ہے، مجھے توقع سے کم کامیابی ہوگی۔ لیکن یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ اُن مسائل تک پہنچتا ہے جو نہ صرف مورخوں کے لئے بلکہ شخصیت کے سبھی قدردانوں کے لئے دلچسپ ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر تقریر کرنے کی تجویز اس لئے اور بھی پسند آئی کہ اس پر آشوب زمانے میں ہمیں جس شدید کشمکش اور سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا اُس کے سبب سے یقیناً ہمارے دلوں میں مشاہدۂ نفس اور ضبطِ نفس کی گہری آرزو تازہ ہوگئی ہوگی۔

اصل مسئلہ جس پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ تاریخ شخصیت کی تشکیل میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کی تعلیم دینے کے اصول اور طریقہ پر اس بحث کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے دل میں سوچنا چاہئے کہ آخر یہ شخصیت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور منشا کیا ہے؟ گوئٹے کا قول اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے کہ شخصیت ہم ابنائے ارض کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور جب ہم مکروہات زندگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو یہ الفاظ مژدۂ جانفزا بنکر چپکے سے ہمارے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ مگر یہ مژدہ ایک طرح

مطالبہ بھی ہے۔ یہ ہم سے اس کا طالب ہے کہ باہر سے جتنے اثرات ہمارے جذبات اور ہماری قوتِ عمل پر پڑتے ہوں اُن سب کے نرغے میں ہم اپنی اندرونی سیرت کو استوار رکھیں اور خارجی اور داخلی زندگی کے درمیان ایک حد قائم رکھیں جس کی حفاظت کرنا ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے۔ اس حد بندی سے یہ مراد نہیں کہ داخلی زندگی کسی آہنی کٹھرے میں مقید کر دی جائے بلکہ یہ منشا ہے کہ خارجی دنیا سے اس کے تعلقات ضابطے اور اصول کے ماتحت رکھے جائیں۔ اس حریم باطن میں آنے جانے کی راہیں ہوں لیکن وہ بیرونی زندگی کے شور و شر سے محفوظ ایسی جگہ ہو جہاں ہم دلجمعی سے اپنے نفس کا مشاہدہ کر سکیں، اپنی قوتوں کو مجتمع کر سکیں اور ان سے خارجی زندگی میں کام لے سکیں۔ مختصر یہ کہ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہو لیکن بڑی دنیا سے وابستہ ہو، اپنا الگ اور مخصوص رنگ رکھتی ہو لیکن اس کی ترکیب انھیں زندگی کی عام قوتوں سے ہوئی ہو؛ سب سے آزاد بھی ہو اور کل کی پابند بھی۔ علاوہ ان باتوں کے یہ ان سب حقیقی اور زندہ کیفیات پر حاوی ہو جن کے وجود میں علمیاتی تنقید سے کسی طرح کا شبہ نہ پیدا ہو سکے۔ یہ چیز کیا ہے؟ ایک نفس جسے اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ یہ جیتی جاگتی کرامت ہمیں مبدا ر فیاض نے عطا کی ہے۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ ہم اس نفس خام سے شخصیت کی تعمیر کریں اور یوں اپنی ذات کو فطرت محض کی سطح سے بلند کریں لیکن اس کرامت کے لئے خود ہماری سعی کی ضرورت ہے۔ جب انسان کو اس دُہری کرامت کا شعور ہوتا ہے تب اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی شخصیت زمین والوں کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔ فطرت نے زندگی کی اور جتنی صورتیں پیدا کی ہیں اُن سب کو ایک معینہ سلسلۂ نشو و نما کا پابند کر دیا ہے مگر صرف انسان کے لئے اُس نے یہ امکان رکھا ہے کہ اس زنجیر کو ڈھیلا کر دے، روحانی آزادی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے اور اس دنیا میں آزادی کا سب سے برتر ثمرہ یعنی ایک مخصوص اور ناقابلِ تقلید سیرت حاصل کرے مگر اس طرح کہ مجموعی زندگی سے اُس کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ انسان نہ تو بالکل تنہائی میں خوش رہ سکتا ہے اور نہ

اپنے آپ کو اپنے ماحول میں محو کر کے۔ اگر انسان حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس پر لازم ہے کہ انفرادی آزادی میں مجموعی تمدنی زندگی کا پابند رہے اور اجتماعی پابندی میں اپنی شخصی آزادی اور اپنی مخصوص سیرت کو محفوظ رکھے۔ یہی شخصیت اور عالم خارجی کا تعلق ہر معقول اور قابل زندگی سیاسی اور سماجی دستور کی بنیاد ہے۔ یہی فرد اور جماعت نفس اور ماحول کا باہمی تعامل اور اُن کی باہمی کشمکش تاریخی زندگی کا لب لباب ہے۔

یہی دونوں مسائل ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہے: ایک تو یہ کہ شخصیت کی اہمیت عالم تاریخ کے لئے کیا ہے اور دوسرے یہ کہ عالم تاریخ کا اثر شخصیت کی تشکیل پر کیا پڑتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اب تک دوسرے مسئلے کے مقابلے میں پہلے مسئلے پر زیادہ کثرت سے اور زیادہ دلچسپ طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا مسئلہ دوسرے سے زیادہ اہم ہے؟ کیا اس میں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ کل قدر و قیمت کا حامل فرد ہے؟ کیا ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم عالم تاریخ کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ اُس میں اشخاص کی جدوجہد کو کہاں تک دخل ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے لوگوں میں جو تاریخی روح سرایت کر گئی تھی اور اس دور کی تاریخی زندگی کے موضوع کو جو وسعت حاصل ہوئی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مسئلے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ عینیت پسند فلسفہ کی تحریک میں ابتدا سے انتہا تک شخصیت ہی مدنظر رہی اور کانٹ اور فشٹے کی تصانیف میں فرد کی اخلاقی آزادی کے مسئلہ پر زیادہ زور دیا گیا۔ لیکن ہیگل کی تصانیف میں مجموعی تاریخی زندگی کو جو افراد کو چار و ناچار اپنے دھارے میں بہائے جاتی ہے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی پھر جب جدید علم تاریخ کی بنیاد پڑی اور جمہور کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تو اجتماعیت اور انفرادیت میں ازسرنو جنگ چھڑ گئی۔ اجتماعیت اُس کی رفیق ثبوتیت اور نئے علم اجتماعیات کی بنیاد اس پر تھی کہ جماعت فرد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ تاریخی انفرادیت اور اُس کی مؤید فلسفیانہ تحریک نے بجائے جارحانہ طرز عمل کے مدافعت اختیار کی اور اسی کے ساتھ ایمانداری

سے یہ کوشش کی کہ اجتماعیت پسندوں کے اصولوں میں جو معقول باتیں ہوں اُن کی سچائی کا اعتراف کرے۔ اس طرح تاریخ پر اجتماعیت چھا گئی اور چونکہ مجموعی تاریخی زندگی کے اثرات نے فرد کو ہر طرف سے دبالیا اس لئے یہ سوال آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا کہ عالم تاریخ کا فرد کی آزاد اور مخصوص سیرت کی تربیت میں کیا منشا اور مقصد ہے۔ اس کا اندیشہ تھا کہ فرد کی اہمیت بالکل نہ رہے گی اور وہ بجائے ایک مستقل مقصد ہونے کے مجموعی زندگی کا ایک ذریعہ بن کے رہ جائے گا۔ اس طرح شخصیت اور عالم تاریخ میں جو تعلقات پیدا ہوئے اُن پر بھی ہم نظر ڈالیں گے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ یہ دونوں سوال یعنی تاریخ کے لئے شخصیت کی اہمیت اور شخصیت کے لئے تاریخ کی اہمیت کیا ہے، ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو ایک سوال کا جواب ہوگا اُس کا اثر دوسرے سوال کے جواب پر بھی پڑے گا۔ جو لوگ تاریخ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتے تھے وہ زیادہ تر اس وجہ سے ایسا کرتے تھے کہ انہیں تاریخی زندگی کا بہت گہرا اثر خود اپنی ذات پر محسوس ہوتا تھا۔ انہیں اس مسئلہ سے علمی اور اخلاقی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی تھی اسلئے انہوں نے اسے بالکل نظری رنگ دے دیا۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس سوال کو اس کی اصلی صورت میں پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ اجتماعیت اور انفرادیت سے ہمارے موضوع بحث کے لئے کیا نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

اجتماعیت کی انتہائی شکل اصل میں فرد کو محض مختلف اجتماعی قوتوں کا جولانگاہ سمجھتی ہے۔ اُس کے خیال میں جماعتوں کے عظیم الشان مستقل نظام، اُن کے رسوم اور اُن کے خیالات فرد پر حاوی ہوتے ہیں جو فطری طور پر قدامت پسند اور سست ہوتا ہے اور جسے فطرت نے گلوں میں رہنے والے جانوروں کی سی طبیعت عطا کی ہے۔ اس لئے ترقی اور تجدید اشخاص کی بدولت نہیں ہوتی بلکہ حالات زندگی کے بدل جانے سے خود بخود ہوتی ہے۔ افراد جو بظاہر تجدید کے بانی ہوتے ہیں اصل میں محض عام حالات اور

رجحانات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لئے عالم تاریخ جو قدیم آئین و دستور اور زندگی کی قوتوں کا حامل ہے، عملی حیثیت سے بیشک افراد پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے بلکہ اُن پر بالکل چھاجاتا ہے لیکن انہیں اس کا موقع نہیں دیتا کہ ان کی مخصوص سیرتیں نشوونما پاسکیں۔ جو چیز بظاہر آزاد اور جداگانہ شخصیت معلوم ہوتی ہے وہ اصل میں ماحول کے اثرات سے تعمیر پاتی ہے اور اس کی تعمیر میں جتنا مسالہ لگتا ہے سب کا سب خارجی دنیا سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر فرد کے یہاں اس مسالہ کی ترتیب مخصوص اور انوکھی ہوتی ہے لیکن محض اس حد تک جیسے "کلائڈ اسکوپ" یا نیرنگی شیشے میں ہر لمحے رنگوں کا ایک نیا نقشہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ کا نظری مطالعہ یعنی زمانہ ماضی کی تحقیق اور مشاہدہ اجتماعیت پسندوں کے نزدیک ارباب فکر پر یہ حقیقت ثابت کر دیتا ہے کہ انسان اسی معمولی آب و گل سے بنا ہے اور اس نے عادت کی گود میں پرورش پائی ہے۔

———=|=———

"اشتراک"

کسی گزشتہ اشاعت میں ہم نے اشتراک اور اسکی مختلف قسموں کی تعریف کی تھی۔ لیکن ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ تعریفیں صرف اشتراک کے معاشی مقاصد کو، خصوصاً املاک کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھیں۔ اور یہ اس لئے کہ قیاس و رائے کی بے ترتیبیوں میں کچھ ترتیب پیدا کی جا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے وسیع معنوں میں اشتراک محض نظام املاک کی کسی مخصوص شکل سے عبارت نہیں۔ یہ تو حیات اجتماعی کے سب شعبوں اور تمام اداروں پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے جس پر جماعت کی زندگی کی ساری عمارت کھڑی کرنی ہے، ایک ذہنیت جو مذہب و اخلاق، معیشت و آئین، فنون و صنعت، غرض تمدنی زندگی کے ہر گوشہ میں جلوہ گری کے لئے بیتاب ہے۔

جماعتی زندگی پر نظر ڈالئے تو جماعت بندی کی مختلف شکلیں نظر آئینگی۔ کہیں اسکی بنیاد معاہدہ پر ہوگی، کہیں باہمی ہمدردی پر، کہیں روایات، پر کہیں قانون پر، کہیں آزادی پر کہیں جبر پر، لیکن ان مختلف شکلوں کی تہ میں ہمیشہ تین اصولوں میں سے کسی ایک یا کئی کی کارفرمائی دکھلائی دیگی۔ یعنی طاقت، محبت، عقل ــــ جب جماعتی زندگی میں انسان کے فطری رجحانات، اور قدرتی محرکات کو اپنا اثر پیدا کرنے کا موقع ہوتا ہے اور حیاتِ اجتماعی میں مدارج و مراتب کی تقسیم افراد یا گروہوں کی جسمانی یا ذہنی یا روحانی بلندی و پستی کی بنا پر ہوتی ہے تو اُس وقت طاقت کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یہ طاقت چاہے جسمانی ہو، چاہے عقلی و ذہنی۔ "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" یا "جس کی بُدھی اُس کی بھینس" یہ دونوں اصول طاقت کی شکلیں ہیں۔ اِس اصول کے ماتحت

جماعت میں پستی وبلندی کی ترتیب طاقت کی تقسیم کی بنا پر ہوتی ہے۔

لیکن جب فطری وقدرتی طاقتوں یا صلاحیتوں کو من مانی شکلیں اختیار کرنے سے روکا جائے اور جماعت کی شیرازہ بندی افراد سے بالاتر اصولوں کے ماتحت کی جائے تو اُس وقت جماعت بندی کو عقلی اصول کا پابند کہیں گے۔ اِس میں یہ نہ ہوگا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ کمزور پر حاوی ہو جائے، یا جس کے پاس دولت ہے وہ مفلس پر، جس کے پاس علم ہے وہ جاہل پر تفوق حاصل کرے۔ بلکہ مثلاً اس قدرتی فرق مراتب سے قطع نظر یہ اصول بنایا جائے کہ دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیئے، علم سے سب کو بہرہ یاب ہونا چاہیئے، توانا اور ناتوان کا فرق مٹانا چاہیئے وغیرہ وغیرہ تو اس وقت حیاتِ اجتماعی مقررہ اصولوں کے تحت میں آجاتی ہے اور اس پر عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

پھر انسانوں کی بعض جماعتیں ایسی بھی بنتی ہیں کہ نہ اُن میں طاقت کا تفوق ہوتا ہے نہ اصولوں کی فرمانروائی بلکہ دوست دوست کو "رشتہ درگردن" جدھر چاہتا ہے کھینچتا ہے۔ عقل یہاں لاچار ہوتی ہے اور طاقت بے بس۔ عقل اور اس کے خود ساختہ اصول یہاں دفتر بے معنی بن جاتے ہیں، یہاں توانا ناتوان کے آگے اور عالم اُمّی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اور سب شاید اپنے مشترک خالق کی وحدت کے پرتو سے ہزار قالب لیکن یک جان ہو جاتے ہیں۔ ان جماعتوں کا اصول بنیادی محبت ہوتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اشتراک کا مجوزہ نظام جماعتی موجودہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت میں پیدا ہوا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں عجیب بات یہ ہے کہ اِس میں جماعت بندی کے مذکورہ بالا تینوں اصول کارفرما ہیں۔ اِس میں زیادہ تر تو وہی طاقت کا اصول ہے، یعنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس یا جس کی دولت اُس کی بھینس۔ یہی وہ اصول ہے جو چند ہزار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کروڑوں محنت کش مزدوروں کے جسم داورانکی

روحیں !) دیدیتا ہے۔ اور دولت و اقتدار کے سامنے اسی کی وجہ سے اخلاق و مذہب، انصاف و عدل کے تمام اصول ماند پڑ جاتے ہیں لیکن ہر چند کہ زیادہ اثر اس نظام میں طاقت کے فطری اصول ہی کا ہے تاہم یہ نہیں کہ دوسرے اصول بالکل کارفرما نہ ہوں، سرمایہ داری نے اپنے نظام کا ایک گوشہ کو تمامتر اصولِ عقلی کے زیر فرمان بھی کر دیا ہے۔ اور وہ کاروباری زندگی کا گوشہ ہے۔ سرمایہ دار اپنا تسلط بھی قائم کرنا چاہتا ہے؛ غیر عقلی آرزوؤں کا شکار بھی ہوتا ہے لیکن منافع کے اصول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں بہی کھاتہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ پھر زندگی کے بعض حصے سرمایہ داری کے نظام میں محبت کے اصول کے لئے بھی وقف ہیں مثلاً خاندانی زندگی سے ابھی اس مقدس اصول کو خارج نہیں کیا گیا ہے۔ یا قومی جنگوں کے وقت اب بھی اس کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں اور محرکات کی اس بوقلمونی کے مقابلہ میں اشتراک صرف ایک اصول کی حکومت چاہتا ہے۔ عقل کی! سرمایہ داری نے کاروباری زندگی کے جس گوشہ میں عقل کو فرمانروا بنایا تھا اشتراک اس پر قانع نہیں اور وہ زندگی کے سب شعبوں کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ طاقت و اقتدار کے اصول کو حرام جانتا ہے اور محبت کے دعاوی کو حرف غلط سمجھتا ہے۔ اسکی صدا ہے عقل، عقل، عقل!

⁂

یہ اصولِ اعلیٰ جس کے مطابق معاشرتی زندگی کو ترتیب دیا جاتا ہے مختلف لوگ جدا جدا طریق پر نکالتے اور بناتے ہیں۔ کسی کے لئے ان کا مخرج وحی و تنزیل کا سرچشمہ ہوتا ہے، کوئی فلسفہ سے یہ اصول نکالتا ہے، کوئی تجربہ سے۔ چنانچہ ان اختلافات کی وجہ سے اشتراک بھی ایک قسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد اقسام ذہنی اور عملی دنیا کے سامنے پیش ہو چکی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جس مذہب اشتراک نے فروغ پایا ہے وہ وہ اشتراک

ہے جس کی تعلیم مدون شکل میں مارکس اور اُس کے دوست انگلس نے دنیا کے سامنے پیش کی ۔ زمانۂ حال میں سرمایہ داری کے خلاف جو رد عمل ہوا اور ہر ملک میں مزدوروں اور ناداروں کی جو تحریکیں اٹھیں اُس کی ذہنی ترجمانی اس جدید اشتراک نے کی ۔ اور چونکہ یہ تحریکیں خود موجودہ نظام جماعت کی بنیادی خامیوں کے باعث ناگزیر تھیں اسلئے اس ذہنی تعلیم نے بھی جس کا نام ہم "اشتراکِ جدید" رکھتے ہیں بہت فروغ پایا اور اشتراکی زندگی کے دوسرے نظام بالکل پس پشت پڑ گئے ۔ ان دوسرے نظاموں کو سمجھنا اس وقت محض تاریخی یا علمی دلچسپی کی چیز ہے ۔ لیکن "اشتراکِ جدید" کا فہم تو موجودہ دنیا کے اہم ترین مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ۔ ہم اس سلسلۂ مضامین میں اسی "اشتراک جدید" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے ۔

⁂

کسی چیز کو "سمجھنے" کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ آپ اس کے معنی و مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور متعلقات و زوائد کی الجھنوں میں سے اس کے بنیادی اصولوں کو نکالکر اس کی اصلی غرض و غایت کو اپنے سامنے لا سکتے ہیں ۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اُس کے منبع و مخرج کو معلوم کریں اور اُس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب و علل کو دیکھکر اس کی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ یا ایک صورت سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ اس چیز کے معنی اور اس کے اسباب کو جانکر آپ اسے بعض مقررہ معیاروں پر پرکھیں یعنی تنقیدی طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کریں ۔

اس مضمون میں ہم اشتراک کو اس کی اصل کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرینگے ہم اس جگہ اس ماحول کا مختصر سا تذکرہ ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں اشتراک کے مسلک نے جنم پایا ۔ اس کے بعد ان شخصیتوں کا حال بیان کریں گے جنکی کاوشوں نے اس ذہنی پودے کی آبیاری کی اور ان رائج الوقت تصورات و خیالات کا جھوا

نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا ۔ اور اس طرح مذہب اشتراک کی موجودہ شکل میں رونما ہونے کے اسباب تین حصوں میں ہمارے سامنے آجائیں گے یعنی جماعتی حالات، رائج الوقت تصورات اور بانیوں کی ذہنی کیفیات ۔

جماعتی حالات

اشتراک جدید کا مسلک مغربی تاریخ کے اُس عہد کی پیداوار ہے جبکہ قرون وسطیٰ کے قائم کردہ تمام جماعتی بندھن کٹ رہے تھے، تمام وہ جماعتی ادارے جن میں فرد پناہ لیتا تھا منتشر ہو رہے تھے، تمدنی زندگی کے معیار بدل رہے تھے، ایمان جارہا تھا، علم آرہا تھا، بندشوں کی جگہ آزادیوں اور یقین کی جگہ شک کو مل رہی تھی لیکن اس عام انتشار اور بند کشائی کے عہد میں خاص طور پر سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۴۰ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب مسلک اشتراکیت کے تیج یورپ کی ذہنی زمین میں بوئے گئے ۔ جن کی آبیاری نہایت کاوش کے ساتھ دو شخصوں نے سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۴۷ء تک کی یعنی مارکس اور انگلس نے ۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں جبکہ کمیونسٹ مینی فسٹو شائع ہوا ہے اشتراک کی کشت زار تیار تھی ۔ اور اس سال کے بعد کوئی نیا ذہنی پودا اس میں نہیں لگا ۔ صرف چمن بندی کے سلسلہ میں کچھ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی اس لئے ہمیں سنہ ۱۸۳۰ء اور سنہ ۱۸۵۰ء کے درمیان کے زمانہ کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے ۔

معاشی حالات

اس زمانہ کی معاشی حالت میں سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ سرمایہ داری کا نظام کچھ عرصہ سے اپنے مدارج عروج پر پہونچ چکا تھا ۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں سب کے

سامنے آچکی تھیں۔ دنیا اس نئے دیو سے سہمی ہوئی تھی۔ اس کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں پر ہر ایک کی نظر پڑ رہی تھی۔ اس کی ریل پیل سے ہر کہ و مہ پریشان تھا اب یہ نہ تھا کہ معاشی اور جماعتی مسائل پر صرف ایوانِ حکومت میں بحث مباحثہ ہوتا ہو۔ ہر راہ چلتا اس نئی مصیبت کا احساس رکھتا تھا اور اس کا حل سوچتا تھا۔ اس زمانہ کی تصانیف کی فہرست اُٹھا کر دیکھو مغربی یورپ کے ہر ملک میں بے شمار سرکاری تحقیقاتوں کی رپورٹیں ملیں گی جس میں مزدوروں کی حالت پر بحث ہے۔ ہر ملک میں اسی موضوع پر اچھی بڑی بے تعداد کتابیں ملیں گی۔ انگلستان میں ۱۸۳۹ء میں کارلائل نے اپنی کتاب Chartism لکھی اور ۱۸۴۳ء میں Past + Present۔ ۱۸۴۴ء میں کنگسلے نے Village Sermons شائع کی، ۱۸۴۵ء میں دسرائیلی نے Sybill or the two Nations۔ فرانس اور جرمنی میں بھی کثرت سے تصانیف نکلیں۔ اس مسئلہ پر غور و بحث کے لئے ہر طرف انجمنیں قائم ہوئیں۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور لکھتے تھے کہ نئی صنعت نے خصوصاً ریل اور تار نے سارے جماعتی نظام کی شکل ہی بدل دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دار کے وجود اور اس کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ روز تغیر ہو روز تبدل۔ لوگوں نے پیدائش دولت کے طریقوں کی نت نئی تبدیلیوں کو محسوس کیا، ہر وقت کی بے عدم تیقّن و گھبراہٹ سے پریشان ہوئے، آدمی آدمی کے درمیان تمام قدیم رشتوں کے کٹنے اور صرف خود غرضی کے رشتہ کے باقی رہ جانے پر مرثیہ خوانی کی، نو دولتیوں کی بدتمیزیوں پر چلا اُٹھے لیکن سب سے زیادہ یہ زمانہ متاثر تھا افلاس و فلاکت کے اس منظر سے جو روز افزوں دولت و مرفہ الحالی کے دوش بدوش ابرِ غم کی طرح ملکوں کے ملکوں پر چھایا جا رہا تھا۔ اگر دیہاتوں میں زراعتی مزدوروں کی مصیبت تھی، تو صنعتی کام کرنے والوں پر بھی آبنی تھی۔ کھیتر بھی روتا تھا اور جولاہا بھی۔ کانوں کے علاقوں میں صنعت کو فروغ

تھا لیکن بے گھر بے در مزدوروں کی فوج میں انسانوں کے غول کے غول داخل ہوتے جاتے تھے، شہروں میں سربفلک عمارتیں بن رہی تھیں، لیکن جن کے خون کو پسینہ کرنے سے یہ سب کچھ ممکن ہوا تھا ان کی جسمانی و روحانی حالت ناگفتہ بہ تھی سختی سے کام لینے کی شرمناک سے شرمناک صورتیں موجود تھیں ۔ لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور یہ بھی کہ خود کام کی نوعیت بدل گئی، پہلے کام ہر مزدور کی شخصیت سے ایک گہرا تعلق رکھتا تھا، اب مشینوں کی ایجاد اور تقسیم عمل کے اصول نے اسے ایک غیر دلچسپ اور بے روح مشغلہ بنا دیا تھا۔

ایک طرف دولت بڑھ رہی تھی دوسری طرف افلاس، ایک طرف مرفہ الحالی کی حکومت تھی دوسری جانب فلاکت و ادبار کی۔ صنعت ترقی کر رہی تھی لیکن لوگ اور بھی غریب ہوتے جاتے تھے، مشینیں اتنا مال بنا دیتی تھیں کہ خریدنے والے نہ ملتے تھے۔ کارلائل نے لکھا ہے: "تمہارے بُنے ہوئے قمیص کس کام کے؟ اُدھر دو کانوں میں دیکھو لاکھوں کی تعداد میں رکھے ہیں اور اِدھر لاکھوں محنت کش برہنہ تن ان کے انتظار میں ہیں لیکن یہ انہیں نہیں ملتیں۔" ضرورت سے زیادہ اشیاء کے پیدا ہونے سے جلد جلد کاروباری دنیا میں بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی ۔ وبائی مرض کی طرح یہ مصیبت نہایت پابندی سے کچھ کچھ سال بعد رونما ہوئی تھی ۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء میں آئی پھر ۱۸۲۵ء میں ۱۸۳۶ء میں ظاہر ہوئی پھر ۱۸۴۷ء میں ۔ مال بہت، خریدنے والے ندارد ۔ کارخانے بند کئے جاتے تھے، مزدوروں کے لئے مزدوری نہ تھی ۔ محنت کش کے لئے محنت کا دروازہ بند اور فاقہ اور موت کی راہ کھلی ہوئی ۔

سیاسی حالات

سیاسی حالات میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ نپولیانی جنگوں کے بعد سے لوگ امن میں بسر کر رہے تھے ۔ اور امن کی زندگی نے امن پسندی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا ۔ قوموں

اور ریاستوں کی نظر اپنے رعب و داب، فتوحات و جنگ آزمائی کی طرف سے ہٹی ہوئی تھی۔ بجائے اس کے کہ ریاستیں اپنے اپنے اغراض کی فکر میں پڑی ہوں اور اپنی ہی غرض کو فلسفہ سیاسی کا اصول اعلیٰ قرار دیتی ہوں اب اغراض ملکی و سیاسی سے بالاتر اصولوں کی حمایت شروع ہو گئی تھی مثلاً آزاد تجارت کا اصول۔ غرض اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی اور خارجی سیاست کا صحیح احساس بہت کم ہو گیا تھا اور اس عہد کو "غیر سیاسی عہد" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قومیت کے اصول پر اس زمانہ میں خاصہ زور دیا گیا لیکن یہ ہمیشہ ملکوں کے داخلی اور اندرونی مسئلہ کی حیثیت سے اور انقلابی خیالات کے ساتھ ساتھ۔ اصول قومیت اور انقلاب کا تعلق یونان، پولینڈ، بلجیم کے معاملوں میں نظر آتا ہے۔ اُدھر انگلستان میں چارٹسٹ تحریک سراسر انقلابی تحریک تھی۔ فرانس میں بھی دنیا بھر کے خارج البلد انقلابی اور خود فرانس کے اشتراکی اور کمیونسٹ انتہا پسند انقلابی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔ اٹلی میں اسی انقلاب کا مجسمہ میزینی تھا۔ جرمنی میں بھی انقلابی پارٹی موجود تھی اور اگرچہ بہت قوی نہ سہی لیکن پروشیا کی احمق حکومت اس سے اس درجہ خائف تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بس دو چار ہی مہینہ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو جائے گی۔

سرمایہ داری نظام سے بے اطمینانی و بیزاری، فکر سیاسی کے انحطاط اور انقلاب و تغیر کی خواہش کی فضا میں اشتراک کے مسلک نے نشو و نما پائی۔ ذہنی اعتبار سے مختلف تصوراتِ رائج کا اس پر اثر پڑا۔ لیکن اس کا صحیح تعین کہ کن خیالات اور کس فلسفہ نے اس پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ظاہر ہے کہ بہت مشکل کام ہے۔ کسی نے اسے پروٹسٹنٹ ذہنیت کا نتیجہ قرار دیا ہے[4]۔ کسی نے کیتھولک خصوصاً فرانسیسی کیتھولک مذہب کا[5]۔ اکثر مورخین

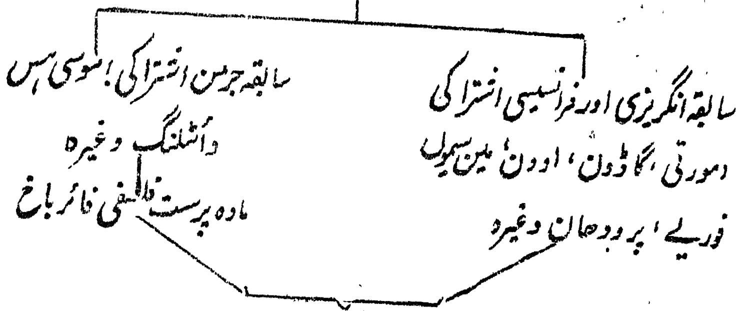
Felix — Cathrein — Masaryk ۴

Dostojewski ۵

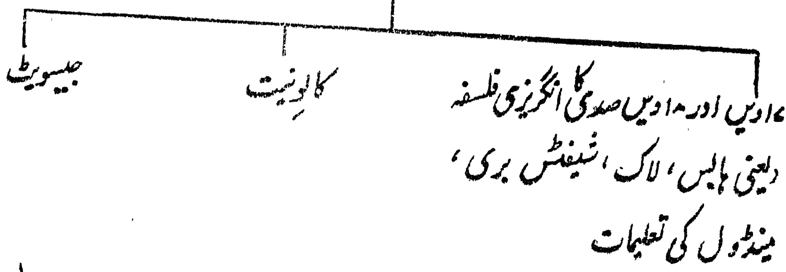
نے غلطی سے اسے جرمن کلاسکی فلسفہ سے مشتق گردانا ہے اور مارکس و انگلس کی تعلیمات اور کانٹ، فشے، اور ہیگل کے فلسفہ میں نہایت گہرا تعلق جتلایا ہے۔ یہ آخری رائے اب تک بہت عام تھی لیکن جرمنی کے مشہور معاشی ورنر زومبارٹ نے حال میں اسے غلط ثابت کردیا ہے اور واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ "اشتراک جدید" کو جرمن کلاسکی فلسفہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس مصنف کی رائے میں اشتراک جدید کا ذہنی شجرۂ نسب یہ ہے:-

اشتراک جدید

مارکس اور انگلس کی تعلیم



اٹھارویں صدی کا فرانسیسی فلسفہ

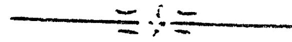


یونان کے دور انحطاط کا فلسفہ

یہودی ذہنیت

ہم نے سطور بالا میں ان عام جماعتی حالات کا ایک خاکہ پیش کر دیا ہے جن میں اشتراک کی تدوین ہوئی اور ان ذہنی تحریکوں اور تعلیموں کا ذکر جن سے یہ مشتق ہے۔ لیکن اشتراک

کے تاریخی فہم کے لیئے ماحول مادی و ذہنی کا یہ بیان کافی نہیں۔ خیالات و مذاہب بیشک اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود اس تمام تاثر کے وہ پھر بھی اپنے بانیوں کی نفسی کیفت اور اُنکی ذہنیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ شاید بڑے سے بڑا آدمی اپنے خیالات میں ماحول سے غیر متاثر نہ رہتا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بڑے آدمی کی تعلیم محض ماحول کے اثرات کا مکانیکی نتیجہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس لئے اِن حالات گردوپیش کے علاوہ ہمیں اشتراک جدید کی اصل کو سمجھنے کے لیئے اس کے بانیوں کی کیفیات نفسی پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ کام ہم انشاءاللہ کسی آیندہ مضمون میں انجام دینے کی کوشش کرینگے۔



نئی دہلی

رہتے رہتے حیدرآباد اب ہمارا وطن نہیں تو مسافر کا گھر ضرور ہو گیا ہے۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے اپریل میں کچھ دنوں کے لئے دہلی گیا تھا۔ گرمی کا پورا زور تو نہ تھا، ہاں مزا آنے لگا تھا۔ لاٹ صاحب کے کچھ دفتر شملہ جا چکے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ نئی دہلی چوپٹ تھی۔ مگر اصلی دلّی میں وہی چہل پہل تھی۔ دس دن ٹھیرا۔ عزیزوں سے ملا، دوستوں سے ملا۔ بنواری لال کا مکان دیکھا۔ نانک چند کی کوٹھی دیکھی۔ لالہ سری رام کا حال دیکھا۔ واحدی صاحب کے ہاں دعوت کھائی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی کے اہلِ قلم سے ملاقات کرائی۔ ہر چیز دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ہر شخص سے ملتا اور لطف اُٹھاتا۔ دل باغ باغ تھا کہ دلی پھر نئے سرے سے دلی ہو رہی تھی۔ مگر چلنے سے ایک دن پہلے مرزا قمر دسے جو باتیں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہوئیں اُس سے سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ دل بیٹھ گیا اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ دلی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

مرزا قمرو کو مرزا قمرو کہوں تو دلی والا تو کوئی نہ سمجھے۔ ہاں مرزا جھکڑ کہوں تو سب سمجھ جائیں۔ ان کو بھی پرانی دلی کا ایک کھنڈر سمجھو۔ چند روز کی ہوا کھا رہے ہیں۔ زمانہ کا ایک آدھ تھپیڑا پڑا اور ان کا خاتمہ ہے۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ ساٹھ ستر ہزار کی جائداد تو دو ہزار کے تمسک میں برابر ہو گئی۔ کچھ بچی کھچی رہ گئی ہے وہ ٹوٹ پھوٹ کر ٹھیکرا ہے۔ انہوں نے اپنے خرچ کم نہیں کئے۔ زمانہ نے سوا، ان کی جائداد کے ہر چیز کی قیمت بڑھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جائداد کو بھی گروی ڈالنا پڑا۔ نالش ہوئی ہے۔ کوئی دن میں وہ بھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ مرجائیں تو

اچھا ہے۔

نام تو ان کا مرزا قمرالدین ہے مگر ان کی وضع قطع، ان کے بھاری بھرکم جسم اور ان کی ٹھمک چال کی وجہ سے ساری دلی ان کو مرزا چھکڑا کہتی ہے۔ پڑھے لکھے خاک نہیں۔ پھر بھی اپنے کو شاعر سمجھتے ہیں اور ایک چھوڑ دو دو تخلص خیال اور دِل رکھ لئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی استعمال میں تو آتا نہیں۔ ہاں یونہی شوق میں ایک نام کے تین نام کر لئے ہیں۔ خیر یہ جتنے چاہیں نام رکھ لیں دلی والے تو ان کو مرزا چھکڑا کہتے ہیں اور یہی کہیں گے۔ تمام دلی کی وضع بدل گئی اور نہ بدلی تو ان کی اور بدلنے کیوں لگی۔ دلی کے جو چھکڑے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ رتی برابر فرق نہیں ہوا جب وہ نہ بدلے تو یہ کیوں بدلنے لگے۔ پرانی وضع پر جان دیتے ہیں، نئی وضع پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آج کل کی کسی بات کی تعریف سنی اور پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں کو مذاق ہاتھ آگیا ہے۔ ایک آیا لاٹ صاحب کی کوٹھی کی تعریف کر گیا، انہوں نے مذمت شروع کی۔ ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے نے آکر کسی اور چیز کی تعریف کر دی۔ یہ پہلا سلسلہ چھوڑ دوسرے کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگ بیچارے کو بہت ستانے لگے ہیں میں نے دس برس پہلے بھی ان کو دیکھا تھا اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اب کچھ باؤلے سے ہو گئے ہیں۔ اسی برس کی عمر ہے آخر دماغ کہاں تک کام دے۔ یہ دوسروں پر بگڑتے ہیں دماغ ان سے بگڑ بیٹھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نئی دہلی کے یہ ایسے دشمن ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو بیچارے کو ناحق کیوں پریشان کرتا۔ چلنے سے ایک دن پہلے شام کو کوئی ساڑھے پانچ بجے گھر سے ٹہلنے نکلا۔ جامع مسجد قریب ہی ہے خود بخود پاؤں اِدھر اُٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ شربت والے کی دوکان کے قریب رومال بچھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا، پہلے تو آنکھوں کو چندھیا کر ذرا شست لگائی۔ جب یوں کام نہ چلا تو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجہ بنا کر غور سے

دیکھا اور ایک دفعہ ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے " اوہو! میاں فرحت ہیں۔ کہو بیٹا تم یہاں کہاں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم حیدر آبادی کے ہو لئے۔ آخر آئے مگر بھئی بہت دنوں میں آئے۔" میں نے کہا " مرزا صاحب کیوں نہ آتا دلی کہیں ہم سے چھوٹ سکتی ہے۔" کہنے لگے " دلی۔ بیٹا! دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری۔ اب یہ دلی تھوڑی ہے یہ تو لاہور کی اماں ہے۔ جاؤ جائداد بیچ کر کہیں اور جا بسو۔ اب یہ تمہاری دلی نہیں رہی یہ دوسروں کی دلی ہو گئی۔" مجھے کیا معلوم تھا کہ نئی دہلی کی تعریف سن کر ان کے آگ لگ جاتی ہے۔ میرے منہ سے نکل گیا "واہ مرزا صاحب واہ۔ دلی تو اب دلہن بن گئی ہے اور ابھی کیا۔ تھوڑے دنوں میں دیکھنا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ کبھی بڑے میاں بھی گئے ہو یا یونہی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نئی دہلی کو صلواتیں سناتے ہو؟" میرا اتنا کہنا تھا کہ بپھر گئے۔ ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ کہا " آ۔ بیٹھ۔ میں تجھے تیری دلی کی تعریف سناؤں۔ تجھے معلوم بھی ہے کہ دلی کا دل کیا تھا؟" میں نے کہا " چاندنی چوک۔" کہنے لگے " ہٹ تیرے چھوٹے کی۔ شرماتا کیوں ہے۔ چاوڑی کیوں نہیں کہتا۔ کہیں بڑی جگہ نوکر ہو گیا ہے جو چاوڑی کو چھوڑ چاندنی چوک کی تعریف پر اتر آیا ہے۔ بیٹا دلی کا دل چاوڑی ہے۔ اب تو جا کر چاوڑی کو دیکھ کیا رنگ ہے۔ جب دل ہی بگڑ گیا تو شہر کیا رہا۔ اب جامع مسجد سے لگا کر اجمیری دروازہ تک چلا جا۔ وہ وہ شکلیں نظر آئیں گی کہ خدا کی پناہ۔ نہ وہ اللہ دی غازی آباد والی رہیں، نہ نور جہاں، نہ وہ حشمت ہے، نہ وہ میرٹھ والی زہرن۔ زہرن تو تجھے یاد ہو گی۔ اب اُس کے قاضی حوض والے کوٹھے کو جا کر دیکھ ایک پہلوان بیٹھے ہیں، تھوبڑا سا منہ، بیل کے سے دیدے، یہ موٹی ناک۔ ڈھیلا ڈھالا پشپوزوں کا سا لباس۔ منہ کے سامنے بجلی کا لیمپ رکھا ہے۔ لیجئے یہ ہیں بی صاحبہ اور کس جگہ آ کر بیٹھی ہیں کہ بی زہرن جان کی جگہ۔ اوپر جائیے تو نہ سلام نہ مزاج پرسی۔ نہ پان ہے نہ چھالیہ۔ جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور

ماشاءاللہ گفتگو ایسی شستہ زبان میں کی کہ منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ گالی بغیر تو بات ہی نہیں ہوتی۔ بھلا ان کے ہاں پان کہاں۔ یہ نہ پان کھائیں نہ پان بنانا جانیں۔ کسی نے بے حیا بنکر پان مانگا تو دو پیسے نکال پھینکدئے۔ نیچے بنواڑی کے ہاں سے پان آ گئے۔ ہاں حقہ بہت پیتی ہیں۔ حقہ آیا تو وہ آیا کہ گنوار بھی اس کو منہ لگاتے ذرا گھبرائیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سارے کا سارا مل کر کوئی دس سیر کا ہوگا۔ نیچہ پر بان لپٹا ہوا۔ نے اتنی موٹی جیسے پھکنی۔ چلم ایسی کہ سوا پا تمباکو آئے۔ لیجئے حقہ حاضر ہے۔ حقہ کا پانی ٹپکا۔ چلا آرہا ہے۔ یہ بھی کوئی نہیں دیکھتا کہ چاندنی پر رکھا گیا تو دھبہ پڑجائے گا۔ اب ہے کوئی ہمت والا جو اس حقہ کا ایک دم بھی لگائے۔ کھانستے کھانستے دم نہ نکل جائے تو میرا ذمہ۔ اب فرما رہی ہیں "پیجئے۔ پیجئے۔ امبرسر کا تمباکو ہے۔ کل ہی سردار صاحب نے لاکر دیا ہے"۔ بھلا کس کی شامت آئی ہے جو اس حقہ کا دم لگاکر مفت میں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے اور خود بی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی چیخ اُٹھا۔ منہ اوپر کرکے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاٹ کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ میں نے اُس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو اس وقت چاوڑی کی ناک کہی جاتی ہے۔ دوسروں کی کچھ نہ پوچھو۔ ان کے ہاں تو دروازہ ہی پر ٹکٹ بٹتا ہے۔ پہلے زمانہ کی چاوڑی تو تجھے یاد ہوگی گرمی کا موسم ہے۔ ادہر شام ہوئی اُدہر سب کمرے روشن ہوگئے۔ یہاں گانا ہو رہا ہے، وہاں گانا ہو رہا ہے، شوقین بیٹھے سن رہے ہیں۔ شریف لوگ سفید براق کپڑے پہنے، موتیا کے گجرے گلے میں ڈالے، مولسری کی لڑیاں ہاتھوں میں لپیٹے سڑک پر ٹہل رہے ہیں، چہل قدمی بھی ہو رہی ہے، گانے کا لطف بھی آرہا ہے۔ بارہ ایک بجے تک یہی گھما گھمی رہی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جا آرام سے سو رہے۔ اب چاوڑی میں رات کو جائیے تو دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے۔ برآمدوں میں کھمبوں سے لگی رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ابھی اندر گئیں، ابھی باہر آئیں، پھر گئیں، پھر آئیں۔ ایک

آدہ کوٹھے پر رُوں رُوں رُوں رُوں بھی ہو رہی ہے۔ مگر گانا کیا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بی جان اپنی اماں کو یاد کر کے رو رہی ہیں۔ سنتا ہوں اب سب کی سب چاوڑی سے نکالی جانے والی ہیں۔ اچھا ہو گا خس کم جہاں پاک۔"

میں نے کہا "مرزا صاحب، بھلا رنڈیوں سے اور دلی کے اچھے بُرے ہونے سے کیا واسطہ۔" کہنے لگے " واہ۔ بیٹا۔ واہ۔ خوب سمجھے۔ اور ننھے بن جاؤ۔ یار عزیز انہیں سے تو دلی دلی تھی نہیں تو دلی میں رکھا ہی کیا تھا۔ ذرا حکیموں کے مطب میں جا کر دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ دلی کی زبان کا سنبھالنے والا کون ہے۔ کبھی کسی کوٹھے پر گئے ہوتے تو کھلتا کہ آدابِ مجلس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے بننے سنورنے کو دیکھتے تو پتہ چلتا کہ لباس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے کمروں کو دیکھا ہوتا تو سمجھتے کہ سلیقہ کس کو کہتے ہیں۔ میاں، رنڈیاں دلی کی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ لاکھ عورتوں میں سے الگ نکال لوں کہ یہ دلی کی رنڈی ہے۔ اب جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں۔ خیر تم بڑے متقی پرہیز گار سہی۔ رنڈیوں کو چھوڑو۔۔۔۔ شہر والوں کو لو۔ لعنت ہے ان کی شکل پر۔ یہ دلی والے ہیں۔ خدا کے لئے سچ کہنا۔ کیا ان کو کوئی دِلی والا کہیگا۔ بال دیکھو تو جھاڑ جھنکار، منہ دیکھو تو ہیجڑوں کا سا۔ لباس دیکھو تو سبحان اللہ۔ نیچے قمیص ہے اوپر کرشتانوں جیسا چھوٹا کوٹ، ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے گِٹ بِٹ گِٹ بِٹ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیجئے یہ ہیں آپ کے دلی والے۔ یہ تو یہ کمبخت عورتوں نے بھی کچھ اپنی عجیب وضع بنالی ہے۔ انگیا، کرتی اور ڈھیلے پیجامے تو غدر کے ساتھ گئے۔ چوڑی دار تنگ پیجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ سلیقہ کا یہ حال ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانہ کی مالک ماما، سینے پرونے کے ذمہ دار درزی، درزی نہیں ماسٹر ٹیلر۔ اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں

صاحب ایک طرف گئے، میم صاحب دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اُن کو اِن کی خبر اور نہ اِن کو اُن کی۔ یعنی یہ آپ کی دلی کی حیا و شرم رہ گئی ہے۔ کچھ بچے کھچے گھرانے اپنی پرانی چال پر چل رہے ہیں لیکن کب تک۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ وہ بھی یا اِسی بھیڑیا چال کو اختیار کریں گے یا نکو بن جائینگے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب یہ تو نہ کہو۔ پردہ تو اب بھی دلی میں خاصہ ہے۔" کہنے لگے "اوہو۔ تو ماشاءاللہ آپکے ہیاں کچھ اس سے بھی زیادہ تیز رنگ ہے۔ بندۂ خدا۔ یہ کوئی پردہ میں پردہ ہے۔ پہلے باہر پھرنے والیاں بھی نکلتی تھیں تو اوڑھے پہنے، برقع اوڑھتی تھیں تو اس طرح کہ صرف ایک آنکھ باہر رہے، نہ اس طرح جیسے اب پھرتی ہیں۔ برقع تو اب بھی اِن کے سر پر ہے لیکن پلو ہیں کہ ہوا میں اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ خود ہیں کہ برقع سے دو قدم آگے مرد میدان بنی چلی آرہی ہیں۔ اب برقع کو برقع سمجھ کر تھوڑی اوڑھا جاتا ہے۔ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ رسم چلی آتی ہے اس کو پورا کر رہے ہیں۔ جب اپنے ہی بُرے ہوگئے تو دوسری قوم والوں کو میں کیا کہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ پہلے جن کی انگلی نہیں دکھائی دیتی تھی اب اُن کی پنڈلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ارے بھئی یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ اب دل بھی تو صاف نہیں رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بیزار، مسلمان ہندوؤں سے بیزار۔ بات بات پر کٹے مرتے ہیں۔ ذرا کلو نے ملو کو گالی دی یا ملو نے کلو کو مارا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ میاں معاملہ کیا ہے۔ آخر لڑنے کا سبب کیا تھا۔ مسلمانوں سے پوچھو تو کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے مسلمان کو ہندو نے کیوں مارا ہندوؤں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں میاں پرے ہٹو۔ ہم کو اس سے غرض نہیں کہ کیا ہوا۔ ہندو کو مسلمان نے کیوں گالی دی۔ جو ہے آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ جس کو دیکھو بھوکے شیر کی طرح پھیر رہا ہے۔ آج اس کا سر پھوٹا۔ کل اُس کا خاتمہ ہوا۔ اسپتال

بھرے چلے جارہے ہیں۔ ولایت سے دواؤں پر دوائیں چلی آرہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیسیں بھرتے بھرتے دیوالہ نکلا چلا جاتا ہے۔ اور ہے کیا کہ کلو نے ملو کو مارا۔ گوروں سے بھری موٹریں اِدھر سے اُدھر یوں پوں کرتی چلی جارہی ہیں۔ تو ہیں کھڑا کھڑ کرتی اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز چیلوں کی طرح سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ فوجیں پرا باندھے یہاں کھڑی ہیں وہاں کھڑی ہیں۔ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پکڑے جارہے ہیں۔ جیل خانے بھر رہے ہیں۔ مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔ کسی کو جنم قید ہوتی ہے۔ کوئی پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ سب کس لئے کہ ملو نے کلو کو گالی دی تھی۔ لیجئے یہ آپ کی دلی ہے اور یہ آپ کے دلی والے ہیں۔ کل ہی کا قصہ ہے میں بڑ دیا کے کٹڑہ سے قاضی کے حوض آرہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت کے کوچہ کے قریب دو بجار[1] لڑ رہے ہیں۔ سب راستے ہیں کہ بند ہیں۔ موٹریں، گاڑیاں، تانگے، ٹرام، پیدل غرض سارا راستہ کا راستہ رکا کھڑا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھکر اور دو لٹھ مار کر انکو علیحدہ کرے۔ آخر جب لڑتے لڑتے خود ہی تھک گئے اس وقت ایک بھاگا۔ دوسرا اُس کے پیچھے بھاگا۔ دو تین آدمی چپیٹ میں آ گئے۔ جب کہیں جا کر راستہ کھلا۔" میں نے کہا "مرزا صاحب آخر مار کر بھگا دینے میں کیا ہرج تھا!" کہنے لگے "میاں۔ ابھی تم نے دلّی دیکھی کیا ہے۔ ہٹانے میں ہرج۔ ارے بھائی خون خرابے ہو جاتے وہ کیا لفظ ہے تصادم۔ ہاں تصادم ہو جاتا۔ بین الاقوامی تصادم ہو جاتا۔" میں نے کہا "ہیں ... بین الاقوامی تصادم۔ یہ بھی آپ نے خوب کہی!" کہنے لگے "ہاں۔ میاں۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ ہماری زبان میں مین میخ نکالتے ہو۔ ہم تو

---

[1] دلی میں اُن بیلوں کو بجار کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اُن کو سانڈ بھی کہتے ہیں مگر بجار (ب۔ج۔ا۔ر) کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔

اب یہی سنتے ہیں کہ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو اخبار والے اس کو بین الاقوامی تصادم کہتے ہیں۔ اب جانے ہماری بلا۔ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ انہی سے جا کر پوچھو کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو بڑے بڑے واقعات ہو جاتے تھے تو بین الاقوامی تصادم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ ہم پھول والوں کی سیر کو جا رہے تھے تمکو یاد ہوگا سیدھی سڑک قطب کو جاتی تھی۔ اب بھی کبھی ادھر گئے ہو۔ خدا نہ لیجائے۔ قطب جانا مشکل ہو گیا ہے۔ چاروں طرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں۔ بے لکھا پڑھا آدمی صبح کو چلے تو کہیں شام کو جا کر قطب پہنچے۔ اب ادھر چلو۔ اب ادھر مڑو۔ اب ادھر گھومو۔ اب ادھر جاؤ۔ ہر موڑ پر تختی لگی ہوئی ہے۔ پڑھنے والے پڑھ لیتے ہوں گے ہمارے تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں دیکھو تختی پر ہاتھ بنا ہے۔ ایک انگلی آگے کو نکلی ہے یعنی ادھر جاؤ۔ آخر ادھر جاؤ تو کہاں جاؤ۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی سڑک ہے کہیں جاتی ہی ہوگی لیکن جاتی کہاں ہے یہ کیونکر معلوم ہو۔ اگر ہاتھ کی جگہ قطب کی لاٹھ بنا دیتے تو سب سمجھ جاتے کہ یہ سڑک قطب جاتی ہے۔ مقبرہ بنا دیتے تو جان جاتے کہ یہ سڑک مدرسے[1] کو جاتی ہے۔ سڑکیں کیا ہیں خاصی بھول بھلیاں ہو گئی ہیں۔ سڑک پر یہاں وہاں جہاں دیکھو سپاہی کھڑے تھرک رہے ہیں۔ کبھی یہ ہاتھ اونچا کرتے ہیں کبھی وہ۔ کبھی ادھر پھیر جاتے ہیں کبھی ادھر۔ غرض کیا کہوں دلی کی سڑکیں بھی تماشہ ہو گئی ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ ہم قطب جا رہے تھے منصور کے مقبرہ کے پاس جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ گاڑی چلی آ رہی ہے۔ اندر بیسیوں آدمی ٹھنسا ٹھس بھرے ہیں۔ چھت پر بوریاں لدی ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی پانچ چھ گنوار دبکے دبکائے بیٹھے ہیں۔ میاں میواتی اونٹ کی نکیل تھامے سامنے کے تختے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

---

[1] ہمایوں اور منصور کے مقبروں کو مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

خدا کی قدرت دیکھو دوسری طرف سے ایک یکہ آرہا تھا یکہ میں تین سیلانی ایک بیچ میں دو اِدہر اُدہر، ایک ہاتھ سے چھتری کے ڈنڈے پکڑے دوسرا ہاتھ ٹوپی سنبھالنے کے لئے سر پر دھرے صاف ستھرے کپڑے پہنے چلے آرہے ہیں۔ یکہ والے نے ہری گھاس چھتری کے اندر باندھ رکھی تھی کہ قطب میں کام آئے گی۔ یکہ جو اونٹ گاڑی کے پاس سے گزرا تو میاں اونٹ کی نظر گھاس پر پڑی۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے اپنی گردن بڑھا چھتری میں داخل کردی۔ سیلانیوں نے ہشت ہشت کی۔ اونٹ نے جو گھبرا کر گردن سیدھی کی تو یکہ گردن میں لٹک گیا۔ بھئی مزہ آگیا۔ اونٹ کے گلے میں بلّی تو سنی تھی یہ اونٹ کے گلے میں یکہ اسی دن دیکھا۔ خیر اِدہر ٹٹوانی نے ہاتھ پاؤں مارے، اِدہر یکہ والے نے غُل مچایا، کچھ راہگیروں نے گڑبڑ کی۔ اونٹ نے جو گردن کو جھٹکا دیا تو یکہ، ٹٹو، سیلانی سب وہ جا کر گرے، چوٹیں بھی آئیں، کپڑے بھی خاک میں ملے، نقصان بھی ہوا، مگر نہ کچھ جھگڑا ہوا نہ ٹنٹا۔ یکہ والے نے کچھ گڑبڑ شروع کی تھی اس کو لوگوں نے ڈانٹ دیا کہ چل بے یہ ہوتا ہی ہے، نہ چھتری میں گھاس باندھ کر لاتا، نہ اونٹ گردن ڈالتا، نہ یہ تماشہ ہوتا۔ لیجئے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ خدانخواستہ اگر آجکل یہ واقعہ پیش آجاتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچتی، خوب کٹم کٹا ہوتی، لکڑی چلتی، نالشا نالشی ہوتی اور کیوں نہ ہوتی؟ کسی مسلمان کے اونٹ کا کسی ہندو کے ٹٹو کو زخمی کرنا کوئی معمولی بات ہے؟" میں نے کہا "تو مرزا صاحب آپ دلّی کی عورتوں سے تو خفا تھے ہی، مردوں سے بھی صاف نہیں؟" کہنے لگے "مرد عورت کیا میں تو دلّی کی ہر بات سے خفا ہوں۔ اب اس گدڑی ہی کو دیکھ لو۔ اب یہ گدڑی تھوڑی رہی ہے خاصہ بزازہ ہوگیا ہے جو ململ شہر میں نہ ملے یہاں سے لو۔ سودے والے ہیں وہ نئی نئی آوازیں نکالتے ہیں۔ اب جو یہ ق۔ ای۔ ق۔ ای پکار رہا ہے۔ جانتے ہو کیا بیچ رہا ہے۔ میاں کھیر بیچ رہا

ہے۔ بھلا اس آواز پر کوئی کیا آئے گا۔ کاچھی سب گونگے ہو گئے۔ یا کسی زمانہ میں گرمی کا موسم ہے تو آوازیں آرہی ہیں کالے اودے لگا دئے ہیں شربت کو، سانوے سلونے لگا دئے ہیں شربت کو۔ جاڑا ہے تو آوازیں آرہی ہیں گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر۔ لاڈو پیاری نے توڑے ہیں بیر۔ اب کاچھی تو دلی سے ناپید ہو گئے۔ ہاں فتحپوری کے نیچے کچھ میوہ والے بیٹھے ہیں۔ وہ ٹھیرے کابلی۔ اُردو بھی کچھ یوں ہی سی جانتے ہیں۔ آوازیں کیا لگائیں گے اور لگائیں بھی تو لوگ ڈر کر بھاگ جائیں۔ پہلے چاندنی چوک میں یہاں سے وہاں تک میوہ والوں کی دوکانیں تھیں۔ نیچے نہر، اوپر درختوں کا سایہ، جا بجا فالودے والوں کی دوکانیں۔ دوکانوں کے سامنے کہیں بنچ بچھے ہیں کہیں مونڈھے پڑے ہیں۔ لوگ آئے، بیٹھے، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پیسے دو پیسے کا شربت پیا، اُٹھے، چلے گئے۔ اب نہ وہ پٹڑی ہے نہ درخت۔ فتح پوری سے لگا قلعہ تک صفاچٹ میدان ہے۔ گرمی میں یہاں سے وہاں جاؤ تو فنا ہو جائے

یا وہ زمانہ تھا کہ دوپہر کو بھی اس سڑک پر بہار رہتی تھی، گھر میں وہ آرام نہ ملتا تھا جو یہاں ملتا تھا۔ اور اس چاندنی چوک کی سڑک تو دیکھو، کیا کالی بھٹ ہوئی ہے۔ ایک چکر لگا کر جاؤ تو یہ معلوم ہو کہ ابھی کوئلے بیچ کر آرہے ہو اور گرم ایسی کہ تنور بھی کیا ہو گا۔ دوپہر کو روٹیاں پکا لو۔ کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی سڑک یہی ہوتی ہے۔ ہاں بھائی ہو گی، ولایت کا مال لگا ہے، قیمتی کیوں نہ ہو گی۔ ایک دن رام لیلا دیکھنے نکلا تھا رات کے بارہ بجے تک تو یہ سڑک ٹھنڈی ہوئی نہ تھی۔ اور ہاں میاں فرحت، کبھی تم رام لیلا کے زمانہ میں بھی دلی آئے ہو۔ میں نے کہا "جی نہیں"۔ کہنے لگے "ارے بھئی کیا کہوں۔ اس میلہ کے ٹوٹنے کا جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ پہلے جو سواری نکلتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے۔ ہندو، مسلمان، امیر، غریب، شریف، رذیل سب کے سب کھانا وانا کھا، سفید کپڑے پہن چاوڑی

ہیں شام ہی سے نکل آتے۔ کوٹھے ہیں کہ روشنی سے بڑے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ رنڈیاں ہیں کہ بنی سنوری گاؤتکیوں سے لگی برآمدوں میں بیٹھی ہیں۔ نیچے سے کچھ بات ہوتی ہے اُوپر سے جواب ملتا ہے۔ اُدھر سے پان آرہے ہیں اِدھر سے روپئے جا رہے ہیں۔ بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، روشنی کا یہ عالم ہے جیسے دن نکلا ہو۔ سواری اس شان سے آتی کہ کیا کہوں ہنسی خوشی چار پانچ گھنٹے گزار گھروں میں جا پڑے۔ اور اب کی سواری دیکھو تو واہ۔ واہ۔ واہ آگے توپ ہے، پیچھے توپ ہے۔ سامنے فوج ہے، پیچھے فوج ہے۔ سپاہی ہیں کہ ڈنڈے بجا رہے ہیں۔ ایک غل مچ رہا ہے کہ بڑھے چلو بڑھے چلو۔ کوٹھے بند ہیں اور ان کا بند ہونا ہی اچھا۔ بھلا آجکل کی کوٹھے والیوں سے میلے کی کیا شان بڑھ سکتی ہے۔ کوٹھوں کی چھتوں پر پولیس والے چڑھے ہوئے ہیں۔ جہاں چار آدمی جمع ہوئے اور سپاہی نے ڈانٹا کہ آگے بڑھو۔ ذرا بھیڑ بھیڑ کی تو پکڑ تھانہ میں لیگئے۔ بھلا اس مصیبت میں کون بڑے بھلے آدمیوں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا۔ اب ایک مذہبی رسم ہے، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی کبھی کبھی مارکٹائی کی نوبت آجاتی ہے اور ہم سے پوچھو تو نہ اب وہ رام لیلا ہے اور نہ رام لیلا کا مزا۔ اس سے بدتر حال پھول والوں کی سیر کا ہے۔ بس یہی دو میلے دلّی کے ایسے تھے کہ سارے جہان میں لاجواب تھے۔ اب نہ رام لیلا وہ رام لیلا ہے اور نہ پھول والوں کی سیر وہ پھول والوں کی سیر ہے۔ پہلے بھادوں آیا، سیر کی تاریخ مقرر ہوئی، نفیری بج گئی، مہرولی آباد ہونی شروع ہو گئی، مکانوں میں سفیدی ہو رہی ہے، کمرے سجائے جا رہے ہیں۔ کرایہ کا یہ حال ہے کہ پہلے جو کمرہ دو روپئے مہینہ کو ملے وہ سو روپئے روز پر ملنا مشکل ہے۔ رنڈیاں رتھوں میں بیٹھی جا رہی ہیں، امیر فٹنیں اڑائے چلے جاتے ہیں۔ غریب غربا مٹکے سروں پر اوندھائے، لنگوٹ کسے، پچنیں اڑاتے، گاتے، بجاتے چلے جا رہے ہیں۔ قطب

کی لاٹھ تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا - بڑے لوگ تو اپنے کمروں پر جا ، نہا ، دھو ، کپڑے بدل نکل آئے ، غریبوں نے جھرنے پر جا دو تین غوطے مارے ، مٹکے میں سے تحفہ تحفہ کپڑے نکالے ، کارچوبی ٹوپی ، ٹاٹ بافی جوتی ، شربتی ململ کا کرتا انگرکھا ، نٹ مار لٹھے کا پیجامہ پہن ایسے نکلے جیسے چاند گہن سے نکلتا ہے - بھلا دیکھ کر کوئی کہہ تو دے کہ یہ میاں قادر سقہ ہیں اور یہ نھّو کہار - مہرولی میں اس سرے سے اُس سرے تک دوکانیں لگی ہیں ، لوگ بیٹھے ہیں ، کھا رہے ہیں ، باتیں ہو رہی ہیں ، ادھر گانا ہو رہا ہے ، ادھر دف بج رہا ہے - باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے کہ ایک دفعہ ہی نفیری کی آواز آئی سمجھئے جوگ مایا جی کا پنکھا آگیا ، سب کے سب اس میں جا شریک ہوئے ، عبدالوہاب کٹورہ بجا رہا ہے ، نفیری کے کمال دکھا رہا ہے ، بیلیں مل رہی ہیں ، کوئی روپیہ دیتا ہے ، کوئی دوشالہ - رات کے ایک دو بجے تک یہی چہل پہل رہی - دوسرے دن درگاہ شریف میں پنکھا چڑھا ، وہاں اس سے زیادہ دھوم دھام رہی - چار پانچ روز آنکھ بند کرتے گزر گئے - ہنسی خوشی گھر آئے ، قطب کے پراٹھے لائے ، چاندی کے چھلے لائے ، اب گھر گھر پراٹھے اور چھلے بٹ رہے ہیں - اور اب کی پھول والوں کی سیر خدا نہ دکھائے - شریف لوگ تو وہاں کیوں جانے لگے - جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے ." میں نے کہا "مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں - فرقہ واری جنگ ." کہنے لگے "چل ہٹ - جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ ، نہ اس کے کچھ معنی ، نہ اُس کے کچھ معنی - خواہ مخواہ اخبار والوں نے نئے نئے لفظ گھڑ ڈالے ہیں اور تو نے یہاں کی زبان بھی سنی - سبحان اللہ کیا زبان ہے اور اسی پر مرے جاتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے - لکھنؤ کا حال تو مجھے معلوم نہیں ، ہاں دلی کی زبان تو اب کچھ نئی زبان ہو گئی ہے ، وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں - اور ان پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے - ایک

لفظ اردو کا بولینگے تو دو لفظ انگریزی کے۔ بھئی مجھے تو یہاں کی زبان سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ پرسوں ہی جمعہ کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ بیان کر رہے تھے ماشاءاللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالے ہیں کہ سبحان اللہ۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ یہ تو رہے مسلمان۔ اب ہندوؤں کی گفتگو سنو تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ جو وہ بولتے ہیں اگر اسی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم تو مرتے جائیں گے یہ زبان نہ آئیگی اچھا بھئی ہم عربی بولیں، تم ہندی بولو مگر اسطرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اُردو میں نہیں ہے اُس کے لیے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور اس کی جگہ ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ قاموس میں سے نکالکر استعمال کریں۔ ایے بھئی سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اُردو کا کوئی بڑا مدرسہ کُھلا ہے۔ سب علم اُردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ"۔ مرزا صاحب بڑے زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "اوہو! یہ نام اور اُردو کا مدرسہ۔ معلوم ہوتا ہے وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر جامعہ تو یہ جیسے جامع مسجد۔ عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہوا اور میاں یہ کلیہ کیا بلا ہوئی"۔ میں نے کہا "آپ اِس بحث کو چھوڑیئے۔ دلی کی کچھ اور سنایئے۔ جب دلی کی ہر چیز سے آپ کو نفرت ہے تو گزرتی کیسے ہو گی"۔ کہنے لگے "میاں بہت ہو گئی تھوڑی رہی ہے۔ صبح ہی اُٹھتا ہوں۔ نماز پڑھ کبھی مہندیوں[1] میں چلا جاتا ہوں کبھی کلو کے تکیہ۔ پُرانی دلّی والے وہاں آرام کر رہے ہیں۔ اُنکی قبروں پر جا بیٹھتا ہوں، اُن کو اور اُن کی دلی کو یاد کرکے دو آنسو بہا لیتا ہوں، جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ شام

---

[1] مہندیاں اور کلو کا تکیہ دلّی کے دو بڑے قبرستان ہیں۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آ بیٹھتا ہوں اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھتا ہوں کہ پہلے دلّی کیا تھی اور اب کیا ہو گئی ." اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی مرزا صاحب رومال جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے " میاں فرحت! یہاں بس اس لئے آتا ہوں ۔ اگر دلی میں کچھ لطف رہ گیا ہے تو جامع مسجد میں مغرب اور عشاء کی نماز میں رہ گیا ہے ۔ یہ بھی نہ ہوتا تو کچھ کھا کر سو رہتا ۔"

دوسرے دن میں حیدر آباد چلا آیا ۔ سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا ۔ جو خوشی دلّی جا کر ہوئی تھی وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی ۔ یہ تو نہیں بھی کہوں گا کہ دلی مجھ کو بھی کچھ نئی نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دہلی رکھا گیا ہے ۔ جو دلی ہمارے زمانہ میں تھی وہ تو اب نہیں رہی ۔ اب چاہے دلی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں ۔

دلاری

گو وہ لونڈی بچپن سے اس گھر میں رہی اور پلی مگر سولہ سترہ برس کی عمر میں بھاگ گئی۔ اس کی ماں کا پتہ نہ تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے، خاندان میں کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ بیگم صاحب بھی زندہ تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں، مامائیں آئیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں، اس کے بعد چھوڑ کر چلی جاتیں۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ سلوک برا ہوتا یا دوسری جگہ انہیں تنخواہیں اچھی ملتیں، بلکہ غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ایک جگہ رہتے رہتے گھبرا جاتیں اور آخرکار کسی معمولی سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں۔ مگر دلاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اسے کھانے اور کپڑے کی کوئی شکایت نہ تھی، دوسری نوکرانیوں کے مقابلہ میں اس کی حالت اچھی تھی مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں۔" اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا مرتبہ گھر کی بیبیوں سے پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، دل کی گہری اور اندھیری بےچینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں، تو وہ اکثر مغموم سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم

اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں ۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا ۔ صاحبزادی کا وقت سینے پرونے پڑھنے لکھنے میں صرف ہونے لگا ۔ دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، گھڑوں میں پانی بھرتی، چھوٹے برتن دھوتی ۔ وہ خوبصورت تھی لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی ۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ اپنے اُجلے کپڑے نکالکر پہنتی اور سنگار کرتی ۔ یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحب یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے ۔

شب برات تھی، دلاری گڑیا بنی تھی، زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی ۔ سب گھر والے، نوکر چاکر، کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ بچے غل مچا رہے تھے، بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا ۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنیوالے تھے ۔ بیگم صاحب انہیں بہت چاہتی تھیں، اگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے، انہیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے ۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کی بحث ہی کرتے گزرجاتی ۔ یہ قریب قریب ہر پُرانی رسم کے 'خلاف' تھے ۔ مگر اظہار ناراضی کرکے سب کچھ برداشت کرلیتے ۔ آخر کرتے کیا! انہیں پیاس لگی اور انہوں نے اپنی ماں کے کاندھے پر سر رکھکر کہا "امی جان ! پیاس لگی ہے "

بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا "بیٹا شربت پیو، میں ابھی بنواتی ہوں"۔ اور یہ کہکر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے ۔

کاظم بولے "جی نہیں امّی، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، میں خود اندر جا کر پانی پی لونگا"۔

مگر دلاری حکم سنتے ہی اندر کی طرف چل دی ۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے ۔ دلاری ایک تنگ، اندھیری سی کوٹھری میں شربت کی بوتل اُتار رہی تھی ۔ کاظم بھی وہیں پہونچکر

رکے۔ دلاری نے مڑکر پوچھا "آپ کے لئے کونسا شربت تیار کروں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے اسے ایک نظر دیکھکر گردن جھکالی۔ دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھالی اور دروازہ کی طرف بڑھی کاظم نے بڑھکر بوتل اس کے ہاتھ سے لیکر الگ رکھدی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اُس کی گود میں دیدیا۔ اُمڈی ہوئی گھٹائیں آخر برس پڑیں۔ دو ہستیوں نے جن کی ذہنی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئیں۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہی چلی جارہی تھیں۔ اکثر پریم کا میٹھا گیت دیپک راگ میں گایا جاتا ہے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آجائیگی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی، بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی، اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کردیا۔

تین چار مہینہ بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا۔ بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہوگئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچ جائیگی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے

ایک سفید چادر سر سے پیر تک اوڑھے، پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں زمین پر جاکر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں، وہ دور سے کھڑی ہو کر اسے دیکھتیں اور افسوس کرکے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آگئی ہے تو وہ باہر نکلے جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے، انہیں ان باتوں کی فرصت ہی نہیں تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا "بے وقوف! اب ایسی حرکت نہ کرنا" اور یہ کہکر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انہیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بیچاری پر بہت ترس آرہا تھا مگر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایک گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت۔ یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی۔ دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اسے اس کی کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہگاروں کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لئے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لئے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کردی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا "دلاری یہ تونے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لئے اپنی بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا

حسینہ بیگم واپس جا ہی رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آگئیں۔ اُن کے چہرہ پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔

"بے حیا، آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ۔ مگر منہ کالا کر کے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے۔۔۔۔۔۔" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھکر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔

یکایک ایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انہوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا: "اے خدا کے لیۓ اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجیۓ۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔" یہ کہکر وہ فوراً واپس چلے گئے۔

لڑکی اس آواز کو سنکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

غزل

(مولانا آزاد سبحانی صاحب)

تمہاری زلفِ مشکیں سے بندھی ہے زندگی اپنی — نہ مرنا ہے خوشی اپنی نہ جینا ہے خوشی اپنی
سبھی پژمردہ بیٹھے رہ گئے حتیٰ کہ ساقی بھی — کچھ ایسی چھا گئی اس انجمن میں بیدلی اپنی
دلِ بے ظرف نے بے ظرفیاں کیں وائے نادانی — اُڑائی طبقۂ عشاق میں اس نے ہنسی اپنی
کہاں تک کہتے پھرئے قصۂ بیچارگی اپنا — کہاں تک اپنے ہاتھوں کیجئے پردہ دری اپنی
خوشا تقدیر جو رہزن مسلّم ہیں زمانہ کے — انہیں کے ہاتھ میں سونپی گئی ہے رہبری اپنی
کہاں زورِ جنوں میں رہ سکے بخیہ گری باقی — محض دیوانگی تھی کوشش بخیہ گری اپنی
خدا کے نام پہ ہم نے بہت سے بُت تراشے ہیں — حَرَم کو بھی لئے ہے دائرہ میں بُت گری اپنی
کسی کا کیا ہے کل سامانِ حسن و عشق اپنے ہیں — دل اپنا، حسن دلبر اپنا، طرزِ دلبری اپنی
دلِ پُر حوصلہ نے کر لیا خود راستہ پیدا — نہ چھوڑی چرخِ کج رفتار نے گو کجروی اپنی
بہت مشہور ہے تو سنگدل اے آسماں لیکن — ہلا دیگی تجھے بھی داستانِ بے کسی اپنی

ہے رازِ زندگی پوشیدہ قربانی میں سبحانی
اگر تم چاہتے ہو زندگی دو زندگی اپنی

نوائے محوی

(از حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

اُف مرے چارہ گروں کا یہ ہراساں ہونا
آج دشوار ہے صبح شبِ ہجراں ہونا

قیس کا جوشِ جنوں مفت میں بدنام ہوا
اُس کی تقدیر میں تھا خاکِ بیاباں ہونا

تجھ سے رنگین ہے افسانۂ حسرت میرا
میرے دل سے نہ جدا ای غمِ جاناں ہونا

ہے پشیمان اجل، روح پریشاں میری
ہائے اُس شوخ کا انگشت بدنداں ہونا

غیرتِ دل کو نہیں منتِ خنجر منظور
ورنہ مشکل نہیں مشکل مری آساں ہونا

نگہِ دوست کا ہدیہ ہے یہ ناسورِ جگر
ہم نہیں چاہتے شرمندۂ درماں ہونا

گر کے دامن پہ ترے بن گیا افسانۂ شوق
ورنہ اس خون کے آنسو کو تھا طوفاں ہونا

چپ ہی بیمار، سحر دور، ہی غمخوار اُداس
مفت بدنام نہ تو ای شبِ ہجراں ہونا

دل کے اِک جذبۂ پنہاں کا مرقع سمجھو!
شمع کا پردۂ فانوس میں عریاں ہونا

دیکھ لو گریۂ خونیں کی چمن آرائی
دیکھ لو گوشۂ دامن کا گلستاں ہونا

جان لے کر ہی غمِ دوست نے چھوڑا آخر
دل کی تقدیر میں تھا کشتۂ ہجراں ہونا

اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی دشوار نہ تھا
دل کے ہر داغ کا اک شمع فروزاں ہونا

میں نہیں تو مری تربت ہے ٹھکانا تیرا
بیکسی! تو نہ مرے بعد ہراساں ہونا

دل میں روشن ہے جو تو ای مری شمعِ اُمید
غیر ممکن ہے مرا کشتۂ حرماں ہونا

ہو نہ ہو، خونِ تمنا کا پتہ دیتا ہے
اشکِ خونیں کا نمایاں سرِ مژگاں ہونا

دیکھ کر حسن کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
عشق کا خاک بسر، چاک گریباں ہونا

دیدۂ شوق ہے اور جلوۂ فردوس جمال
اب کسے چاہیئے منت کشِ رضواں ہونا

ہو الگ سب سے ترا طرزِ سخن اے محوی
تو نہ دلدادۂ اندازِ حریفاں ہونا

غزل

(مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی)

کچھ نہ تھا اور، وعظ کے سلسلۂ دراز میں
نہر شراب موجزن، جنت خانہ ساز میں

یارب اثر تھا کون سا، آہ جگر گداز میں
کوند رہی ہیں بجلیاں، ایک حریم ناز میں

شوق درِ حبیب کے جذب کی، کوئی حد نہیں
پھر نہ اُٹھا جو سر جھکا، سجدہ گہِ نیاز میں

ہجرِ وطن ہے اک عذاب کیوں نہ تڑپ کے جان دے
عیدِ حقیقت آشنا، دامگہِ مجاز میں

جہل ہے منتہائے علم، عقل ہے اسکی معترف
عبدِ ذلیل! شک نہ کر، قدرتِ کارساز میں

عمرِ دو روزہ کاٹ دی، شیب میں اُٹھتے بیٹھتے
فرض ہیں دو ہی رکعتیں، وقتِ سحر نماز میں

پی لیا آبِ زندگی آپ نے کیوں جناب خضر!
قیدِ حیات الجھ گئی، سلسلۂ دراز میں

ایسے عمل پہ دوستو! رخنہ گری ہے، خودکشی
ہم بھی اُسی جہاز میں، تم بھی اُسی جہاز میں

مستِ صبوحیٔ الست تھے جو صفیؔ، بہک گئے
کیفِ شراب دیکھکر، نرگسِ نیم باز میں

اقتباسات

رُوس کی تعلیمی ترقی | جنگ عظیم کے بعد روس کی سیاسی اور معاشی نظام میں جو انقلاب ہوا ہے اور جو تجربات ہو رہے ہیں اُس کے متعلق کوئی رائے ابھی آسانی کے ساتھ نہیں قائم کی جا سکتی۔ البتہ وہاں کی تعلیمی حالت میں جو عظیم الشان ترقی ہو رہی ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے خصوصاً ہندوستان کیلئے ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق اُس مُلک میں پڑھے لکھے مرد اور عورتوں کی تعداد کا اوسط فی ہزار ۵۰۴ تھا لیکن اشترا کی جمہوریت کے قیام کے بعد سے جو اصلاح وہاں کے نظام تعلیم میں کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پڑھے لکھوں کی تعداد میں تقریباً ۴ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں اتنی ترقی یقیناً حیرت انگیز اور قابل داد ہے۔

روسی جمہوریت کے تمام تعلیمی امور جس جماعت کے متعلق ہیں اُسکو Peoples Commissariat کہتے ہیں اور اس کے سات شعبے ہیں۔ ایک شعبہ کے متعلق انتظامی امور ہیں مثلاً تعمیرات اور مصارف وغیرہ۔ دوسرے شعبے کے متعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نگرانی ہے۔ تیسرے شعبہ کے متعلق حرفتی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چوتھے کے متعلق غیر روسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چونکہ رُوس میں تقریباً سو سے زائد مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اور اُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس لئے اُن کی مادری زبان میں تعلیم کے انتظام کے لئے اس شعبہ کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت تھی۔ یہ شعبہ مختلف اقوام کی معاشرتی اور تمدنی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ہر ایک کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ پانچواں شعبہ ایک علمی جماعت ہے جو طریق تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کرتی ہے اور تمام تعلیمی اور صنعتی مدارس کے لئے نصاب تعلیم تیار کرتی ہے۔ چھٹا

شعبہ وہ ادارہ ہے جو اکیڈمی اور تحقیقی کام کرنے والی جماعتوں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی شعبہ جمہوریت کے اندر تمام آثار قدیمہ، فنون لطیفہ کے عجائب خانوں، موسیقی کی درسگاہوں اور سرکاری تھیٹروں کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ ساتویں شعبہ کے متعلق اشاعت علوم کا کام ہے چاہے وہ کتب کے ذریعہ سے ہو یا رسائل کے ذریعہ یا سینما کے ذریعہ سے۔

ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال رکھی گئی ہے اور ثانوی کی پانچ سال، اس کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ عمر کی زیادتی کی وجہ سے یا کاروبار زندگی کی مشغولیت کی وجہ سے، یا غربت کی وجہ سے مدارس میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کرسکتے، اُن کے لئے مدارس شبینہ، صنعتی مدارس، مدرسہ بالغین قائم کئے گئے ہیں۔ روس میں سب سے زیادہ قابل تعریف اُن کے وہ مکتب ہیں جہاں ۳ برس سے ۷ برس تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کنڈرگارٹن کے اصول پر کیجاتی ہے حکومت نے غریب، لاوارث، اور یتیم بچوں کے لئے جگہ جگہ دارالاقامہ قائم کئے ہیں، اور سرکار کی طرف سے اِن کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ طلبار کے اخلاق کی نگرانی کے لئے انسپکٹر مقرر ہیں جو بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر اور دیگر مقامات پر نوجوانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۱۴۵۰۴ تھی اور طلبار کی تعداد ۱۱۰۰۰۰۰۰ تھی۔

مدارس بالغین تین قسم کے ہیں، دن کے مدرسے، مدارس حرفہ، اور سیاسی مدرسے۔ دن کے مدرسے یا تو صنعتی ہوتے ہیں یا زراعتی جیسی ضرورت مقامی حالات کے لحاظ سے ہو، مدت تعلیم ۲ سال عام طور پر ہوتی ہے لیکن اگر کسی خاص فن کے کسی خاص شعبہ میں مہارت تامہ پیدا کرنا ہو تو ایک سال تعلیمی مدت میں اور بڑھ جاتا ہے۔ مدارس حرفہ میں حرفہ کی تعلیم کے ساتھ ادبی تعلیم بھی رکھی گئی ہے۔ بے پڑھے لکھوں کے لئے خاص مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن ان مدارس کی تعداد اب روز بروز کم

ہوتی جاتی ہے اس لیئے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھتے جاتے ہیں۔ سیاسی تعلیم کے لیئے مدارس روس کے تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت ہیں اور ان مدارس کا مقصد ایسے اشخاص پیدا کرنا ہے جو بالشویک اصول کی تبلیغ و اشاعت کا کام کریں۔ ۱۹۲۳ء میں اس قسم کے سیاسی مدارس کی تعداد ۲۳۲ تھی جن میں ۱۶۰۰۰ طالبعلم تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ جماعت کی یونیورسٹیاں ہیں جنکی تعداد ۱۹۲۶ء میں کل پندرہ تھی اور طالب علموں کی تعداد چھ ہزار سے زائد تھی۔ ملک کی عام تمدنی و معاشرتی اصلاح اور باشندوں میں شہریت کا احساس اور عام بیداری پیدا کرنے کے لیئے انجمنیں قائم کیگئی ہیں جن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲۷ ہزار سے زیادہ تھی۔

روس میں یونیورسٹیاں دو قسم کی ہیں ایک کا مقصد جدید امریکی طریقہ پر کسانوں اور مزدوروں کی تعلیم ہے اس لیئے ٹریڈ یونین اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ان یونیورسٹیوں کی امداد میں صرف کرتی ہے۔ ان یونیورسٹیوں کی طرف سے شام کے وقت مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین پر قابل اساتذہ تقریر کے ذریعہ درس دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے صرف ماسکو میں اس وقت تقریباً دس ہزار طلبا ۶۰ مختلف مضامین کے درس میں شریک ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی یونیورسٹیاں جو باقاعدہ مختلف علوم و فنون کی اور مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتی ہیں ان کی تعداد اس وقت سوا سو کے قریب ہے اور طلباء کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ سائنس کی تعلیم اور تحقیقی کام کے لیئے معمل گاہیں قائم کی گئی ہیں جن کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں مختلف کیمیائی، طبعی اور برقی تجربات کیئے جاتے ہیں جن سے ملک کی صنعت، حرفت اور تجارت کی ترقی کی راہیں نکلیں۔

یونیورسٹی، مدرسہ اور معمل گاہوں اور انجمنوں کے ذریعہ جو تعلیم ہوتی ہے اُس کے علاوہ کتب خانہ، سنما، عجائب خانہ بھی تعلیم کے لیئے بہت مفید ذریعہ ثابت

بنے ہیں چنانچہ اس وقت جمہوریت روس میں ۲۰ ہزار مستقل کتب خانے ہیں اور ۵۰ ہزار
سفری کتب خانے جو روس کے ساڑھے پانچ لاکھ دیہاتوں میں وقتاً فوقتاً دورہ
تے رہتے ہیں، پھر ۳½ ہزار مستقل سنما اور ۱½ ہزار سفری سنما بھی تعلیمی کام کے لئے
ستعمال کئے جاتے ہیں۔ Broad Casting کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا
ام اب حکومت نے شروع کیا ہے۔

سطور بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر روسی
مہوریت نے اپنی قوم کی تعلیم میں کس قدر سرگرمی سے کام کیا اور کیسی حیرت انگیز ترقی
اصل کی ہے۔ اس دس سال کی مدت میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اُس کا
وت بھی عنقریب ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو جانے کے بعد ملجائے گا۔

تنقید و تبصرہ

کتب

ارنسٹ ۔ مخزنِ نجات ۔ مہمات الصرف و النحو ۔ مبادی نباتات۔

ارنسٹ (مصنفہ آسکر وائلڈ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب حجم ۱۰۹ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ لکھائی معمولی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ اچھا۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

آسکر وائلڈ کا یہ ڈراما اس کی تصانیف میں معنوی خوبیوں کے لحاظ سے سب سے ہلکا مگر اسلوب بیان کی شوخی اور ظرافت کے چٹخارے کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے۔ اس کا ترجمہ اسی صورت میں جائز تھا کہ جو دلچسپی اصل میں ہے وہی ترجمے میں پیدا کردی جائے۔ افسوس ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ترجمہ صحیح ہے مگر یہ کافی نہیں۔

کتاب میں پہلے ایک "تقدیم" ہے، پھر مصنف کی اور دونوں مترجموں کی تصویریں پھر سلطان حیدر صاحب جوش کا "پیش لفظ" پھر شبیر حسن صاحب جوش کا "تاثر" پھر مسعود حسن صاحب ذوقی کا "تعارف" پھر انیس مجتبیٰ صاحب کا "اعلام" پھر تمکین کاظمی صاحب کی "تقریب"۔ ان چیزوں سے علاوہ مصنف کی صورت اور سیرت کے ناظرین مترجموں کی شکل سے، ان کے لباس سے، ان کی زندگی کے حالات سے اور کتاب کی طباعت کی مختصر روداد سے بھی واقف ہو جائیں گے اور جو باتیں دریافت کرنا ہوں وہ غالباً خط و کتابت سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ترجمے میں طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جن میں سے بعض کا لمبی چوڑی "تصحیح" میں بھی ذکر نہیں مثلاً صفحہ ۸، سطر ۱۱ اور ۱۳ میں "شکر" کی جگہ "شکریہ"۔ چند غیر مانوس انگریزی الفاظ بجنسہ رکھدئے گئے ہیں اور ان کے معنی حاشیے میں بھی نہیں بتائے گئے مثلاً "کرمپٹ" "مفن"۔ بعض انگریزی الفاظ ایسے ہیں جو غیر مانوس تو نہیں مگر ان کا ترجمہ اُردو میں ہوسکتا تھا مثلاً "مَیڈم" "کمپنی" یعنی صحبت۔ خیر یہ بھی سہی مگر خدا جانے Handle کا تلفظ "ہانڈل"، Hand-bag کا "ہانڈ بیاگ" اور Cloak Room کا "کلاک روم" کیوں ہوگیا۔

باوجود ان باتوں کے کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

مخزن نجات (پہلا حصّہ) (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ۔ حجم ۱۶ صفحے۔ تقطیع $\frac{۲۰×۲۶}{۱۶}$ - لکھائی، چھپائی کاغذ خوشنما۔ قیمت ۴/)

عرب کے معجز بیان کی چالیس حدیثیں مولانا جامی کی منتخب کی ہوئی اور اُن کے منظوم ترجمے کے ساتھ۔ ایسا دینی تبرک اور ایسی ازلی دولت ہر مسلمان اور ہر شائق ادب کے لئے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ شرف الدین احمد خاں صاحب نے اُردو میں بہت عمدہ ترجمہ کرکے اس کے فیض کے دائرے کو اور وسیع کردیا ہے۔

خاصیات الصرف والنحو (مؤلفہ حکیم شیخ عبدالوحید صاحب ندوی شائع کردہ شبلی بک ڈپو، لکھنؤ۔ حجم ۸۰ صفحے۔ تقطیع $\frac{۲۲×۲۹}{۱۶}$، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۲ ؍)۔

افعال کی خاصیتیں خوبی اور اختصار سے سمجھائی گئی ہیں۔ آخر میں نحو کی اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے۔ عربی کے طلبہ کے لئے مفید چیز ہے۔

مبادی نباتات | (از جگموہن لال صاحب چترویدی - حجم ۱۰۳ صفحہ - تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ - لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اوسط درجے کا قیمت عمر - ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی. اسٹیشن روڈ. لاہور)۔

نباتیات کے ابتدائی مسائل سہل اور سلیس عبارت میں سمجھائے گئے ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے سادی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ نہ صرف طلبہ کے لئے بلکہ تمام شائقین علم کے لئے مفید چیز ہے۔

کتاب کا نام مبادی علم نباتات یا مبادی نباتیات ہوتا تو اچھا تھا۔

شذرات

افسوس ہے کہ رسالہ کو وقت پر لانے میں اتنی جلدی نہیں ہو سکتی جتنی ہم چاہتے ہیں آ
پھر بھی اُمید ہے کہ اگست سے ہر مہینہ کا رسالہ اُسی مہینہ میں شائع ہونے لگے گا۔ انشاءاللہ

کارکنان جامعہ ملیہ کی تجویز ہے کہ آئندہ سال اپنے معلّمین کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ماہرین تعلیم کے لکچروں کا انتظام کریں۔ مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل صاحب اور دوسرے اساتذہ نے ازراہ عنایت وعدہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً خود تشریف لاکر لکچر دیا کریں گے اور ہر طرح سے اس تجویز کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔ ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا جب ہو جائے گا تو جامعہ اور پیام تعلیم میں شائع کر دیا جائے گا۔

امیر امان اللہ خاں کا افغانستان کے تخت سے دستبردار ہو کر یورپ چلا جانا نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ایشیا والوں کے لئے صدمے اور عبرت کا باعث ہے۔
امیر صاحب کی نسبت بد قسمتی سے پچھلے دنوں یہ خیال قائم ہو گیا ہے اور قائم کرایا گیا ہے کہ اُن کی زندگی کے سارے کارنامے مغربی تہذیب کی اوچھی تقلید تک محدود ہیں اور اب کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ افغان قوم نے دینی جوش اور قومی غیرت سے کام لے کر اُس شخص کو جو اُن کے دین کو ضعیف اور اُن کے شعار قومی کو معدوم کرنا چاہتا تھا ملک بدر کر دیا ہے اور اب وہ امیر حبیب اللہ کے زیر حکومت سچی اسلامی زندگی بسر کریگی۔
جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں اور دوسروں میں پھیلاتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض جان بوجھ کر اپنے ذاتی فائدے یا ملکی مصالح کی خاطر سچائی کا خون کرتے ہیں،

بعض نیک نیتی اور سادہ لوحی سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے بوجھے ایمان لے آئے ہیں اور بعض صحیح واقعات کا علم رکھنے کے باوجود اپنی تنگ نظری اور تاریک خیالی سے نتیجے اُلٹے نکالتے ہیں۔

... ...

لیکن جو شخص ذاتی اغراض سے پاک ہے اور تھوڑی سی سمجھ اور وسعت نظر رکھتا ہے وہ افغانستان کے حالات پر نظر ڈالتے ہی یہ رائے قائم کریگا کہ امان اللہ خاں کی ذات اُن کی قوم کے لئے بہت بڑی نعمت تھی جسے کھو کر وہ بہت جلد پچھتائے گی۔ امیر صاحب کا یورپ کی ظاہری زندگی کی تقلید پر اس قدر زور دینا بجائے خود قابل اعتراض ہو لیکن اس کی وجہ سے اُن کی گراں قدر قومی اور ملکی خدمت کو یک قلم فراموش کر دینا انتہائی بے ایمانی، یا تعصب، یا جہالت ہے۔

... ...

یورپ کی تقلید کا مسئلہ بہت طویل بحث کا محتاج ہے۔ اس وقت ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے لباس وغیرہ کا رائج کرنا امیر امان اللہ خاں کے کام کا صرف ایک پہلو ہے جس سے اُن کی مجموعی خدمات پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ جو قومیں اُنکی مخالف ہیں انہیں دینی جوش یا قومی غیرت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کی مخالفت کی وجوہ بالکل دوسری ہیں۔

... ...

امیر امان اللہ خاں نے جو مفید اصلاحات اپنے ملک میں کیں اُنکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے :-

(۱) صنعت و حرفت کو فروغ دینا۔

(۲) لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی ترقی میں انتہائی کوشش کرنا اور طلبہ کو وظیفے
مغربی ممالک اور ٹرکی بھیجنا ۔
(۳) باضابطہ اور منظم فوج تیار کرنا ۔
(۴) امرا کی قوت کو کم کر کے بادشاہ کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا اور اس
افغانوں کے مختلف جرگوں کے مجموعے کی جگہ ایک قوم بنانے کی کوشش کرنا ۔
(۵) اصلاح معاشرت خصوصاً عورتوں کی اصلاح و ترقی کی تدابیر اختیار کرنا ۔

. . .   . . .

ان میں سے نمبر ۵ کو مابہ النزاع سمجھکر چھوڑ دیا جائے تب بھی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کی بنا پر تاریخ امان اللہ خاں کا شمار افغانستان کے سچے خادموں اور محسنوں اور دنیا کے قابل ترین حکمرانوں میں کریگی ۔

. . .   . . .

اب رہے ناکامی کے اسباب تو اُن میں سب سے بڑا سبب اُمرا کی غداری ہے جب انہوں نے اپنی دولت اور حکومت کو خطرے میں دیکھا تو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے امیر صاحب کی مخالفت شروع کی اور بھولی بھالی رعایا کو اُن کے خلاف اُبھارنا شروع کیا ۔ انہوں نے ایک طرف تو افغانستان کے بیرونی دشمنوں سے اور دوسری طرف اُسکے اندرونی دشمنوں یعنی ملاؤں سے ساز باز کر کے اپنی قوت کو اور مضبوط کر لیا ۔

. . .   . . .

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کو اپنی کوششوں میں خود امیر صاحب کی ناعاقبت اندیشی سے بڑی مدد ملی ۔ امیر صاحب نے اصلاحات کے معاملہ میں عجلت اور بےصبری سے کام لیا ۔ ملک کی اقتصادی حالت سنبھلنے سے پہلے انہوں نے اس پر اتنا مالی بوجھ ڈال دیا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ یورپ کی تقلید میں سب سے بڑی غلطی جس کے

ایشیائی مرتکب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختلاف حالات پر غور کئے بغیر وہ یورپ والوں کی طرح فضول خرچی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی کے لئے شاندار مدرسے، روشن خیالی کیلئے بجلی کی روشنی، ذہنی ترقی کے لئے قیمتی ساز و سامان ضروری ہے کیونکہ یورپ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یورپ نے یہ مرفہ الحالی دوسری قوموں کو لوٹ کر اور غلام بنا کر حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اس معاملہ میں اسکی ریس نہیں کر سکتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مادی فلاح کا موجودہ معیار ذہنی ترقی کا آئینہ نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ میں بھی جو قومیں ذہنی دولت سے مالامال ہیں انہیں دولت دنیا میں دوسروں سے کم حصہ ملا ہے۔

... ...

یہی غلطی امیر امان اللہ خاں سے بھی سرزد ہوئی۔ انھوں نے اپنے اور اپنی قوم کے معیار زندگی کو بڑھانے کی کوشش میں بھاری محصول لگائے اور اُن کے وصول کرنے میں سختی کی۔ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی جس سے امرا اور ملاؤں نے فائدہ اُٹھایا اور چونکہ امیر صاحب نے یورپ سے واپسی کے بعد اصلاح معاشرت میں بہت شدت شروع کردی تھی اس لئے ان لوگوں نے حامئ دین بن کر جہلا کے قدامت پرستانہ جذبات کو ابھارنا شروع کیا۔

... ...

ان سب باتوں کے ملجانے سے ملک میں ایسی آگ لگ گئی جسے امیر امان اللہ خاں نہ بجھا سکے اور آخر انہیں اپنے ملک کو طوائف الملوکی کی حالت میں چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں پھر افغانستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ افغانستان کے بہی خواہ سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ سے امیر صاحب کی واپسی اُن کی اصلاح اور انکی کامیابی کی دعا کریں۔

سیرۃ نبوی پر مستند و مفید کتابیں

سیرۃ النبی علامہ شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق اور مقتدر تصنیف :-
حصہ اول للعہ / حصہ دوم ۓ / حصہ سوم صہ

خطبات مدراس سیرۃ نبوی پر مولنا سید سلیمان ندوی کے گرانقدر، بصیرت افروز اور پر کیف آٹھ مفید و موثر لیکچر۔ قیمت ۱ؔہ

رحمۃ للعالمین قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مشہور اور مقبول ترین کتاب
حصہ اول عؔہ / حصہ دوم للعہ

سیرۃ خیر البشر ۔ از مولنا محمد علی امیر شریعت احمدیہ لاہور۔ قیمت ؏

اسوۂ حسنہ علامہ ابن قیم شاگرد رشید امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب زاد المعاد کے اختصار کتاب ہدی الرسول کا اردو ترجمہ از مولنا عبد الرزاق ملیح آبادی۔ :

تذکرۃ المصطفیٰ ۔ از پروفیسر سید نواب علی صاحب پرنسپل جوناگڈھ کالج قیمت عہ

نشر الطیب ۔ از مولنا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔ قیمت عہ

لڑکے، لڑکیوں، عورتوں اور عام مطالعہ کے لئے

ہمارے نبیؐ
از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے قیمت ۱ہ

ہمارے رسولؐ
از مولنا خواجہ عبد الحی استاذ جامعہ ملیہ قیمت

سرکار کا دربار
از احمد الیاس صاحب مجیبی قیمت عہ

سیرۃ الرسولؐ
از مولنا محمد اسلم جیراجپوری استاذ جامعہ

مکتبہ جامعہ ملیہ - دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

ولنا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی

لد ۱۲	بابتہ ماہ جون ۱۹۲۹ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول

مارکس اور مذہب اشتراک

ہر اس چیز کی طرح جو زندگی رکھتی ہو اشتراک بھی ایک رجحان ہے نہ کہ بندھے ہوئے نظریوں کا ایک معین اور تعریف پذیر مجموعہ۔ اگر اشتراک کی تعریف کیجائے تو یقینی ہے کہ اس میں بعض خیالات شامل ہو جائیں گے جو اکثر لوگوں کے نزدیک غیر اشتراکی ہیں اور دوسرے ایسے خیالات خارج ہو جائیں گے جو شامل ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اشتراک کی اصلیت سے سب سے زیادہ قریب تر ہونگے، اگر ہم اس کی تعریف یہ کریں کہ یہ زمین اور سرمایہ کے اجتماعی ملک ہونیکی حمایت کا نام ہے۔ اجتماعی ملک کے معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک جمہوری ریاست کی مِلک، لیکن اس میں کسی ایسی ریاست کی ملک شامل نہیں سمجھی جاسکتی جو جمہوری نہ ہو۔ اجتماعی ملک کے معنی جیسا کہ نراجی اشتراکی سمجھتے ہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک گروہ کے مرد اور عورتوں کی آزاد جماعت مالک ہو بلا ان جبری قوتوں کے جو ریاست بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ بعض اشتراکی توقع کرتے ہیں کہ یہ اجتماعی ملک یک بیک اور اپنی کامل صورت میں ایک تباہ کن انقلاب کے ساتھ ساتھ آجائے گی، دوسرے امید کرتے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ آئے گی، پہلے ایک صنعت میں بعد کو دوسری میں۔ بعض اصرار کرتے ہیں کہ زمین اور سرمایہ کا یہ تمام وکمال جمہور کے ہاتھ میں آنا لازمی ہے، دوسرے

اس پر قانع ہیں کہ کہیں کہیں ملکیت شخصی کے جزیرہ سے باقی رہجائیں بشرطیکہ یہ بہت وسیع اور طاقتور نہ ہوں ۔ ان سب شکلوں میں جو چیز مشترک ہو وہ ہر جمہوریت اور موجودہ نظام سرمایہ داری کا کامل یا تقریباً کامل انہدام ۔ اشتراکیوں ، نراجیوں اور سنڈکلیوں کا باہمی فرق زیادہ تر اس امر پر منحصر ہے کہ یہ جمہوریت ہو کس قسم کی ۔ اصلی اشتراکی حکومت کے میدان میں جمہوریت مشورتی کو کافی سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہو کہ دستور ریاست کی اس شکل میں جو خرابیاں آجکل معلوم ہوتی ہیں وہ سرمایہ داری کے مٹ جانے سے خود مٹ جائیں گی ۔ برخلاف اس کے نراجی اور سنڈکلی سارے کے سارے مشوری نظام کے خلاف ہیں اور جماعت کے سیاسی معاملات کے انضباط کے لئے یہ ایک دوسرا طریقہ چاہتے ہیں ۔ لیکن یہ سب کے سب جمہوری اس معنی میں ہیں کہ سب ہر قسم کی مراعات اور ہر نوع کی مصنوعی عدم مساوات کو مٹانا چاہتے ہیں ۔ سب کے سب موجودہ جماعت میں مزدور کے حامی ہیں ۔ تینوں کے معاشی مذہب میں بھی بہت کچھ مشترک ہو ۔ تینوں سرمایہ داری اور نظام مزدوری کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ یہ مالک طبقوں کے اغراض کے لئے مزدور سے بیجا فائدہ اٹھانے کے ذرایع ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ (دولت) پیدا کرنے والوں کو آزادی دلانے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے یعنی کسی نہ کسی شکل میں ملکیت اجتماعی کا قیام ۔ لیکن اس مشترک مذہب کے ڈھانچے کے اندر بہت سے فرقے ہیں اور خود ان میں جنہیں تنگ معنوں میں اشتراکی کہنا چاہئے نہایت قابل لحاظ اختلافات موجود ہیں بحیثیت ایک طاقت کے یورپ میں اشتراکیت کی ابتدا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارکس سے ہوئی ۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے بھی انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں اشتراکی نظریے موجود تھے ۔ یہ بھی سچ ہو کہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں فرانس میں اشتراکی نے تھوڑے عرصہ کے لئے ریاست میں خاصہ

اثر حاصل کرلیا تھا۔ لیکن مارکس سے پہلے جو اشتراکی ہوئے انکا رجحان عموماً خیالی خواب دیکھنے کیطرف تھا، چنانچہ یہ کوئی طاقتور یا پائدار سیاسی جماعت (پارٹی) نہ قایم کرسکے۔ یہ مارکس کا حصہ تھا کہ اُس نے انگلس کی مدد سے اشتراکی مسائل کا ایک مربوط مجموعہ تیار کیا جس میں اتنی سچائی تھی یا جو بظاہر اتنا معقول معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی کثیر تعداد کے دماغوں پر حاوی ہوسکے اور نیز بین الملل اشتراکی تحریک کی بنیاد ڈالی جو پچھلے پچاس سال میں یورپ کے تمام ممالک میں برابر بڑھتی رہی ہے۔

مارکس کا مذہب سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ ان اثرات کے متعلق ہم کچھ واقفیت حاصل کریں جنہوں نے مارکس کے خیالات بننے میں مدد دی۔ یہ ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے صوبہ رہائن کے ایک مقام تریوس میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ ایک قانونی عہدیدار تھا اور نسلاً یہودی جس نے برائے نام عیسائیت قبول کرلی تھی۔ مارکس نے قانون، فلسفہ، معاشیات اور تاریخ کی تعلیم مختلف جرمن یونیورسٹیوں میں حاصل کی۔ فلسفہ میں اس نے ہیگل کے مذہب کا اثر لیا جو اس زمانہ میں معراج شہرت پر تھا اور ان مسائل کا کچھ نہ کچھ اثر تمام عمر اس کے خیال پر باقی رہا۔ ہیگل کی طرح اس نے بھی تاریخ میں ایک خیال کی نشو و نما دیکھی۔ اس نے تغیرات عالم کا تصور یوں قایم کیا کہ یہ گویا منطقی منازل کی ایک کڑی ہو جس میں ایک حالت انقلاب کے ذریعے ایسی دوسری حالت میں بدل جاتی ہو۔ جو اس کی ضد ہو۔ یہ ایک تخیل ہے جس نے اس کے خیالات کو ایک سخت تجرید کا رنگ دیدیا تھا اور بجائے ارتقار کے انقلاب پر اعتماد۔ لیکن ہیگل کے زیادہ قطعی مسائل میں سے مارکس میں جوانی کے بعد کوئی بھی باقی نہ تھا۔ اسے لوگ نہایت ذہین طالب علم تسلیم کرتے تھے اور یہ بہ حیثیت پروفیسر یا سرکاری عہدیدار کے نہایت خوشحال زندگی بسر کرسکتا تھا، لیکن اس کی سیاسی دلچسپی اور اس کے

انتہا پسند خیالات نے اسے زیادہ دشوار گذار راستوں پر لا ڈالا۔ ۱۸۴۲ء ہی میں یہ ایک اخبار کا مدیر ہوگیا جسے اس کے انتہا پسند خیالات کی وجہ سے اگلے سال کے شروع ہی میں پروشیا کی حکومت نے بند کردیا۔ چنانچہ مارکس نے پیرس کی راہ لی۔ یہاں یہ اشتراکی کی حیثیت سے مصروف کار ہوگیا اور اپنے فرانسیسی پیشروؤں[1] کے متعلق علم حاصل کرتا رہا۔ یہیں ۱۸۴۴ء میں اَنگلس سے اس کی وہ دوستی شروع ہوئی جو ساری عمر قائم رہی۔ اَنگلس اس زمانہ تک بسلسلہ کاروبار مینچسٹر میں تھا، اس نے یہاں انگریزی اشتراکیت سے واقفیت حاصل کی تھی اور بڑی حد تک اس کے مسائل کو قبول کیا[2]۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس پیرس سے نکالا گیا اور انگلس کے ساتھ بروسیلز میں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اس نے "جرمن مزدوروں کی جمعیت" قایم کی اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا جو اس جماعت کا آرگن تھا۔ بروسیلز کی کارگذاریوں کے سلسلہ میں پیرس کی جرمن اشتراکی لیگ کو اس سے واقفیت پیدا ہوئی اور اس لیگ نے ۱۸۴۷ء کے ختم پر اسے اور انگلس کو دعوت دی کہ انکے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں، جو جنوری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ہے وہ مشہور "اشتراکی اعلان" جس میں پہلی مرتبہ مارکس کا نظام پیش کیا گیا۔ یہ بڑے

---

(۱) ان میں سے خاص فورئیے اور ساں سیماں تھے جنھوں نے اشتراکی ریاستوں کے کچھ خیالی نقشے تعمیر کئے تھے۔ پرودھاں کو جس سے مارکس کے کچھ بہت دوستانہ تعلقات نہ تھے بجائے اشتراکی کے نراجیوں کا پیشرو سمجھنا چاہئے۔

(۲) مارکس اپنی کتاب "فلسفہ کا افلاس" (۱۸۴۷ء) میں انگریزی اشتراکیوں کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتا ہے۔ خود اسکی طرح یہ بھی اپنے دلائل کو ریکارڈو کے نظریہ قدر پر قایم کرتے ہیں لیکن اس کا سا تبحر اور اس کی سی علمی وسعت نہیں رکھتے۔ ان میں ٹامس ہاجکن (۱۷۸۷-۱۸۶۹)

اچھے وقت شائع ہوا۔ اگلے ہی مہینہ، فروری میں پیرس میں انقلاب برپا ہوا اور مارچ میں جرمنی تک پھیل گیا۔ انقلاب کے خوف سے بروسلیز کی حکومت نے مارکس کو بلجیم سے خارج کر دیا لیکن جرمنی انقلاب نے اس کے لئے خود اپنے ملک میں واپسی ممکن کر دی۔ جرمنی میں اس نے پھر ایک اخبار نکالا جس نے اسے پھر ارباب حکومت سے ٹکرایا اور جوں جوں انقلاب کا ردعمل زور پکڑتا گیا یہ مخالفت بھی بڑھتی گئی۔ جون ۱۸۴۹ء میں اسکا پرچہ بند کر کے اسے پروسیا سے خارج کر دیا گیا۔ یہ پیرس واپس گیا لیکن وہاں سے بھی نکالا گیا۔ چنانچہ یہ جا کر انگلستان میں مقیم ہوا، جو اس وقت حامیان حریت کا مامن بنا ہوا تھا، اور اشاعت تحریک کے سلسلہ میں جو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے لئے یہ باہر گیا اس سے قطع نظر یہ اپنی موت یعنی ۱۸۸۳ء تک انگلستان ہی میں رہا۔ اس کے وقت کا زیادہ حصہ اپنی بڑی کتاب "سرمایہ" کی تالیف میں صرف ہوا۔ آخری زمانہ میں اسکا دوسرا اہم کام "مزدوروں کی بین الملل جمعیت" کے قیام اور توسیع پر مشتمل تھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد اس کے وقت کا زیادہ حصہ "برٹش

کا نام لیا جاسکتا ہے جو پہلے بحری افسر تھا لیکن بحری نظم کے طریقوں پر ایک تنقیدی رسالہ لکھنے کی وجہ سے موقوف کر دیا گیا۔ اس کی تصنیف سے "سرمایہ داری کے خلاف محنت، ومانع" (۱۸۲۵ء) اور دوسری کتابیں ہیں۔ نیز ولیم ٹامس (۱۷۸۵-۱۸۳۳) مصنف کتاب "تحقیق بابتہ اصول تقسیم دولت جو انسانی خوشحالی کے لئے سب سے زیادہ معین ہوں" (۱۸۲۴ء) اور "محنت کا انعام" (۱۸۲۵)؛ اور پیرسی ر آون اسٹون جس سے ہاجکن نے زیادہ تر اپنے خیالات لئے ہیں۔ غالباً ان سب سے زیادہ اہم رابرٹ اودن تھا

(۱) اس کی پہلی اور سب سے اہم جلد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اور باقی دو جلدیں اس کے انتقال کے بعد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں

میوزیم" میں صرف ہوا جہاں یہ جرمن اصبر کے ساتھ، نظام سرمایہ داری کے خلاف اپنی بے پناہ قرار داد جرم کے لئے مواد جمع کرتا تھا۔ لیکن بین الملی اشتراکی تحریک پر اسکا قابو برابر قایم رہا۔ نپولین کے بھائیوں کی طرح اکثر ملکوں میں اس کے داماد اس کے نائب تھے اور جو اندرونی مناقشے پیدا ہوتے تھے ان میں عموماً اسی کی مرضی غالب رہتی تھی۔

ہندوستان میں تنقیدِ فن کا دورِ جدید

(۱)

فن اور تنقیدِ فن

جس طرح زمین و آسمان، ابر و باد و باراں، شجر حجر بشر، کرشمے ہیں قدرت و ذات خداوندی کے اسی طرح رنگینیِ شعر و رنگ آمیزیِ تصویر، موجِ رقصِ شیریں اور جوئے شیر فرہاد، بتانِ آذر اور سبحۂ خلیل جلوے ہیں قدرت و ذات انسانی کے یہ دونوں یعنی ایک طرف بہ زبان انگریزی 'نیچر' اور دوسری طرف آرٹ، تخلیقی پہلو ہیں ایک فردِ مدرک، ایک شخصیت کے۔ ہم کو یہ پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ یورپ میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آرٹ کی نیچر پرستی کے بعد جسے نسل انسانی کے فنی ارتقا کے دورِ اول کی تکمیل سمجھنا چاہیے، جو فنی انقلاب اکسپرشنزم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے اس کے پہلے ریلوں کے رفع دفع ہونے کے بعد آج ہم ٹھنڈے دل سے حال اور ماضی کے فنی کارناموں کا موازنہ کر سکتے ہیں، اور اس موازنے سے ہم پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ جس وقت انسان اپنا منصب تخلیقِ صورت کھو بیٹھتا ہے اور محض نقالیِ فطرت یا اتباعِ طرز و نقوشِ پارینہ کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے، اس کی کوششوں پر لفظ آرٹ کا کسی صورت سے اطلاق باقی نہیں رہتا۔ جذبات کے نقوش کو الفاظِ رنگیں کا جامۂ صد آہنگ پہنانا، اسی کا نام ہے شاعری اور جذبات کے پرتووں کی نقش و رنگ سے تنویر کر دینا اسی کا نام ہے مصوری۔ جس طرح الفاظ کے ٹھنڈے بے جان موتیوں کو ردیف و قافیہ کی لڑیوں میں پرونے والے کو ہم شاعر نہیں بلکہ ناظم کہتے ہیں

اسی طرح مشاہدات فطرت کو کینوس یا کاغذ پر جیسے کا تیسا بنا دینے والے کو ہم تصویر ساز کہیں مصور نہیں کہہ سکتے۔ شاعری جزو پیغمبری اور پیغمبری جزو خدائی اگر ہے تو آفرینش کی بنا پر اور مصور پر اگر دعوائے خدائی کا الزام عاید کیا جاتا ہے تو یہ بھی آفرینش ہی کی بنا پر۔ فن غالب و فن مانی کی بنیادی نوعیت ایک ہے۔ یہ ایک بڑا ادبی عجوبہ ہے کہ شاعر کو تو مصور جذبات کہیں اور مصور کا مصور جذبات ہونے سے کوئی واسطہ نہ سمجھیں اور اسکی ایک کاریگر کی سی حیثیت قرار دیدیں جو گارے اینٹ کی چنائی کے بجائے رنگ آمیزی میں سر کھپایا کرے اور اپنی باریکی قلم کو معراج فن کا معیار ٹھہرائے۔ زمانہ حال کے مغربی نکتہ رس آرٹ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "آرٹ اشکال پُر اظہار کی تخلیق کا نام ہے" لیکن میں اس طوالت کی ضرورت نہیں خیال کرتا کیونکہ ہر وہ شکل جس کی واقعی تخلیق کیجائے اور جو محض مشاہدہ فطرت کی نقل نہ ہو وہ لابد مظہر ہوگی جذبات شخصی کے پس منظر کی۔ آرٹ یا فن سے مراد ہے تخلیق اشکال۔

لیکن ہر بنائی ہوئی شکل پر تخلیق فنی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ تخلیق فنی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی شکل کو اصل میں اس شکل کی خاطر اور محض ضمناً افادی اغراض کی بنا پر بناتا ہے۔ جب انسان نے اپنا پہلا پیالہ بنایا ہوگا تو جو شکل اس نے اس پیالے کی بنائی اس کے دائرے اور اس کی ہیئت، اس کی ضروریات مادی کے نتیجہ نہ تھے بلکہ اس کے انفرادی ترنگ اور من کی موج کا نتیجہ تھے۔ میں خاص طور پر یہ کہنے سے احتراز کرتا ہوں کہ وہ اس کے حسن لطیف اور اس کی ذوق جمال پر مبنی تھے۔ حسن ایک تصور اضافی ہے اور کسی ایسے معیار کا متحمل نہیں جس کا ہر زمان و مکان پر اطلاق ہوسکے۔ فن کی تعریف حسن کے معیار سے کرنا ایک امر بے معنی ہے۔ مزید برآں یہ جمالی نقطہ نظر انسان کی تخلیقی امنگ اور صلاحیت پر ایسے قیود عاید کردیتا ہے جو

کی جدت و شدت اظہار کے لئے نہایت درجہ محدود کن ثابت ہوتے ہیں بلکہ بنا ہو جاتے ہیں فن کی بے بضاعتی اور اس کے جمود کی۔ مثالاً ہم یونانی بت تراشوں اور مغل اسکول کے مصوروں کو پیش کر سکتے ہیں جنکا معیار سراسر جمالی تھا۔ کس درجہ غیر محرک اور بے رس معلوم ہوتے ہیں انکے عمل چینی مصوروں کی آزاد قلمی اور ہندی بت تراشوں کی دیوانہ واری کے سامنے۔

اور جب انسان نے اپنا پہلا بت پرستش کے لئے تراشا تو اس کی شکل کسی مادی ضرورت کی پابند نہ تھی بلکہ اس کی اپنی انفرادی ترنگ کا مظہر تھی اور انہی انفرادی ترنگوں سے رفتہ رفتہ حسن کے ان معیاروں کا ارتقا ہوا ہے جو آج ہمارے پیش نظر ہیں اور انہیں انفرادی ترنگوں کی مجموعی قوت کی بنا پر آئے دن یہ معیار بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔

لہذا فن کا جمالی پہلو بھی اسی قدر عارضی ہے جتنا کہ اسکا اخلاقی پہلو اور ہرگز اس کا جوہر نہیں۔ فن، حسن اور اخلاق دونوں کی قیود سے بالاتر اور آزاد ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے وہ جلوہ ہے انسان کی جذباتی کشمکشوں اور اس کی تخلیقی امنگوں کا۔ یہی کشمکش اور یہی امنگیں کہیں شعر اور ترنم بنکر "فردوس گوش" ہوتی ہیں تو کہیں تصویر اور کہیں رقص کی صورت میں "جنت نگاہ" کا اثر رکھتی ہیں۔ انہیں کشمکشوں اور امنگوں کا نتیجہ ہیں میلو کی زہرہ اور داونچی کی مونالیزا، نٹ راج شوا اور اجنتا کی کوہ تراشیاں، دہلی کی مسجد اور آگرے کا تاج، بیتھوون کی سمفونیاں اور موزارٹ کے آپیرے۔ حافظ و غالب کے اشعار اور رومی و اقبال کی مثنویاں۔

میں نے سطور بالا میں کوشش اس امر کی ہے کہ فن سے جو کچھ مراد ہے اس کو مختصراً بیان کر دوں اور اس نقطۂ نظر کو واضح کر دوں جو ہم کو فن کے سمجھنے اس کی تنقید کرنے اور اس سے لذت یاب ہونے میں غلط روی و دارزانی سے بچائے اور ہندوستان

کے موجودہ مسئلہ فن پر ایک رائے قائم کرنے میں ہماری رہبری کرے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا
چاہئے کہ فن سے لذت یاب ہونے یا فن کے برتنے کے لئے کسی نقطہ نظر کا دانستہ وجود
لازم ہے۔ فن اپنے ارتقا کے بالاترزینوں پر پہنچکر یعنی جہاں وہ صنّاعی سے ہٹکر ایک
مستقل تمدنی شعبہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے سراسر امرقع ہوتا ہے انسان
کی زندگی کے جذباتی پہلو کا۔ چنانچہ انسان ذہنی نقطہ ہائے نظر اور نظریات فن سے
جس قدر آزاد ہوگا اسی قدر اس کے فنی کارنامے پرزور اور بے لاگ ہونگے یہی
ہے کہ جیسے جیسے ذہنی وعلمی نقطہ نظر دنیا پر غالب آتا گیا ہو ویسے ویسے فن کی شدت کیف
گھٹتی گئی ہے اور آج ہماری مجال نہیں کہ ہم فن کے پرانے کارناموں کا کیا بہ لحاظ
وزن وجسامت اور کیا بہ لحاظ زور وشدت ایک آن مقابلہ کرسکیں۔ بلکہ فن سے
واقعی لطف اندوز ہونے میں بھی ذہنی عنصر کا وجود ایک بڑی حد تک حائل رہتا ہے
گو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے ادراک میں ایسی باریکی پیدا کردیتا
جو بذات خود لطف خاص سے خالی نہیں۔

لیکن ہمارا دور بیسویں صدی عیسوی کا دور ہے یعنی کیمرے اور سنیما کا
اور ہوائی جہازوں نے تمدنی کنارہ کشی کے آخری امکانات کو مسمار کردیا ہے۔
گو اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور اس میں نئی نوع انسان کی سرا
بہتری ہے لیکن اس خیال سے کہ ہم اپنے ہیرے جواہرات کو گاہلوتیزی رنگ برنگی
کے بدلے انکی غیر معمولیت سے متحیر ہوکر تبدیل نہ کرلیں جیسا کہ امریکہ کے وحشی باشندو
کے متعلق مشہور ہے۔ یا سمندر پار سے جو کچھ کوڑا کچڑا ببمبئی تک بہہ آوے اسے
عجائب روزگار ہی سے نہ سمجھیں ہم پر لازم ہے کہ ہم ذہنی عنصر کو استعمال کر
ہم پر لازم ہے کہ ہم تشریح کریں، چھان بین میں سرماریں اور تفریق وترتیب سے
لیں۔ کسی کارنامہ فن سے محظوظ یا متغض ہوتے وقت اپنی دماغی کیفیت اور

ہی ساتھ کاغذ پر جو نقش و رنگ ہیں انکی تشریح کریں۔ مختصراً یہ کہ ہم کو لازم ہے کہ ہم اپنے اندر تنقید کی صلاحیت بہم پہنچائیں۔

لیکن دراں حالیکہ آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے اصحاب فن موجود ہیں جنکا پلہ دنیا کے بڑے سے بڑے صاحب فن سے کسی صورت سے کم نہیں، کیا ہم اپنے یہاں صحیح معنوں میں نقاد فن کی ایک مثال بھی پیش کرسکتے ہیں؟ جو مضامین ہندوستان کے روزانہ اخباروں اور رسالوں میں فنی تنقید کے نام سے شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہندوستان کے جلیل سے جلیل اور کم پایہ سے کم پایہ مصوروں کی کم و بیش ایک ہی جیسے الفاظ میں مدح سرائی کیجاتی ہے ان کو پڑھکر جو روحی صدمہ ہوتا ہے اس کا بیان عبث ہے اور اس کی ساری ذمہ داری صرف ہندوستانیوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انکے معلمین فن یعنی انگریز جو ہندوستان میں فن اور معیار فن کی ٹکسال قائم کئے ہوئے ایک شان ہمہ دانی کے ساتھ جلوہ گستر ہیں بذات خود فن کے معاملہ میں فطرتاً حد درجہ کند حس واقع ہوئے ہیں۔ انگلستان میں مسٹر کلاسوبل ایک دل خوش کن استثنا رہی، (بلکہ یہاں تک ماننا پڑے گا کہ یورپ کے موجودہ نقادان فن میں انکا انداز بیان سب سے زیادہ صاف اور واضح ہوتا ہے، گو یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ انکی تنقید کی نشو و نما پیرس کے ارباب فن کے جم گھٹوں میں ہوئی)۔ لیکن سویز کے اس طرف کا کیا رنگ ہے؟ - جس عنوان سے وہ کسی آرٹسٹ کے عمل پر نکتہ چیں ہوتے ہیں وہ کمتر مستثنیات سے قطع نظر سراسر کھوکھلا اور مضحک ہوتا ہے اور اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ انکے اندر حس فن جو ایک نقاد سخن کے لئے ناگزیر ہے موجود نہیں۔ وہ مباحث فنی کے متعلق جو ایک لاطائل لفظی گورک دھندوں کی زبان قائم ہوگئی ہے کسی غریب کی تعریف یا کسی غریب کی مذمت میں صرف کرتے ہیں اور ہمیں اپنے ممدوح یا معتوب کے متعلق کوئی واقعی

اطلاع مطلقاً نہیں دیتے ۔ نقاد کی ذمہ داریاں دوہری ہوتی ہیں ۔ اسکا فرض اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ عام افراد سے، جن میں تنقیدی صلاحیت اور حسِ فن کم ہوتی ہے فنی کارناموں کو قرین تر کردے اور ان کارناموں سے جو کیفیات خود اس پر طاری ہوتی ہیں خواہ بزبانِ حال خواہ بزبانِ قال دوسروں پر منتقل کردے، اور ان میں اچھے برے کی تمیز کا جذبہ مشتعل کردے ۔ ضمناً وہ آرٹسٹ کے لئے بھی امداد کا باعث ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ وہ اس کے کمزور پہلوؤں میں چٹکیاں لے لے کر اسے خوابِ غفلت سے جگاتا ہے ۔ ممکن ہو کہ وہ اس کو اکثر آمادۂ بغاوت کردے لیکن نقاد آرٹسٹ کو جمود سے محفوظ رکھتا ہے ۔

یہ صورت تو بہترین صورت اور نقاد کی یہ حیثیت بہترین حیثیت ہوگی لیکن ایک بڑا خطرہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ساکھ جم جانے کے بعد نقادِ فن سے دلالِ فن ہو کر نہ رہ جائے ۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم کو بتلا دے کہ کون کیا ہے، کہاں تک ہے، اور کیوں، وہ آرٹسٹوں کو کیڑوں کے حیاتیاتی نمونوں کی طرح شیشوں میں بند کر کر کے ان پر ان کے ناموں اور داموں کی چٹھیاں چپکانے لگتا ہے ۔ بجائے نقش و رنگ کے وہ سونے اور چاندی کو معیار قرار دینے لگتا ہے اور آرٹ کے بازار پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہو جس طرح مسٹر مانٹیگو ایک زمانے میں چاندی کے بازار پر حاوی تھے یا شاید اب بھی ہوں ۔ یہ ہی دراصل وہ وبا جو آج کل یورپ میں عام ہو رہی ہے اور ہم کو اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اسکا عہدِ مغلیہ کی سرپرستی فن سے بھی زیادہ یہ اثر ہوتا ہے کہ آرٹسٹ ایک مزدور بنکر رہ جائے اور اس پر "حکم سرکار کا ظلم دربار کا" صادق آئے ۔ بہرحال جو کیفیت آجکل ہماری ہے ہندوستان میں تو ناگفتہ بہ ہے از فن کی طرف سے ہمارا نقطۂ نظر کلیتاً غلط ہے ۔ عوام، جن میں ابتک فنی خود شناسی پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ انکے دلوں کو تو انگریزی باتصویر پوسٹکارڈوں نے مسخر کر رکھا ہے

کرلیا ہے۔ میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ عوام سے میری مراد غریب و مفلس دہقانی نہیں کیونکہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور یہ دہقانی ایک ہی صف میں نظر آئیں گے بلکہ عموماً دہقانی کی حسیات ان سے زیادہ تیز اور صحیح پائی جائینگی۔ اب رہے ایسے لوگ جو فن کا کچھ احساس رکھتے ہیں تو وہ عجیب عجیب مضحک خیالوں اور منصوبوں کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر فن کو ایک قومی معاملہ بناتے ہیں اکثر ان سے بھی بڑھکر اس کو ایک مذہبی معاملہ بنائے بیٹھے ہیں یعنی ایک طرح کا ہندو مسلم سوال۔ اجنٹا ہندوؤں اور قوم پرستوں کا مسلک ہے تو تاج خلافتیوں کا منتہائے نظر۔ لیکن دونوں کے دونوں کرانٹ مارکٹ کے مبتذل ٹکے ٹکے والے یا تصویر پوسٹ کارڈوں پر دل وجان سے ریجھ جائیں اور اپنی بدمذاقی کا ذرا احساس نہ کریں۔ ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اکثر امریکی سرپرستوں کی صلاح کے بموجب احتیاط کے پیرو ہوکر ہندوستان کے "خالص آرٹ" کی "خدمت" کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان حضرات سے کہوں گا کہ خدا کے لئے آپ اپنے اپنے کام سے لگئے اور ہندوستان غریب کے آرٹ اور اس کے مسئلے کو اس کے حال پر چھوڑئے۔ ان خیالات کو دماغ میں جگہ دیکر تصویریں انگلینی نہ شروع کر دیجئے۔ تصویر بنانے اور شروع بنانے لیکن جب، کہ جیسے کسی کے دل میں درد ہو اور اس سے پیچھے بغیر نہ بنے، یا یوں کہ آپ کو کچھ کہنا ہے جو آپ کے خیال میں کسی اور نے ابتک نہیں کہا ہے، یا اس لئے بھی کہ پیٹ ہر شخص کے ساتھ ہے اور اسکا پالنا لابد، اور اپنی رنگ آمیزی اور تصویر سازی کے گر سب کے لئے ہیں لیکن خدارا آپ ملک و قوم یا بنی نوع انسان کی خدمت کے خیال سے قلم کو جنبش نہ دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان امریکی حضرات نے جو بے نقص سوٹ زیب تن کئے ہوئے کیل کانٹے سے بالکل درست، غریب فاقہ کش ہندوستان کو ایک مہینے اور اجنٹا کو ایک دن میں نپٹانے کے لئے نئی دنیا سے آتے ہیں ہمارے لئے بہت کچھ باعث مضرت

ثابت ہو رہے ہیں ۔ ہندوستانی کم از کم اتنا تو ہے کہ اپنے فنی احساسات میں
ایمانداری سے کام لیتے ہیں اور خود کو دھوکے میں نہیں ڈالتے ۔ میں کہیں بہتر سمجھتا
ہوں کہ وہ مبتذل اور بد مذاق تصویروں کو دل سے لگائیں بجائے اس کے کہ وہ اعلیٰ
کی تصویروں کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ کے حال میں مبتلا ہوں اور خود فریب
اضطراری کیفیات اپنے اوپر طاری کریں ۔ میں نے ان جہانیاں جہاں گشت غولوں
کو یورپ میں برسوں دیکھا ہے اور ان سے خوب واقف ہوں ۔ دنیا کے بہتر سے بہتر
فنی کارناموں کو دیکھتے وقت انکا رویہ قابل دید ہوتا ہے ۔ "تحیر انگیز!" "کس
درجہ تحیر انگیز!" ان میں سے ہر دیکھنے والا اور دیکھنے والی تھوڑے تھوڑے وقفہ
کے بعد کہتی رہے گی ۔ ساتھ ہی اس قسم کے اظہار خیال ہوتے رہتے ہیں کہ "یہ لاکھوں
میں بنا ہوگا" اور "یہ کروروں میں خریدا گیا ہوگا" اکثر ایسے بھی خوش مذاق ہوتے
ہیں جو یہ کہنے سے باز نہیں رہتے کہ امریکہ اگر چاہے تو یہ سب چیزیں خریدلے ۔ اور وہ
یکے بعد دیگرے گزرتے جاتے ہیں اور بیچارہ "گائڈ" جو انکے ساتھ ہوتا ہے ان کی
بکواس سنتا رہتا ہے اور آثار ضادید کی پرانی رٹی ہوئی داستان شروع سے آخر
تک آیت حدیث کی طرح دہراتا ہے اور وہ بھی انکے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے
اور ایک برج سے دوسرے برج میں گزرتا جاتا ہے ۔ وہ کچھ نہیں دیکھتے اور انکو
بالکل کسی فنی قدر کا حس نہیں ہوتا ۔ میری اپنے ہم ملکوں سے دست بستہ یہ استدعا ہے
کہ وہ ان حضرات کو اپنا نمونہ نہ بنائیں ۔ دلی میں رہکر تاج کو دیکھے بغیر اس کی ایک
تصویر خیالی لئے ہوئے مرجانا اچھا ، لیکن تاج کو ڈھالی کی طرح چھو کر چلے آنا نہیں اچھا

ٹالسٹائے اور مشرق

(ماخوذ)

جس وقت ٹالسٹائے نے وفات پائی کسی کو مطلق گمان نہ تھا کہ اسکا تخیل کبھی اس دنیا میں اثر بھی کریگا۔ مگر اس نے بیج بو دیا تھا اور وہ موسم بہار کی بارش کا منتظر تھا۔ بادل آئے، پانی برسا، کھیتی سرسبز ہوئی اور اب فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ ٹالسٹائے کی کشت امید کا ہرا ہونا ہندوستان کے کسان گاندھی کی عرقریزی پر موقوف تھا۔

نوع انسان کی تاریخ میں ایک بات نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ ساری تاریخ دیکھ جائیے جتنی تخیلی امیدیں ارباب فکر کے ذہن میں تھیں اور جن کا پورا ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا سب کی سب ایک دن عملاً پوری ہو کر رہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسکا عکس یعنی ایک مخالف خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں باہم تصادم ہوتا ہے اور ذہن انسانی کے سمندر میں ایک طوفان و تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی لہروں سے زندگی کی کھیتی سیراب ہوتی ہے اور اس سے نئے نئے پودے اُگتے ہیں۔

۱۸۴۷ء میں جب ٹالسٹائے کی عمر اُنیس سال کی تھی اور وہ قازان کے شفاخانہ میں زیر علاج تھا اُسے ایک لاما سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بزرگ کسی ڈاکو کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شفاخانے میں آئے تھے اور انہیں اتفاق سے ٹالسٹائے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔ ان کے فیض سے ٹالسٹائے کے دل میں حقیقت اور محبت کی چنگاری چمک اٹھی۔ تیس سال تک دنیاداری کی راکھ میں یہ چنگاری دبی رہی اور اس کے بعد بھی اسے شعلہ جوالہ بننے کے لئے موافق ہوا نہ ملی۔

البتہ کوئی ساٹھ برس کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس چنگاری سے ہندوستان کے ایک نوجوان گاندھی کے دل میں معرفت اور محبت کا شعلہ بھڑکا۔ گاندھی نے تکلیف اور مصیبت کی آندھیوں میں اس شعلہ کو نشو و نما دی یہانتک کہ اس نے سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دی جس کی آنچ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ ٹالسٹائے کو مشرق سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق اس درجہ اہم ہے کہ اگر ٹالسٹائے کی سیرت میں اس کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ سیرت نامکمل رہجائے گی۔ ٹالسٹائے کے خیالات سائبیریا ریلوے کی طرح یورپ اور ایشیا کو ملاتے ہیں۔

ٹالسٹائے اور ایشیا کے تعلقات کے متعلق ہم کو اس کے شاگرد رشید پاؤل بیروکاف کی کتاب ٹالسٹائے اور مشرق میں بہت کافی مواد ملتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے کو ابتدا ہی سے مشرق سے محبت تھی اور اس کا دل ہمیشہ ادھر کھنچتا تھا۔ جب وہ ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے جامع قازان میں تعلیم پاتا تھا تو اُسے عربی اور ترکی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ وسط ایشیا کے قیام کے زمانے میں اسے اسلامی تہذیب سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں اس نے ابتدائی مدارس کے لئے جو کتابیں تصنیف کیں ان میں تقریباً سارا مواد ہندوستان اور عرب کے قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا تھا۔ جب ٹالسٹائے کو مذہب کی طرف توجہ ہوئی تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ انسان کی تسکین اور نجات کے لئے محض انجیل ناکافی ہے۔ چنانچہ اس نے خالص مشرقی مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور یہ کوشش کرنے لگا کہ مشرقی مذاہب کے اصولوں کو یورپ کے لوگ بھی عقیدت اور احترام سے قبول کرلیں۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب "تخیل العقلا" کے نام سے تالیف کی جس

ہیں اس نے انجیل کے حقائق، چینی حکیم (   ) لے ادتسے کے کلام اور سری کرشن جی کے خیالات کو جمع کردیا۔ اس کا ابتدا سے یہ عقیدہ تھا کہ بنی نوع انسان کے بڑے بڑے مذاہب کے اصول ایک ہی مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اُس نے اس مقصد کے لئے تمام مشرقی ممالک سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

ٹالسٹائے کے تخیل سے زیادہ قریب چینیوں کا تخیل ہے لیکن چین ہی میں اُس کے خیالات پر سب سے کم عمل ہوا ہے۔ ۱۸۸۴ء کے شروع میں ٹالسٹائے نے کنفوشس اور لے ادتسے کی سیرت کا مطالعہ کیا ان میں سے وہ لے ادتسے کی زیادہ قدر کرتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اسے دو معزز چینیوں سے خط و کتابت کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک کا نام سین ہوانگ ٹونگ اور دوسرے کا کوک ہوانگ مینگ تھا۔ موخر الذکر پیکن کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور یورپ میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ انقلاب کے زمانہ میں وہ جلاوطن کردیا گیا اور جاپان میں پناہ گزیں ہوا۔

ستمبر ۱۹۰۶ء میں ٹالسٹائے نے جو خط کوک ہوانگ مینگ کو لکھا اس میں اس نے چینیوں کی بیحد تعریف کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کی قوتیں ظلم اور فریب سے چین کے حصے بخرے کرنا چاہتی تھیں اور چین نے انتہائی مہمان نوازی سے اُن کی جوع الارض کو تسکین دینے کے لئے اپنے ملک کو سفرۂ عام اور خوان یغما بنا دیا تھا۔ اس بات سے ٹالسٹائے بہت خوش تھا اور وہ چینیوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ اس فیاضی پر استقلال سے قائم رہیں۔ آخر میں فتح انہیں کی ہوگی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ٹالسٹائے کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ مثلاً اُس زمانہ میں چین نے پورٹ آرتھر اور ڈالنی روس کو دیدیا تھا مگر آگے چلکر روس کو (جنگ روس و جاپان میں) اس کی بڑی زبردست قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسی طرح کیوچیو جرمنی کے ہاتھ لگا تھا اور وہی ہائی وی برطانیہ کی دراز دستی کا شکار رہا تھا۔ کیوچیو کا حشر دنیا کو معلوم ہے وی ہائی وی کا بھی انشاءاللہ

ایک دن یہی انجام ہونا ہے ۔

مگر چند سال بعد جب چینیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ یورپ والوں کا مقابلہ انہیں کے ہتھیار سے کریں تو ٹالسٹائے کو بڑی بے چینی پیدا ہوئی ۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر چینی بھی یورپ والوں کے متعدی مرض میں مبتلا ہو گئے تو نہ صرف چین کی روحانی ہلاکت کا باعث ہوگا بلکہ ساری دنیا کو نقصان پہنچے گا ۔ اسکا خیال ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی میں ایک دن ضرور اصلاح ہوگی اور اس اصلاحی تحریک میں چین دنیا کی رہنمائی کرے گا ۔ چینیوں کے پاس ایک بڑی دولت ہے جسے وہ "ڈاؤ" یعنی حسن اخلاق کہتے ہیں ۔ اُن میں کفایت شعاری، دیانت داری، نرمی، محنت اور استقلال کی خصلتیں ہیں ۔ اگر انہوں نے یہ چیزیں کھو دیں تو وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے ۔ یورپ کی تقلید میں سیاسی اور صنعتی انقلاب کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پرانا استبدادی نظام بدستور باقی رہے ۔ یورپ کی حالت زار چینیوں کے پیش نظر ہے :۔ غریبوں کی قابل رحم حالت، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش، فوج کی بھرتی، جنگ کی تیاری ۔ نو آبادیوں کو لوٹنے کی پالیسی ۔ کیا چین والے اس کی تقلید کریں گے ؟ نہیں ہرگز نہیں مگر دوسری طرف وہ اس پر بھی کبھی راضی نہ ہوں گے کہ یورپ والے انہیں پامال کر ڈالیں ۔ ایسی صورت میں اُنکے لئے صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ روحانی قوت سے کام لیں اور روح کے ناقابل شکست ہونے پر یقین رکھیں ۔ انہیں اس عقیدے اور اس قوت کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہئے ۔ اگر وہ کرہ ارض کی طرح خاموشی سے اپنے مدار پر حرکت کرتے رہے تو یوروپ ایک دن مجبور ہوگا کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈالدے ۔ نوع انسان کی خیر و برکت چین کے روحانی پیشواؤں کے ان تین اصولوں میں پوشیدہ ہے، کنفوشس کی "تواضع" لے اوتسے کے "نظم بے ضابطہ" اور بدھ کے "ایثار محبت" میں ۔

یہ ہے ٹالسٹائے کی نصیحت چین کو۔ اب سوال یہ ہو کہ کیا چین نے اس نصیحت پر عمل کیا ؟ ٹالسٹائے کا مکتوب الیہ کوک ہوانگ مینگ بہت تنگ خیال آدمی تھا۔ وہ شخصی حکومت کا حامی تھا اور اُسے ہر مرض کی دوا خیال کرتا تھا۔ وہ ناکامیاب ہوا اور ٹالسٹائے کے اصول کے مطابق اُسے ناکامیاب ہونا بھی چاہیئے تھا۔ مگر چین کا موجودہ انقلاب بھی روسی حکیم کے راستے سے بہت دور ہے۔ یہ سوائے اس کے کہ تاریخ کے دفتر بے پایاں کا ایک ورق الٹ دے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ ٹالسٹائے کے خیالات چین کے ہزاروں برس کے فلسفے کے مطابق ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چین ان خیالات کو اپنے لئے مشعل ہدایت نہ بنائے۔

جاپان کے متعلق ٹالسٹائے نے جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ جاپانی بہت بے چین طبیعت رکھتے ہیں اور ان میں نئے خیالات قبول کرنے کا مادہ بہت ہے۔ ایشیا کی قوموں میں سب سے پہلے (غالباً ۱۸۹۰ء میں یا اس کے کچھ پیشتر) جاپانیوں نے ٹالسٹائے سے تعلق پیدا کیا۔ مگر ٹالسٹائے کو ان کی روحانی ترقی کی صلاحیت میں بہت شبہ ہے اس کے نزدیک یہ حب وطن اور فوجی قوت کی پرستش کرتے ہیں اور یورپ کی تہذیب سے مسحور ہوگئے ہیں۔ اس نے جاپان کے جتنے لوگوں سے خط وکتابت کی اُن سب کی طرف سے اُسے مایوسی ہوئی۔ ان میں سے جن لوگوں کو ٹالسٹائے کی پیروی کا دعوے ہے ان کی بھی اصل میں یہ کوشش ہے کہ اُس کے اصولوں کی تاویل کرکے ان سب سے حب وطن کی حمایت کا کام لیں۔ مثلاً ایک نوجوان ۱۹۰۴ء میں ٹالسٹائے کی تصانیف کو پڑھ کر چلا اٹھتا ہے کہ "حقیقت میں ٹالسٹائے ہمارا پیغمبر ہے" مگر چند ہفتے بعد جب جاپان سین ٹاؤ میں روس کے بیڑے کو غرق کردیتا ہے تو یہی نوجوان حب وطن کی شراب سے متوالا ہوجاتا ہے۔ اور ٹالسٹائے کے بنیادی اصولوں کا مخالف۔

صرف چند جمہوری اشتراکی لیڈر جاپان میں ہیں جو ٹالسٹائے کی طرح جنگ کے
ٰالف ہیں ۔ مگر ان کے اور ٹالسٹائے کے خیالات میں مجموعی حیثیت سے بہت فرق ہے۔
ہوں نے ستمبر ۱۹۰۴ء میں روسی حکیم کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے ان کا شکریہ
واکیا اور جنگ کی مخالفت میں ان کی ہمنوائی کی مگر اس کے ساتھ ہی اشتراکیت کی
ریک سے بھی اختلاف ظاہر کیا۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جاپان پر ٹالسٹائے کا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ ٹالسٹائے کی ہشتاد
سالہ سالگرہ کے موقع پر جو مجموعہ مضامین شائع ہوا اس میں ایک جاپانی کاٹمین چینگ
ا بھی ایک مضمون تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ ٹالسٹائے سے جاپان کے لوگ بہت متاثر ہوئے
ہیں، اُس کی مذہبی تصانیف کی بدولت ۱۹۰۲ء ۔ ۱۹۰۳ء میں نہ صرف جاپان کے عیسائیوں
یں بلکہ بدھ مذہب والوں میں بھی ایک اخلاقی انقلاب شروع ہوگیا ۔ بدھ مذہب
ت سے ظاہری عبادات و رسوم پر زور دیتا چلا آتا تھا ۔ مگر اب اس میں باطنیت
کی تحریک بھی شروع ہوئی ۔ اب جاپان ہر طرف مذہبی احساس ، مذہبی ضمیر کا چرچا ہونے لگا
مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی داخلیت بھی خطرے سے خالی نہیں ۔ اس سے علاوہ قربانی اور
محبت کے جذبات کے خود پسندی، خود غرضی، تعصب، مایوسی کے پیدا ہونے کا بھی امکان
ہے بلکہ بعض اوقات خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ جاپان والے اس قدر جذبات
پرست واقع ہوئے ہیں کہ اگر وہ ٹالسٹائے کے مذہب پر ایمان لائیں تو انکے لئے اس کا
نباہنا بہت مشکل ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں المناک نتائج نہ پیدا ہوں ۔ پھر بھی جاپان
میں ٹالسٹائے کے مریدوں کی چند چھوٹی چھوٹی جماعتیں کوبے کے آس پاس کاشتکاری
کرتی ہیں، اور لوگوں کو حضرت عیسیٰ کا پیام محبت پہنچاتی ہیں ۔ روسی حکیم کی یادگار میں
ایک علمی انجمن بھی ہے جس کی طرف سے ایک سّو صفحے کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے۔

جاپان میں ٹالسٹائے کے پیرووں میں سب سے زیادہ قابل احترام ذات ایک

شخص کی ہے جس کا نام ڈانوہ چینیز ہے۔ اُس نے ٹالسٹائے کو ایک عقیدت آمیز خط لکھا لیکن اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس پیر روشن ضمیر کی زیارت کے لئے روانہ ہوگیا وہ روسی زبان بالکل نہیں جانتا تھا اور انگریزی بھی بہت کم۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹالسٹائے کے گاؤں یاسنایہ تک پہنچا۔ وہ وہاں صرف پانچ روز قیام کرکے جاپان واپس آگیا مگر اس تھوڑے عرصے میں اس کے دل پر اُس کے مرشد کی زندگی، بات چیت اور خصوصاً مسکراہٹ کا اتنا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے اور غالباً تمام عمر باقی رہے گا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے "اگرچہ مجھے ٹالسٹائے سے ملے ہوئے سات ۳۰ تیس دن ہوگئے اور میں اس سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ہوں لیکن اُن کی مسکراہٹ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ آج کل میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک کتا۔ ہم سب مل کر ایک مختصر مکان میں گزر کر لیتے ہیں۔ میں نے کچھ ترکاری بو رکھی ہے اور اسکی کیاری میں جو گھاس روزانہ اُگ آتی ہے کھود کر پھینکتا رہتا ہوں۔ میرا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے اور یہ شغل مجھے بہت محبوب ہے۔ اس میں میری اندرونی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کی حالت میری سی ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اپنا سارا وقت مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور عمل بالکل نہیں کرتے"

روس کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے۔ اس لئے ٹالسٹائے کو اکثر مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن دوستوں سے وہ خط و کتابت کیا کرتا تھا ان میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے نے روس کے عیسائی کلیسا سے قطع تعلق کیا تو اس نے اپنے ملک کی اعلیٰ مذہبی کونسل کے نام ایک کھلا خط بھیجا۔ اس خط میں توحید کی وہ سچی روح تھی جس نے تمام عالم اسلام کو ہلا دیا۔ بہت سے مسلمان ٹالسٹائے کے دل وجان سے حامی ہوگئے، روس کے باشکیریوں، ہندوستان کے مسلمان

ہناؤں اور استنبول کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ٹالسٹائے کو خلوص اور محبت سے بھرے
یے خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ٹالسٹائے کے خط میں موحدانہ جذبات دیکھ کر اُنکے
وں پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ وہ سب اسے اپنا بھائی
ردل سے مسلمان سمجھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ زبان سے بھی اسلام کی حقانیت
اقرار کرلے۔ قادیان ضلع گرداسپور سے کسی صاحب محمد صادق نامی نے بھی ایک خط لکھا
سے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ انہوں نے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ٹالسٹائے
یہ بتایا کہ اسلام میں ایک مجدد پیدا ہوئے ہیں جن کا نام حضرت مرزا غلام احمد ہے۔
ن بزرگ نے عیسائیوں کے باطل خیالات کی تردید میں یہ بھی لکھا کہ کشمیر میں یوز آسف یعنی
یسٰی) کی قبر کا انکشاف ہوا ہے۔

جن مسلمانوں نے ٹالسٹائے سے خط وکتابت کی ان میں سے اکثر حماقت اور مسخرے
ن کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کی کوتاہ نظری، خود بینی اور خود ستائی کو دیکھ کر ٹالسٹائے
و قرون وسطیٰ کے عیسائی یاد آتے تھے۔ مثلاً جب ٹالسٹائے اسلام کے ان مجدد پر ایمان
نہیں لایا تو خط لکھنے والے بزرگ نے کئی بار اسے لکھا کہ انسان کے پاس خدا کا پیام
ین طرح پہنچتا ہے بعض لوگ اپنے عقل و فہم سے ہدایت پاتے ہیں، بعض وحی اور الہام
سے اور بعض تلوار کے زور سے۔

ٹالسٹائے ان لوگوں پر اعتراض نہیں کرتا کیونکہ اُس کے خیال میں حقیقت
کے طالب کو نہ تو مختلف مذاہب کی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا چاہئے اور نہ اُنکے اختلافی
سائل پر بلکہ صرف اس نقطے کو تلاش کرنا چاہئے جو تمام مذاہب میں مشترک ہے چنانچہ
س نے ان قادیانی امام صاحب کو جنہیں اپنے مذہب کی برتری پر اس قدر ناز تھا صرف
یہ جواب دیا "ہر اس شخص پر جو سچی دینداری کے جذبات سے لبریز ہے فرض ہے کہ وہ
اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائے اور ایمانداری اور خلوص کے ساتھ نیکی کی تبلیغ

کرے۔ ہم سب کا مقصد ایک ہے اور وہ بھلائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنا ہے"

ٹالسٹائے نے اسلام کی بہت تعریف کی ہے اور قرآن کے بہت سے معارف اُس کے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اُسکا خیال ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی بہت سی دوراز کار باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اسلام کو قابل قبول اور سچا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس میں سے بہت سے عقائد جو غلطی پر اور بہت سے جذبات جو تعصب پر مبنی ہیں نکال دینا پڑیں گے اور صرف وہ چیزیں رہ جائیں گی جو نیکی اور بھلائی کی جڑ ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے "اگر تمہیں میری باتیں بری لگیں تو معاف کردو کیونکہ میں جب حق بات کہتا ہوں تو پوری کہتا ہوں۔ آدھی بات کہنے سے تو میرے نزدیک چپ رہنا بہتر ہے" مگر دوسری طرف ٹالسٹائے کو بعض روشن خیال اور وسیع النظر مسلمانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب وہ روس کی عیسائی جماعت سے علیحدہ ہوا تو مصر کے مشہور مصلح اور رہنما مفتی محمد عبدہٗ نے اسے مبارکباد کا خط لکھا کہ اس کی ذات تمام طالبان حق کے لئے نمونہ ہے اور ان سب کی آنکھیں اس کے نقش قدم پر لگی ہوئی ہیں۔ تقریبًا اسی مضمون کا خط ٹالسٹائے کو مرزا رضا خاں نے جو استنبول میں ایرانی قنصل کی حیثیت سے مقیم تھے لکھا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ اثر ٹالسٹائے پر ایک بہائی کے خط کا ہوا۔ یہ جبریل ساشی نام ایک شخص تھا جو عرب کا رہنے والا تھا۔ اُس نے پہلے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پھر بہائی ہوگیا۔ اپنے خط میں اُس نے ٹالسٹائے کو اپنے عقائد کی تبدیلی کی داستان لکھی تھی جس کے جواب میں ٹالسٹائے نے لکھا کہ میں مدت سے بہائیت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں اور اس مبحث پر جتنی کتابیں مل سکتی ہیں قریب قریب سب میں نے جمع کرلی ہیں۔ مجھے یقین ہے بہائیت میں اخلاقی تربیت کی قوت ہے اور اس مذہب کو مشرق میں ترقی کا موقع ملیگا بلکہ مذہب عیسوی کی اندرونی کمزوری

کے سبب سے خیال ہوتا ہے کہ مذہب بہا اس کا قائم مقام ہو جائے تو تعجب نہیں۔

۱۹۰۸ء میں ٹالسٹائے کی ہشتادسالہ سالگرہ کے موقع پر کلکتے کے ایک مسلمان عبداللہ ماموں سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ٹالسٹائے کو مبارکباد بھیجی اور آپ یوگی کے لقب سے مخاطب کیا۔ انہوں نے لکھا کہ قرآن ٹالسٹائے کے عدم تشدد کے عقیدے کا ہرگز مخالف نہیں ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح ٹالسٹائے انجیل کا مطالعہ کرتا ہے یعنی باطل کی ظلمت میں نہیں بلکہ حق کی روشنی میں، اسی طرح قرآن کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی تعریف میں کہا کہ وہ نہ مغرب کا نور ہے نہ مشرق کا بلکہ خدا کے انوار میں سے ایک نور ہے جو دنیا کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ٹالسٹائے کا عدم تشدد کا عقیدہ ہندوستان کے مہاتماؤں کی تعلیم کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب بنائے گا جس کی تبلیغ کے لئے ایک نیا ہادی پیدا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور وہ شخص پیدا ہوگیا جو ہندوستان میں ٹالسٹائے کے فلسفے کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہندوستان اُنیسویں صدی کے آخر میں بیدار ہوگیا۔ یوروپ والے بالعموم اس حقیقت سے بیخبر ہیں۔ صرف چند علما جو سیاست اور ملک گیری سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ کتابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اس بیداری کا علم رکھتے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے خداداد جوہر پھر چمکیں گے لیکن ۱۹۰۰ء میں یہ چمکے اور ایسے چمکے کہ دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ذہنی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ ریاضی ہو یا سائنس، شاعری ہو یا صنعت و حرفت ہندوستان میں ترقی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ آریہ سماج کے قائم ہونے سے ویدانی فلسفے کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ہے اس کے علاوہ کیشب چندرسین نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی ہے جس نے خدمت خلائق اور رفاہ عام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں

کیشب چندر نے مذہب کے عیسوی تخیل اور مشرقی تخیل کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان کے مذہبی مصلحوں میں سے دو خاص امتیاز رکھتے ہیں ایک تو رام کرشن (۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۶ء) اور دوسرے انکے لائق شاگرد سوامی ویویکانند (۱۸۶۳ء تا ۱۹۰۲ء) ان دونوں نے اپنے ہموطنوں میں صدیوں کے بعد سچی مذہبی روح پھونکی ہے۔ ٹالسٹائے جو ہر میدان میں حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہتا تھا ان دونوں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ ویدک میگزین کے اڈیٹر رام دیو نے اُسے سوامی ویویکانند کی تصانیف بھیجی تھیں اس نے ان سب کو پڑھا اور ۱۸۹۶ء سے برابر ان مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا جو سوامی جی کے قلم سے نکلتے تھے۔ اس کی نظر سے رام کرشن کے مقالات بھی گزرے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سوامی ویویکانند ۱۹۰۰ء میں یوروپ کی سیاحت کے دوران میں یاسنایا نہ جاسکے کہ ٹالسٹائے سے اوران سے عمر بھر میں ایک بار تو ملاقات ہو جاتی۔ راقم الحروف کا قصد تھا کہ پیرس میں جاکر اس مقدس مہان کی زیارت کرے مگر شومی قسمت سے موقع نہ ملا جس کی آج تک ندامت باقی ہے۔

وہ ہندوستانی جو قلب باصفا رکھتے ہیں ٹالسٹائے کو کرشن کا اوتار سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ اُسے مہاتما کہتے ہیں۔ دی نیو ریفارمر کے اڈیٹر گوپال چیٹی ٹالسٹائے کے پیرو ہیں۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی ہشتادسالہ سالگرہ کے موقع پر (۱۹۰۸ء میں) ایک مضمون لکھا جس میں ٹالسٹائے کو گوتم بدھ سے تشبیہ دی۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر ٹالسٹائے ہندوستان میں پیدا ہوتا تو لوگ اُسے اوتار سمجھ کر، پرش سمجھ کر، سری کرشن سمجھ کر اُس کا احترام کرتے"

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کو ہندوستان میں براہ راست جس جماعت سے سابقہ پڑا وہ سوراجیوں کی جماعت ہے۔ ۱۹۰۸ء میں سی آر داس نے جو آگے چل کر آزادی کی تحریک میں مہاتما گاندھی کے دست و بازو بن گئے ٹالسٹائے کو ایک خط لکھا جس

ں انہوں نے سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور ٹالسٹائے کے عدم مزاحمت
نظریے پر نکتہ چینی کی اسی کے ساتھ انہوں نے ٹالسٹائے سے درخواست کی کہ اُن کے رسالے
ری ہندوستان" کی قلمی اعانت کرے۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائے نے ۱۴ دسمبر
۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں اُس نے پہلی بار عدم مزاحمت اور محبت کا پیام
ندوستانیوں کے نام بھیجا۔ اس نے ہر جملے میں سری کرشن کے فلسفے کو مدنظر رکھا اور
ندوستانیوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی پرانی حکمت و دانش کو چھوڑ کر یوروپ کی تہذیب
تقلید کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "توقع تھی کہ برہما، بدھ اور کنفوشس کی قلمرو میں مغربی
ذیب کو کہیں جگہ نہ ملے گی یعنی چینی، جاپانی اور ہندی اپنے اپنے معلم کے نقش قدم پر چلتے
یں گے۔ اور چونکہ وہ تشدد کے حامیوں کی غلطی سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے وہ
سائل زندگی کے حل کرنے کے لئے آشتی اور محبت کی تدابیر اختیار کریں گے لیکن کیسی
متی ہے کہ دوسری قوموں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد مشرق کے رہنے والے
غربی تہذیب سے مسحور ہو گئے چنانچہ جاپان کا یہی حال ہے اور اسکا انجام ہرگز اچھا
ہوگا۔ چین اور ہندوستان کے بعض رہنماؤں کا بھی اس طرف رجحان ہو گیا ہے چنانچہ
پ نے ہندوستان کے سوراج کا ذکر کرتے ہوئے کسی رسالے میں یہ رائے ظاہر کی ہے
غاصب کا مقابلہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور عدم مزاحمت سے دوسروں کو فائدہ
پہنچتا ہے اور ہم کو سراسر نقصان"

"یہ کیوں، تم لوگ مذہبی آدمی ہو لیکن مغربی تہذیب سے مسحور ہو گئے ہو اور اپنی قوم کی
دیم رسم محبت کو توڑنا چاہتے ہو . . . . یوروپ کے لوگ جو پہلے مذہب کے غلام تھے اور اب
ائنس کے بندے ہیں، ہمیشہ سے تشدد کا خیال لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ وہ
ق کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ بھی تیاری نہ کی۔ میری
مجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اس لئے قبضہ

کرلیا کہ ہندوستان میں مقابلے کی قوت نہ تھی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہے انگریزوں کو مقابلہ کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ ہندوستانی ابتدا سے انتہا تک اس عقیدے پر جمے رہے کہ تشدد ہی ہر منظم جماعت کی بنیاد اور اساس ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے ہندوستانی اپنے سرداروں کے مطیع بنے۔ اسی عقیدے کے سبب سے وہ آپس میں لڑتے ہیں، یورپ والوں سے لڑتے ہیں، انگریزوں سے لڑتے ہیں ..... ایک تجارتی کارخانہ جس میں تیس ہزار سے زیادہ افراد نہیں تھے بتیس کروڑ آدمیوں پر غالب آگیا۔ لیکن کیا انگریز اس شخص پر غالب آسکتے ہیں جسے ان کی طرف رغبت نہ ہو؟ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے سپرد کر دیا .... ہندوستان کی زندگی ماضی سے حال تک تشدد کے ماتحت گزرتی رہی ہے۔ ہندوستان دائمی محبت کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے .... کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان کی عمر جہالت میں گزرتی ہے۔ جو چیز اس کے قبضے میں ہے اُسے وہ دنیا بھر میں تلاش کرتا ہے کیونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ واقعی جاہل کی حالت رحم کے قابل ہے "میں نے اسے (محبت کا) زیور دیا ہے اور یہ (محبت کا) زیور اُس کے پاس ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے،، (سری کرشن)

"انسان کو صرف اس قانون، محبت پر عمل کرنا چاہئے جو اُس کے دل میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور صرف عدم مزاحمت اور عدم تشدد کے قانون کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ اس طرح نہ صرف کئی سو آدمی کئی ہزار آدمیوں پر غالب نہیں آسکتے بلکہ کئی لاکھ آدمی مل کر ایک آدمی کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ بس تم یہ عہد کر لو کہ ہم کوئی گناہ نہیں کریں گے اور گنہگاروں کے ساتھ نہیں رہیں گے، قانون کو نہ توڑیں گے، خراج دینے سے انکار کریں گے، فوج میں نہیں داخل ہوں گے۔ پھر دنیا میں کوئی تم پر غلبہ نہ حاصل کر سکے گا،،

اس طویل خط کے آخر میں ٹالسٹائے نے پھر سری کرشن کے چند جملے نقل کئے ہیں

بچو! چشم غفلت کھول کر دور تک دیکھو تمہیں ایک محبت سے معمور نئی دنیا نظر آئے گی یعنی
طری عالم جو میری خالص عقل سے بنا ہے۔ یہی عالم حقیقی ہے۔ پس تمہیں اندازہ ہوگا اس
مال اور برتری کا جو محبت نے تمہیں عطا کی ہے اور تم پہچانوگے ان باتوں کو جن پر عمل
رنے کی تمہیں محبت نے ہدایت کی ہے۔

یہ کھلا خط جو ٹالسٹائے نے اصل میں سارے ہندوستانیوں کے نام لکھا تھا ایک
نوجوان وکیل کے ہاتھ میں پڑا جو افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں رہتا تھا۔ یہ شخص جسے دنیا مہاتما
گاندھی کہتی ہے اس خط کو پڑھ کر جوش مسرت سے اچھل پڑا۔ گاندھی نے غالباً ۱۹۰۹ء میں
ٹالسٹائے کو خط لکھا جس میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ کس طرح دس سال سے ٹالسٹائے کی تعلیم
کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور اس بات کی اجازت چاہی کہ ٹالسٹائے نے
جو خط سی۔ آر۔ داس کے نام لکھا تھا اس کا ترجمہ ہندوستانی میں شائع کر دیا جائے۔

ٹالسٹائے نے اس خط کا جو جواب دیا وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے لکھا کہ
"میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں نرمی اور آشتی
کا اور غرور و تکبر کے مقابلے میں انکسار و محبت کا بول بالا ہو"۔ اس کے بعد جب ٹالسٹائے نے
گاندھی کی کتاب ہند سوراج پڑھی تو اسے اس مذہبی تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔
اُس نے گاندھی کو ایک خط میں لکھا کہ تمہارا عدم تشدد اور عدم مزاحمت نہ صرف ہندوستان
کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے قابل قدر ہیں۔

ٹالسٹائے نے جب گاندھی کی سوانح عمری پڑھی تو اُسے بیحد خوشی ہوئی اور باوجودیکہ
وہ اس زمانے میں سخت بیمار تھا مگر اس نے گاندھی کو کئی خط لکھے (مئی ۱۹۱۰ء) جب
اسے کسی قدر صحت ہوئی تو اس نے (اپنے مرنے سے ایک مہینہ پہلے یعنی ۷ ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کو
پھر گاندھی کو ایک خط لکھا جو عدم تشدد کے مذہب کے لئے انجیل کا حکم رکھتا ہے۔ یہ خط جو گویا
ٹالسٹائے کا وصیت نامہ ہے جنوبی افریقہ میں "انڈین اوپینین" میں شائع ہوا۔ سچ پوچھئے

تو عدم تشدد کی پہلی کامیابی اس خط کی بدولت ہوئی ۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ادھر یہ خط شائع ہوا اور ادھر ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کے شعلے دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم میں پھیل گئے اور لاکھوں خدا کے بندے اس نفرت اور عداوت کی آگ میں جل کر بھسم ہو گئے ۔

مگر شکر ہے کہ یہ ہلاکت اور تباہی کے ہنگامے ختم ہو گئے ہیں ۔ خونخوار درندوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہو گئی ہیں اور امن وامان کی بلبل یعنی گاندھی کی خوشگوار آواز صلح و آشتی کے ترانے سنا رہی ہے ۔ انسانی ہمدردی کا یہ نیا مقدس گیت بہت سے لوگوں کو پرانے گیت سے زیادہ شیریں اور زیادہ پراثر معلوم ہوتا ہے ۔

عربی معاشرت پر ایرانی اثرات

یہ مضمون مشہور جرمن مستشرق فان اے کریمر کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جو عنقریب بعض ضروری مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوجائیگا۔

عراق وایران کی تسخیر کے تھوڑے ہی دنوں بعد عرب ایرانی شہنشاہوں کی شان و شوکت اور انکے درباری آداب و مراسم اور تکلفات سے واقف ہوگئے تھے۔ اموی خلفانے بھی ان کی بہت کافی تقلید کی ہے۔ قرآن مجید کے امتناعی احکام کے باوجود دربار دمشق میں شراب نوشی کی رسم عام ہوگئی تھی۔ ابتدا میں یہ لوگ انگور کا ابلا ہوا رس (طلا) یا ایک یونانی شراب جس کا نام رساطون ہے (رساطون یونانی لفظ ہی) استعمال کرتے تھے۔ امویوں کے زوال کے بہت کافی زمانے کے بعد ایک مرتبہ بغداد میں بلور کا ایک بہت بڑا جام دکھایا گیا تھا جس میں خلیفہ ہشام کی بیوی ام حکیم صبوحی پیا کرتی تھی دربار بغداد میں بھی رومیوں کی شراب کی محفلوں کی طرح خوشی کے موقعوں پر میخواروں کو پھولوں کے ہار پہنائے جاتے تھے۔

بایں ہمہ بنوامیہ کے زمانے میں دربار کے آداب بہت زیادہ سخت نہیں تھے ہر شخص دربار میں آجا سکتا تھا اور خاص خاص لوگ یا تو خلیفہ کے پاس ہی دیوان یا کرسیوں اور گدوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک درباری نے لکھا ہے کہ ایک روز جب کہ ابھی چاندنی راتیں تھیں اسے ولید ثانی کے دربار میں جانیکا اتفاق ہوا تو ایک بہت بڑے طشت میں اسکے سامنے شراب کے چند جام پیش کئے گئے اور جب اس نے یہ دریافت کیا کہ یہ شراب نوشی کا کونسا موقعہ ہی تو اسے بتایا گیا کہ یہ وہ شراب ہی جسے ایرانی ہفت گاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کا دور سال کے ایک حصے میں برابر سات ہفتوں

تک قائم رہتا ہے۔ شام کی تفریحوں میں جب رقص سرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں تو خلفا قدیم ایرانی رسم کے مطابق پردے کی اوٹ میں بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پردہ کمرے کے وسط میں لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ خلیفہ اہل دربار اور گانے والوں سے ممتاز ہو جائے۔ لیکن اس رسم پر تمام خلفا نے عمل نہیں کیا۔

سرود کا فن جسے دربار دمشق میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی عربوں نے ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ شروع شروع کے بہترین گانے والے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت یا تو ایرانی تھے یا ایرانی اساتذہ کے شاگرد۔ حریم خلافت میں شب و روز عیش و عشرت کا چرچا رہتا تھا۔ ان لوگوں میں اور مسلمانوں کے اولین خلفا میں جو کسی طرح بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں رہتے تھے کس قدر فرق تھا۔ ولید ثانی ہر روز جواہرات سے مرصع نئے نئے طلائی ہار پہنا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک دور دراز صوبے کے عامل۔ عامل خراسان نے ایک مرتبہ دربار خلافت سے شکایت کی کہ اس کے صوبے کی ساری مالگذاری اس کے باورچیخانے کے اخراجات کے لئے پوری نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ ایرانی لباس کا رواج عام ہوگیا۔ چنانچہ یزید ابن مہلب نے ایک عرب کو اس جرم میں سزا بھی دی تھی۔ عربوں کو ایرانی چیزوں سے خواہ مخواہ کا تعصب تھا ایک شخص نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے:۔ اسمٰعیل ابن یسار ایرانی نژاد تھا لیکن اس کے آبا و اجداد اپنے دوسرے ہم قوموں کی طرح ایک عربی قبیلہ (تیم) کے مولا ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے یہ اسمٰعیل ہر ایرانی شئے کی تعریف کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں وہ عبداللہؓ ابن زبیر کی خلیفہ کا طرفدار تھا لیکن انکے زوال پر اس نے امویوں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ ایک مرتبہ اسے خلیفہ ہشام کے دربار میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہشام اس وقت قصر رصافہ میں ایک مرمریں حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس نے اسمٰعیل سے کہا کوئی قصیدہ سناؤ۔ اس پر اسمٰعیل نے اپنے وہ اشعار پڑھنا شروع کئے جن میں اس نے اپنے ایرانی الاصل ہونے پر اظہار فخر کیا تھا

اسمٰعیل نے کہا :-

"مجھے اپنے آباو اجداد کی قسم میں وہ لکڑی نہیں ہوں جو لڑائی میں آسانی سے ٹوٹ جائے نہ وہ چشمہ ہوں جو خشک ہو جائے میں شریف قبیلے سے ہوں اور شان شوکت میں کوئی مجھسے بڑھ کر نہیں۔ میری زبان تلوار کی طرح تیز ہے اور اس سے میں اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کرتا ہوں خواہ وہ کوئی تاجدار کیوں نہ ہوں۔ میرے آبا واجداد اپنے زمانے کے بادشاہ تھے۔ وہ نہایت شائستہ، فیاض اور مہماں نواز تھے۔ وہ شہرت اور عزت میں اور اپنی فوج کی کثرت میں خسرو اور شاپور سے مشابہ تھے۔ وہ لڑائی میں شیروں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ انہوں نے ترکوں اور یونانیوں کو نیچا دکھایا۔ وہ بھاری بھاری زرہیں پہنکر چلتے تھے جس طرح بھوکے شیر نکلتے ہیں اور اگر تم پوچھو تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہم اس نسل سے ہیں جو سب سے افضل ہے"

پہلے تو خلیفہ صبر و تحمل کے ساتھ اس کے اشعار سنتا رہا لیکن آخر کار مغلوب الغضب ہو کر کہنے لگا "اسے حوض میں پھینکدو"۔ جو شیلے درباریوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حوض میں پھینکدیا جس سے وہ بمشکل تمام ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ بالآخر خلیفہ نے اسے شام سے نکالدیا اور اسمٰعیل نے بھاگ کر عرب میں پناہ لی جہاں وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے آبا و اجداد کی شان میں مدح خوانی کرتا رہا۔

دولت امویہ کے انقراض کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو اہل ایران اور ایران کے ہمدردوں کے دن پھر گئے۔ عباسی خلفار کے دربار اور ان کے دار السلطنت میں بہت کافی ایرانی موجود تھے۔ ان لوگوں کو قرب سلطانی ہی حاصل نہیں تھا بلکہ رفتہ رفتہ انکو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا گیا جس سے انکی دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ برامکہ کے مشہور خاندان

کا حال کون نہیں جانتا - یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے زوال کی منحوس اور المناک ساعتوں تک نہایت مطلق العنانی کے ساتھ حکومت پر متصرف رہے - بڑی بڑی مہموں کی سرداری بھی ایرانیوں ہی کے حصے میں آتی تھی۔ خلیفہ ہادی کے زمانے میں ایک ایرانی جو اپنا سلسلۂ نسب ایرانی عمال کے ایک پرانے خاندان سے ملاتا تھا اور جو اسلام قبول کر لینے پر خلیفہ منصور کا مولا ہو گیا تھا خوزستان کا امیر عساکر مقرر ہوا اور اسے اختیار دیدیا گیا کہ وہ اس اہم صوبے کی مالگذاری بھی وصول کر لیا کرے -

یہ باتیں قدیم عربی جماعت کو نہایت ناگوار گذرتی تھیں اور وہ لوگ اکثر صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیتے تھے - اس سلسلہ میں میں ایک ہجو کی طرف اشارہ کروں گا جو شروع عباسی عہد میں ایرانیوں کے خلاف لکھی گئی تھی اور جس سے عربی جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی ہوتی ہے :-

"خدا کو یونہیں منظور تھا کہ میں تمہیں اسی وقت سے جانتا جب تم گھاس کی منڈی میں بیٹھا کرتے تھے اور ابھی تمہاری خوش نصیبی کا زمانہ نہیں آیا تھا - لیکن بمشکل ایک سال گذرنے پایا ہے کہ اب تم ریشم اور بانات کا لباس پہنے ادھر ادھر اکڑتے پھرتے ہو - ایک زمانہ تھا جب تمہاری عورتیں کنووں کے پاس بیٹھی دھوپ میں فاختاؤں کے ساتھ چلایا کرتی تھیں - خدا کی شان ہے کہ اب انکے بدن پر دنیا بھر کے ریشمی کپڑے نظر آتے ہیں - کیا انکو وہ زمانہ بھول گیا جب ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وہ پہاڑیوں میں پتھر توڑا کرتی تھیں اور اپنے کرتے کے دامنوں میں گھاس کے بڑے بڑے گٹھے باندھ کر لایا کرتی تھیں - اب جو ان کو مال و دولت نصیب ہوا تو وہ کس قدر بے شرمی سے جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں ہم شریف ہیں، ہم دہقانوں کی اولاد ہیں - اور اگر ان میں سے کسی کمینے سے کمینے سے بھی پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو نہایت غرور سے کہتا ہے

میں بہرام چوبیں کا بیٹا ہوں - میرا کون مقابلہ کر سکتا ہے، میں وہ ہوں جسے
کسریٰ نے مال و دولت عنایت کیا تھا اور اپنا وارث بنایا تھا"
ایرانیوں کے غرور پر اس سے زیادہ شدید حملہ اور کیا ہو سکتا ہے :-
" دیکھو اب انہوں نے گدھوں کی بجائے اپنی زینیں نہایت قیمتی ٹٹوؤں پر کس لی
ہیں اور ترکاری بوتے بوتے امرا و سلاطین کے محلوں میں پہنچ گئے ہیں - وہ
عربوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو خدا اور اس کے رسول سے
نفرت ہے -"

لیکن اس اظہار غیظ و غضب کے باوجود جو سلب قوت اور زوال اقتدار کا ضروری نتیجہ تھا - عربوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا - دربار خلافت میں ایرانی اثر بتدریج بڑھتا گیا - یہاں تک کہ خلیفہ ہادی، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں تو اس کی انتہا ہو گئی - مامون کے اکثر وزرا ایرانی تھے یا ایرانی النسل - بغداد میں ایرانی وضع قطع اور ایرانی طرز معاشرت دن بدن مقبول ہوتا گیا - رفتہ رفتہ لوگوں نے نوروز مہرجان اور رام قدیم ایرانی تیوہار بھی منانا شروع کر دیے - ارکان سلطنت ایرانی لباس پہنتے تھے - چنانچہ دوسرے ہی عباسی خلیفہ کا حکم تھا کہ ملازمین حکومت قلانیس (لمبی لمبی مخروطی سیاہ ٹوپیاں جو یورپ کی ٹاپ ہیٹ سے مشابہ تھیں) استعمال کیا کریں (۷۷۰-۷۶۰ / ۱۵۳ھ) دربار میں بھی ایرانی شہنشاہوں کے سے زرتار کپڑے پہنے جاتے تھے اور یہ صرف خلفا کا حق تھا کہ اس لباس کو جسے چاہیں عنایت کریں ہمیں متوکل کے زمانے کا ایک سکہ ملا ہے جس میں خلیفہ ایرانی لباس پہنے نظر آتا ہے - اگرچہ ابتدا میں بھی مسلمان تصویر سازی کے کچھ بہت زیادہ مخالف نہیں تھے لیکن اس واقعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ دربار خلافت میں قدیم اسلامی تعصبات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور یہ سب کچھ ساسانیوں کی تقلید کا نتیجہ تھا - بغداد کے اعلیٰ طبقوں میں ایرانی

اثرات کے اس طرح سرایت کر جانے سے مذہبی زندگی میں بھی ایک نئے ہیجان اور ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے۔ عراق میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں تھی جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سرِ نو تحریک ہوئی۔ بصرہ میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت وہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار نے جسکی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی۔ یہیں سب سے پہلے وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چلکر دربار خلافت بھی محفوظ نہیں رہا۔

ایثار کی فتح

تراوشِ قلم: میٹلڈا سیراؤ

(۱)

میٹلڈا سیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) ایطالیہ کے زنانہ اہلِ قلم کی صفِ اوّل میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی عمر تک وہ مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ نمایاں ہے بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر متشابہ ہو جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے نفسیات انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ "تصوفِ جدید" کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعتِ مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ "ولی" اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرزِ تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ اُس کے ایک جدید افسانہ کی (ہیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ اہلِ امریکہ کے اس مذاقِ ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ مسرت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔ مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع کیا ہے، چنانچہ یہ قصہ اہلِ امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ نگاہ سے ایک "ٹریجیڈی"!

صوفیہ اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے نفیس لیس پر متحرک تھیں لیکن لولو اِدھر اُدھر کمرے میں ٹہل رہی تھی اور طاقچوں میں رکھے ہوئے سامانِ آرائش سے کھیل رہی تھی، یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

اثرات کے اس طرح سرایت کر جانے سے مذہبی زندگی میں بھی ایک نئے ہیجان اور ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے۔ عراق میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں تھی جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سر نو تحریک ہوئی۔ بصرہ میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت وہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار نے جس کی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی۔ یہیں سب سے پہلے وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چل کر دربار خلافت بھی محفوظ نہیں رہا۔

ایثار کی فتح

تراوش قلم: میٹلڈا سیراؤ

(۱)

میٹلڈا سیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) ایطالیہ کے زنانہ اہل قلم کی صف اوّل میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی عمر تک وہ مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ نمایاں ہے بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر متّبع جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے نفسیات انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ "تصوف جدید" کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعتِ مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ "ولی" اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرز تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوشِ جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے ایک جدید افسانہ کی (ہیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ اہل امریکہ کے اس مذاق ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ مسرت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔ مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع کیا ہے، چنانچہ یہ قصہ اہل امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ نگاہ سے ایک "ٹریجیڈی"!

صوفیہ اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے نفیس لیس پر متحرک تھیں لیکن تو لو اِدھر اُدھر کمرے میں ٹہل رہی تھی اور طاقچوں میں رکھے ہوئے سامانِ آرائش سے کھیل رہی تھی، یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

اثرات کے اس طرح سرایت کر جاتے سے مذہبی زندگی ۔ سے ہیجان اور
ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے ۔ عراق میں ایسے مسلما ں کمی نہیں تھی
جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام
سے کوئی نسبت نہیں تھی ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں
سے میل جول کا نتیجہ تھا ۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سر نو تحریک ہوئی ۔ بصرا
میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا ۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب
آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت
دہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے ۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار
نے جسکی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے
چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی ۔ یہیں سب سے پہلے
وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں
سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چلکر دربار خلافت
بھی محفوظ نہیں رہا ۔

ایثار کی فتح

تراوش قلم: میٹلڈا اسیراؤ

(۱)

میٹلڈا اسیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) ایطالیہ کے زنانہ اہل قلم کی صف اوّل میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی عمر تک وہ مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ نمایاں ہے بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر متنبع ہو جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے نفسیات انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ "تصوف جدید" کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ "ولی" اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرز تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ اُس کے ایک جدید افسانہ کی (ہیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ اہل امریکہ کے اس مذاق ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ مسرت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔" مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع کیا ہے، چنانچہ یہ قصہ اہل امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ نگاہ سے ایک "ٹریجیڈی"!

صوفیہ اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے لیس لیس پر متحرک تھیں لیکن لولو ادھر اُدھر کمرے میں ٹہل رہی تھی اور طاقچوں میں رکھے ہوئے سامانِ زائش سے کھیل رہی تھی، یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس وقت اس کا جی کسی کام میں نہیں لگتا اور وہ بیتاب ہے کہ سلسلۂ گفتگو شروع کرے۔ مگر ساتھ ہی اپنی بڑی بہن کے پُروقار انداز سے مرعوب بھی ہے۔ خیر اب وہ ایک گیت گنگنانے لگی۔ اُس نے ایک شعر پڑھا لیکن صوفیہ نے کوئی التفات نہ کیا۔ آخر لولو کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اب وہ پوری بیباکی سے ہمکلام ہونے پر مجبور ہو گئی۔ وہ اپنی بہن کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی اور پوچھا :-

"صوفیہ! تمہیں کچھ خبر ہے کہ اُستانی نے مجھ سے کیا کہا ہے ؟ !"

"یقیناً کوئی دلچسپ بات نہ کہی ہوگی۔"

"صوفیہ! یہ ایسا خشک و سرد جواب ہے کہ اُس کو سُنکر گرمی کے موسم میں بھی آدمی کی رگ و پے میں سردی سرایت کر جائے! میری کشمیری بہن! آخر یہ سردی اور سردمہری تم میں کہاں سے آگئی ہے ؟"

"لولو! تم ابھی تک بالکل بچہ ہو !"

"ہاں! یہی تو تم کو غلط فہمی ہے؛ میری پیاری بہن! میں بچہ نہیں ہوں؛ میری تو اب شادی ہونے والی ہے !"

"کیا کہا؟ !"

"جی ہاں! یہی وہ غیر دلچسپ بات ہے جو جینیٹے نے مجھ سے کہی ہے !"

"کس قدر لغو بات ہے! میں تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں"

"اچھی بات ہے؛ تو اب میں تم کو ساری داستان ہی سنا دوں، جس طرح ڈرا مانویس سُنایا کرتے ہیں؛ لیکن حضور کے گوشگذار رہے کہ یہ ذرا طویل اور مُسلسل تذکرہ ہوگا؛ اور میں سرکارِ عالیات آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ پوری توجّہ سے اُس کو سُننا بھی گوارا فرمائیں گی ؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کیجئے "

"میدانِ مریخ میں جس دن گھوڑ دوڑ ہوئی ہے وہ دن اور وہ موقعہ اس داستانِ عشق کا

وقت اور محل ہے۔ آپ وہاں تشریف فرما تھیں۔ اس لئے کہ آپ تو حسب معمول اپنی کتابوں میں مستغرق تھیں!"

"اگر تم نے اِسی طرح قصہ بیان کیا اور نفس مضمون کو چھوڑ کر ایسی ہی بیراہ روی اختیار کی تو میں ایک حرف آیندہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں!"

"اجی آپ سُنیں تو! یہاں تو وہ حال ہو رہا ہے کہ:-

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد   وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"اچھا اب آپ شروع بھی کریں گے یا نہیں؟"

"ارے صاحب ذرا دم تو لینے دیجئے! اچھا تو گھوڑ دوڑ میں ہم اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں پاؤ لولیوٹیو آیا اور ہمارے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو پیش کیا۔ یہ رابرٹ مانٹی فرینکو تھا۔ خیر رسمی صاحب سلامت اور طرفین سے بے معنی تکلف و تپاک کے بعد وہ لوگ عین ہماری پشت والی قطار میں بیٹھ گئے۔ ہمارے آپس میں دو چار ہی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ گھوڑ دوڑ کے شروع ہونے کا سگنل ہوا۔ تم جانتی ہو کہ گارگن (گھوڑی) میری منظور نظر تھی، مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ میرے حق میں وہ کس قدر بے مروّت ثابت ہونے والی ہے! خیر۔ آدمی کو حیوانوں کی محسن کشی پر بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ الغرض دوڑ شروع ہو گئی اور گھوڑے گرد و غبار کے بادل میں غرق ہو گئے۔"

میں یکبارگی چلّائی کہ "گارگن جیت گئی"۔

فرینکو نے کہا: "نہیں، بلکہ لارڈ لیویلو (گھوڑا) جیتا!"

"میں اُس کی تردید پر کبیدہ خاطر ہوئی مگر وہ مُسکراتا رہا اور اسی جملہ کی تکرار کرتا رہا۔ آخر ہماری نوک جھونک اسی شرط پر ختم ہوئی کہ دیکھیں دونوں میں سے کون جیتتا ہے۔ کامل نصف گھنٹہ کی اُمید و بیم کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکا دیا۔ میں ہاری اور مانٹی فرینکو جیتا ذرا اس بات پر غور کرنا! اب میں اُس سے کہہ رہی ہوں کہ میں ابھی شرط کا روپیہ ادا کرتی ہوں

اور وہ سرنگوں ہوکر آداب بجالاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "کچھ مضائقہ نہیں، جلدی کیا ہے"۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے شیاجاپر ملتی ہوں اور ایک مستفسرانہ نگاہ اُس پر ڈالتی ہوں اور وہ بدستور سرخم کرتا ہے اور ایک معنی خیز تبسّم اس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ بس بالکل تھیٹر کا سامعاملہ تھا اب میں انتہائی اشتیاق تجسّس کی حالت میں ہوں ....

رابرٹو ایک جوانِ رعنا ہے، ۲۶ سال کی عمر ہوگی؛ اور آج صبح کا یہ واقعہ ہے کہ ماٹی فرنیکو جو میرے آیندہ خسر بننے والے ہیں دو گھنٹہ تک امّی کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے!"

"اچھا!" صوفیہ کے مُنہ سے نکلا۔

"جی! اَب تو لوگوں کے چہروں پر توجّہ کی علامات نظر آتی ہیں! خیر! تو جن باتوں پر اُس ملاقات میں بحث ہوئی ہے اُن کی مجھ کو پوری اطّلاع ملی ہے: مختصراً یہ کہ شادی کے جملہ مراتب اَب طے پاگئے ہیں، مگر ہاں ایک نہایت اہم جُز وہی اَمر کا تعیّن ابھی باقی ہے یعنی یہ کہ میئر کے دفتر ("دارالنکاح") میں اَب مجھے کس دن جانا ہے، اور آیا میں اُس دن خاکستری گون پہنوں گی یا قرمزی رنگ کا؟ اور ہاں اُس دن مجھ کو پھُندنے دار ٹوپی پہننی چاہیئے یا بے پھُندنے کی؟"

"تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

"ہوا کا گھوڑا؟ بھلا یہ کیونکر؟ تمہیں کہو اَب کون سی رُکاوٹ باقی ہے؛ رابرٹو اور میں ایک دوسرے پر دیوانہ وار شیدا ہو جائیں گے؛ ہمارے والدین بھی اس رشتہ سے مطمئن ہیں۔"

"اور تم اس طریقے سے ایک شخص سے شادی کرلوگی؟!" صوفیہ نے سوال کیا۔

"اس طریقے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو بہت معنی خیز لفظ ہے!"

"یعنی یہی کہ بغیر اس کو جانے ہوئے اور بغیر اُس سے محبّت والفت کے پینگ بڑھائے ہوئے!"

"مگر ایسا تو نہیں ہے، میں اس کو جانتی ہوں، میں نے اُس کو گھوڑدوڑ میں دیکھا،

پھر باہر ٹہلتی ہوئی بھی اُس سے ملی ؛ باہمی شناسائی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ میں اُس کی پرستش کرنے لگی ہوں ! پرسوں کا ذکر ہے کہ محض اس بات پر کہ میری اُس کی مُلاقات نہ ہو سکی میں نے دوپہر کا کھانا نہ کھایا اور صرف تین پیالی چاء پر دن گزار دیا ؛ اُس دن میں قریب تھا کہ خودکُشی کر لیتی !"

"اور وہ ! ؟" صوفیہ نے پوچھا

"وہ ؟ وہ بھی یقیناً مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ، پس معلوم ہوا کہ مجھ سے مُحبّت بھی کرتا ہے" نوتو نے جواب دیا اس جواب میں ایک فاتحانہ لہجہ تھا ؛ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اس بات پر صوفیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے تو وہ اس ناعاقبت اندیشانہ انداز پر متاسّف ہوئی۔ بہن کے سر پر جُھک کر اُس نے پیار سے پوچھا :

"کیوں بہن ! کیا میرے مُنہ سے کوئی ناگوار بات نکلی ؟"

"نہیں پیاری نہیں ! تم ٹھیک کہتی ہو : جب کوئی عشق کرتا ہے تو شادی بھی کرتا ہے ؛ لیکن جب مُحبّت نہ ہو تو مُحبّت پیدا تو نہیں کی جا سکتی !

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ⁂ کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے !"

یہ کہنے کے بعد صوفیہ کے مُنہ سے ایک آہ نکلی !

"بہن ! یہ کیا کہا کہ "لگائے نہ لگے ؟" میں تم سے کہتی ہوں کہ اس آگ کا بھڑکنا آسان ہے ، صوفیہ ! لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ابروؤں سے متانت ٹپکتی ہو ، آنکھوں سے غم برستا ہو ، اور ہونٹوں پر کبھی تبسّم نہ پیدا ہوتا ہو ! جب تمہاری طرح کوئی لڑکی جا کر کونے میں بیٹھ جائے اور وہاں مصروفِ غور و فکر ہو جائے ، درآنحالیکہ دوسری لڑکیاں ناچتی کودتی اور ہنسی دلگی کرتی پھر رہی ہوں ۔ جبکہ تمہاری طرح کوئی ہر وقت پڑھا ہی کرے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بجائے فلسفیانہ اور شاعرانہ خواب ہی دیکھا کرے ! اور جبکہ تمہاری طرح کوئی لڑکی کم سنی ہی میں بڑے بوڑھوں کا سا مُتفکّرانہ انداز اختیار کر لے ، تو اُس وقت تو بلا شبہہ

مشکل ہے کہ کوئی اُس سے مُحبّت کرے !"
صوفیہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر آہستہ سے ایک ارتعاش پیدا ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے لب پر آہ ہے۔ لیکن وہ ضبط کرنا چاہتی ہے!
یہ حالت دیکھکر لولو نے پوچھا:
"بہن! کیا میں نے تمہارے جذبات کو پھر مجروح کر دیا؟ .... یقین مانا کہ میں نے یہ ساری باتیں اس لئے کہی ہیں کہ لوگ تم سے بھی مُحبت کرنے لگیں، اور میں تمکو شانِ محبوبی میں دیکھوں! تمہارے گرد وپیش مُحبّت و اُلفت کا حصار ہو اور میں تم کو ایک روز دُلہن بنا ہوا دیکھوں! ہاں! کیا خوب ہو کہ میری اور تمہاری شادی ایک ہی دن رچے!!"
"اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں! سُنا لولو! میں بڑھاپے تک کنواری رہنا چاہتی ہوں!"
"نہیں میری دوشیزہ! میں اس کو کب گوارا کر سکوں گی! تم کیسی خراب آدمی ہو! خدا نے تم کو کیا عجیب الخلقت بنایا ہے! اگر رابرٹو واقعی کوئی اچھا آدمی ہے تو اُس کا ضرور کوئی کنوارا بھائی بھی ہونا چاہیئے، کاش ایسا ہی ہو!"
گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ اُن کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہوا خوری کے لباس میں تھی۔
"کیا آپ پھرنے جا رہی ہیں، امّی؟" لولو نے پوچھا۔
"ہاں پیاری میں اس وقت مُنیم کے یہاں جا رہی ہوں"
"اوہ! مُنیم کے یہاں! تو معلوم ہوا کوئی کاروبار کا معاملہ ہے۔"
"بس لولو! تم کو جلد حقیقت معلوم ہو جائے گی! صوفیہ! تھوڑی دیر کے لئے تم میرے ساتھ چلو"
"ایں! کیا صوفیہ کو بھی کمبخت مُنیم کے ساتھ کوئی سابقہ پڑا کرتا ہے؟!"
"لولو! میں کہتی ہوں کہ تم کبھی سنجیدہ بھی ہوگی؟"

"بہت جلد امی! آپ خود دیکھ لیں گی"

لولو نے دروازہ کھولا تاکہ ماں اور بہن باہر نکل جائیں، اور پھر اُن کو دو دفعہ جھک کر

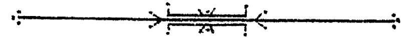
م کیا۔ اور دبی زبان سے کہا: "میڈیم میڈیا ئسل!"

ب دونوں کمرے سے روانہ ہو گئے تو لولو نے دروازے پر سے ان کو پکارا۔ اور ایک فرمایشی

ہہ لگایا:

"ہاں ہاں! اپنی باتیں جاری رکھیئے، جاری رکھیئے! میں بھی جان بوجھ کر انجان

، جاؤں گی"



(۲)

بحیثیت مجموعی رابرٹ مانٹی فرینکو کوئی صاحب فکر آدمی نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کو اپنی

ر ونظر کو نشو ونما دینے کا کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ گھوڑوں کی سواری، ملاقاتیں اور دعوتیں

، ہی ہنگامہ آرائیوں میں اُس کے دن اُڑ جاتے تھے؛ اور اُس کی زندگی اب نہایت پُر لطف

ریقے سے اُس کی حسین مہ جبین لولو کی آغوشِ اُلفت میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض

وسری کے کام بھی رابرٹ کو انجام دینے پڑتے تھے: یعنی وکلاء کے ساتھ اوقات مقررہ پر طے

رہ قرارداد کے مطابق ملاقات کرنا۔ معاہدوں پر دستخط کرنا اور پُرانے قرضوں کی حساب فہمی

یرہ وغیرہ۔ اور آئندہ متاہل زندگی کی تیاریوں اور شادی کی کوشش میں جو سلسل دورے اُس کو

ینے پڑتے تھے۔ اُن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں! بمشکل اُس کو آدھا گھنٹہ مطالعہ کے لئے ملتا ہو گا۔ یا

ی ہوٹل کے سامنے پندرہ منٹ چہلقدمی کے لئے! الغرض اس کو کبھی کسی نے اس حال میں نہ

یکھا کہ وہ غور وفکر میں محو ہو، نہ کبھی یہ سُنا کہ وہ کسی اجتماعی مسئلہ کے حل کرنے میں مصروفِ فکر

پا گیا ہو۔ رابرٹ کی زندگی کسی دردناک حادثہ سے آشنا نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی سیرت میں کوئی

تمانہ بات تھی بلکہ اس کے برعکس وہ ایک دنیا دار اور کاروباری مزاج کا آدمی تھا اور اُس کے

بہت سے ساتھی اُس کی اس اُفتادِ مزاج پر رشک کرتے تھے۔

لیکن آج دوپہر کو خلافِ معمول اُس کو اس رنگ سے دیکھا گیا کہ وہ اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور مطالعہ کرنے کی حقیقی خواہش کے آثار اُس کے چہرہ پر نمایاں تھے! کتاب اگرچہ دلچسپ تھی، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کتاب کا پڑھنے والا ایک بے خودی و محویت کے عالم میں تھا واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کچھ اس سے بھی زیادہ تھی یعنی وہ کسیقدر مضطر و مضطرب بھی تھا! اُس کو ورق گردانی کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اس لئے کہ دو تین سطریں پڑھنے کے بعد اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطبوعہ حروف اپنی جگہ سے محو ہو گئے ہیں، اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں، آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں، اور پھر نظر سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں! آج غیر شعوری طور سے رابرٹو کا دل و دماغ فکر و تخیّل کی نئی اور غیر معلوم دُنیا کی سیر کر رہا ہے!!

"والد اس نسبت سے مطمئن ہیں، میری سب چچیوں نے اپنی دُعائیں بھیجی ہیں، لیکن میری رشتہ کی بہنیں خفا ہیں! اُدھر ہوٹل کے حلقۂ احباب میں جو میرے دوست آشنا ہیں وہ ایک معنی خیز انداز میں مجھ کو مبارکباد دیں دے رہے ہیں! میرے قلبی دوست بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں یہ ساری باتیں پسندیدگی کے آثار ہیں اور فی الواقع شادی کی ایک "فضا" پیدا ہو گئی ہے .... اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ لولو بہت حسین ہے؛ جس وقت وہ اپنی شوخ و شنگ آنکھیں مجھ پر ڈالتی ہے، ہاں جب وہ مصروفِ تبسّم ناز ہوتی ہے اور اُس کے لبِ لعلین کی آڑ میں دُرِ دندان کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو بے اختیار میرے جی میں یہ بات آتی ہے کہ اُس کا پیارا سر اپنے ہاتھوں میں لے لوں، اور بار بار اُس کو چُوموں! اُس کی سیرت بھی بہت خوب ہے؛ یوں کہنا چاہئے کہ وہ زرّین مزاج رکھتی ہے، ہمیشہ خوش و خرّم اور ہشاش بشاش رہتی ہے، بہت نیک نہاد ہے، ہنسی دل لگی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ بہت ذہین اور حاضر جواب ہے؛

خوش فعلیوں اور شگفتہ طبیعیوں سے لبریز ہے، اور کبھی مغموم و ملول نہیں ہوتی؛ غرض یہ کہ ہماری اُس کی خوب نبھے گی۔ میں پُر متانت انداز کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے تو اُس کے دیکھنے تک کی برداشت نہیں۔ بالخصوص اُن لوگوں میں جن سے میں مُحبّت کرنا چاہتا ہوں مجھکو ہمیشہ ایسا محسوس ہوا ہے کہ آدمی کے چہرے کے ایسے آثار کے پیچھے اندرونی رنج وغم ہوتا ہے جس سے میرا دل مطلقاً ناآشنا ہے، اور جس کا میرے پاس کوئی درماں نہیں۔ بلکہ مجھکو یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے غم و الم کا میں غیر ارادی طور سے خود باعث بنجاتا ہوں! صوفیہ جو میری سالی بننے والی ہے اُس کی طبیعت کا یہی رنگ ہے۔ مجھے سرد مہرا در جذبات سے خالی چہرے سے چڑ ہے۔ جب کبھی وہ میرے سامنے آجاتی ہے میرے ہوش و حواس گُم ہوجاتے ہیں۔ میرے ہونٹوں سے ہنسی کافور ہوجاتی ہے، اُس وقت اگر موسم بہار کا شاندار آفتاب بھی ضیا پاشی کررہا ہو تب بھی میرے لئے یہ سارا حسین منظر ماہِ نومبر کا ایک سرد و خشک اور بے رونق اور بے کیف دن بن جاتا ہے! اس وقت مجھے لُولُو سے بھی خوش طبعی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی! الغرض صوفیہ سارے جوش و مسرّت کی قاتل ہے!.................ممکن ہے اُس نے وہ ناگوار اثر محسوس کیا ہو جو وہ مجھپر ڈالتی ہے کیونکہ جس وقت وہ مجھسے بات کرتی ہے تو آنکھیں چار نہیں کرتی۔ مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملاتی، اور اگر اُس کو مجھے کسی بات کا جواب ہی دینا ہوتا ہے تو وہ مختصر ترین الفاظ اختیار کرتی ہے۔ شاید وہ میری ناپسندیدگی کو جان گئی ہے، ممکن ہے میری روش سے شاکی بھی ہو!

"مگر لُولُو کو دیکھو کہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے؛ وہ کتنی شوخ ہے! وہ کبھی مجھ سے متانت کا ایک کلمہ بھی نہیں کہتی، اور کبھی اس کو اس قسم کا لفظ مُنہ سے نکالنا بھی پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بن رہی ہے، اُسے یہ زبان ہی نہیں آتی"۔

"وہ مجھ سے مُحبّت کرتی ہے، مگر وہ مُحبّت نہیں جو دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی ہو، سچ تو یہ ہے کہ اس مُعاملہ میں میرے جذبات بھی مجنونانہ نہیں ہیں۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ دو نظریوں پر میرا عقیدہ بالکل راسخ ہے: ایک یہ کہ جو مرد اور عورت آپس میں ہمشیرہ ہونا چاہتے ہیں اُن کو ہم رشتہ ہونا چاہیئے؛ دوسرے یہ کہ اُن کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز تیز و تند جذباتِ عشق سے نہ کرنا چاہیئے۔ یہی ہم دونوں کا معاملہ ہے! میں اور لولو آپس میں بہت ہی خوشی و خرمی کی زندگی بسر کریں گے؛ ہم اٹلی کا ایک چکر لگائیں گے لیکن عجلت کے ساتھ نہیں۔ چھوٹی چھوٹی منزلیں کریں گے اور ہر قسم کی لطف و آسایش سے لذت لیں گے، جہاں چاہیں گے قیام کر دیں گے، اور بہت ہی حقیر اور غیر اہم چیزوں کو بھی بے دیکھے نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح ہم اپنی سیر و سیاحت میں تین مہینے صرف کر دیں گے! مگر نہیں، یہ کافی نہ ہوگا! یوں کہنا چاہیئے کہ چار مہینے! مجھ کو اس بات سے خوشی ہوگی کہ میں لولو کو صوفیہ کی ماتمی صحبت سے تھوڑے دنوں کے لئے ہٹا لیجاؤں گا! لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا یہ کوئی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ لڑکی (صوفیہ) اس سن و سال میں اس قدر متین ہو! اُسکی عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہ ہوگی، اور اس کا چہرہ حُسن کے نقش و نگار سے خالی نہیں ہے! واقعہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بہت حسین ہیں اور سارا انداز تو ایسا ہے جیسا کہ ایک بادشاہ بیگم کا ہوتا ہے! اگر وہ اس درجہ خشک و پُر وقار نہ ہوتی تو اُس میں دلفریبی اور باصرہ نوازی کے بہت سے سامان موجود تھے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کا یہی رنگ رہا تو وہ بڑھاپے تک ناکتخدا ہی رہیگی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کو کوئی اندرونی بدوحانی جانکاہ غم ہے؛ ممکن ہے اس پردے کے پیچھے کوئی داستانِ عشق چھپی ہوئی ہو یعنی کسی "عشق ناکام" کا معاملہ! مجھ کو کتنا اشتیاق ہے کہ مجھے اُس کی اس غیر معمولی خاموشی اور بے خودی کا راز معلوم ہوتا! میں اور لولو ایک مرتبہ جب اکیلے ہونگے تو میں اس معمے کی بابت اس کا خیال معلوم کروں گا۔

"ہاں میری لولو پھولوں کی بھی عاشق ہے، اپنے اس مذاق گلچینی سے اس نے مجھ کو اُسی شام کو مطلع کیا تھا جب مجھے اُس کے گھر جانے کا دوسرا موقع تھا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے وہ کس انداز سے پھولوں کو توڑتی ہے! اور یہ پھول اُس کے ہونٹوں کے قریب جا کر ہمرنگی کی

جہاں سے کیسی غیر معلوم اور ناقابلِ شناخت ہو جاتے ہیں ! اور ہاں تھوڑی دیر کی "خانہ برانداز چمن" کے بعد وہ کیسا پیچ وتاب کھاتی ہے کہ اور پھول اور کلیاں اَب توڑنے کو نہیں رہیں !
سچ مچ بڑی پیاری ہے ، بڑی ہی پیاری ہے ! ایک دن اُس نے چپکے سے میرے کان میں کہا، کہ "جب بادل گرجتا ہے تو میرا جی لرز جاتا ہے اور میں دوڑ کر اپنا سر تکیوں میں چھپا لیتی ہوں"
اپنے مذاق لباس کے متعلق ذکر کرتے ہوئی اُس نے یہ بات بیان کی کہ "میں مدتوں سے ایک سیاہ مخمل کے گون کا خواب دیکھ رہی ہوں کہ جس کے گلے اور آستینوں پر سفید جھالر لگی ہو ، پوشاک کے معاملہ میں میرا یہ محبوب تخیّل ہے"
اُس نے مجھکو جتا دیا ہے کہ "میں رشک رقابت کا ایک قاتلانہ جذبہ رکھتی ہوں ، ایسا جسکے لئے اہل اسپین ضرب المثل ہیں اور اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں ایک چھوٹا سا زرکار دستہ کا خنجر خریدوں !"
جس وقت ان الّڑھ پنے کے طفلانہ خیالات پر وہ سرگرم گفتگو ہوتی ہے تو اُس وقت پرستش کے قابل ہوتی ہے ! اور تو اور صوفیہ بھی بعض اوقات اُس کی باتیں سُنکر مُسکرانے پر، مجبور ہو جاتی ہے ، اور پھر اُس وقت اس لڑکی کا چہرہ کتنا دلفریب ہو جاتا ہے ! لیکن صوفیہ! ارے یہ صوفیہ ! اس کے قلب کی گہرائیوں کو کوئی کب پا سکے گا ؟ !"
یہاں پہونچکر اُس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب فرش پر گر پڑتی ہے ، اور یہ نوجوان اس آواز سے چونک پڑتا ہے اور حیرت زدہ ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خود اپنے کو پہچاننے سے قاصر ہے !
مگر یہ وہی ہمارا دوست رابرٹ ماٹی فرنیکو ہے جو حسین تخیّلات کے پرستان میں اِس وقت مصروف خواب ہو گیا ہے !

(۳)

جھٹپٹا یوں چھایا ہوا تھا جیسے آسمان سے بھوری راکھ برس رہی ہو صوفیہ کھڑکی میں

بیٹھی ہوئی سڑک کے ہجوم اور شوروغوغا کو دیکھ اور سن رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب شہر کا چوک لوگوں کی چہل پہل سے بہت بارونق ہو جاتا ہے اور مجمع کے تصادم سے یہ جگہ کافی خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ پیدل راہ گیروں اور گاڑیوں کی کثرت سے بازار میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ الغرض ایک مسلسل زندہ سیلاب تھا جو اس راہ سے رواں تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں کسی خاص شخص کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یکبارگی اس کے چہرے پر ایک سرخ رنگ آگیا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر جھکایا، اس کے رخسارے زرد پڑ گئے اور پیچھے ہٹ کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ ایک منٹ کے بعد تو لو آندھی پانی کی طرح آدھمکی، دروازوں کو دھڑ سے کھولا۔ کرسیوں اور میزوں کو ادھر ادھر پھینکا اور چشم زدن میں صوفیہ کے پاس کھڑی تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں، ڈانا صوفیہ سینٹ انجیلو؟ غالباً پڑھ رہی ہو گی؟"

"جی ہاں پڑھ رہی تھی۔"

"لیکن تم نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر اس وقت سڑک کے منظر کا لطف اٹھاتیں؟!"

"اور اگر یہ مقصد عالیہ میں حاصل بھی کر لیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"ہیہات! ہیہات! ابھی میں تو اس وقت بالاخانہ پر البینا درزی کی منتظر تھی، چنانچہ آج شام کو زیب تن کرنے کے لئے وہ میرا گون تیار کر کے لایا تھا جس کے دیکھنے میں میں مشغول تھی اور اسی کام میں میں اتنی دیر وہاں رکی رہی۔ انتظار اور بےصبری سے میرا برا حال ہو رہا تھا کیونکہ میں جلد جلد یہاں حاضر ہونا چاہتی تھی۔ کل شام کو میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا خاکستری اوورکوٹ پہن آئے، گاڑی میں بہت نفیس سامان اور گھوڑے پر اعلےٰ درجہ کا ساز ہو، اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے سیر کو نکلنے کا انتظام کیا جائے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ میری فرمایش کی حرف بحرف تعمیل کریگا!"

"رابرٹو تو اسی ساز و سامان کے ساتھ ابھی اپنی گاڑی میں یہاں سے گذرا تھا اور وہ اسی رنگ کا اوورکوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔"

"خدا کی قسم ؟ !" لولو چلّا اُٹھی، "کیا یہ واقعہ ہے ؟ نہیں بھلا کس طرح معلوم ہُوا ؟ میں سمجھتی
ی کہ تم پڑھنے میں مشغول ہو گی !"
"میں کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی"
"اور تم نے رابرٹو کو پہچان لیا ؟ مگر تم تو کبھی اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ! کیسی عجیب
ت ہے ! ہاں بتاؤ تو کیا اُس نے تم کو سلام کیا تھا ؟"
"ہاں !"
"ہاں بہن بتانا تو اُس نے اپنی ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟"
"ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟ ! .... جس طرح ہمیشہ اُتارتا ہے ؟ !"
"اچھا تم نے بھی اُس کے سلام کا جواب دیا تھا ؟"
"جواب ؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں آداب تہذیب سے اس قدر عاری ہوں کہ کسی کے سلام
کا جواب نہ دوں ؟ !"
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم اُس کو دیکھ کر کچھ مُسکرائی بھی تھیں ؟"
"ہرگز نہیں ! ــــــ مگر میں وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی، ممکن ہے کوئی اضطراری
حرکت اس قسم کی ہو گئی ہو"
"تم اچھی آدمی نہیں ہو، صوفیہ ! بیچارا رابرٹو تو کل مجھ سے تمہارا بہت ذکر کرتا رہا"
"یہی ذکر کہ صوفیہ کوئی اچھی آدمی نہیں ہے ؟"
"جی نہیں، تمہاری خاموشی اور کم سخنی کی بابت پوچھتا تھا؛ وہ کہتا تھا کہ تم دونوں بہنوں
کی طبیعت میں یہ بُعد المشرقین کیوں ہے ؟ لیکن میں نے تمہاری نسبت ایک پورا نثریہ
قصیدہ کہہ کر سُنا دیا : میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ مجھ سے بدرجہا زیادہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھ سے
زیادہ محبّت و اُلفت کے جذبات سے لبریز ہے۔ مجھ سے زیادہ شان محبوبی رکھتی ہے اور اس
میں اگر کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنے ان تمام صفات پسندیدہ کو چھپانا چاہتی ہے ! صوفیہ

سچ کہتی ہوں۔ اُس نے انتہائی دلچسپی سے میری زبان سے تمہاری فطرت کی تفسیر سُنی! ہاں آخر میں پھر اُس نے یہ پوچھا کہ صوفیہ آخر مجھ سے کیوں اس قدر دور دور رہتی ہے ؟"

"دور دور ؟"

"کم ازکم اُس کے الفاظ یہی تھے اور تم خود ہی انصاف کرو کہ اُس نے کچھ غلط کہا ؟ ماشاءاللہ آپ اس سے کتنا خلوص اور محبّت کا برتاؤ کرتی ہیں۔ لیکن میں نے تو اس معاملہ میں بھی تمہاری وکالت کی۔ سچ پوچھو تو میں نے دنیاسازی اور ظاہرداری سے کام لیا، اس لئے کہ میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ تو تم کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور تمہاری درپردہ بہت ہی قدرشناس ہے!"

"لولو! تم بھی ایک ہی آفت کا پرکالہ ہو!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ بات صحیح نہ تھی، لیکن میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ رابرٹو تمہارا اتنا قدرداں اور ثناخواں ہے کہ تمہارا اُس کے ساتھ یہ مغائرت کا سلوک بڑی ہی بےدردی اور احسان ناشناسی ہے!"

صوفیہ نے اپنی باہیں چھوٹی بہن کے گلے میں ڈالدیں اور اُس کے رُخساروں کو بوسہ دیا! لولو بھی لپٹ گئی، اور بڑے پیار اور چاؤ کے لہجہ میں کہا کہ "بہن بتاؤ تو 'بیچارے رابرٹو کی جگہ تمہارے دل میں کیوں نہیں ہے ؟"

یہ سُننا تھا کہ صوفیہ یکبارگی بہن کو چھوڑکر پیچھے ہٹی، اور بُت بن کر رہ گئی!

"اچھا" لولو نے فوراً کہا، میں اب سمجھی، تم آج شام کی ہواخوری میں ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہو"۔

"نہیں، میں نے کچھ قسم تو کھائی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میرے سر میں درد ہے! تم امّی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں ؟"

"میں تو روز ہی جاتی ہوں اور آج بھی جاؤں گی۔ میں اِس تفریح کا لطف کیسے

چھوڑ سکتی ہوں؟"

"کیا رابرٹو بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟"

"نہیں وہ آج کلب جا رہا ہے، جہاں اس وقت ڈائرکٹروں کا ایک مشورے کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اس فرصت کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں۔ بعد میں بال میں جاؤں گی جہاں کل صبح تک مصروفِ رقص رہوں گی!"

"اور اگر کہیں اُس کو یہ معلوم ہو جائے؟"

"اور بھی اچھا ہے! اُس کو ابھی سے معلوم ہو جائیگا کہ میں اس معاملہ میں بالکل آزاد بے قید رہنا چاہتی ہوں، یہ کہ اگر وہ مجھ پر کسی قسم کی بندشیں عائد کرنے کا خیال رکھتا ہو تو چھوڑ دے میں اس کو کبھی گوارا نہ کروں گی کہ اُس کی عادت بگاڑ دوں!"

"مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اُس سے بس برائے نام ہی مُحبّت ہے۔" صوفیہ نے کہا

"نہیں، مُحبّت تو بہت سخت ہے، لیکن یہ مُحبّت میں اپنے ہی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتی ہوں۔ ہاں بہن اَب مجھ کو جا کر جلدی جلدی کپڑے بدلنا ہے۔ اس میں بھی تو مجھ کو کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے۔"

صوفیہ کھڑی روانہ ہونے والی گاڑی کو دیکھ رہی ہے جس میں اُس کی ماں اور بہن سیر کو جا رہی ہیں۔ وہ اَب اکیلی رہ گئی، بالکل یکہ و تنہا۔ اور اُس کی خواہش بھی یہی تھی! بچپن کے زمانہ میں جب کبھی کوئی اُس کو ستایا کرتا تھا تو اس وقت بھی اُس کا یہی معمول تھا کہ تنہائی میں جا کر رویا کرتی تھی! یہ پُرانی عادت اس میں آج بھی باقی تھی۔ اَب وسیع ڈرائنگ روم (نشست گاہ) میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کمرہ روشنی سے بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ صوفیہ کے ہاتھ بے حس و حرکت تھے۔ اور اُس کا سر آرام کُرسی کی پُشت سے لگا ہوا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دل دوز غم کا نقاب کھنچا جس میں ایک نہایت سخت اندرونی کشمکش کی جھلک نظر آ رہی تھی! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے کسی اور تنہائی کے عالم میں اس دردناک غم کے احساس نے اور بھی شدت اختیار کر لی ہے۔

امرِ واقعی کا ادراک جسے وہ عرصہ سے دبا رہی تھی۔ اس وقت ایک واضح اور خوفناک حقیقت بنکر آنکھوں کے سامنے تھا!

اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی اور صوفیہ چونک پڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ رابرٹ ہے! نووارد نے جب اس لڑکی کو کمرے میں اکیلا دیکھا تو وہ رُکا اور ٹھٹکا، لیکن بعد میں خیال کر کے کہ گھر کے باقی لوگ دوسرے حصۂ مکان میں ہوں گے وہ پھر آگے بڑھا۔ صوفیہ مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی!

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر ——"

دونوں ایک کشمکش میں مبتلا تھے!

"خدایا! یہ لڑکی کس قدر ملول اور افسردہ رہا کرتی ہے!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔

اس اثناء میں صوفیہ نے اپنے ہوش و حواس درست کر لئے تھے اور اس کے چشم و ... ایک مرتبہ پھر متانت و وقار کی تصویر تھے! آخرکار دونوں بیٹھ گئے، لیکن ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلہ پر!

"آپ کی والدہ اچھی ہیں؟"

"جی ہاں، اچھی ہیں، شکریہ!"

"اور لولو؟"

"وہ بھی بالکل اچھی ہے"

اب پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رابرٹو نے ایک عجیب جذبۂ مسرت محسوس کیا جس میں تلخی کی بھی آمیزش تھی!

"تو لولو کسی کام میں ہے؟" اس نے پوچھا۔

صوفیہ کے دل میں ایک خفیف اضطراب پیدا ہوا جس کو اُس نے دبا دیا۔

"وہ امی کے ساتھ بال میں گئی ہوئی ہے" صوفیہ نے جواب دیا، ساتھ ہی اُس نے یہ محسوس کیا کہ رابرٹو اس پر مزید سوالات کرے گا۔

چونکہ اس وقت صوفیہ اتفاق سے بالکل تنہا تھی۔ اس لئے رابرٹو نے خیال کیا کہ یہ بڑی بے مروتی ہوگی اگر وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس کے ساتھ باتیں نہ کرے۔ یہ خیال آتا تھا کہ رابرٹو کے دل میں ایک ناقابل مزاحمت جذبہ پیدا ہوا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ تاہم اُس نے اپنی نشست سے حرکت نہ کی۔

"میں اس وقت ادھر یوں نکل آیا کہ ہمارے کلب میں آج دوستوں کی کافی جمعیت نہ تھی اور حاضرین کی مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہوئی" رابرٹو نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ گویا وہ اپنی اس وقت کی مداخلت بے جا کے لئے معذرت پیش کر رہا ہے!

"لیکن لولو آپ کی تشریف آوری کی متوقع نہ تھی، مجھے اس بات کا افسوس ہے" صوفیہ نے کہا رابرٹو نے فوراً قطع کلام کر کے کہا کہ "خیر کوئی بات نہیں ہے!"

مگر رابرٹو کے منہ سے یہ جملہ بہت بے پروائی سے نکلا جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اُسے لولو کی غیر حاضری سے کوئی خاص مایوسی ہوئی۔

"اور آپ تشریف نہ لے گئیں؟" اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں تو نہیں گئی، آپ جانتے ہیں کہ میں "بال" کی ایسی دلدادہ نہیں ہوں"

"آپ کا خاص شوق تو شاید مطالعہ ہے؟"

"جی ہاں یہ مجھے بہت مرغوب ہے"

"لیکن اس مسلسل کتب بینی سے آپ کی صحت کو تو نقصان نہ پہونچے گا؟" رابرٹو نے کہا۔

"جی نہیں، میری آنکھیں کافی قوی ہیں!" یہ کہتے ہوئے صوفیہ نے ذرا تیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کافی قوی ہیں، اور کافی حسین!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر آہ ان میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں" (صوفیہ سے) میرا مطلب یہ ہے کہ ——

"اخلاقی نقصان، شاید؟" صوفیہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "مگر میں ایسا خیال نہ
کرتی، جس قسم کی کتابیں میرے مطالعہ میں رہتی ہیں اُن سے مجھ کو بہت سکون قلب حا
ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم سکونِ قلب کی محتاج ہو؟!"

"ہم سب ہی اس آبِ حیات کے پیاسے ہیں!"

صوفیہ کی آواز عارفانہ متانت کے لہجے میں ڈوب گئی؛ رابرٹو کو اس میں بڑا لطف
آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس مزے سے وہ پہلی بار لذت اندوز ہو رہا ہے۔ آج وہ اُ
پُراسرار عورت کی آنکھوں سے دوچار ہے جو ابھی تک اُس کے لئے مکتوب سربستہ کا حکم رکھتی
اور جو اس وقت اپنے ہر لفظ سے اور ہر ادا سے اپنی مخفی ہستی کے اوپر سے نقاب اُٹھا رہی
صوفیہ کا تکلف اور سرد مہری اس وقت رخصت ہو چکی تھی؛ وہ اس وقت ایسی از خود رفتہ
کہ اس کا وقار و تمکنت تھوڑی دیر کے لئے معطل ہو گیا تھا، چنانچہ گرمیٔ کلام اور ذوقِ گفتگو
وہ بار بار رابرٹو کو نظر بھر بھر کے دیکھتی بھی تھی، کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی، اور اُس سے با
ایک دوستانہ انداز میں سرگرمِ گفتگو تھی! اس سے پہلے اُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے
اور اس وقت کیا رنگ نظر آ رہا تھا!!

"لیکن جب میں کوئی کتاب پڑھا کرتا ہوں" رابرٹو نے کہا، "تو مجھ کو اس بات کی
جستجو رہتی ہے کہ خود مصنف کی ہستی اور حقیقت کو معلوم کروں اور یہ پتہ لگاؤں کہ اس کی سیر
سرشت کیسی ہے، آیا وہ بھی دُنیا کے علائق سود و زیاں میں حصہ دار رہا ہے، آیا اُس نے
عشق و عاشقی کی ہے، اور آیا وہ بھی ہجر و وصال کی لذت سے آشنا ہوا ہے ——"

"میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ اصول تنقید غلط فہمی پر مبنی ہے؛ کتابیں لکھنے والے "جگ
سُناتے ہیں"۔ "آپ بیتی" نہیں کہتے!"

"اور یہ غالباً خودداری اور وقار کی بنا پر؟" رابرٹو نے رائے دی۔

"نہیں بلکہ رشک و رقابت سے" صوفیہ نے تصحیح کی، "جہاں تک میرا خیال ہے یہی بات
بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کا رازِ عشق نہاں خانۂ
ے نکلکر گوشِ اغیار تک پہونچے۔"

صوفیہ نے جس وقت یہ لفظ کہے اُس کی آواز میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا، اُس کے
ے پر صاف گوئی کے آثار ہُویدا تھے، اُس کا لہجہ بالکل معصومانہ اور مخلصانہ تھا۔ رابرٹو کو اس
ن دیگراں" میں "سرِّ دلبراں" کی جھلک نظر آتی تھی! رابرٹو کے لئے اب کوئی بات تعجب خیز
ں، اور ہر چیز قدرتی اور توقع کے مُطابق نظر آتی تھی؛ حتّٰی کہ اُس کو ایسا محسوس ہورہا تھا
ں پُر اسرار روح رکھنے والی لڑکی صوفیہ کے ساتھ اُس کی یہ شام کی صحبت بھی گویا ایک
تۂ تقدیر اور اَمرِ الٰہی تھا! جس وقت وہ جُدا ہوئے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے کی
ں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا گویا کہ وہ اس طرح سے مزید اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں
ب دوسرے کی روح کا بھید معلوم کرلیا ہے۔ رخصتی کے وقت صوفیہ نے مصافحے کیلئے
ڑھایا۔ رابرٹو نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے جُھک کر بوسہ دیا! اب اس
یشانہ مُلاقات کا آخری لمحہ آگیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو خُدا حافظ کہا۔"

جب صوفیہ کی موجودگی اور گفتگو کی طلسمی فضا ختم ہوگئی تو رابرٹو کا دل و دماغ ایک
ی شمکش میں مُبتلا ہوگیا۔ یہ یک وقت خوش و خرّم بھی تھا، اور ملول و غمگین بھی! وہ مرجانے
ادہ تھا، لیکن ساتھ ہی ایک مژدۂ حیات بھی اُس کے کانوں میں پہونچ رہا تھا!
کا دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا کہ لولو کے متعلق کیا رائے قایم کرے، اپنی حالت کو کیا
ے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کس نتیجے پر پہونچے۔

صوفیہ بہت خوش ہے، بہت ہی خوش ہے! چنانچہ اسی غیر معمولی جذبہ خوشی سے مغلوب
ر وہ زار و قطار رونے لگی اور اس عالم میں اُس کا سر پھر اپنے بستر کے تکیوں میں چھپ گیا تھا!



تین مہینے گذر گئے ہیں اور لولو کی شادی برابر ملتوی ہوتی رہی ہے۔ لولو کی ماں جو اس التوا و تاخیر کا راز سمجھنے سے قاصر تھی بار بار لولو کو تخلیہ میں لیجاتی اور اس گو مگو کا سبب پوچھتی لیکن لولو ہمیشہ یہی جواب دیتی کہ:

"میں ابھی انتظار کرنا چاہتی ہوں، مجھ کو رابرٹو کے دل و دماغ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے!"

واقعہ یہ ہے کہ اس لڑکی میں بھی غور و فکر کے آثار پیدا ہو گئے تھے! اُس کی زندگی میں بظاہر کوئی تغیّر نہیں ہوا تھا، وہ پہلے کی طرح گایا کرتی تھی، ہنستی تھی، مذاق کرتی تھی لیکن وقتاً فوقتاً وہ اپنے ان زندہ دلانہ مشاغل کو ترک کر دیتی تھی اور اس اثناء میں اپنی بہن کی فطرت کا مُطالعہ کرتی! یا رابرٹو کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتی! لوگ اُسے اکثر اس حال میں دیکھتے کہ اُس کے ہونٹ بھچے ہوئے ہیں، اور بھَویں کھنچکر آپس میں مل گئی ہیں یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اہم مسائل پر غور کر رہی ہے۔

پھر لولو ہونے والے واقعات کو دیکھتی، اُس کے گرد و پیش عجیب و غریب وارداتیں پیش آرہی تھیں! رابرٹو میں اب وہ مادیّت اور ہشاشی اور بشاشی باقی نہیں رہی ہے بلکہ وہ متفکّر، مغموم، زرد اور مُضطرب الحال سا نظر آتا ہے! وہ بہت کم سخن ہو گیا ہے اور کچھ مختصر سی گفتگو کرتا بھی ہے تو اُس سے ایک بے خودی اور خود فراموشی ٹپکتی ہے! جن چیزوں سے اُس کو پہلے غیر معمولی دلچسپی تھی اَب اُن سے وہ کسی ذوق و التفات کا اظہار نہیں کرتا! کبھی کبھی بہت سخت جد و جہد کے بعد وہ اپنی اس غیر حالت پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، اور وہی پچھلا رابرٹو بن جاتا ہے۔ لیکن یہ قلب ماہیت محض آنی ہوتی ہے اور چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی! وہ کبھی "بننے" کا عادی نہ تھا۔ اور اس قسم کی کوششوں میں ہمیشہ بُری طرح ناکامیاب ہوا کرتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُس کے قلبی اضـ

اور اُس کی روحانی کوفت کی غمازی، اُس کی آنکھیں کیا کرتی تھیں!

ہاں ان دنوں صوفیہ بھی کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی! یعنی ایک مضطر و مضطرب صوفیہ، جو کبھی جوشِ محبت میں اپنی بہن کو سینہ سے لگاتی اور کبھی کئی کئی گھنٹے اس حالت میں گذار دیتی کہ اس کو نہ دیکھتی، اور نہ دیکھنا کیا معنی اس سے گریزاں سی نظر آتی! اس کے چہرے پر شرم و حیا کی اضطراری کیفیت سُرخی بن کر جھلکتی اور معًا غائب ہو جاتی۔ اُس کی آنکھیں شعلہ افشانی کرتیں اس کی آواز کبھی گہری اور جوشیلی ہوتی، اور کبھی خشک و خشن! عالمِ جذب و جوش میں اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ اُس کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی؛ تولو آدھی رات کے وقت اُٹھتی، اور برہنہ پا صوفیہ کی خوابگاہ کے دروازہ پر کان لگا کر سنتی اور بہن کو بےچینی سے کروٹیں بدلتے اور روتے پاتی۔ تولو پوچھتی: "بہن کیسی طبیعت ہے؟" مگر ہمیشہ ایک ہی جواب تھا کہ "کچھ نہیں لولو!"

جب راَبرٹو اور صوفیہ آپس میں ملتے اور اُن کی یہ مُلاقات بلا ناغہ روزانہ ہوتی، تو جو انقلاب دونوں کی دنیائے دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ اُس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا! گفتگو برائے نام ہی ہوتی، جوابات یا تو اضطراری انداز میں دئے جاتے یا وہ بالکل مبہم اور بےمعنی سے ہوتے! عجب انوکھے طریقے سے وہ ایک دوسرے پر نظریں ڈالتے، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ملاقات کی پوری پوری شامیں سکوتِ مطلق میں گذر جاتیں، اور کوئی ایک کلمہ بھی دونوں کی مہرِ خاموشی کو نہ توڑتا! لیکن ساتھ ہی دونوں ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کے مطالعہ میں غرق پائے جاتے! وہ کبھی پہلو بہ پہلو نہ بیٹھتے، لیکن یہ ضرور دیکھنے میں آتا کہ جس کتاب کو صوفیہ کی اُنگلیوں نے مَس کر دیا ہوتا، اُسکو راَبرٹو کسی نہ کسی حیلہ سے ہاتھ میں اُٹھا لیا کرتا! بعض اوقات جب صوفیہ کمرے میں نہ آتی تو راَبرٹو لمحہ بہ لمحہ مُضطرب ہوتا جاتا اور بند دروازوں کی طرف رُخ کرکے فرضی سوالات کا ایک خود فراموشی کے لہجہ میں جواب دیا کرتا! کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کو آئے ہوئے ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ راَبرٹو اپنی

ہیٹ سنبھالتا اور چل دیتا! لڑکی روز بروز زرد پڑتی جاتی تھی، اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے! آخر کار اُس نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو مُنہ نہ دکھائے گی۔ چنانچہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی دن شام کے وقت وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی جہاں وہ بے صبر و بے تاب لرزاں و مرتعش نظر آتی، اور اپنی سوزش قلب سے سُلگا کرتی!

ایک دن شام کو لولو کمرے میں داخل ہوئی، اور اُس نے صوفیہ کو مخاطب کر کے کہا:

"کیا اس وقت میرے لئے ایک کام کرو گی؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"مجھ کو اس وقت ایک خط لکھنا ہے، مگر رابرٹو باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے؛ تم اتنا کرتیں کہ ذرا وہاں چلی جاتیں اور اُس کے پاس بیٹھتیں، کیوں جاؤ گی؟"

"لیکن میں ——————"

"بہن کیا اس کمرے میں پڑی پڑی اپنے کو ہلاک کر لو گی؟! کیا میری اتنی سی بات مان لینے میں تم کو کوئی بڑی قربانی کرنی پڑے گی!"

"اچھا پھر تم جلدی چلی آؤ گی؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"مجھے تو بس چند سطریں لکھنے کے لئے چند منٹ چاہئیں"

صوفیہ نے باہر کی طرف رُخ پھیرا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سخت آزمائش کے لئے وہ اپنا جی کڑا کر رہی ہے! وہ اُٹھی لیکن دروازہ تک پہونچکر ٹھہر گئی؛ رابرٹو باہر چبوترے پر اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا؛ آخر اُس نے ہمّت کی اور قدم بڑھاتی ہوئی اُس کے پاس جا پہونچی۔

"لولو نے مجھے بھیجا ہے" اُس نے زیر لب آواز میں کہا۔

"مگر تم کو یہاں آنے میں اپنے آپ پر بہت جبر کرنا پڑا ہو گا!"

"جبر؟! - نہیں تو!"

صوفیہ کے سارے بدن میں رعشہ ہے۔ رابرٹو اس کے قریب ہی کھڑا ہے، اُس کے

چہرے کی ہیئت ایک خاص جذبے نے بدل دی ہے!

"صوفیہ! اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟" رابرٹو بولا۔

"جی کچھ نہیں، آپ نے کیا کیا ہے؟ اللہ! میری طرف ان نظروں سے نہ دیکھئے! میں التجا کرتی ہوں، ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں!"

"صوفیہ، تم جانتی ہو کہ تم میرا دل لے چکی ہو! بالکل لے چکی ہو!!"

"اُف چُپ رہو، رابرٹو، چُپ رہو! خدا کے لئے ایسا کلمہ مُنہ سے نہ نکالو! تم سوچتے نہیں کہ اگر لولو ہماری باتیں سُن پائے ——————"

"مجھ کو لولو سے محبّت نہیں! اب میں تمہارا دلدادہ ہوں!"

"آہ! یہ غدّاری! یہ بے وفائی!!"

"میں اس جُرم کا مُعترف ہوں، لیکن اب تو مَیں تمہارا عاشق ہوں! اچھا اب مَیں جاؤں گا ——————"

"خوب!" لولو کمرے کے دوسرے دروازے میں کھڑی ہوئی دور سے چلّائی، "خوب! آج تو تم دونوں میں صلح نامہ سا ہو گیا ہے!"

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ صوفیہ بھاگی، اور اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا! لیکن رابرٹو بالکل بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا؛ اس کے سکوت و جمود کا یہ حال تھا کہ گویا وہ ایک سنگی مجسمہ ہے!

"رابرٹو!" لولو نے پُکارا۔

"لولو"

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟!"

"کچھ نہیں؛ اب جاتا ہوں"

اور بغیر اُس کی اجازت وہ چل کھڑا ہوا! روانہ ہوتے وقت وہ یاس و دلشکستگی کی

ایک تصویر تھا! لولو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، وہ حیران کھڑی ہوئی تھی، اور خیالات میں مستغرق!

"اُف! میں یہاں اور وہ وہاں!" لولو کی زبان آہستہ سے متحرک ہوئی لیکن اس افسانۂ عشق کا ماضی کتنا شاندار تھا! خیر، کچھ نہیں!

ہرچہ بادا باد حرفے چند میگویم بہ او — کارِ خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم!"

(۵)

"اور پس ان تمام قوی دلائل اور اہم مصالح کی بناء پر میں اب رابرٹ مانٹی فرنیکو سے شادی نہیں کر سکتی" لولو نے آخر کار اپنی ماں سے کہہ دیا!

"یہ کس قدر نامعقول دلائل ہیں! بیٹی ذرا ان کے مہمل پن پر تو غور کرو!" اس نے اپنا سر ہلا کر کہا۔

"ماں! بس قصہ مختصر یہ ہے کہ میں آپ سے صاف صاف کھلی کھلی بات کہتی ہوں کہ رابرٹو کی ذات میں اب میری مسرت قلب کا کوئی سامان نہیں ہے۔ اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اُس کے ساتھ ہرگز شادی نہ کروں گی!"

یہ باتیں صاف صاف اور کھلی کھلی تو ضرور ہیں، لیکن ایک وہم وجنون سے زیادہ نہیں! تم جانتی ہو کہ رابرٹو تم سے محبت کرتا ہے"

"خیر اگر وہ مجھ سے محبت بھی کرتا ہے تو اُس کی طبیعت کو ہوگا قلق چند روز — سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی!"

"لیکن تم اس بات کو بھول جاؤ گی کہ تمہارے اور اس کے درمیان قول وقرار ہو چکے ہیں؟!"

"ہم اپنے قول وقرار کو واپس لے لیں گے؛ اب وہ زمانہ نہیں کہ لوگ جبراً شادی

کرنے پر مجبور کئے جائیں!"

"دنیا کیا کہے گی ؟!"

"اماں! ذرا اِس "دنیا" کی تعریف تو کرنا!"

"یہی سب لوگ!"

"مجھے بتایئے کہ یہ "لوگ صاحب" کون بزرگ ہیں ؟! مجھے ان کی خدمت میں اب تک نیاز حاصل نہیں ہوا! میں ان "حضرتِ لوگ" کی اتنی مرہونِ منّت نہیں ہوں کہ اُن کی خاطر اپنی ساری زندگی کو تلخ کرلوں!"

"کس قدر آتش کا پر کالہ ہو! لیکن اب مجھے بتاؤ کہ رابرٹو سے میں کس طرح معاملہ طے کروں؟ میں اُس سے کہوں تو کیا کہوں ؟"

"جو چاہیئے کہدیجئے، آپ کو اختیار ہے، آپ میری ماں ہیں۔"

"آہ! کیا یہ میرا فرض ہے کہ تم نے جو اندھے پنے سے غلطیاں کی ہیں اُن کا خمیازہ میں بھگتوں؟! افسوس کیسی رسوائی ہو گی!"

"میں رسوائی کی رسومات کو نہیں مانتی؛ بہتر ہے کہ آپ اس سے یہ بات مُہذب طریقہ سے نرمی کے ساتھ کہدیں؛ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اُس سے میری برائی بھی کر سکتی ہیں اُس سے کہیئے کہ لولو ایک شکّی طبیعت کی خفیف الحرکات اور طفلانہ مزاج لڑکی ہے؛ کہد تجئے کہ بحیثیت بیوی کے وہ بہت بُری ثابت ہوگی؛ کہیئے کہ اُس میں قطعاً متانت نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ شانِ وقار سے بالکل خالی ہے اور یہ کہ لولو کی بہن ——————"

"لولو کی بہن ؟! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!"

"اجی! آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں؛ فی الحال رابرٹو اور صوفیہ ایکدوسرے سے بے تعلق سے ہیں۔ لیکن اگر ان کی راہ و رسم اور جاری رہی اور وہ ایک دوسرے کے مذاق سے زیادہ واقف ہُوئے تو پھر انہیں ایک دوسرے سے وحشت نہ رہے گی۔ وہ

ایک دوسرے کے قدردان اور مدّاح ہو جائیں گے، اور پھر ———— کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟! اور آپ کی بھی تعریف ہوگی کہ کتنی اچھی ماں تھی جس نے آخر بڑی ہی لڑکی کو پہلے بیاہا!"

"سچ کہتی ہو! ————"

"اور میں بھی بے شوہر کے نہ رہوں گی اور ابھی اس کے لئے کون جلدی ہے؛ میں بمشکل اٹھارہ برس کی ہُوں گی۔ ابھی تو چند روز تک میں تفریح کرنا چاہتی ہوں، ابھی کچھ دنوں ناچوں گی کودوں گی۔ اور اپنی پیاری ننھی سی ماں کے ساتھ اپنی جوانی کا لُطف اُٹھاؤں گی!"

"تم بھی آفت ہو آفت!" ماں نے کہا اور یکبارگی محبّت سے مغلوب ہو کر لولو کو گلے سے لگا لیا۔

"شکر ہے کہ آپ میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئیں! اچّھا اب یہ نا ملائم خبر ملائمت و خوبصورتی کے ساتھ رابرٹو کو پہونچا دیجئے۔ لیکن یہ کہیئے کہ ہم اب بھی آپس میں دوست رہیں گے، اگر رابرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے کے عشق میں مُبتلا ہو جائیں تو اُن کو ہونے دیجئے۔ جو چیز مقدّر ہو چکی ہے اس کو کون روک سکتا ہے؟"

"لیکن نٹ کھٹ لڑکی! تجھے یقین ہے کہ معاملات صلح و آشتی کے ساتھ ہمارے حسبِ مرضی ہی طے پا جائیں گے، اور کوئی مشکل پیش نہ آئے گی؟ تم جانتی ہو کہ میں جھگڑے سے کتنا بھاگتی ہوں؟"

"میری پیاری ماں! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں اور آپکی بدعقیدگی کا کیا علاج کروں؟ آپ تو سینٹ ٹامس سے بھی زیادہ منکرانہ دماغ رکھتی ہیں! ہاں مجھکو جو وسیع تجربہ ان معاملات میں حاصل ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتی ہوں کہ کوئی بدنامی کی صورت پیش نہ آئے گی۔ رابرٹو ایک شریف آدمی ہے اور وہ کبھی مجھ سے یہ تقاضا نہ کرے گا کہ میں بغیر محبّت کئے اُس سے شادی کر لوں!"

"جو چیز مجھ کو ناممکن نظر آتی ہے وہ صوفیہ کا معاملہ ہے ——————"

"اماں، کوئی چیز ناممکن چیزوں سے زیادہ ممکن نہیں!" لولو نے بڑی عالمانہ شان متانت سے کہا۔

"پیاری لولو! ایک ہی وقت میں اتنے فلسفیانہ ملفوظات کا ڈھیر نہ لگا دو! بس اتنا ہی بہت ہے! ہم کو یہ سارے پیچیدہ معاملے مستقبل پر چھوڑ دینا چاہئیں، شاید وقت ہی ہماری بگڑی کو بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہو اسمیں تو کلام نہیں کہ تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے!"

"ہاں میں بہت وہمی ہوں ——"

"وہمی تو کیا، مگر یہ تمہاری خامکاری ہے، اور قوت فیصلہ کی غلطی"

"نہیں نہیں، میں پرلے درجہ کی وہم پرست ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں مجھے قبول ہے مجھکو وعظ وپند سنائیے تنبیہ کیجئے۔ میں ان سب باتوں کی مستحق ہوں، ہاں ہاں! کہئے، رک کیوں گئیں؟ میں تو منتظر ہوں، کیا آپکے پاس اب کچھ اور کہنے کو نہیں؟"

"پیاری آؤ۔ مجھے ایک بار پیار کرنے دو اور پھر جا کر سو رہو! شب بخیر!"

"شکریہ اماں، شب بخیر"

---

(۶)

"خیر چلو اچھا ہے" لولو کی ماں نے اپنے دل میں کہا، "لولو ابھی کم سن بھی ہے اور ہم آئے دن ان کم سن لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کا انجام دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا ہم کو ان افسوسناک نتائج سے بچائے رکھے! ہاں، مصلحت یہی ہے!"

"واہ وا!" لولو نے چونک کر اپنے دل میں کہا" واہ میں نے کس حکمت عملی سے کام لیا اور والدہ کو قائل کرنے میں اس فن لطیف کی کیسی داد دی! میں تو ایک بہت اچھی

مُلکی سفیر بن سکتی ہوں! کتنی زبردست کامیابی ہے! کامرانیٔ عشق کی طرح! لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس فتح کا سہرا لوٹو ہی کے سَر ہے!"

لوٹو بہن کے کمرے کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اندر کی آوازوں کو سُن رہی ہے وہ بار بار دلدوز آہوں کو سُنتی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ صوفیہ ضبطِ فغاں کی جدّوجہد کر رہی ہے! آہ غریب صوفیہ دل شکستہ ہوگئی اور اس نے اپنا اطمینانِ قلب کھو دیا!

"سو جاؤ بہن صوفیہ سو جاؤ" لوٹو نے آہستہ سے بڑے پیار کے لہجے میں کہا اور یہ الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اُس نے دروازے کے قُفل کو چوم لیا۔ گویا کہ وہ اپنی مصیبت زدہ بہن کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہو! "اپنے دلِ مُضطر کو تسلّی دو۔ اور کچھ سو لو۔ آج شام کو میں نے تمہارے لئے کچھ کیا ہے!"

اور اس کے بعد یہ فراخ دل لڑکی خود بھی جا کر سو رہی اور اس اطمینان نے اُسکو لوری دی کہ اس نے اپنی بہن کے دردِ دل کے درماں کے لئے کچھ کردیا ہے!

وقت نے، قدیم مہربان وقت نے ہاں اس وقت نے جو حکمت سرمدی کا حامل ہے۔ آخر یہ مہم سَر کرلی، اور ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ لوٹو نے اپنے دل سے پوچھا کہ آیا یہ بن بیاہی بہن جو دُلہن کی سہیلی بنی ہے اُس موقع پر آسمانی ریشم کا گون زیب تن کرے گی۔ یا بادامی رنگ کی سیدھی سادی پوشاک پہنے گی! اس نے رابرٹو سے پوچھ کہ کیا وہ اس تقریب میں بہت سے بتاشے لائیگا اور پھر صوفیہ سے درخواست کی کہ کیا وہ عاریتہً اُس کو اپنا کشیدہ کاردستی رومال دیدے گی جو اپنی شاعرانہ باریکی و لطافت میں بس ایک لکۂ ابر کی طرح ہے جس کو بادِ نسیم اُڑائے لئے جا رہی ہو! رابرٹو اور صوفیہ جان گئے تھے کہ اس لڑکی کے دل میں کتنی وسعت پیدا ہو گئی ہے اُس کی ان شگفتہ طبعی اور لااُبالی پن کی باتوں پر ہنستے تھے۔ لوٹو دونوں کی محبوب اور عزیز تھی اور وہ اُس کو اپنے لئے ایک فرشتۂ غیب سمجھتے تھے!

"میرا عرصہ سے یہ عقیدہ ہے" رابرٹو مانٹی فرنیکو نے سلسلۂ کلام میں جبکہ وہ اپنی شادی کے مسئلہ پر بحث کر رہا تھا، کہا" کہ میاں بیوی کو متضاد طبیعتوں کا ہونا چاہیئے اس لئے کہ انتہائی نقاط آپس میں مس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے متبائن اوصاف کو محسوس کر سکیں گے۔ آپس میں ملیں گے، اور دونوں اجزاء سے ایک مکمل واحد چیز بنائیں گے! لیکن برعکس اس کے یکساں مذاق رکھنے والا جوڑا مثل متوازی خطوط کے ہوتا ہے: وہ بے شک پہلو بہ پہلو چلتے ہیں لیکن کبھی ملتے نہیں بالخصوص عشق و محبّت کی نشو و نما کے لئے یہ اختلاف طبائع بہت کارآمد ہے۔ ہاں اب میرا یہی نظریہ ہے اور میں اب اسی کی تلقین کیا کرتا ہوں!"



غزل

از مولٰنا آزاد سبحانی

اس ضعف کا کیا کہنا بخشے جو توانائی — اس یاس کے ہیں صدقہ دی جسنے شکیبائی
ہے مذہب اُلفت کا آئین جُدا گانہ — سر مستی ہے ہشیاری نادانی ہے دانائی
عشاق کا سرمایہ، ناطاقتی و پیری — سرمایۂ معشوقاں رعنائی و زیبائی
ہر درد پہ ہنگامے ہر رنج پہ فریادیں — اور اسپہ ہی حضرت کو دعوائے شکیبائی
ہر قید سے بے قیدی، ہر وضع سے بے وضعی — رکھنا ہے یہی مشرب بننا ہے جو شیدائی
عاشق کو ہر اک جلوہ بس جلوۂ جانانہ — مجنوں کی نگاہوں میں ہر جلوہ تھا لیلائی
ہم عاشق صادق ہیں ہم ننگ کے دشمن ہیں — ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بدنامی و رسوائی
ہر شمع ہے پروانہ ہر ہوش ہے دیوانہ — کیا طرفہ تماشا ہے یہ انجمن آرائی
کوئی نہیں جُز تیرے، تو اور تیری شانیں — عارف کی نظر میں ہے یہ معنیٔ یکتائی
وہ جلوہ نما ہر جا، میں جلوہ طلب ہر جا — ہر جگہ میسّر ہے اُن کی مری یکجائی
ہر رنج کے شکوے بھی ہر جور پہ طعنے بھی — کس مُنہ سے پھر اپنے کو کہتا ہے تمنائی
اِک بندۂ عاجز کی فریاد نہیں سنتا — سچ کہنا مرے دارا، کیا ہے یہی دارائی

سبحانیٔ وحشی کو معذور رکھے خلقت
دیوانہ ہے دیوانہ، سودائی ہے سودائی

ولہٗ

کوئی ایسا ہے جسے کہیے کہ یہ باہوش ہے — جو بھی ہے اس بزم میں وہ سر بسر مدہوش ہے
ساری مے میخانۂ عالم کی ہو جاتی ہے صرف — بیشک اس میخانہ میں کوئی بڑا مے نوش ہے

یہ سبق دیتا ہے دریا کو سمندر کا خروش
جس میں جتنا مادّہ ہے اتنا وہ پُرجوش ہے

یہ وہ مے خانہ ہے جس کی ہائے وہو ہے دائمی
دل کے خم خانہ میں ہر دم شغلِ نوشانوش ہے

دل کی اس افسردگی پہ کھا نہ دھوکا اے حریف
شعلہ ہی تو ہے اگرچہ شعلۂ خاموش ہے

قتل ہوتے ہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے حسینؑ
وائے اس دنیا پہ جب مسلم بھی ناحق کوش ہے

رحم کے قابل ہے تیرا حالِ زار اے مردِ عشق
بار ہے کونین کا اور تیرا نازک دوش ہے

اس کے رنج و غم کا پیمانہ ہی کیا جانچے کوئی
یہ مریضِ عشق جو آٹھوں پہر بیہوش ہے

محویت میں ہو چکا ہوں ساری دنیا سے الگ
التفاتِ یار میں ہوں اور تری آغوش ہے

دیکھتی ہے لغزشیں اور پردہ در ہوتی نہیں
وہ نگاہِ رحم دیکھو کتنی لغزش پوش ہے

دل سے بالکل محو کر دے دوش کو ماضی پرست
فکرِ فردا کر کہ بے انجام ذکرِ دوش ہے

ہو بھی تو دلکش کوئی نغمہ بیان و پند کا
رندِ مستغرق کا تو ہر رونگٹا اک گوش ہے

کس کو ساغر میں ملی ہے اور کس کو اوک میں
اس ذرا سے فرق پہ کیوں میکشو یہ جوش ہے

کوئی کیف اس دہر کا لطفِ بقا رکھتا نہیں
جو ہے یاں صرفِ فنا ہی نیش ہے یا نوش ہے

کاٹتا ہے زندگی سبحانی اب اس وضع سے
سر بکف، زنجیر در پا، و کفن بر دوش ہے

غزل

از حضرت درؔد ـ کاکوری

واں ہیں اشک اور ہر دم کلیجہ مُنہ کو آتا ہے
الٰہی خیر ہو دل کی یہ آخر ماجرا کیا ہے

رق حسرت کا ہے وست الم میں اور دل غمگیں
نہ وہ بزم شبانہ ہے نہ وہ ذوقِ تمنّا ہے

واں ہیں اشک، چہرہ پر اُداسی، پھول دامن میں
الٰہی کون بہرِ فاتحہ مدفن پہ آیا ہے

بر دیتا ہے ہر دم جاذبہ موجِ تنفس کا
کہ پھر مہجور قطرے کیلئے بیتاب دریا ہے

ہر محفل دلوں میں پھونکدی ہے آگ سی جس نے
یہ سوزِ دل ہے یا سازِ جگر کا اِک ترانا ہے

ے صدقہ نہ پنہاں ہو ابھی اے جلوۂ پنہاں
ترے قرباں ابھی تجھکو کہاں جی بھر کے دیکھا ہے

ر میں ٹیں، لب پر آہ، اشک آنکھوں میں دل زخمی
ہمارا قلب، یا اِک محشر انگیز تمنّا ہے

کہیں روزِ ازل حُسنِ ازل کو دیکھہ پایا تھا
سبب یہ ہے جو ہر دم درؔد دل اپنا تڑپتا ہے

ولہ

ز بکوئے من گذر، کرد کہ کرد یار کرد
باز بسوئے من نظر، کرد کہ کرد یار کرد

ز ز تیغ غمزہ ہا، کشت کہ کشت یار کشت
ظلم و ستم برین جگر، کرد کہ کرد یار کرد

ز لبوئے بسملاں، دید کہ دید یار دید
باز بخستگاں نظر، کرد کہ کرد یار کرد

ق جمال بر دلم، ریخت کہ ریخت یار ریخت
باز ز عشق شور و شر، کرد کہ کرد یار کرد

وتِ جذب بیخودی، داد کہ داد یار داد
بیخود و مست و بے خبر، کرد کہ کرد یار کرد

سوز و گُداز درؔد دل، داد کہ داد یار داد
باز ز ناز یک نظر، کرد کہ کرد یار کرد

تنقید و تبصرہ

کتب :-

ہندوستان کے معاشرتی حالات - اسلام اور غیر اسلام
اسلام اور غلامی - مختصر تاریخ گجرات

ہندوستان کے معاشرتی حالات | مجموعۂ خطبات علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، قیمت عمر

پچھلے برس ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی دعوت پر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے ہندوستان کے ازمنہ متوسط کے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر متعدد خطبات دئے تھے جن کو اب ہندوستانی اکاڈیمی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تاریخ اور معاشیات انکے خاص مضامین ہیں۔ جو لوگ تاریخ ہند سے ذوق رکھتے ہیں وہ ان خطبات کو نہایت دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ طلبہ کو خصوصیت کے ساتھ ان سے استفادہ کرنا چاہئے۔ پہلے خطبے میں عبداللہ یوسف علیصاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار قائم کئے ہیں اور پھر ازمنہ متوسطہ کے تین حصے قرار دیکر دوسرے تیسرے اور چوتھے خطبات میں یکے بعد دیگرے ساتویں صدی دسویں اور گیارھویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی (اس لئے کہ ازمنہ متوسطہ کے یہی تین حصے ہیں) کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر نہایت دلچسپ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کے یہ خطبات معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہیں

اور جو لوگ ان سے مدد لیکر اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی کوشش کرینگے۔ انکے علم میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس لئے کہ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے ہماری توجہ جن مسائل کیطرف منعطف کرائی ہے وہی در اصل تاریخ کی جان ہیں۔ ہماری زبان میں حرد ب وسنین کے متعلق تو غالباً بہت کافی کتابیں موجود ہوں گی لیکن ایک رسالے کی شدید ضرورت تھی جس کے مطالعہ سے علم دوست طبقہ تاریخ ہند کے اصلی مسائل کیطرف توجہ کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جناب عبداللہ یوسف علیصاحب کے ان قابل قدر خطبات نے اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کر دیا ہے۔ ابتدا میں تمہید کے طور پر انہوں نے کتابت وطباعت کی بحث چھیڑتے ہوئے حامیان اردو کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹائپ سے بے اعتنائی نہ برتیں بلکہ جہانتک ہوسکے اسے "حسین وجمیل" بنانے کی کوشش کریں۔ ہماری رائے میں انکا یہ مشورہ نہایت مفید ہے۔

اسلام اور غیر مسلم اسلام اور غلامی	از محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی۔ قیمت ۸/ اور ۳/ ملنے کا پتہ: مسلم بکڈپو پھلواری شریف (پٹنہ)

یہ دو نہایت ہی مفید رسالے ہیں جن میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے ان الزامات کی تردید کی ہے کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عمل میں آئی یا یہ کہ اسلام نے غلامی کو جائز ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان دونوں رسالوں کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب نے اپنا مطلب بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور جابجا قرآن پاک، احادیث اور مسلم اور غیر مسلم مورخین کے بیانات اپنے دعوے کی تائید میں پیش کئے ہیں۔

مختصر تاریخ گجرات	مصنفہ سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہا ودیالے، مطبوعہ مطبع معارف

اعظم گڑھ۔ مصنف سے مہا ودیالے احمدآباد (گجرات) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

یہ تاریخ گجرات پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ابوظفر ندوی صاحب پروفیسر

مہادو یالے نے بچوں کی واقفیت کے لئے راجگان وسلاطین گجرات کے مختصر حالات جمع کر دیے ہیں آخر میں تحریک ترک موالات اور کسی قدر انگریزی عہد کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب بچوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں اس لئے کہ محض واقعات اور سنین کے مطالعہ سے بچوں کے دماغ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بہتر ہوتا اگر کتاب کو زیادہ دلچسپ بنانیکی کوشش کیجاتی۔

رسائل واخبار:۔

دبی دنیا - کامیابی - جدت - دولت کونین - موٹرکار - مومن

دبی دنیا لاہور | ماہوار باتصویر رسالہ زیرنگرانی سرعبدالقادر۔ چیف ایڈیٹر تاجور صاحب نجیب آبادی۔ ایڈیٹر حنیف صاحب ہاشمی۔ تقطیع $\frac{20\times 26}{8}$ حجم تقریباً نوے صفحے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی سرورق بہت خوشنما سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۱۲/-

بڑی خوشی کی بات ہے لاہور سے ایک اور قابل قدر ادبی رسالہ نکلا ہے۔ اس کے دو نمبر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلامت مذاق اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دوسرے رسالوں سے سبقت لیجائے گا۔ اس قیمت میں بڑے سائز پر عمدہ مضامین کے نوے صفحے شائقین ادب کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جسے وہ یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس رسالے میں اور کئی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تصویروں کے انتخاب میں خوش مذاقی سے کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں سے چیدہ ادبی شہ پاروں کا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی دئے جاتے ہیں۔

ہم اس رسالے کی ادارت کو چند مخلصانہ مشورے دینا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ

کہ رسالے کا سائز اتنا بڑا نہ رکھا جائے۔ اس سے دیکھنے والے مرعوب تو ضرور ہوتے ہیں مگر مانوس نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ دوسری زبانوں سے جو ترجمے دئے جاتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں تک محدود نہ ہوں بلکہ مکمل قصے یا مضامین ہوں جن سے اس زبان کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ہر پرچے میں تمام دنیا کی زبانوں سے ترجمے موجود ہوں۔ باری باری سے تین چار زبانوں کے ترجمے چھاپے جا سکتے ہیں۔ آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ ارباب ادارت کو زبان کے معاملے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ زبان کی خوبی ادب کی جان ہے۔

کامیابی دہلی | ماہوار رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ تقطیع $\frac{20\times30}{8}$ حجم ۴۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما قیمت سالانہ ۶ عار

یہ اپنے طرز کا بالکل نیا رسالہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں عزم و استقلال کسب حلال کا شوق اور کامیابی کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ مضامین کا انتخاب اور ترتیب اچھا ہے۔ بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلاحی مضامین خشک نہیں ہیں بلکہ زبان کی سلاست اور روانی نے انہیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب جیسے ادیب کی نگرانی میں یہ رسالہ اونچے ادبی معیار پر قائم رہے گا۔

جو دو پرچے اب تک نکلے ہیں ان میں مضامین زیادہ تر ادبی ہیں یا اصلاحی۔ امید ہے آئندہ پرچوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہونگے جن سے تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں کامیابی کے ذرائع معلوم ہوں۔ کامیابی کا ترانہ سنانے کے ساتھ کامیابی کی راہ دکھانا بھی ضروری ہے

روزنامہ جدت | چیف اڈیٹر سید شبیر حسن صاحب قتیل۔ ملنے کا پتہ۔ روزنامہ جدت لکھنؤ لکھائی چھپائی متوسط۔ کاغذ بھی متوسط۔ بڑا سائز۔ چندہ سالانہ لعہ ر ششماہی صہ رفی پرچہ

کسی ملک میں آجکل کثرت سے اخبارات کا شائع ہونا اس کے مہذب اور تعلیم یافتہ

ہونیکی سب سے بڑی دلیل ہے اس لحاظ سے ہمارے ملک میں جس کثرت سے اخبارات شائع ہوں اسی قدر ہماری نیکنامی ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت روزنامہ جدت کا دوسرا نمبر ہے۔ کاغذ اور صفحات کے لحاظ سے اس کی ایک پیسہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ اودھ کے باشندوں کے لئے یہ نایاب موقع ہے کہ کم سے کم قیمت میں ایک روزنامہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

مضامین کی ترتیب اور زبان بھی خاصی ہے لیکن ایک اخبار کا جہاں یہ فرض ہو کہ وہ اپنی ظاہری زیبائش کو قائم رکھے۔ اپنی باطنی خوبیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہئے۔ شاید جدت اس آخری خوبی کو اس نمبر میں قائم نہیں رکھ سکا۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ جدت کو جانبدارانہ جذبات سے علحدہ رہکر خدمت قوم کرنا چاہئے

دولت کونین | اڈیٹر جناب مفتی محمد نعیم صاحب فاضل دیوبند۔ ملنے کا پتہ لودھیانہ (پنجاب)
سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ ۶/ فی پرچہ ۴/

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے۔ اس میں کثرت سے وہی مضامین درج ہوتے ہیں۔ جن سے مسلمانوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ خاص خاص مہینوں کی مناسبت سے ان کی خصوصیات اور انکے متعلق احکامات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف ایک اسلامی درسگاہ کے مہتمم بھی ہیں۔ اس لئے اس رسالے کے اجراء سے غالباً ان کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس درسگاہ سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔

موٹر کار | اڈیٹر عبدالرحیم صاحب۔ چندہ سالانہ رؤساء سے ۳/ عوام۔ طلبہ اور موٹر ڈرائیوروں سے ۲/۸۔ سائز چھوٹا۔ ملنے کا پتہ۔ اڈیٹر موٹر کار گورکھپور (یو۔پی)

رسالہ موٹر کار کی تیسری کا نمبر ۲-۲۶ ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا مقصد مشینوں کے متعلق عموماً اور موٹر کار اور موٹر سائیکل کے متعلق خصوصاً معلومات فراہم کرنا ہے۔

نام کے پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں سارے مضامین موٹر ہی کے متعلق

ہونگے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دلچسپی کے لئے غزلیات اور ادبی مضامین بھی درج کئے جاتے
ہیں۔ ایک ایسے شہر سے جو ادب اردو کے لئے مشہور نہ ہو ایسے مختلف اور مجتمع المقاصد
رسالہ کا نکلنا قابل مبارکباد ہے۔

رسالہ مومن | اڈیٹر مولوی حافظ وحی الدین احمد۔ ملنے کا پتہ اڈیٹر رسالہ مومن۔ منگل باغ
ہزاری باغ (بہار) سالانہ چندہ عہ ممالک غیر سے عا فی پرچہ ۳
خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب ایسی زبان کیطرف توجہ کی ہے جو تقریباً
انہیں کی ہے
رسالہ مومن اس کا کافی ثبوت ہے۔ یہ رسالہ ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے
اس میں مضامین بہت سادے اور مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم مسلمانوں
کو خاص طور پر مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کو ضرور خریدیں۔ بشرطیکہ وہ ہندی
سمجھ لیتے ہوں۔

شذرات

جامعہ کا یہ نمبر مئی کے نمبر کے بعد چند ہی روز کے وقفہ سے شائع ہو رہا ہے امید ہے کہ انشاءاللہ اگست کے مہینے میں بھی اسی طرح دو نمبر شائع ہوں گے۔ اور رسالہ اپنے معمولی وقت پر آجائے گا۔

جب سے رسالہ کی اشاعت مقررہ وقت سے پیچھے ہو گئی ہے قارئین کرام مسلسل شکایت اور تقاضے کے خطوط لکھ رہے ہیں۔ اس سے ہمیں شرمندگی بھی ہے اور خوشی بھی۔ شرمندگی تو ظاہر ہے کہ اپنے قصور پر ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے رسالے کے پڑھنے والے اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اگر کسی نمبر کے پہونچنے میں دیر ہو تو پہلے انتظار۔ اور پھر شکایت اور تقاضا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ادارت جامعہ کے خیال میں بہت غنیمت ہے۔ کہ جامعہ کے سے خشک رسالے سے کچھ حضرات تو دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس رسالے کی کوشش ابتدا ہی سے یہ ہے کہ جتنے مضامین پیش کئے جائیں، وہ علمی شان، ادبی لطف اور سلامت مذاق سے خالی نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بلند تر اخلاقی اور مذہبی مقاصد بھی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ ابھی کل مضامین اُس معیار تک نہیں پہونچے جو مدیران جامعہ اور مُربّیان جامعہ نے قایم کیا ہے پھر بھی عام سطح سے رسالہ ضرور اونچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت محدود ہے اور اس کے قدردان کم ہیں۔ لیکن ہمیں اس کمی کا افسوس نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ رسالے کے پڑھنے والے حضرات وہی ہوں جو معیار کے بلند ہونے کی شکایت نہیں بلکہ بلند تر ہونے کی تاکید کریں۔

ہمارے موقر ہمعصر رسالہ "کامیابی" کے جولائی نمبر میں مکرمی ڈاکٹر سعید احمد صاحب
نے جامعہ ملیہ کے کارکنوں کو بہت مفید مشورہ دیا ہے۔ صحیح مشورہ بڑی قیمتی چیز ہے
خصوصاً جب مشورہ دینے والے کا دل خلوص اور ہمدردی سے لبریز ہو۔ ممدوح کی
رائے یہ ہے کہ جامعہ والے شہر سے دور کسی گاؤں میں ایک بستی بسائیں،
جہاں جامعہ کے بچوں اور اُستادوں کے علاوہ بچوں کے والدین بھی رہ سکیں اور
جامعہ کے کارکنوں کے ساتھ اس تعلیمی تجربے میں شریک ہوں جو وہ کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے پیش نظر جو نصب العین
ہے یعنی وہ تعلیم جو زندگی کی صحیح تفسیر ہو وہ تربیت جو عقیدے اور عمل پر مبنی
ہو وہ سادگی جو رہبانیت کی حد تک نہ پہونچے وہ مذہبیت جس میں تنگ خیالی
اور تعصب کی بُو نہ ہو وہ روشن خیالی جو لامذہبی اور بے اصولی سے پاک ہو
وہ حُبِ وطن جو اسلام کی وسعت نظر کے منافی نہ ہو وہ قوم پرستی جو خدا پرستی
سے نہ روکتی ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے یقیناً "موجودہ تہذیب و تمدن" کی فضا
سے باہر رہنا ضروری ہے۔ یہ فضا نفرت، عداوت، بغض و حسد، شک و شبہہ
پست خیالی اور پست ہمتی کی زہریلی ہواؤں سے مسموم ہو رہی ہے۔ اس سے دور
رہنا ہماری صحت کے لئے بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جامعہ کے کارکنوں
کے دل میں بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ اور وہ دہلی کے قرب و جوار میں مناسب
جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ مدیر "کامیابی" کے یہ الفاظ انھیں اپنے خیال میں اور پختہ
اور اپنے ارادے میں اور مستقل کر دیں گے۔

مگر اکثر مفید اور اہم تجاویز کی طرح اس تجویز کے ساتھ بھی بہت سے خطرات

وابستہ ہیں جن سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمام تعلیمی اور اصلاحی کاموں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کو سُدھاریں۔ اگر اصلاح کی کوشش کرنے والے ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آبادی سے دور جا بسیں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا رشتۂ تعلق ہیئت اجتماعی سے منقطع نہ ہو جائے۔ اور اگر تعلق باقی بھی رہے مگر صرف اتنا کہ وہ کشمکش زندگی سے الگ بیٹھے تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ اصلاحی تدابیر بتایا کریں تو اس سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو، عملی حصّہ لیں اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش ساری کڑیاں جھیلیں۔ جو شخص حیاتِ قومی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ کنارے پر کھڑا ملّاحوں کو ہدایتیں دیتا رہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ کشتی میں رہ کر کشتی والوں کو تسکین دے۔ ملّاحوں کا ہاتھ بٹائے اور اُن کی ہمّت بڑھائے۔

اگر یہ مقصد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے تو تعلیمی اور علمی مقاصد کیلئے گوشہ نشینی میں کوئی ہرج نہیں۔ تعلیم کے لئے بچّوں کو عام زندگی کے شور و شر سے بچا کر ایک گوشۂ عافیت میں رکھنا ایسا ہی ہے جیسے باغبان چھوٹے پودوں کو طوفان ابر و باد کی زد سے باہر کسی گرم خانہ میں یا محفوظ کیاریوں میں رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ یہ حفاظت عارضی ہے ایک دن ان پودوں کو سورج کی گرمی۔ آندھی کی تیزی اور پانی کے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب ان کی جڑوں میں زندگی کا رس دوڑ جائے گا اور مضبوطی و استحکام پیدا ہو جائے گا تو وہ عناصر کے حملوں کی تاب نہ لا سکیں گے اور وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ جیسے جیسے اُن کی نشو و نما مکمل ہوتی جائے وہ انھیں آہستہ آہستہ ان قوتوں کی مقاومت کی مشق کراتا جائے

جن سے اُنھیں عمر بھر کا سابقہ ہے۔

اگر جامعہ ملیّہ والے اپنی تجویز پر جسے مدیر "کامیابی" کی تائید حاصل ہے عمل کریں تو انھیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ "بے ہمہ اور باہمہ" کی راہ صرف صوفیوں ہی کے لئے دشوار گزار نہیں بلکہ ہر سالک زندگی کو اس کی صعوبت کا احساس ہوتا ہے لیکن بے اس کٹھن مرحلے سے گزرے چارہ بھی نہیں ہے۔

جنوبی جرمنی کے شہر میونک میں ایک نیم سیاسی اور نیم علمی ادارہ جرمن اکادمی کے نام سے قائم ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے قومی ادب کو ترقی دے غیر ممالک کو جرمنی کی علمی خدمات سے آگاہ کرے اور بین الاقوامی سیاسی مباحث میں جرمنی کی قلمی حمایت کرے۔ اس اکادمی نے ابھی حال میں تین وظائف کا اعلان کیا تھا جو ان ہندوستانی طالب علموں کو دیئے جائیں گے جنھیں ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میونک یونیورسٹی میں طب، انجینیری، اور کیمیا یا طبعیات میں ریسرچ کرنے کا شوق ہو۔

یہ غالباً پہلا وظیفہ ہے جو کسی یورپ کی یونی ورسٹی نے ہندوستانی طالب علموں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرمن اکادمی کو جیسا اس نے اعلان کیا ہے ہندوستانیوں کی مہماں نوازی کا احسان اُتارنا ہے جو اُنھوں نے میونک یونیورسٹی کے چند طالب علموں کے ساتھ برتی تھی لیکن پھر بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں۔ غریب ہندوستانیوں کو کون اس قابل سمجھتا ہے کہ اُن کی خدمات کا مُعاوضہ دے۔

اخباروں میں روز یہ خبر آرہی ہے کہ روس اور چین کے تعلقات بہت کشیدہ ہیں اور ان دونوں میں عنقریب جنگ شروع ہونے والی ہے بلکہ باوجود باقاعدہ اعلان جنگ نہ ہونے کے ایک آدھ معرکہ ہو بھی چکا ہے ان خبروں سے ان سب لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو سمجھتے ہیں کہ روس خلوص کے ساتھ ایشیائی قوموں کی آزادی اور ترقی کا حامی ہے اور بغیر اپنی کسی غرض کے ان کی مدد کرنے کو موجود ہے۔

کچھ دن پہلے جب چین کے قوم پرستوں کی جماعت جنوبی حصہ ملک پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی مستبدوں سے سرگرم پیکار تھی تو روس نے ایثار کے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ کیا اور کچھ تھوڑی بہت مدد کی بھی لیکن بہت جلد اس ایثار کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ روسی جو مددگار بن کر آئے تھے مالک بنکر رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ غریب قوم پرستوں کو ایک وقت میں دو دشمنوں کا بلکہ متعدد دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف تو شمالی مستبد حکومت کا دوسری طرف بالشویکوں اور ان سادہ لوح یا بدنیت چینیوں کا جو ان کے آلۂ کار تھے اور تیسری طرف دول یورپ کا جو خفیہ سازشوں کا جال پھیلا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی مدد کی اور چینی قوم ان اندرونی اور بیرونی دشمنوں پر غالب آئی لیکن ابھی معلوم نہیں کہ اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اسے پھر ان دشمنوں سے ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مقابلہ کرنا ہوگا۔

جو لوگ یورپ کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں انھیں روس کے قول و فعل میں یہ اختلاف دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ یورپ میں مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ کسی ملک کے نظام حکومت کی اندرونی تبدیلیوں سے سیاست خارجیہ

ئی فرق نہیں پڑتا۔ فرانس میں جب وہ عظیم الشان انقلاب ہوا جس نے
م دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور صدیوں کی جمی ہوئی شاہی حکومت کو چند دنوں
ں نیست و نابود کر کے جمہوری حکومت کی بنیا در کھی تو کیا اس کی بیرونی سیاسی
یسی بدل گئی؟ تاریخ سے پوچھئے تو وہ کہے گی ہرگز نہیں۔ فرانس کی زمین کی
وک اور قوت کی ہوس نہ صرف نپولین کے زمانہ میں بلکہ نپولین کے بعد بھی بدستور
ئی رہی اور آج تک باقی ہے۔ اسی طرح روس کے جو ارادے اور حوصلے ہمیشہ
ے چلے آرہے ہیں ان میں اشتراکی انقلاب سے کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ ز
یادتی ہوگئی ہے۔ کیونکہ روس کی فوجی طاقت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے
س کا دانت چین، ہندوستان، ایران، ٹرکی پر جیسے پہلے تھا اب بھی ہے۔

ایشیا والوں کو خصوصاً ہندوستانیوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قوموں
، اندر مختلف جماعتوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن غیر قوموں کے مقابلے
ں انہیں اپنی عصبیت قایم رکھنا پڑتی ہے اور اسی پر ان کی زندگی منحصر ہے۔
س کی بالشویک حکومت ہو یا انگلستان کی لیبر حکومت کسی سے یہ توقع رکھنا
وہ اپنے ملک کے مفاد کو پس پشت ڈالکر کسی اصول یا کسی نصب العین
حمایت میں ایشیا کی کمزور قوموں کا ساتھ دے گی بڑی نادانی ہے۔
ن محال اگر کسی ملک کی حکمراں جماعت اس ایثار پر آمادہ بھی ہو جائے تو
م قوم اس جماعت کو ایک دن بھی برسر حکومت نہ رہنے دیگی۔
